جولائی 2015

ماہنامہ

کرن

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

جولائی 2015

جلد 38 شمارہ 4

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Website: www.khawateendigest.com

Email: kiran@khawateendigest.com

مدیرہ

اداریہ

ماہ جولائی کا شمارہ آپ کے ہاتھوں کی زینت بن چکا ہے۔
ساتھ ہی ساتھ ماہ صیام اپنی رحمتوں، برکتوں اور سعادتوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ یہ مبارک مہینہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایتوں، رحمتوں، مغفرتوں اور عذاب جہنم سے نجات کا ہے۔ یہ خاص اللہ تعالیٰ کا مہینہ ہے۔ اس ماہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور اٹھے ہوئے ہاتھ خالی نہیں جاتے۔
پورے ماہ کی عبادت و ریاضت کے بعد مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا انعام اور خوشیوں بھرا تحفہ عید ہے۔ عید مبارک کے شور میں عید کا دن اپنے جلو میں کتنے ہی رنگ لیے طلوع ہوتا ہے۔ ہر طرف خوشیاں مسکراتی ہیں لیکن خوشیوں کا لطف تب ہی آتا ہے جب ان میں دوسروں کو بھی شریک کیا جائے۔ اپنے ارد گرد نظر ڈالیں۔ آپ کی ذرا سی امانت سے کچھ لوگوں کو عید کی خوشیاں میسر آسکتی ہیں اور عید سعید وہی ہو گی جب سب کے دل مسرور ہوں۔
ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی اور ہماری عبادتوں کو قبول فرمائے اور عید کی خوشگوار ساعتیں ان گنت خوشیوں اور حقیقی مسرتوں کا پیغام لے کر آئیں۔

تنزیلہ ریاض کا سلسلے وار ناول،

اس ماہ ہم نفیسہ سعید کے ناول کی آخری قسط پیش کر رہے ہیں اور اگلے ماہ آپ کی محبوب اور پسندیدہ مصنفہ تنزیلہ ریاض کا دلکش سلسلے وار ناول "رابینزل" پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے تنزیلہ ریاض کی اور تحریروں کی طرح ان کا یہ سلسلے وار ناول بھی آپ کو پسند آئے گا۔
خطوط کے ذریعے آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔

اس شمارے میں،

- "پہلا روزہ" شاہین رشید کا عید کے حوالے سے خصوصی سروے،
- اداکار فیروز خان سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اس ماہ پروا کرن صدیقی کے مقابل ہے آئینہ،
- تنزیلہ ریاض اور فرحین اظفر کے سلسلے وار ناول،
- "اک ساگر ہے زندگی" نفیسہ سعید کے سلسلے وار ناول کی آخری قسط،
- "میں گماں نہیں یقین ہوں" نبیلہ عزیز کا مکمل ناول،
- "ہاری تو میں تیری" زرین آرزو کا ناول،
- "جاندبات" نایاب جیلانی کا مکمل ناول،
- "ایم جلسی حیدی" صدف آصف کا ناولٹ،
- "تم آؤ تو عید کروں" رابعہ افتخار کا ناولٹ،
- "شاید" فائزہ افتخار کا دلکش ناولٹ،
- نذاحسنین، تمثیلہ زاہد اور دیا شیرازی کے افسانے اور مستقل سلسلے شامل ہیں۔

مفت،
کرن کتاب عید کے رنگ کرن کے سنگ "کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت پیش خدمت ہے۔

حمد باری تعالیٰ

لکھتا ہوں میں ثنا کی سطر تیرے واسطے
ہوتی ہے یونہی زیست بسر تیرے واسطے

ہر دم تیرے جمال سے ہوتا ہوں فیض یاب
اٹھتی ہے جس طرف بھی نظر، تیرے واسطے

ملتا ہے پھر سرور عجب رنگ کا مجھے
جھکتا ہوں جب میں وقتِ سحر تیرے واسطے

چندا یہ چاندنی، یہ ستارے، یہ کہکشاں
سارے ہیں تیرے زیرِ اثر، تیرے واسطے

سہراب تیرے نام پہ قربان ہوتا جائے
اس کا قلم رواں ہو اگر، تیرے واسطے

سہراب جنگ لدھیانوی

نعت رسول مقبول

دل جس کا آئینہ ہے وہ صورت تمہیں تو ہو
عنوان کائنات مشیت تمہیں تو ہو

سر تا قدم نگاہ کی دولت تمہیں تو ہو
خود جس سے روشنی ہے عبارت تمہیں تو ہو

محکم تمہارے ذکر سے ہے اعتبار عشق
سرمایۂ فروغ محبت تمہیں تو ہو

دستِ سوال دامن کونین کی قسم
حاجت روا بقدر ضرورت تمہیں تو ہو

تم سے ہے یار سولؐ! چراغاں حیات میں
آنکھوں کا نور دل کی بصیرت تمہیں تو ہو

اقبال صفی پوری

زندگی میں کیا گیا پہلا کام ہمیشہ یاد رہتا ہے اور اگر یاد نہ بھی رہے تو دوسرے یاد دلاتے رہتے ہیں۔ تم نے فلاں کام اس عمر کیا تھا' اس عمر میں تم نے چلنا سیکھا تھا اور اس عمر میں تم نے بولنا شروع کیا تھا اور ہاں اس عمر میں تم نے پہلا روزہ رکھا تھا۔ ویسے پہلے "روزہ" تو انسان کو خود بھی یاد رہتا ہو گا کہ زندگی کا پہلا "روزہ" عبادت کی تلقین "سارا دن کا پروٹوکول" "لمحے لمحے کا خیال" "شام کے وقت رونق" "مہمانوں کی آمد" اور سب سے بڑھ کر "گفٹ" جو کبھی بھول ہی نہیں سکتے۔ تو زندگی کے ہر شعبے سے لوگوں کی یادداشت کا امتحان لے ڈالا ہم نے کہ "میرا پہلا روزہ۔" جی آپ نے کس عمر میں پہلا روزہ رکھا تھا اور پھر کیا کیا ہوا تھا۔

میرا پہلا روزہ

شاہین رشید

حیا بخاری:۔ (رائٹر افسانہ نگار+ناول نگار)

میں بچپن میں اپنی خالہ اور نانی کے پاس رہتی تھی' بہت بعد میں پتا چلا کہ میرے سگے امی ابو کون ہیں اور یہ اسی رمضان المبارک کی بات ہے جب میں نے پہلا روزہ رکھا تھا۔ اس وقت میں 5 سال کی تھی۔ گرمیوں کا شاید موسم تھا۔ سب ننھیال والے آئے ہوئے تھے۔ اور سب میرے لیے بہت کچھ لائے تھے' دن بہت اچھا گزرا۔ میری نانی سارا دن ٹھنڈے پانی سے میرے ہاتھ منہ دھلواتی رہی تھیں اور نانی کے ساتھ ساتھ بڑی خالہ سارا دن ہاتھ کا پنکھا جھلتی رہیں کہ کہیں میں گرمی سے گھبرا نہ جاؤں۔ "نانا" کے ساتھ عبادت میں بھی حصہ لیا' اپنی عمر کے انداز میں۔ مجھے دن میں صرف پیاس نے تنگ کیا۔ شام کو سب میرے لیے گفٹ لے کر آئے۔ سب کی دعاؤں سے میرا پہلا روزہ مکمل ہوا۔ کھجور سے روزہ افطار کیا۔ ٹھنڈا شربت بھی پیا۔ ایسے میں کسی نے اچانک ہی کہہ دیا کہ بچی کا پہلا روزہ ہے اور اس کے امی ابو نہیں آئے' بس اس اچانک خبر سے مجھے ایک دم الٹیاں شروع ہو گئیں' لیکن سچ پوچھیں تو میرا پہلا روزہ میرے لیے بہت بڑی خوش خبری لے کر آیا۔ یہ بتادوں کہ یہ بات ہے 1991ء کی اور اس زمانے میں ہمارے گاؤں کے چند گھروں میں ہی لائٹ تھی جبکہ ہمارے ددھیال میں جو کہ ڈیرہ اسماعیل خان میں تھا وہاں لائٹ تھی اور ننھیال جو کہ "لکی مروت" میں ہے وہاں لائٹ نہیں تھی۔ نانی کے انتقال کے بعد 1992ء میں میں مستقل طور پر اپنے والدین کے پاس آگئی۔

شبانہ کوثر:۔ (معروف گلوکارہ)

میں نے جب پہلا روزہ رکھا تو میں بہت چھوٹی تھی اور مجھے "روزہ" رکھنے کا بہت شوق تھا۔ میری والدہ (اللہ انہیں جنت میں اعلا مقام دے) مجھے کہا کرتی تھیں کہ بیٹا ابھی تمہاری عمر نہیں ہے روزہ رکھنے کی۔ میں سحری میں روزانہ اٹھ جاتی تھی بغیر کسی کے اٹھائے تو میرے بڑے بھائی جاوید نے میرا نام وقت کی پابند رکھ دیا تھا۔ امی کے منع کرنے کے باوجود میں نے روزہ رکھ لیا۔ میرے والدین بہت خوش ہوئے خاص طور پر ابو کہ میری بیٹی نے چھ سال کی عمر میں روزہ رکھا ہے میری روزہ کشائی کے لیے بہت سے لوگوں کو نہیں بلایا بلکہ قریبی اور پیار کرنے والوں کو ہی مدعو کیا۔ جن میں میرے تایا ابو اور میری خالائیں وغیرہ کیونکہ ننھیال ددھیال کے زیادہ لوگ انڈیا۔ امریکہ اور کینیڈا میں رہتے ہیں۔ جو لوگ یہاں تھے وہ سب آئے اور میرے لیے تحفے تحائف لے کر آئے۔ وہ دن میرا بہت اچھا گزرا' مگر مجھے پیاس بھی بہت لگی اور بھوک بھی۔ چیزوں کو دیکھ کر دل بہت للچایا بھی تھا مگر معلوم تھا کہ اللہ تعالٰی چاروں طرف ہیں اور ہمیں دیکھ رہے ہیں' ہم کچھ کھا بھی لیں گے تو رب العالمین دیکھ لیں گے' کیونکہ گھر کا ماحول تھوڑا مذہبی تھا تو جو باتیں گھر میں ہوتی تھیں وہ ہمارے ذہن میں بھی محفوظ ہو گئی تھیں۔ افطار کے وقت والد صاحب ہار لے کر آئے جو کہ ہمیں پہنائے گئے۔ بہن بھائی بھی نہال ہو رہے تھے۔ میری پسند کی افطاری بن رہی تھی۔ اور والدہ پیار بھی کر رہی تھیں اور مجھے بہلا بھی رہی تھی کہ مجھے بھوک پیاس کا احساس نہ ہو' نماز کی تلقین ہو رہی تھی۔ مجھے مصروف رکھنے کی کوشش کی جا رہی تھی خیر افطار کی۔ سب نے دعائیں دیں اور میرے روزے کو یادگار بنا دیا۔ بس پھر اس کے بعد میں روزانہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ سحری میں اٹھتی تھی بغیر کسی کے کہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میرا پہلا روزہ ضرور قبول ہوا ہو گا۔ رب کی بارگاہ میں کیونکہ وہ روزہ سچے دل کے ساتھ صرف اور صرف اللہ تعالٰی کی محبت میں میں نے رکھا تھا۔ اور تب سے اب تک ہم دونوں بہنیں نماز بڑی باقاعدگی کے ساتھ پڑھتی ہیں اور روزے رکھتی ہیں۔ اور ماحول کا بڑا اثر ہوتا ہے تو میرے بیٹے مصطفیٰ نے چار سال کی عمر میں روزہ رکھا۔

سونم کیفی (آر جے ایف ایم 100)

مجھے اپنا پہلا روزہ بالکل یاد ہے' میں جب 7 سال کی تھی تو میں نے پہلا روزہ رکھا اور چونکہ مجھے بہت شوق تھا روزہ رکھنے کا تو میں نے بہت ایکسائیٹڈ ہو کے روزہ رکھا تھا۔ ان دنوں اسکول کی چھٹیاں تھیں تو پڑھائی کی ٹینشن نہیں تھی تو سارا دن کچھ ٹائم کھیل کے۔ کچھ ٹائم ٹی وی دیکھ کر اور کچھ ٹائم سو کر دن گزارا میں نے۔ اور میں نے بچپن سے ہی اپنی امی کو بہت مذہبی دیکھا تو مجھے بھی بچپن سے ہی نماز کی عادت پڑ گئی۔ قرآن پڑھنے کی عادت پڑ گئی تو روزہ کی حالت میں نماز بھی پڑھی' پوری طرح اگرچہ نماز نہیں بھی آتی تھی تو جب امی نماز کے لیے کھڑی ہوتی تھیں تو میں بھی ان کے ساتھ کھڑی ضرور ہو جاتی تھی۔ امی کی سائیڈ سے اور والدہ کی سائیڈ سے جو فیملی ممبرز تھے وہ سب کراچی میں تھے جبکہ ہم اسلام آباد میں تھے تو بس خالہ جو اسلام آباد میں تھیں وہ آگئی تھیں۔ وہ بھی پھولوں کے ہار اور گفٹ لے کر آئیں۔ امی ابو نے بھی گفٹس دیئے اور افطار

میں کافی اہتمام کیا میری پسند کی وہ ساری چیزیں بنیں جنہیں کھا کر عموماً" بچے خوش ہوجاتے ہیں۔ تصویریں کھینچی گئیں۔ تو بہت یادگار رہا میرا پہلا روزہ۔

کنور ارسلان:۔ (آرٹسٹ)

مجھے اپنا پہلا روزہ یاد ہے۔ میں نے پہلا روزہ سات سال کی عمر میں رکھا تھا اور مجھے روزہ رکھنے کی اتنی زیادہ ایکسائٹمنٹ تھی کہ میں خود ہی سحری میں اٹھ گیا تھا اور چونکہ چھوٹا تھا تو روزہ رکھنے کی دو وجوہات تھیں ایک تو یہ کہ مجھے روزہ رکھنے کا بہت شوق تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ مجھے بہت سارے تحفے ملیں گے۔ دن بہت اچھا گزرا۔ بھوک پیاس نے ستایا مگر بہت زیادہ نہیں۔ شام کو افطار میں بہت اہتمام ہوا۔ میری پسند کی چیزیں پکائی گئیں' قریبی رشتے داروں نے شرکت کی جو میرے لیے کافی گفٹس لے کر آئے۔ اس پہلے روزے کے بعد میں نے' پھر شاید رمضان میں کبھی کبھار ہی روزہ چھوڑا ہوگا۔ بچپن میں روزہ رکھنے کا یہی فائدہ ہوتا ہے کہ آپ کو روزے رکھنے اور نماز پڑھنے کی عادت ہوجاتی ہے۔

نازلی نصر:۔ (سینئر آرٹسٹ)

پہلا روزہ تو کچھ کچھ یاد ہے مگر یہ یاد نہیں ہے کہ میں نے کتنی عمر میں رکھا تھا۔ اور گھر والوں کو بتائے بغیر ہی رکھا تھا۔ اسکول سے آکر میں نے سب کو بتایا کہ میں نے روزہ رکھا ہوا ہے تو دوپہر کو ٹھیک بارہ بجے امی نے میرا روزہ کھلوادیا کہ بچوں کا روزہ اتنا ہی ہوتا ہے۔ خیر پھر ایک دو سال کے بعد میں نے باقاعدگی سے روزے رکھنے شروع کردیے کہ مجھے علم ہوگیا تھا کہ روزہ کب سے کب تک ہوتا ہے اور سب کے لیے ایک ٹائمنگ ہوتے ہیں مگر افسوس کہ مجھے میرے پہلے روزہ پہ کچھ بھی نہیں ملا تھا۔ میرے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ مسلسل روزے رکھنے سے مجھے یرقان ہوجاتا تھا اور اس کی وجہ سے اسپتال میں داخل ہونا پڑتا تھا۔ تو سب ناراض ہوتے تھے کہ جب ہمت نہیں ہے "روزہ" رکھنے کی' تو کیوں رکھتی ہو۔

نازیہ کنول نازی:۔ (رائٹر افسانہ و ناول نگار)

میں نے جب پہلا روزہ رکھا تھا تب مجھ پر "روزہ فرض" نہیں تھا شدید گرمیوں کے دن تھے' اور میں نے امی کے ساتھ ضد کرکے اور بہت زیادہ اصرار کرکے روزہ رکھ لیا' ہمارے سامنے والے گھر میں ایک "بیر" کا درخت تھا۔ جس کے "بیر" مجھے بہت پسند تھے۔ اب شوق شوق میں روزہ تو رکھ لیا تھا۔ مگر جب گھر سے باہر آئی اور پکے ہوئے بیر دیکھے تو طبیعت مچل گئی اور یہ بھی بھول گئی کہ میرا روزہ ہے۔ کافی سارے

بیر توڑ کر کھانے کے بعد مجھے یاد آیا کہ میرا تو روزہ تھا۔ اپنی دوست کو بتایا تو اس نے کہا اس کا گناہ تمہاری امی کو ملے گا۔ یہ سن کر میں بہت روئی کہ میری غلطی کا گناہ میری امی کو ملے گا' اللہ سے بہت معافیاں مانگیں۔ شام کو امی کو بتایا کہ میں نے بھولے سے بیر کھالیے تھے۔ تب امی نے تسلی دی کہ بھول کر کچھ بھی کھانے پینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا' اس وقت اتنی خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ عصر کے بعد بھوک پیاس سے بہت برا حال ہوگیا تھا۔ امی نے بہت مشکل سے ٹائم پورا کروایا۔ افطار کے وقت جب روح افزا کا شربت بنا اور بہت ساری چیزیں سامنے آئیں تو اپنے "روزہ دار" ہونے پر بہت فخر ہوا کہ اللہ نے ان سب نعمتوں میں میرا حصہ لکھ دیا' روزہ کھولا اور پھر تین چار دن تک بیمار پڑی رہی' خیر۔ اس کے بعد جب بھی کبھی روزہ رکھا' بہت دل کے ساتھ اور بہت شوق سے رکھا اور کبھی جان بوجھ کر روزہ نہیں چھوڑا۔

فائزہ حسن:۔ (آرٹسٹ)

میرا خیال ہے کہ میں شاید 9 یا 10 سال کی تھی جب میں نے پہلا روزہ رکھا تھا۔ یہ یاد نہیں کہ اس دن اسکول کی چھٹی تھی یا امی نے چھٹی کرادی تھی۔ بہرحال اسکول نہیں گئی تھی' خیر روزہ کیا تھا بس فاقہ تھا۔ کیونکہ نہ نماز نہ کچھ اور عبادت' نہ ہی سپارہ پڑھا تھا۔ "روزہ" نے بالکل بھی پریشان نہیں کیا۔ لال لیس کی یا نیٹ کی (Net) پشواس (Pishwas) پہنی۔ اور اسکول اور محلے کی سہیلیوں کو بلایا تھا کہ آج ہماری بیٹی نے روزہ رکھا ہے۔ افطاری کا انتظار تھا' کھجور اور لال شربت سے روزہ کھولا اور گھر پر ہی اہتمام کیا۔ پکوڑے سموسے' دہی پھلکیاں سب سہیلیوں نے کھائیں۔ کچھ دیر گزری کہ ہماری ایک شوقین سہیلی نے فرمائش کی اور اس کی فرمائش پر ٹیپ ریکارڈر لگا کر خوب دھماچوکڑی مچائی۔ یہ تھا جناب ہمارا پہلا روزہ۔

ردا آفتاب:۔ (شیف)

جی پہلا روزہ میں نے سات سال کی عمر میں رکھا تھا اور ماشاء اللہ بہت زبردست رہا۔ بھوک بھی لگ رہی تھی اور پیاس تو خیر لگ ہی رہی تھی۔ اور ہمارے یہاں روزے کا بہت اہتمام کیا جاتا تھا اور اب بھی کیا جاتا ہے۔ ہم سب کو بچپن سے ہی روزہ رکھنے کی عادت ہے۔ تو جب میں نے پہلا روزہ رکھا تو امی نے کہا نماز پڑھو اور سوجاؤ۔ پھر جب نماز کا وقت ہوا۔ امی نے اٹھایا اور کہا کہ نماز پڑھو اور بے شک سوجاؤ۔ تو اس طرح

کافی ٹائم سو کر گزارہ۔ شام کو امی نے کافی اہتمام کیا کافی ڈشیز بنائیں۔ میری پسند کی چیزیں بنائیں مگر اتنا کچھ کھایا ہی نہیں گیا پانی زیادہ پیا گیا تھا۔ افطار میں خالہ وغیرہ کو مدعو کیا گیا تھا۔ گھر کے سارے افراد تھے۔ خالہ وغیرہ نے پھول پہنا دیئے تھے۔ تو بس یہی کچھ ہوا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ باقاعدہ روزہ کشائی ہوئی ہو۔

عدنان شاہ ٹیپو:۔ (آرٹسٹ)

میں شاید آٹھ نو سال کا تھا جب میں نے پہلا روزہ رکھا تھا گرمیوں کا موسم تھا اور فیصل آباد کی گرمی بھلا کون اس سے واقف نہیں ہے۔ آپ سوچیں کہ میرا کیا حشر ہوا ہو گا۔ میرے پہلے روزے سے میری والدہ بہت خوش تھیں کہ آج ان کے بیٹے نے روزہ رکھا ہے۔ میری روزہ کشائی میں کافی لوگ آئے تھے اور سب ہی تحفے بھی لائے تھے۔ اور جناب بچپن کی تربیت کا اثر ہے کہ روزے بڑی باقاعدگی کے ساتھ رکھتا ہوں۔

فاطمہ آفندی:۔ (آرٹسٹ)

مجھے بچپن سے ہی روزے رکھنے کا شوق ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں تقریباً" سات سال کی تھی کہ میں نے پہلا روزہ رکھا تھا اور گھر والوں سے ضد کر کے رکھا تھا۔ کیونکہ سب کا خیال تھا کہ میں ابھی چھوٹی ہوں۔ مجھے ابھی روزہ نہیں رکھنا چاہیے۔ مگر میں جب سحر و افطار میں امی کو اہتمام کرتے دیکھتی تھی تو میرا بھی دل چاہتا تھا۔ میرے پہلے روزے پر میرے گھر والوں نے بہت اہتمام کیا اور خاندان کے لوگوں کو بھی مدعو کیا جو میرے لیے گفٹ لے کر آئے۔ بہت اچھا رہا میرا پہلا روزہ۔ اور جس طرح میں اپنے پہلے روزے پر ایکسائیٹڈ تھی آج بھی اسی طرح ایکسائیٹڈ ہوتی ہوں اور بہت اہتمام سے روزے رکھتی ہوں۔

شہود علوی (آرٹسٹ)

پہلا روزہ میں نے سات سال کی عمر میں رکھا تھا۔ گھر والے منع کر رہے تھے مگر میں نے بہت ضد کی اور ضد میں آکر روزہ رکھ لیا۔ مگر رکھنے کے بعد میں پورا دن پچھتاتا رہا اور سوچتا رہا کہ میں نے کیوں روزہ رکھا اور امی سے ضد کرتا رہا کہ مجھے کچھ کھانے کو دیں تو امی نے کہا کہ اب کچھ نہیں کھا سکتے۔ لیکن تم ایسا کرو کہ تم دو روزے رکھ لو اور بارہ بجے روزہ کھول لینا اور پھر دوسرا روزہ رکھ لینا اور وہ شام کو کھول لینا اور جب بارہ بجے۔۔۔ اللہ پاک نے کیسی طاقت اور انرجی دی کہ میں نے امی سے کہا کہ اب میں روزہ شام کو ہی کھولوں گا۔ اور یوں میرا پہلا روزہ بڑا اچھا گزرا بس شروع میں تھوڑا مشکل لگا تھا۔ پھر آسان ہو گیا۔ تو پہلا روزہ بہت اچھا گیا اور اس کے بعد سے الحمد اللہ میں نے کوئی روزہ نہیں چھوڑا۔ افطار کا اہتمام گھر پر ہی کیا تھا۔ گھر والے سارے ہی موجود تھے اور ابو نے مجھے تحفہ بھی دیا تھا جو کہ گھڑی تھی اور Cassio کی گھڑی تھی۔ یہ پہلا روزہ رکھنے کا اہتمام تھا۔

فاطمہ (اونر فاطمہ بیوٹی پارلر)

پہلا روزہ کب رکھا تھا۔ یہ تو مجھے یاد نہیں۔ مطلب عمر تو مجھے یاد نہیں۔ ہاں یہ ضرور یاد ہے کہ جس دن میں نے پہلا روزہ رکھا تھا۔ اس دن بہت گرمی تھی۔ مگر میں نے بہت خوشی خوشی روزہ رکھا کہ شام کو بہت مزے مزے کی چیزیں کھانے کو ملیں گی۔ شام کو میرے ابو پھولوں کا ہار لے کر آئے میرے لیے۔ اور میرے گلے میں ڈال دیا۔ اور میری امی نے اپنے گھر کے درخت سے جامن توڑے اور میرا پہلا روزہ "جامن" سے کھلوایا۔

ابن آس (رائٹر+ڈرامہ نگار)

میں نے پہلا روزہ سات سال کی عمر میں رکھا اور اسی دن میں نے قرآن پاک بھی مکمل کیا تھا۔ پہلا "روزہ" اور "آمین" لوگ بہت اہتمام کرتے ہیں' اپنے بچوں کے لیے۔ لیکن چونکہ ہمارے مالی حالات اتنے اچھے نہیں تھے اس لیے کسی قسم کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ گفٹ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن یہ بات کبھی نہیں بھول سکتا کہ میرے پہلے روزے اور آمین پر میری بہنیں جو کہ مجھ سے چھوٹی ہیں اور میرے والدین نے بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا تھا۔ میرے پہلے روزے کی خاص بات یہ تھی کہ بار بار پانی پینے کو دل چاہتا تھا۔ امی منع کر رہی تھیں کہ روزہ نہیں رکھنا کہ میں چھوٹا ہوں مگر میں نے ضد میں آکر روزہ رکھا تھا۔ پہلے روزہ کی خوشی اور سرور کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس دن رات کو ہر کام سے فارغ ہو کر "روزے کی خوشبو" کے عنوان سے کہانی لکھی جو میرے ہی احساسات کی کہانی تھی۔ یہ کہانی ماہنامہ "ساتھی" میں شائع ہوئی اور اس کہانی پر مجھے بہترین "کہانی نویس" کا ایوارڈ بھی ملا۔

فیروز خان سے ملاقات

شاہین رشید

فیروز خان کے لیے اگر کہا جائے کہ اسے راتوں رات شہرت ملی تو غلط نہ ہوگا۔ یاسر نواز کی ڈائریکشن میں ڈراما سیریل "چپ رہو" نے ملک گیر شہرت حاصل کی اور اس کے کردار "آزر" نے بھی۔ "آزر" کا کردار "فیروز خان" نے کیا اور لاجواب کیا کہ اس کی آخری اقساط میں اگرچہ اس کے کردار کو ختم کردیا گیا۔ کمال کی مناسبت سے مگر اس کے باوجود اس کردار کو لوگ اسکرین پر دیکھنے کے منتظر رہتے تھے۔ آج کل آپ انہیں ڈراما سیریل "تم سے مل کر" میں "بہلول" کے رول میں دیکھ رہے ہیں۔ خوش اخلاق اور بڑوں کا ادب کرنے والے اس فنکار کا ایک تعارف تو یہ بھی ہے کہ یہ معروف فنکارہ عمیمہ ملک کے بھائی بھی ہیں۔

"کیا حال ہیں جی؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"چپ رہو" میں تو کمال اداکاری کی اب "تم سے مل کر" بھی بہترین ہے۔ اسکرین پہ بہت دیر میں نظر آئے۔ کہاں تھے اتنا عرصہ؟"

"ایسا کچھ نہیں ہے اور میں بہت بڑا کام کررہا ہوں جو کہ ان شاءاللہ بہت جلد آپ کو اسکرین پہ نظر آئے گا۔ بس میں اسے وقت سے پہلے سوشل میڈیا میں لانا نہیں چاہتا کیونکہ میرا ایمان ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اس پروجیکٹ کو شہرت دینی ہوگی تو بغیر پبلسٹی کے ہی مل جائے گی۔"

"مزید کتنے انڈر پروڈکشن ہیں؟"

"اصل میں ... میں ایک وقت میں ایک ہی پروجیکٹ لیتا ہوں کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ میں جس کردار میں ہوں اس سے اس وقت تک باہر نہ نکلوں جب تک وہ ختم نہ ہو جائے۔ [illegible] میں چند روز ایک پروڈکشن ہاؤس [illegible] کی اور پروڈکشن ہاؤس [illegible] کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی محنت کی ایک [illegible] لگاؤں اور اس کے انجام سے بعد [illegible] ایک قسم سائن کی "اسرا [illegible]" جو کہ [illegible] ہیں۔ محنت ہو رہی ہے فلم کی اور میں لیڈ رول کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ کمرشلز بھی چل رہے ہیں۔ الحمدللہ بہت اچھا چل رہا ہے اللہ نے برکت ڈالی ہوئی ہے۔"

"انڈین فلموں کے لیے بھی آفرز ہوئی ہیں؟"

"مجھے لگتا ہے کہ آفرز کی کوئی ویلیو نہیں ہوتی۔ آفرز تو سب کو ہوتی ہیں۔ آفرز کی کوئی ویلیو نہیں ہوتی اس وقت تک جب تک آپ کو کوئی پروجیکٹ مل نہ جائے اور آپ اسے کر نہ لیں۔ تو میں چاہتا ہوں کہ میں جب جاؤں تو اس رغبت کے ساتھ کہ مجھ میں ٹیلنٹ ہے اور میں اپنا ٹیلنٹ پروف کرسکوں۔ میں ایک بڑے چینل کے ساتھ ایک بڑے کام کے ساتھ آؤں تو اپنا ٹیلنٹ دکھا سکتا ہوں۔"

"اداکاری کی صلاحیت خداداد ہے یا کسی سے تھوڑا بہت سیکھا آپ نے؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ مجھ میں خداداد صلاحیت ہے۔ [illegible] اسکول نہیں گیا [illegible] وقت تھا [illegible] یہ سب [illegible] اللہ نے مجھے بڑی عزت دی ہوئی ہے۔"

"سیریل "چپ رہو" لوگوں کے ذہنوں میں ابھی تک محفوظ ہے۔ جو اس میں دکھایا گیا وہ حقیقت کے قریب تھا؟ ایسا ہوتا ہے؟"

"ایسا ہوتا ہے۔ جو وقت چل رہا ہے وہ بہت برا وقت ہے۔ ہمارے بزرگوں نے آخرت کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اب تقریباً ویسا ہی ہو رہا ہے اور ہمیں اس بات کو مان لینا چاہیے۔"

"کوئی خاص بات جو ڈرامے کی ریکارڈنگ کے وقت

ہوئی ہو؟"

"اس سیریل میں ایک سین ایسا تھا کہ مجھے بہت لاؤڈلی چیخنا تھا' محل پہ 'تو جب میں یہ سین کروا رہا تھا تو ہم اوپر فلور پہ تھے اور نیچے فلور پر فلم "جلیبی" کی شوٹ ہو رہی تھی تو ہماری آوازیں سن کر پروڈیوسر اور ڈائریکٹر اوپر آگئے' وہ سمجھے کہ شاید اوپر بہت بڑی لڑائی ہو رہی ہے۔ کئی لوگ جمع ہو گئے تھے اور جب بتایا کہ بھئی شوٹ ہو رہی ہے' تب انہیں اطمینان ہوا۔"

"فیلڈ میں آئے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟"

"میں 2014ء میں اس فیلڈ میں آیا اور اس فیلڈ میں آنے کے چھ ماہ بعد میں نے اداکاری شروع کی اور اس فیلڈ میں تھوڑی دیر سے آنے کی وجہ یہ تھی کہ میں انگلینڈ میں تھا اور اپنی پڑھائی میں مصروف تھا اور لندن یونی ورسٹی سے میں نے "بزنس لاء" کی ڈگری حاصل کی اور پھر سوچا کہ کیوں نہ اس فیلڈ میں قسمت آزمائی کروں اور جب اس فیلڈ میں آیا تو مجھے بہت محبتیں اور بہت کامیابیاں ملیں اور اس فیلڈ میں بہت سے فنکار آتے ہیں اور وہ بہت محنت بھی کرتے ہیں۔ مگر جو لوگ دوسروں کے دل میں جگہ بنا لیتے ہیں وہ اس انسان کی بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ کئی لوگ دل میں جگہ نہیں بنا پاتے۔"

"کیا دیکھتے ہیں اپنے فیوچر میں؟ کوئی پلاننگ؟"

"سچ بتاؤں... میں نے کبھی بھی "کل" کے بارے میں نہیں سوچا اور نہ ہی میں سوچنا چاہتا ہوں اور صرف اپنے رب سے دعا کرتا ہوں اور میرا رب جو مجھے دیتا ہے اسے میں سوچ سمجھ کے خرچ بھی کرتا ہوں اور فیصلہ بھی کرتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے اور مجھے جو کام ملتا ہے اسے پوری جانفشانی کے ساتھ کرتا ہوں۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتائیں' پھر مزید باتیں ہوں گی؟"

"جی جی ضرور... میرا پورا نام "فیروز خان" ہے امی مجھے "گڈا" کہتی ہیں۔ باقی سب فیروز ہی کہتے ہیں اور میری فیس بک پہ بھی یہ ہی نام ہے اور لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کے نام کے ساتھ ملک (عمیمہ ملک) کیوں نہیں ہے۔ خان کیوں ہے تو' اس کی تفصیل بھی آج میں پہلی بار آپ کے توسط سے بتا دیتا ہوں کہ "میرے پردادا کا نام" ملک محمد فیروز خان" تھا۔ ان کو سب عزت سے خان صاحب بولا کرتے تھے۔ میرے خاندان میں سولہ سال سے کوئی لڑکا پیدا نہیں ہوا تھا۔ تو جب میں پیدا ہوا تو میرے دادا کی یہ خواہش تھی کہ وہ میرا نام اپنے والد کے نام پر رکھیں گے تو پھر میرا نام "فیروز خان" رکھا گیا۔ تو جناب 11 جولائی 1990ء کو میں کوئٹہ میں پیدا ہوا۔ ستارہ کینسر ہے اور قد کاٹھ 5 فٹ اور 11 انچ ہے۔ ہم چھ بہن بھائی ہیں۔ چار بہنیں اور دو بھائی اور میرا نمبر پانچواں ہے اور تعلیم تو میں نے آپ کو بتا ہی دی تھی کہ بزنس لاء کیا ہے اور شادی کا فی الحال کوئی ارادہ نہیں ہے۔ کیونکہ ابھی تو عمر بھی بہت کم ہے اور ابھی زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے۔ ابھی تو پریکٹیکل لائف کی شروعات ہیں۔ لیکن ان شاء اللہ شادی تو کرنی ہے اور پسند سے کروں گا۔ مگر اس میں میرے والدین کی پسند بھی شامل ہو گی۔"

"اس فیلڈ میں جب چانس ملے آجانا چاہیے یا پہلے تعلیم مکمل کرنی چاہیے؟"

"میں اس فیلڈ میں آنے کے شوقین حضرات سے کہنا چاہتا ہوں کہ وہ جلدی سے اپنی تعلیم مکمل کریں اور اس فیلڈ میں آجائیں۔ کیونکہ ہمیں اس فیلڈ میں باصلاحیت لوگوں کی بہت ضرورت ہے اور پڑھے لکھے لوگ جب سے اس فیلڈ میں آئے ہیں اس انڈسٹری کی شکل بدل گئی ہے۔ اب یہ انڈسٹری بہت بہتر ہو گئی ہے۔ یہ انڈسٹری ایک مکمل بزنس ہے۔ یہ بہت وسیع فیلڈ ہے۔ اس میں آگے بڑھنے کے بہت چانس ہیں۔"

"بہن کام آئی؟" (عمیمہ ملک)

"الحمد للہ بہن کے سہارے نہیں آیا۔ میری بہن سے لوگ میری تعریف کرتے ہیں' تمہارا بھائی بہت باصلاحیت ہے۔ آپ یا سرنواز سے یا کسی سے بھی پوچھ سکتی ہیں۔ میری بہن نے کسی سے بھی نہیں کہا کہ میرے بھائی کو کاسٹ کریں یا کسی کو فون کیا ہو۔"

"فیروز آپ لندن گئے پڑھائی کے لیے تو دوران تعلیم کوئی جاب بھی کی یا گھر والوں کی ہی سپورٹ رہی؟"

"گھر والوں نے تو سپورٹ کیا' مگر وہاں مہنگائی اتنی ہوتی ہے کہ گھر والے کتنا سپورٹ کرتے' چنانچہ میں نے پڑھائی کے ساتھ ساتھ خود بھی جاب کی' جب میں پڑھنے گیا تو میری عمر پندرہ یا سولہ سال کی تھی اور مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک اسٹور میں جاب کی اور اس اسٹور کا ٹائلٹ صاف کیا تو مجھے پاؤنڈ کی شکل میں میری محنت کا معاوضہ ملا اور یوں میری کمائی کا عمل شروع ہوا اور پارٹ ٹائم جاب تھی تو کبھی وہ کچن دھلواتے تھے۔ کبھی کچھ تو کبھی کچھ اور میں سارے کام کر دیا کرتا تھا۔"

"تو آپ کو برا نہیں لگتا تھا؟"

"نہیں... کیوں برا لگے گا؟ محنت میں شرم کیسی... محنت کر کے ہی تو انسان آگے بڑھتا ہے اور سیکھتا بھی بہت کچھ ہے۔"

"آپ اسمارٹ تو ہیں' مگر کچھ زیادہ ہی دبلے بھی ہیں۔ کیا کچھ ڈائیٹ وغیرہ چل رہی ہے؟"

"میں کافی ہیلتھی ہوتا تھا' کافی ویٹ تھا میرا۔ میں نے اپنے آپ کو کم کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اب میں ٹھیک ہوں اور بالکل... ڈائیٹ چل رہی ہے۔ میں روٹی نہیں کھاتا' چاول نہیں کھاتا' میری ایک پراپر ڈائیٹ ہوتی ہے اور اگر وقت پر کھانا نہ ملے تو میں تھوڑا سا چڑچڑا بھی ہو جاتا ہوں۔"

"غصہ آتا ہے؟"

"بالکل آتا ہے اور مجھے اپنے ہی غصے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ بچپن میں بہت غلطیاں ہوئی ہیں' لیکن الحمد للہ میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا ہے اور مجھے اپنے غصے سے تو ڈر لگتا ہی ہے' مجھے اپنے بھائی کے غصے سے بھی ڈر لگتا ہے۔"

"لوگ تعریف زیادہ کرتے ہیں یا تنقید؟"

"دونوں اور "چپ رہو" میں کچھ نے کہا کہ تم بہت اچھا کر رہے ہو۔ کچھ نے کہا کہ تمہیں اس طرح بی ہیو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مگر الحمد للہ مجھے پوزیٹو فیڈ بیک بہت اچھا ملا۔"

"کرائسس میں وقت گزارہ؟"

"اگر مالی طور پر پوچھیں تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہمیشہ اللہ کی مہربانی رہی۔ البتہ وہ وقت کبھی نہیں بھولوں گا جب میری ماں کا روڈ ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور ڈاکٹروں نے انہیں جواب دے دیا تھا۔ کیونکہ وہ کوما میں چلی گئی تھیں اور کافی عرصہ وہ بے ہوش رہی تھیں' لیکن دعائیں اور ماں کی نیکیاں کام آئیں۔ اللہ نے انہیں دوبارہ زندگی دی۔ خدا میری ماں کا سایہ ہمارے سروں پہ ہمیشہ قائم و دائم رکھے۔ تو وہ وقت بہت برا گزرا تھا اور ابھی میں آپ کو بتا بھی رہا ہوں تو میرا دل کانپ رہا ہے۔"

"کوئی کردار جو کرنا چاہتے ہیں؟"

"مجھے ایک Lover boy کا کردار کرنا ہے۔ مجھے ایک Love Story میں کام کرنا ہے۔ میں شوہر کا کردار نہیں کرنا چاہتا۔ وہ تو پھر ایک روایتی کردار ہو جاتا ہے' آپ سمجھ گئی نا۔"

"ڈرامہ اور انسان کی اپنی زندگی۔۔۔ کچھ میچ ہے آپس میں؟"

"نہیں کچھ میچ نہیں ہوتا۔۔۔ ڈرامہ بالکل الگ چیز ہے۔ اس میں آپ اداکاری کر رہے ہوتے ہو اور زندگی الگ چیز ہے جو آپ اپنی مرضی سے گزار رہے ہوتے ہو۔"

"آپ نے کہا کہ آپ ایک Lover boy کا کردار کرنا چاہتے ہیں۔ عام زندگی میں کیسے ہیں؟"

"عام زندگی میں' میں اپنے کام پر بہت فوکس رہتا ہوں۔ بہت محنتی ہوں۔ اپنے کام سے بہت دلچسپی ہے۔ عشق و مشق کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں ہے۔"

"گھر سے باہر یعنی دوسرے ملک میں پڑھائی کے لیے گئے' اپنے کام خود کرنے کی عادت ہو گی؟"

"جی بالکل۔۔۔ بہت سی اچھی باتیں بھی سیکھی ہیں باہر جا کر۔ ایک تو وقت کی پابندی بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ کئی کام آسان ہو جاتے ہیں۔ پھر اپنا ہر کام خود کر لیتا ہوں۔ کھانا بھی پکا لیتا ہوں اور بھوک لگی ہو تو کچھ بھی پکا لیتا ہوں۔"

"مارننگ شو میں نظر نہیں آتے؟"

"مارننگ شو۔۔۔ سچ پوچھیں تو مجھے مارننگ شو سمجھ میں ہی نہیں آتے' اگرچہ مجھے لوگ بلاتے بھی ہیں' تب بھی نہیں جاتا۔"

"کبھی شہرت نے پریشان کیا؟ گھر آ کر تھکن کا اظہار کرتے ہو یا بستر کی راہ لیتے ہو؟"

"شہرت نے کبھی پریشان نہیں کیا۔ سب سے بہت خوش اخلاقی سے پیش آتا ہوں۔ تصاویر بھی بنوا لیتا ہوں اور گھر آ کر اگر تھکن بہت ہو تو پھر گھر والوں سے سوری کر کے جلدی سونے کے لیے چلا جاتا ہوں۔"

"کیا کیا چیزیں پاس رکھ کر سوتے ہیں؟"

"والٹ' لیمپ' پانی' موبائل' گھڑی' لازمی رکھتا ہوں' کیونکہ سب ہی ضروری ہیں۔"

"کہتے ہیں کہ جب تک کسی سے محبت نہ ہو یا جب تک گرل فرینڈ نہ ہو لڑکوں کا کام میں دل ہی نہیں لگتا' ایسا ہے؟"

"یہ غلط ہے۔۔۔ میرا تو خیال ہے کہ اگر آپ کی گرل فرینڈ ہے تو پھر آپ کا کسی کام میں دل نہیں لگتا۔۔۔ اس لیے میں نے یہ روگ پالا ہی نہیں اور اسی لیے میں ویلنٹائن ڈے بھی نہیں مناتا۔"

"گھر آ کر کیا دل چاہتا ہے؟ اور موبائل زندگی کے لیے کتنا ضروری ہے۔"

"گھر آ کر دل چاہتا ہے کہ صاف ستھرا اور مزے دار کھانا اور چائے مل جائے اور جناب موبائل تو اب زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔ جب کبھی سروس آف ہو تو لگتا ہے کہ جیسے کسی نے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے ہوں۔"

"فلم میں کام کا شوق ہے تو فلمیں دیکھتے بھی ہیں؟ اور کچھ یاد ہے سینما میں پہلی فلم کون سی دیکھی تھی؟"

"جی بالکل دیکھتا ہوں اور مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے کہ پہلی فلم "سنگم" دیکھی تھی اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اس کے گانے بھی بہت مشہور ہوئے تھے۔"

"شاپنگ ضرورتاً کرتے ہیں یا شوقیہ؟"

"ضرورتاً بھی کرتا ہوں اور شوقیہ بھی۔۔۔ مجھے شاپنگ کرنے میں بھی اور ونڈو شاپنگ کرنے میں مزا آتا ہے۔"

"اور اس انٹرویو کے ذریعے کچھ کہنا چاہیں گے؟"

"آیا آپ کو انٹرویو دے کر بہت مزا آیا اور آپ کو پتا ہے کہ میں انٹرویو نہیں دیتا لیکن یہ انٹرویو صرف آپ کی محبت میں دیا ہے۔"

"بہت شکریہ۔۔۔ بہت خوش رہو۔۔۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے فیروز خان سے اجازت لی۔"

☆ ☆

میری بھی سنیے

صنم سعید

شاہین رشید

1 "میرا نام؟"
"صنم سعید۔"

2 "پیار کا نام؟"
"صنم ہی کہتے ہیں یہ بگڑ نہیں سکتا۔"

3 "جنم دن / سال / شہر؟"
"2 فروری / 1985ء / انگلینڈ (لندن)"

4 "بہن بھائی / میرا نمبر؟"
"تین بہن بھائی / میں پہلے نمبر کی ہوں' گھر کی بڑی۔"

5 "تعلیم؟"
"اے لیول برٹش اسکول سے کیا اور پھر گریجویشن کیا۔"

6 "جو سیریلز میری پہچان بنے؟"
"دام' کدورت اور اب دیار دل ویسے اللہ کا شکر ہے کہ میرے تمام سیریلز ہی ہٹ ہوتے ہیں اور سیریلز کے علاوہ تھیٹر بھی میری پہچان بنا اور ہاں "زندگی گلزار ہے" تو میرا بہترین سیریل تھا۔"

7 "میرا خواب جو پورا ہوا؟"
"یہی کہ میں شوبز میں آؤں اور خوب نام کماؤں' تھیٹر میرا جنون تھا اور ہے اور اللہ نے میرا جنون پورا کیا۔"

8 "شوبز میں کون لایا؟"
"کوئی نہیں' کم عمری سے تھیٹر کر رہی تھی تو بس تھیٹر کرتے کرتے بڑی ہو گئی اور پھر راستے کھلتے چلے گئے۔"

9 "محبت کا اظہار کس طرح کرتی ہوں؟"
"خط لکھ کر۔۔۔ میرے خیال میں یہ بہترین طریقہ ہے۔"

10 "مجھے نفرت ہے؟"
"شاپنگ سے۔۔۔ بہت ضروری ہو اور مجبوری ہو تو شاپنگ کے لیے گھر سے نکلتی ہوں۔"

11 "مجھے ڈر لگتا ہے؟"
"امی کے غصے سے۔"

12 "موڈ اچھا ہو جاتا ہے؟"
"جب مجھے پتا چلتا ہے کہ فلاں کے گھر بیٹی یا بیٹا پیدا ہوا ہے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

13 "فیشن جو مجھے پسند ہے؟"

"مجھے زیادہ تر ویسٹرن فیشن پسند ہے۔"

14 "خوشی ہوتی ہے؟"

"جب میں کسی تقریب میں جاؤں اور کوئی بہت ہی پیار اور اپنائیت سے کہے کہ آپ کے آنے سے ہماری تقریب میں رونق ہو گئی ہے یا ہمیں اچھا لگا آپ کا آنا۔"

15 "ایک خواہش جو ابھی تک پوری نہیں ہوئی؟"

"اللہ کا بڑا شکر ہے۔ قناعت کے حساب سے دیکھا جائے تو تمام بنیادی خواہش تو پوری ہو گئی ہیں اور ویسے دیکھا جائے تو انسان کے اندر خواہشات کا سمندر ہوتا ہے میں ایک قناعت پسند لڑکی ہوں۔"

16 "رینگنے والے کیڑوں سے ڈر لگتا ہے یا بڑے جانوروں سے؟"

"بڑے جانوروں سے تو پالا تب ہی پڑے گا جب ہم ان کے قریب جائیں گے۔ البتہ رینگنے والے کیڑوں مکوڑوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ خاص طور پر لال بیگ سے۔"

17 "میں فضول خرچ ہوں مگر؟"

"ان لوگوں کے لیے جو میرے اپنے ہیں۔ میری فیملی سے ہیں اور اپنے اوپر خرچ کرکے بھی مزا آتا ہے۔"

18 "برے لگتے ہیں وہ لوگ؟"

"جو کمپیوٹر اور فیس بک پر بیٹھ کر اپنا وقت ضائع کرتے ہیں اور وہ لوگ جو محفل میں کام کی باتیں کرنے کی بجائے دوسروں کی برائیاں کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔"

19 "دن بہت اچھا گزرتا ہے؟"

"جب موبائل سروس آف ہوتی ہے بہت اطمینان ہوتا ہے سکون ہوتا ہے۔ اس دن آرام کرتی ہوں کیونکہ پتا ہوتا ہے کوئی ڈسٹرب کرنے والا نہیں ہے۔"

20 "تحفے میں کیا دینا اچھا لگتا ہے؟"

"کتا یا بلی یا کسی بھی جانور کا بچہ۔"

21 "اس ملک کے لیے میرا مشن ہے کہ؟"

"میں خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے اور غریب بچوں کی تعلیم کے لیے کچھ کروں۔"

22 "مجھے متاثر کرتی ہے؟"

"سمندر کی گہرائی، میرا چھٹی کا دن سمندر کے کنارے ہی گزرتا ہے۔"

23 "گھر آتے ہی دل چاہتا ہے؟"

"کہ کھانا مل جائے۔ کیونکہ مجھے رات کا کھانا گھر پر کھانا ہی پسند ہے۔"

24 "ٹی وی کے کون سے شو بے کار لگتے ہیں؟"

"مارننگ شو بہت ہی فضول ہوتے ہیں۔"

25 "جھوٹ بولتی ہوں؟"

"بالکل بولتی ہوں۔ مگر ایسا جھوٹ جو کسی کے فائدے کے لیے ہو۔ بلاوجہ کسی کو نیچا دکھانے کے لیے نہیں۔"

26 "محنت سے زیادہ پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی۔ کیونکہ میری کام والی سارا دن محنت کرتی ہے تب بھی اتنا نہیں کما سکتی جتنا سڑک کا فقیر... تو میں روڈ کے فقیروں کو دس روپے سے زیادہ نہیں دیتی۔"

27 "کیا چیزیں میری سائیڈ ٹیبل پہ لازمی ہوتی ہیں؟"

"پانی، گھڑی، کوئی کتاب اور کریم ہاتھوں پہ لگانے والی۔"

28 "جب پلان کے مطابق کام نہ ہو تو؟"

"تو پھر زندگی بری لگنے لگتی ہے کہ اتنی پلاننگ کے باوجود کامیابی نہیں ہوئی۔"

29 "مذہبی تہوار پسند ہیں اس لیے کہ؟"

"کہ یہی ایک واحد دن ہوتا ہے جب سب ایک دوسرے سے پیار سے ملتے ہیں اور مجھے یہ دن اس لیے بھی پسند ہے کہ سب رشتے داروں سے ملاقات ہو جاتی ہے جو کہ عام دنوں میں نہیں ہوتی۔"

30 "ناشتا اور کھانا پسند ہے؟"

"ابو کے ہاتھ کا کہ وہ بہت اچھا پکاتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں لذت ہے۔"

31 "برداشت نہیں کر سکتی؟"

"جھوٹ بولنے والے کو اور بدتمیزی سے گندی زبان استعمال کرنے والے کو۔"

32 "پاکستان کے علاوہ میرا پسندیدہ ملک؟"

"کینیڈا بہت خوب صورت ہے۔"

33 "گھر سے نکلتے وقت لازمی چیک کرتی ہوں کہ؟"

"کہ فون لیا کہ نہیں، بٹوا بیگ میں ہے یا نہیں اور خاص طور پر سیفٹی ٹائرز ضرور چیک کرتی ہوں۔"

34 "میری بری عادت؟"

"موبائل ادھر ادھر رکھ کر بھول جاتی ہوں۔ بیچارے لوگ کالز کرتے رہتے ہیں۔ مگر مجھے خبر ہی نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے اکثر لوگ ناراض بھی ہو جاتے ہیں۔"

35 "اچھی عادت؟"

"بتانا تو نہیں چاہتی کہ یہ میرا اور اللہ کا معاملہ ہے مگر آپ پوچھ رہی ہیں تو بتا دیتی ہوں کہ میں نماز روزے کی پابندی کرتی ہوں۔"

36 "میرے ہٹ کردار؟"

"کشف، شازیہ اور رومی، بالترتیب "زندگی گلزار ہے" "میرا نصیب" "دیار دل"۔"

37 "کس بات میں دوسروں سے بہتر ہوں؟"

"کہ میں وقت کی پابندی کرتی ہوں بے شک میں پرفیکٹ نہیں ہوں مگر دوسروں سے بہت زیادہ بہتر ہوں۔"

38 "دیس کے کھانے پسند ہیں یا پردیس کے؟"

"پردیس کے۔ مجھے کانٹی نینٹل کھانے بہت پسند ہیں۔ اس لیے ایسے ریسٹورنٹ میں جاتی ہوں جہاں انگریزی کھانے آسانی سے مل جائیں۔"

39 "خود کیا اچھا پکا لیتی ہوں؟"

''الحمدللہ مجھے ہر طرح کے کھانے پکانے آتے ہیں اور ہماری فیملی میں اور ہمارے خاندان میں سب ہی لوگ بہت اچھا پکا لیتے ہیں۔''

40 ''مجھے شوق ہے؟''

''ٹریولنگ کا اس لیے کہیں نہ کہیں ضرور جاتی ہوں۔''

41 ''شاپنگ کرتے وقت کس بات کو مد نظر رکھتی ہوں؟''

''کہ والٹ میں اتنے پیسے ہیں کہ آسانی سے شاپنگ ہو جائے کہیں شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔''

42 ''میں بچت کرتی ہوں؟''

''پیسے کی صورت میں تاکہ ٹریولنگ کے لیے ٹکٹ خرید سکوں۔''

43 ''میوزک تب سنتی ہوں؟''

''جب بہت بور ہو رہی ہوتی ہوں۔''

44 ''نہیں رہ سکتی؟''

''اگر روڈ پہ بھی ٹھیلے والے کو گول گپے اور دہی بڑے بیچتے ہوئے دیکھ لوں۔ ضرور کھاتی ہوں کیونکہ ان چیزوں کو کھانے کا مزا ہی روڈ پہ ہے۔''

45 ''کب بہت اچھی نیند آتی ہے؟''

''جب بہت تھکی ہوئی ہوتی ہوں تو بس بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے۔''

46 ''سورج کی روشنی رحمت یا زحمت؟''

''ارے؟۔۔۔ سورج تو خدا کی بہترین تخلیقات میں سے ایک بہترین تخلیق ہے۔ سورج نہ ہوتا تو سوچیے زندگی کتنی بے کار ہوتی۔''

47 ''زندگی میں کیا چیز مسئلہ بنتی ہے؟''

''بہت سی باتیں ہیں۔ مگر میں اس فیلڈ کے حوالے سے بات کروں گی کہ شہرت حاصل کرنا اتنا آسان نہیں جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ شہرت کی حفاظت کرنا ہے۔''

48 ''کب کہیں جانے کے لیے بالکل بھی تیار نہیں ہوتی؟''

''جب بہت تھک جاتی ہوں بس تھکن میں تو اپنے بستر سے بہتر کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔''

49 ''آزمائش سے گزرتی ہوں؟''

''جب کہیں جاتی ہوں۔ فیملی کے ساتھ' دوستوں کے ساتھ اور لوگ پہچان لیتے ہیں۔ ایسے میں بڑے تحمل اور صبر سے کام لیتی ہوں' اچھی طرح پیش آتی ہوں کہ کہیں میرے رب کو کچھ برا نہ لگ جائے۔''

50 ''ایک کردار جو کرنا چاہتی ہوں؟''

''میرا دل کرتا ہے کہ میں کامیڈی رول کروں۔ مگر ابھی تک یہ رول مجھے آفر نہیں ہوا۔''

51 ''چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟''

''توبہ کریں' چیزیں تو جمع کر ہی نہیں سکتی ہر دو چار ماہ کے بعد گھر کی فالتو چیزیں کسی کو دے دیتی ہوں یا پھینک دیتی ہوں۔''

52 ''امی ناراض ہو جاتی ہیں؟''

''جب ان کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً'' نہ دوں تو۔''

53 ''اپنے گھر میں سکون ملتا ہے؟''

''اپنے کمرے میں' اپنے بستر پر۔۔۔ اپنے بستر سے بڑھ کر تو کوئی نعمت ہے ہی نہیں۔''

54 ''ہمیشہ مخلص پایا؟''

''اپنوں کو ہی۔''

55 ''میں خوش نصیب ہوں کہ؟''

''مجھے بہت کم عمری میں بہت کچھ مل گیا۔ کم عمری میں ہی یعنی سولہ سال کی تھی تو تھیٹر میں جاب مل گئی اور اس کے بعد جو چاہا ملتا چلا گیا مجھے۔''

56 ''صبح ہوتی ہے میری؟''

''اگر کام پہ یعنی شوٹ ہو تو جلدی اٹھ جاتی ہوں۔ ورنہ پھر آرام سے اٹھتی ہوں۔''

57 ''کب فون نمبر تبدیل کر لیتی ہوں؟''

''کبھی نہیں۔۔۔ کئی برسوں سے میرا ایک ہی نمبر ہے جو سب کے پاس ہے۔ تبدیل کروں گی تو مشکل ہو جائے گی۔''

58 ''کس سے ملنے کی خواہش ہے؟''

''ہالی ووڈ کے پرانے اور سینئرز فنکاروں سے۔''

59 ''اپنے میں تازگی محسوس کرتی ہوں؟''

''صبح کے وقت۔''

60 ''غلطی مان لیتی ہوں؟''

''بالکل۔۔۔ اس میں ہی انسان کی بڑائی ہے۔''

61 ''پسندیدہ چینلز؟''

''ویسے تو جس پہ ریموٹ رک جائے وہ ہی چینل اچھا ہوتا ہے۔ ویسے جو چینل شوق سے دیکھتی ہوں وہ HBO ہے۔''

62 ''گھر پر کھانا اچھا لگتا ہے یا باہر؟''

''دونوں جگہ۔۔۔ مگر کبھی گھر میں کبھی باہر۔ ایک جگہ پہ کھا کھا کر انسان بور ہو جاتا ہے۔''

63 ''اگر اس فیلڈ میں نہ ہوتی تو؟''

''تو کچن' گھر اور بچے اور میاں کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی ہوتی۔''

پرواکرن صدیقی

ادارہ

س "آپ کا پورا نام' گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟"

ج "پرواکرن صدیقی۔ گھر والے پیار سے سحری پکارتے ہیں۔"

س "کبھی آئینے نے آپ سے یا آپ نے آئینے سے کچھ کہا؟"

ج "جی میں آئینے کو دیکھ کر مسکراتی ہوں اور آئینہ مجھے دیکھ کر کہتا ہے یار اس کی آنکھیں ہیں یا کسی شاعر کی کوئی غزل۔ بنانے والے نے کسی بھی چیز کی کمی نہیں رکھی ہر لحاظ سے پرفیکٹ بنایا ہے۔"

س "آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟"

ج "میری امی جان زینب اشفاق۔"

س "آپ اپنی زندگی کے دشوار لمحات بیان کریں؟"

ج "مشکل وقت کو میں یاد نہیں کرنا چاہتی۔"

س "آپ کے لیے محبت کیا ہے؟"

ج "محبت ایک خوب صورت جذبہ ہے۔ اس کے بغیر زندگی کے رنگ پھیکے اور ادھورے ہیں بقول شاعر۔

محبت ایسا دریا ہے
بارش روٹھ بھی جائے
تو پانی کم نہیں ہوتا

س "مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا آپ کی ترجیح میں شامل ہے؟"

ج "میں ایم ایڈ کرنا چاہتی ہوں۔ بس اسی پر عمل کرنا ہے۔"

س "پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور و مطمئن کیا ہو؟"

ج "پچھلے سال میں نے پریگننسی کے دوران اپنا بی ایڈ کیا تھا۔ میری بیٹی میجر آپریشن سے ہوئی تھی تو اپنی پندرہ دن کی بیٹی کو چھوڑ کر ورکشاپ ٹریننگ پر جاتی تھی وہ فیڈر بھی نہیں پیتی تھی تو یہ میرے لیے بہت بڑی کامیابی ہے اور اپنی بیٹی کے صبر پر رشک آیا۔"

س "آپ اپنے گزرے کل' آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟"

ج "اللہ پر کامل یقین۔"

س "آپ اپنے آپ کو بیان کریں؟"

ج ریشم جیسے لوگ ہیں ہم
الجھن میں ہی رہتے ہیں

س "کوئی ایسا ڈر جس نے آج بھی اپنے پنجے آپ میں گاڑے ہوں؟"

ج "کوئی ڈر ایسا نہیں ہے۔"

س "آپ کی کمزوری اور طاقت کیا ہے؟"

ج "میری امی اور میرے ہزبینڈ۔"

س "آپ خوشگوار لمحات کیسے گزارتی ہیں؟"

ج "سب سے شیئر کرتی ہوں۔ اپنی فرینڈز اور سب سے پہلے آنٹی آصفہ سے۔"

س "آپ کے نزدیک دولت کی اہمیت؟"

ج "آج کے دور میں صرف اسی انسان کی عزت ہے جس کے پاس دولت ہے۔ جس کے پاس پیسہ نہیں' وہ کسی گنتی میں شمار نہیں کیا جاتا۔ لوگ اس کو پوچھتے تک نہیں۔"

س "گھر آپ کی نظر میں؟"

ج "گھر ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں پر آکر عورت کو تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔"

س "کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کر دیتی ہیں؟"

ج "نہ میں معاف کرتی ہوں اور نہ ہی بھولتی ہوں۔ ہاں اگنور کر دیتی ہوں کیونکہ اللہ منصف ہے۔ ایک دن سب کو اپنے اعمالوں کا بدلہ ملے گا۔"

س "اپنی کامیابیوں میں کسے حصہ دار ٹھہراتی ہیں؟"

ج "اپنی امی جان کو۔ میری امی اتنی اچھی ہیں کہ لفظوں میں بیان کروں تو لفظ کم پڑ جائیں۔ انہوں نے ہمیں کسی بھی چیز کی کمی نہیں رکھی ہر خواہش بن کہے پوری کی ہے۔ میری امی جیسی پیاری ماں دنیا میں کوئی نہیں ہو گی۔ وہ دیکھنے میں میری امی نہیں میری بڑی بہن لگتی ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ میری امی کو ٹھیک کر دیں (آمین)"

س "سائنسی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر کے کاہل کر دیا یا واقعی یہ ترقی ہے؟"

ج "سائنسی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج نہیں کیا بلکہ یہ آج کے دور کی ضرورت ہے۔"

س "کوئی عجیب خواہش یا خواب؟"

ج "حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جانا چاہتی ہوں۔"

س "برکھا رت کو کیسے انجوائے کرتی ہیں؟"

ج "فرینڈز اینڈ کزنز کو بارش کی مناسبت سے SMS کر کے اور جب بارش آتی ہے تو امی اس دن سوئیٹ ڈش لازمی بناتی ہیں۔ کبھی بیسن کا حلوہ' کبھی مکھڈی حلوہ یا پھر میدے کے پوڑے بناتی ہیں۔ ہماری جوائنٹ فیملی ہے تو خوب انجوائے کرتے ہیں۔"

س "آپ جو ہیں وہ نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟"

ج "اگر میں پروانہ ہوتی تو "یارم" کی "امرحہ" ہوتی۔"

س "آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب...؟"

ج "جب مجھے اپنے میکے جانا ہوتا ہے۔ دل خوشی سے چھلانگیں مار رہا ہوتا ہے۔ اپنے گھر والوں سے ملنے کی خوشی جو ہوتی ہے۔"

س "آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟"

ج "میری پرنسز صالحہ اور سفینہ کی ہنسی۔"

س "کیا آپ نے زندگی میں وہ سب پالیا جو پانا چاہتی تھی؟"

ج "جی' الحمدللہ۔ میں نے اپنی اوقات سے بڑھ کر پایا ہے۔ جس کی امی زینب جیسی ہو نا۔ وہ کبھی تشنہ نہیں رہتا۔"

س "اپنی ایک خوبی اور خامی جو آپ کو مطمئن و مایوس کرتی ہے؟"

ج "حد سے زیادہ حساس ہوں اور میں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا۔ کبھی کسی کے معاملے میں انٹرفیئر نہیں کیا۔"

س "کوئی ایسا واقعہ جو آپ کو شرمندہ کر دیتا ہو؟"

ج "نہیں جی' کوئی واقعہ نہیں ہے ایسا۔"

س "کیا آپ مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں یا خوفزدہ ہو جاتی ہیں؟"

ج "انجوائے کرتی ہوں۔"

س "متاثر کن کتاب' مصنف' مووی؟"

ج "قرآن پاک۔"

س "آپ کا غرور؟"

ج "میری پیاری امی جان۔"

س "کوئی ایسی شکست جو آج بھی آپ کو اداس کر دیتی ہو؟"

ج "ہوتے ہیں بعض ایسے واقعات' جن کو یاد کر کے اذیت کے سوا کچھ نہیں ملتا۔"

س "کوئی شخصیت یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی۔ جس نے آپ کو حسد میں مبتلا کیا ہو؟"

ج "میں حسد نہیں کرتی۔ اللہ اس بری بلا سے ہمیں بچائے۔"

س "مطالعے کی اہمیت آپ کی نظر میں؟"

ج "تنہائی دور کرنے کا بہترین ذریعہ۔"

س "آپ کی پسندیدہ شخصیت؟"

ج "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ۔"

س "ہمارا پیارا پاکستان سارے کا سارا خوب صورت ہے۔ آپ کا کوئی خاص پسندیدہ مقام؟"

ج "سوات' کالام اور جھیل سیف الملوک۔ فورٹ منرو۔"

☼ ☼

کچھ موتی چنے ہیں

ادارہ

ہمارا قانون

اس دور میں چور کو سزا تک پہنچنے کے لیے' پکڑے جانے سے پہلے چوری کا ثابت ہونا اور چوری ثابت ہونے کے بعد پکڑا جانا ضروری ہے۔ ان مراحل کے بغیر قانون کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ ہمارا قانون دن بدن شریف ہوتا جارہا ہے۔ صرف شریفوں سے واسطہ رکھتا ہے۔ جرائم پیشہ عناصر اس کے لیے نامحرم کا درجہ اختیار کرتے جارہے ہیں۔

(ڈاکٹر محمد اسد اللہ۔۔۔ پنگھٹ)

حماواجد۔۔۔ کراچی

خیرات کی حقیقت

اللہ سے انسان محبت کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ اللہ بھی اس سے محبت کرے' مگر محبت کے لیے وہ کچھ دینے کو تیار نہیں۔ اللہ کے نام پر وہی چیز دوسروں کو دیتا ہے' جسے وہ اچھی طرح استعمال کرچکا ہو۔ چاہے وہ لباس ہو یا جوتا' وہ خیرات کرنے والے کے دل سے اتری ہوئی چیز ہوتی ہے اور اس کے بدلے وہ اللہ کے دل میں اترنا چاہتا ہے۔

(عمیرہ احمد۔۔۔ شہزادت)

حرا قریشی۔۔۔ بلال کالونی ملتان

قربانی کا وصف

عورت کا رتبہ بہت بلند ہے۔ دنیا میں محبت کی سب سے مضبوط علامت' قربانی دینے کا وصف اللہ نے اسی میں رکھا ہے۔

عالیہ بخاری۔۔۔ دیوار شب

(وثیقہ زہرہ۔۔۔ سمندری)

رشوت

رشوت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا اور رشوت دینے کے بعد کوئی کام نہیں رکتا۔ دیوی دیوتاؤں کو رشوت دی جاتی ہے تو اسے چڑھاوا کہتے ہیں۔ ٹیچر رشوت لیتا ہے تو اسے ٹیوشن کہتے ہیں۔ سینما کے ٹکٹ کے لیے رشوت دی جاتی ہے تو اسے بلیک کہتے ہیں۔ چپڑاسی رشوت لیتا ہے تو اسے بخشش کہتے ہیں۔ دولہا رشوت لیتا ہے تو اسے جہیز کہتے ہیں۔ بیچ کا آدمی رشوت لیتا ہے تو اسے کمیشن کہتے ہیں۔ پنڈت رشوت لیتا ہے تو اسے دکشنا کہتے ہیں۔

اس دور میں جب کہ ہر شے میں ملاوٹ پائی جاتی ہے۔ رشوت خالص رشوت ہوتی ہے۔ کام کرنے سے پہلے خود اعتمادی اور کام ہونے کے بعد سکون دیتی ہے۔ یہ دنیا میں خیر پھیلانے والا سب سے بڑا شر ہے۔ رشوت نے ہر طرح کے امتیاز و تفریق کو مٹا دیا ہے۔ امیر غریب کی مدد کرنا پسند نہیں کرتا۔ لیکن اسے رشوت دے سکتا ہے۔ پہلے کسی کے رشوت لینے کی بات سن کر لوگ چونک اٹھتے تھے۔ اب کسی کے رشوت نہ لینے کی بات پر چونک جاتے ہیں۔ آدمی جتنا بڑا ہوتا ہے اتنی بڑی رشوت لیتا ہے۔

(داؤد کاشمیری۔۔۔ کہا سنا معاف)

اریشہ سرور۔۔۔ فیصل آباد

منافع

ایک خرکار جنگل میں گدھوں پر مال لادے چلا جارہا تھا کہ ڈاکوؤں کا کھٹکا ہوا۔ وہ گدھوں کو پکارا۔ "خطرہ! خطرہ! بھاگو' بھاگو! ڈاکو آرہے ہیں۔ گدھوں نے کہا تم بھاگو ہم کیوں بھاگیں' ہمیں تو بوجھ ڈھونا ہے' تیرا بوجھ ہو یا کسی اور کا ہو۔"

اگر مال کے منافع میں سے کچھ حصہ گدھوں کا ہوتا تو وہ ہرگز ایسی بات نہ کہتے۔

(ابن انشا۔۔۔ اردو کی آخری کتاب)

ثمینہ ایاز۔۔۔ نواب شاہ

ایسا بھی ہوتا ہے

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جو واقعی انسانیت
سے پیار کرتے ہیں یا جنہیں واقعی انسانیت
سے لگاؤ ہوتا ہے' ان کو دنیا جینے نہیں
دیتی یا پھر ان کے ہاتھ باندھ دیے جاتے
ہیں کہ وہ اس جرم کی سزا پاتے
پاتے لاغر سے لاغر تر ہوتے چلے جاتے
ہیں اور آخر انسانیت کو سسکتا چھوڑ
کے لامکاں کی ان دیکھی وسعتوں میں چلے جاتے
ہیں۔

(اشفاق احمد کی کتاب "ایک محبت سو افسانے" سے)

سیما ممتاز عباسی۔۔۔ لاڑکانہ

فلم انڈسٹری

امریکی مزاح نگار رول راجرز نے کہا ہے کہ صرف ایک چیز فلم انڈسٹری کو مار سکتی ہے اور وہ ہے تعلیم۔ اس لیے ہمیں تسلی ہے کہ پوری دنیا کی فلم انڈسٹری مر بھی گئی تو ہماری پھر بھی زندہ رہے گی۔ (ڈاکٹر یونس بٹ۔۔۔ افراتفریح)

حماواجد۔۔۔ کراچی

ماں

مائیں ولی اللہ نہیں ہوتیں۔۔۔ مگر ولی اللہ کو پیدا ضرور کرتی ہیں۔

مائیں پیغمبر بھی نہیں ہوئیں۔ مگر پیغمبروں نے ان کی انگلی پکڑ کر چلنا ضرور سیکھا۔ اور مائیں بددعا بھی نہیں دیتیں۔۔۔ بے جی نے بھی نہیں دی تھی۔

طارق' ماں سے نظریں ملانے کے قابل نہیں تھا۔ معصومہ' طارق سے نگاہ ملانے جوگی نہ رہی تھی ہاں۔۔۔ مگر بے جی سرخرو رہی تھیں۔ اپنے کملے بیٹے کے سامنے۔۔۔

بے جی نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان تاروں سے بھرا تھا۔ مگر ان کا تارا۔۔۔؟ ان کا آسمان آج بھی خالی تھا۔

نہ جانے کہاں ہوگا تارے۔۔۔ زندہ بھی یا۔۔۔

نہ جانے کس حال میں ہوگا' نہیں ٹھیک ہی ہوگا۔

اللہ نے دنیا میں معصومہ جیسے لوگ بھی بنائے ہیں' مگر کم تعداد میں۔۔۔ سو امید کی جاسکتی ہے کہ تارے کہیں بہت اچھی جگہ پر ہی ہوگا۔

دنیا میں خوف خدا رکھنے والے لوگوں کی کمی نہیں۔

(سائرہ رضا۔۔۔ خالی آسمان) روبینہ لیاقت۔۔۔ ملتان

موٹے لوگ

مجھے ابھی تک کوئی ایسا موٹا شخص نہیں ملا جو اپنے موٹاپے پر حیرت کا اظہار نہ کرتا ہو اور یہ نہ کہتا ہو کہ وہ تو کچھ بھی نہیں کھاتا۔ اللہ جانے موٹا کیوں ہوتا جارہا ہے ایک دن ایک دوست اسی طرح اپنی حیرانی کا اظہار کررہے تھے' وہ مجھے بتا رہے تھے کہ صبح انہوں نے ایک سوکھا توس چائے کے ایک کپ کے ساتھ لیا' دوپہر کو آدھی چپاتی سالن کے ساتھ کھائی۔ رات کو سوپ پیا اور چند لقمے ابلے ہوئے چاولوں کے لیے' اب اس سے زیادہ اور کیا کیا جاسکتا ہے؟

میں نے کہا "اور وہ جو فلاں حلوائی کی دکان سے آپ نے میرے ساتھ رس ملائی کھائی تھی۔"

کہنے لگے "ہاں تھوڑی بہت بدپرہیزی تو ہو ہی جاتی ہے۔"

میں نے انہیں یاد دلایا کہ دوپہر کو خان بابا کا قورمہ بھی کھایا تھا۔

بولے "اب الزام نہ لگاؤ وہ تو میں نے آپ کا ساتھ دینے کے لیے چند لقمے کھائے تھے۔"

میں نے کہا۔ "اور وہ جو جناب نے رات کو حافظ جوس کارنر سے کیلے کا ملک شیک پیا تھا؟"

کہنے لگے اب فاقوں سے تو نہیں مرجانا آخر زندہ بھی تو رہنا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تو پھر ان شاء اللہ آپ اس موٹاپے کے ساتھ ہی زندہ رہیں گے۔" (عطاالحق قاسمی)

ملک قراۃ العین عینی۔۔۔ منڈی بہاؤالدین

نفیسہ سعید

ایسا کب ہے زندگی

ملک صاحب اپنے گھر والوں کو بے خبر رکھ کر اپنے کم سن بیٹے ایشال کا نکاح کردیتے ہیں جبکہ ایشال اپنی کزن عریشہ میں دلچسپی رکھتا ہے اور سن بلوغت تک پہنچتے ہی وہ اس نکاح کو تسلیم کرنے سے انکار کردیتا ہے' ملک صاحب ہار مانتے ہوئے اس کی دوسری شادی عریشہ سے کردیتے ہیں۔ جس کی شرط صرف اتنی ہے کہ وہ اپنی پہلی منکوحہ کو طلاق نہیں دے گا۔

جبیبہ تعلیم حاصل کرنے کراچی آئی ہے جہاں وہ شاہ زین کے والد کے آفس میں جاب کرنے لگتی ہے۔ جس دوران شاہ زین جبیبہ میں دلچسپی لینے لگتا ہے' مگر جبیبہ کا ردعمل اس معاملے میں خاصا عجیب وغریب ہے وہ شاہ زین کو اپنا دوست تو مانتی ہے' مگر اس کی محبت کا مثبت جواب نہیں دے پاتی۔

فرہاد تین بھائی ہیں اس کے دونوں بڑے بھائی معاشی طور پر مستحکم ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی بیوی' بچوں کی ضروریات بھی کھلے دل سے پوری کرتے ہیں جبکہ فرہاد اس معاملے میں خاصا کنجوس ہے یہ ہی سبب اس کی بیوی زینب کو فرہاد سے بدظن کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔

فضا' زینب کی جٹھانی ہے جو اس کی خوب صورتی سے حسد کرتی ہے اور اپنی اس حسد کا اظہار وہ اکثر و بیشتر اپنے رویہ سے کرتی رہتی ہے۔ سالار' صباحت کا کزن ہے جو شادی شدہ ہونے کے باوجود زینب کو پسند کرنے لگتا ہے' اسی لیے وہ بہانے بہانے اسے قیمتی تحائف سے بھی نوازتا ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

تیرھویں اور آخری قسط

صحن میں یہاں وہاں سامان بکھرا پڑا تھا' آب زم زم کے کین ' کھجور ' جانمازیں اور بھی بہت سارا سامان جس کے یاسمین آپا پیکٹ بنا رہی تھیں اور فرہاد ان پر سب رشتہ داروں کے نام لکھ رہا تھا۔ میری حیثیت تیسرے فریق جیسی تھی جس کے وہاں ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس سارے عمل کی کرتا دھرتا یاسمین آپا تھیں' کس کو جا نماز دینی ہے' کسے صرف کھجور اور پانی اور کس کو وہاں سے لایا ہوا کوئی اور تحفہ' اس سب کا فیصلہ وہ ہی کر رہی تھیں اور فرہاد ان کے کیے گئے ہر فیصلہ پر کسی روبوٹ کی مانند عمل در آمد کر رہا تھا۔

صبح سے آنے والے مہمانوں کی خاطر مدارات نے مجھے تھکا دیا تھا' ابھی فضہ بھابھی نے ملنے آنا تھا اسی سبب میں کچن میں کھانا بنا رہی تھی جب باہر سے آتی یاسمین آپا کی آواز نے میرے کام کرنے کے عمل کو سست کر دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے موضوع گفتگو' میری ذات ۔ یا میرے گھر والے ہیں' میں کچن کے دروازے سے مزید قریب ہو گئی' یاسمین آپا کی میرے کانوں تک آتی آواز نے مجھ پر ہر چیز واضح کر دی۔

"میرا خیال ہے کہ کھجور اور پانی کے ساتھ ایک جانماز اور تسبیح کافی ہے۔"

"لیکن آپا..." فرہاد آہستہ آواز میں منمنایا۔

"میں جو سفید دوپٹا لایا ہوں وہ بھی اماں جی کا ہے حسن اور احسان کے لیے ٹوپیاں بھی رکھ دیں اور دو عطر کی بوتلیں بھی ان کی ہیں۔"

"حد ہے فرہاد کیا ضرورت ہے اتنا سامان دینے کی اب دیکھو ہمیں چھ گھنٹے ہو گئے آئے ہوئے' مگر مجال ہے ابھی تک کسی نے ایک فون کرکے مبارک دی ہو۔"

"وہ تو صحیح ہے آپا پھر بھی برا لگتا ہے غیروں کی طرح دو چیزیں دینا۔"

مجھے حیرت ہوئی فرہاد اور میرے گھر والوں کی وکالت' مجھے کسی طور یقین نہ آرہا تھا کہ یہ الفاظ فرہاد کے ہیں۔

"لو بھائی پھر جو تمہارا دل چاہے تم کرو' مجھے میری کھجور اور پانی الگ کر دو۔" صاف محسوس ہوا کہ آپا ناراض ہو گئی ہیں۔

"اوہو آپا اتنی چھوٹی سی بات پر آپ اپنا دل کیوں برا کر رہی ہیں' ٹھیک ہے' جو آپ بہتر سمجھیں وہ کریں۔"

اب مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں کچن سے باہر نکل آئی' شروع سے ہی سب مجھ سے یہ کہتے تھے کہ میں بہت جذباتی ہوں اور غصے میں بنا سوچے سمجھے جو منہ میں آتا ہے بول دیتی ہوں بنا کسی لحاظ و مروت کے' میری یہ خوبی شاید کافی عرصہ سے میرے حالات نے دبا دی تھی' اب مجھے محسوس ہوا کہ وہ ابھر کر سامنے آرہی ہے اور شاید یہ میری جذباتیت ہی تھی جو بنا سوچے سمجھے کچن سے باہر آکر یاسمین آپا سے الجھ پڑی۔

"یاسمین آپا آپ پلیز میرے گھر والوں کے لیے کھجور اور پانی بھی مت دیں۔ اماں سے سپارہ پڑھنے والے بچوں کے گھر سے یہ سب سوغات اتنی آتی ہیں کہ ہم خود محلے میں تقسیم کرتے ہیں۔"

"تم کچن میں جاؤ زینب تم سے بات نہیں ہو رہی۔" ان کے جواب دینے سے قبل ہی فرہاد بول اٹھا۔

"مجھ سے بات نہیں ہو رہی' لیکن میری بات ہو رہی ہے۔ آپ محلے بھر کے لیے تحفہ تحائف لائے' میں نے تو کچھ نہیں پوچھا' جہاں میرے گھر والوں کی بات ہوئی وہاں انہیں پریشانی لاحق ہو گئی۔"

مانتی ہوں میرا لہجہ بہت تیز تھا اور شاید یہ یاسمین آپا کے لیے بالکل غیر متوقع تھا کہ میں فرہاد کے سامنے اتنی بدتمیزی کا مظاہرہ کروں' وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہکا بکا میرا منہ تکنے لگیں۔

"آپ پیٹھ پیچھے تو خوب باتیں کرتی ہیں اور اب سامنے بالکل ایسے لگ رہا ہے جیسے آپ کو بولنا ہی نہ آتا ہو۔"

فرہاد کا مجھے بنا بتائے ان کے ساتھ عمرہ پر جانا' میری ہر بات ان سے ڈسکس کرنا یہ وہ وجوہات تھیں جنہوں نے اس پل مجھے بری طرح بھڑکا دیا۔

"میں نے تو کبھی آپ کے شوہر کو فون کرکے آپ کی برائیاں نہیں کیں تو پھر کیا کام ہے آپ کا' ہر وقت فرہاد سے میری باتیں مزے مزے لے کر سننے کا اور کرنے کا۔"

"زینب خاموش ہو جاؤ..."

فرہاد نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ مجھے خاموش کروانے کی کوشش کی جبکہ یاسمین آپا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور بنا کچھ کہے یہاں وہاں رکھا سامان سمیٹنے لگیں۔ ان کے ماتھے پر پڑی تیوریاں ان کے شدید غصہ کی عکاسی کر رہی تھیں۔

"کیوں خاموش ہو جاؤں' پچھلے چھ سات سال میں نے خاموش رہ کر ہی گزار دیے اور آپ میری ایک ایک بات اپنی بہن سے شیئر کرنے لگے' بنا یہ سوچے کہ مرد و عورت ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں اور یہ حکم قرآن کا ہے کہ ہمیں اپنی باتیں دوسروں کے سامنے نہیں کرنی چاہئیں۔ پھر بھی فرہاد آپ نے نہ کبھی خود میری عزت کی اور نہ کسی کو کرنے دی۔"

زور زور سے بول کر میں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور پھر کچھ بھی سنے بنا اندر کمرے میں جاکر دروازے کی کنڈی لگالی اور بستر پر گر کر رونے لگی۔ مجھے لگا شاید میری باتوں نے فرہاد کے اندر موجود انسان کو جگا دیا ہو گا' مجھے امید تھی کہ وہ پشیمان ہو گا اور کچھ دیر بعد مجھے کھانے کے لیے بلانے ضرور آئے گا' مگر ایسا کچھ نہ ہوا دوپہر سے شام ہو گئی کسی نے میرے کمرے کا دروازہ نہ بجایا اور نہ ہی مجھے آواز دی۔

میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا' جہاں سے آنے والی آوازیں سن کر مجھے پتا چلا کہ فضہ بھابھی بھی آئی ہوئی ہیں' لیکن ان میں سے کسی نے بھی ضرورت محسوس نہ کی کہ مجھے آواز دے کر بلایا جاتا' کم از کم فضہ بھابھی تو مجھ سے آکر ملتیں' مگر ایسا نہ ہوا اور رات کو ڈھیٹوں کی مانند کمرے کا دروازہ کھول کر میں خود ہی باہر نکل آئی۔ ظاہر ہے جب مجھے یہاں رہنا تھا تو بلاوجہ یہ سب نخرے کرنے کی کیا ضرورت تھی' جبکہ معلوم تھا کہ انہیں دیکھنے والا یہاں کوئی نہیں ہے۔ ویسے بھی بھوک بڑی ظالم چیز ہے' پیٹ کی ہو یا کسی اور چیز کی...

☆ ☆ ☆

"پلیز اریشہ مجھے معاف کر دو اور اس طرح تنہا چھوڑ کر مت جاؤ۔"

ایشال نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ میں تھما بیگ پکڑ لیا۔

"چھوڑ دو ایشال میں فیصلہ کر چکی ہوں حبیبہ سے رخصتی کی صورت میں تمہیں مجھے طلاق دینا ہو گی۔"

سرخ آنکھیں اور پیلی رنگت کے ساتھ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"بے وقوف عورت تمہیں کس نے کہا کہ میں حبیبہ کو رخصت کروانے لگا ہوں۔"

اپنے لہجہ کو بشاش بناتے ہوئے اس نے اریشہ کو بازو سے تھام کر اپنے قریب کیا۔

"مجھے معاف کر دو اریشہ شاید حسد' غصہ اور جانے کس جذبے کے تحت میں نے وہ بے وقوفانہ فیصلہ کیا جس نے کئی دنوں سے پورے خاندان کو ایک اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے' میں شرمندہ ہوں اپنے کیے ہوئے الفاظ اور عمل سے جو تمہاری تکلیف کا باعث بنے۔" نہ صرف اس کے الفاظ بلکہ لہجہ میں بھی شرمندگی تھی۔

"میں نے ہمیشہ یہ سمجھا کہ حبیبہ کے ہونے یا نہ ہونے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا' لیکن شاید حبیبہ میرے بغیر مرجائے گی یہ احساس برتری ہمیشہ میرے اندر موجود رہا۔ مجھے لگتا تھا کہ جب میں اسے طلاق دینے لگوں گا تو وہ میرے سامنے گڑگڑائے گی۔ میرے سامنے حبیبہ کا تصور ایک بے چاری سی عورت کا تھا' لیکن جب وہ میرے سامنے آئی تو اس کے اعتماد اور مجھے اگنور کرنے کے عمل نے میرے تن من کو جھلسا دیا' مجھے آگ لگا دی اور میں

ضد میں آگیا' جانے کیوں میں اسے اپنے سامنے روتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا' مگر ایسا نہ ہوا' حبیبہ کے رویہ نے میری مردانگی پر ضرب لگائی اور اسے جھکانے کی خاطر میں بنا سوچے سمجھے یہ سب فضول حرکتیں کرتا گیا جن پر اب میں بے حد شرمندہ ہوں۔ اب ہو سکے تو پلیز تم وہ سب باتیں بھول جاؤ اور مجھے معاف کر دو۔"

وہ اس کی منت کرتے ہوئے بولا۔ اریشہ نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی جہاں شرمندگی رقم تھی' مگر پھر بھی اس کا دل نہ چاہا کہ وہ ایشال کو معاف کر دے' پچھلے کئی دنوں سے وہ اس کی وجہ سے جس ذہنی اذیت کا شکار تھی وہ قطعی قابل معافی نہ تھی' لیکن کیا کرتی مجبور تھی کیوں کہ وہ ایک مشرقی عورت تھی' جو ہمیشہ اپنے نصف بہتر کی تمام غلطیوں کو نظر انداز کرنے کی عادی ہوتی ہے' چاہے وہ کسی اعلا یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ ہی کیوں نہ ہو' لیکن شاید عورت صرف عورت ہوتی ہے ایسے حالات میں اریشہ اور زینب میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

"فی الحال مجھے تنہا چھوڑ دو ایشال' میرا اس وقت کسی سے کوئی بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا۔"

وہ اپنے کمرے کی جانب واپس پلٹی ایشال کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ رک گئی تھی۔ ورنہ آج اگر وہ ایشال کی بات نہ مانتی اور یہ گھر چھوڑ جاتی تو جانے کیا ہوتا؟ اسے یقین تھا کہ ماموں اور مامی کبھی اریشہ کو دوبارہ اس گھر میں نہ آنے دیتے خواہ کچھ بھی ہو جاتا۔

"تھینک یو اریشہ تم نے آج میرا مان رکھ لیا۔" وہ اریشہ کے پیچھے کمرے کے دروازے تک آیا۔

"تمہارا مان نہیں' اپنی عزت رکھی ہے آج میں نے اور میں اگر یہاں رکی ہوں تو اس کی وجہ تم نہیں ہو' وجہ صرف یہ ہے کہ میں نہیں چاہتی لوگوں کا محبت پر سے یقین اٹھ جائے۔"

اس نے اپنی جگہ رک کر سیدھا ایشال کی آنکھوں میں جھانکا وہ لاجواب سا ہو گیا' سمجھ ہی نہ آیا کہ ان تمام باتوں کا کیا جواب دے۔

"اور ہاں پلیز اب تم یہاں سے جاؤ اور جاتے ہوئے کمرے کا دروازہ لاک کر دینا۔"

اس نے الماری سے اپنے کپڑے نکالے اور واش روم کی جانب بڑھتے ہوئے ایشال کو ہدایت کی اس نے خاموشی سے سنا اور الٹے پاؤں کمرے سے باہر آگیا باہر نکلتے نکلتے وہ کمرے کا دروازہ لاک کرنا نہ بھولا۔

☼ ☼ ☼

کئی دنوں سے فرہاد مجھ سے واجبی سے بات چیت کر رہا تھا وہ چاہتا تھا کہ میں یاسمین آپا سے معافی مانگوں' مگر میرا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا رات ہی اماں اور احسان' فرہاد سے ملنے آئے اور اتوار والے دن فرہاد کے ساتھ ساتھ یاسمین آپا کو بھی دوپہر کے کھانے کی دعوت دے گئے۔

"میں تو آج ہی فضہ بھابھی کے گھر رہنے جا رہی ہوں کیوں کہ ان کی فیملی میں میری دعوت ہے اور پھر شاید پیر کی صبح مجھے اسلام آباد بھی واپس جانا ہے۔ البتہ فرہاد اور زینب آجائیں گے۔"

اماں کی بات سنتے ہی یاسمین آپا نے نخوت سے جواب دیا' جسے اماں نے تو شاید محسوس نہ کیا' لیکن میرے ساتھ ساتھ احسان کے چہرے پر بھی ناگواری کا تاثر ابھر آیا۔

"پھر بھی بیٹا کوشش کرنا اگر تم آسکو' تو یقین جانو ہم سب کو بہت خوشی ہوگی۔" میری سادہ سی ماں ان کے نخرے سمجھے بنا دعوت قبول کرنے پر زور دیتے ہوئے بولی۔

"اگر آسکتی تو آپ کو کبھی اس طرح منع نہ کرتی۔"

یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئیں جبکہ اس سارے عمل کے دوران فرہاد نہایت اطمینان سے ٹی وی دیکھنے میں مصروف رہا۔

"اچھا بیٹا جیسے تمہاری مرضی۔"

اماں نے کھڑے ہوتے ہوئے احسان کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا' جسے سمجھتے ہی میں آگے بڑھی اور انہیں کندھوں سے تھام لیا۔

"کہاں جا رہی ہیں اماں بیٹھ جائیں' میں نے کھانا بنا لیا ہے کھا کر جائیے گا۔" میں نہیں چاہتی تھی کہ میری ماں اس طرح بنا کچھ کھائے پیئے میرے گھر سے جائے' مگر اماں نہ رکیں۔

"نہیں بیٹا مجھے احسان کے ساتھ کہیں اور بھی جانا ہے پھر کبھی آئی تو ضرور کھاؤں گی۔" میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے وضاحت کی۔

"اچھا فرہاد بیٹا اللہ حافظ۔"

انہوں نے فرہاد کے قریب جا کر اس کے بھی سر پر دست شفقت رکھا۔

"اللہ حافظ۔"

اتنا کہہ کر وہ پھر سے ٹی وی دیکھنے میں مگن ہو گیا' میں انہیں دروازے تک چھوڑ کر اندر واپس آئی تو فرہاد ٹی وی بند کر چکا تھا۔

"دیکھ لو تمہاری ماں اور بھائی میرے گھر آئے تو میں نے کتنی عزت کی' تمہاری کوئی شکایت نہیں لگائی اور نہ ہی انہیں دیکھ کر منہ بنایا۔" میرے اندر داخل ہوتے ہی وہ طنزیہ بولا۔

"اور اگر میرا کوئی بہن بھائی یہاں آجائے تو تم سے برداشت بھی نہیں ہوتا اور اصل یہ ہی فرق ہے تمہاری اور ہماری تربیت میں۔"

اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر وہ میرے قریب آیا' آہستہ آواز میں بولتے ہوئے ہلکا سا مسکرایا اور برآمدے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا' لیکن باہر نکلتے نکلتے اپنے الفاظ کے ذریعے وہ میرے تن بدن کو آگ لگا گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا تعلق کسی اعلا خاندان سے ہے اور میں کوئی نہایت گری پڑی عورت جس کی کوئی عزت اور حیثیت ہی نہ تھی۔

"یقین جانو تمہارے تمام الفاظ تمہیں لوٹا کر ہی اس دنیا سے واپس جاؤں گی۔ تمہیں بتاؤں گی کہ عورت اگر اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے پر آئے تو تم جیسے مرد دو کوڑی کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔"

فرہاد کو پشت سے دیکھتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں عہد کیا اور پھر اپنے اس عہد کو پورا کرنا میری زندگی کا مقصد بن گیا۔ اب میں صرف یہ ہی چاہتی تھی کہ فرہاد کو احساس دلا سکوں کہ' دنیا میں اس سے زیادہ خوب صورت اور اعلا مقام لوگ میری ایک نظر کرم کے منتظر ہیں اور اب میں کسی ایسے مرد کا ہونا چاہتی تھی' جو مجھے فرہاد اور اس کے خاندان میں وہ عزت اور مرتبہ دلاتے جو اس خاندان کی دوسری عورتوں کو حاصل تھا اور بس یہاں سے ہی میری کہانی نے نیا موڑ لیا۔ سچ تو یہ ہے کہ عورت ہو یا مرد انتقام کی آگ دونوں کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ جس کا ہوش سب کچھ ختم ہونے کے بعد آتا ہے۔

☼ ☼ ☼

فائزہ اپنے سسرال گئی ہوئی تھی اور اس کا گھر آج کل خالی تھا جہاں اکثر اوقات وجاہت آجاتا' جس کی اطلاع وہ مجھے موبائل پر فون کر کے دے دیا کرتا اور جس حد تک ممکن ہوتا میں اس سے ملنے اوپر چلی جایا کرتی۔

میرے اور اس کے درمیان موجود تمام فاصلے ختم ہو گئے تھے جس میں میرے نزدیک سارا قصور فرہاد کا تھا' نہ وہ مجھ سے اتنی بے اعتنائی برتتا اور نہ میں اس دلدل میں گرتی' جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہیں بچتا۔ اپنی غفلت

کے سبب اس نے اپنے ساتھ ساتھ میری آخرت بھی برباد کی اللہ ایسے تمام مردوں کو نیک ہدایت دے تاکہ انہیں علم ہو سکے کہ بیوی کے حقوق کیا ہیں؟ اور وہ اپنی ماں، بہن اور بیوی کے درمیان ایک حد قائم رکھ سکیں۔

وجاہت مجھے اکثر اوقات ہی خرچے کے نام پر کچھ رقم بھی دے دیا کرتا جو میرے لیے کافی ہوتی میں نے فرہاد سے کوئی بھی پیسہ مانگنا چھوڑ دیا وہ بھی مطمئن ہو گیا اور کبھی یہ جاننے کی کوشش نہ کی کہ میں اپنے تمام اخراجات کہاں سے پورے کر رہی ہوں یا شاید اس کے نزدیک میرے کوئی اخراجات بھی نہ تھے سوائے دو وقت کی روٹی کے جو وہ مجھے فراہم کر رہا تھا اور اس کا یہ بھی مجھ پر ایک احسان عظیم تھا جو وہ ہر وقت جتایا کرتا۔

☼ ☼ ☼

"ایشال نے یہ پیپرز بھیجے ہیں۔"

سالار نے ہاتھ میں تھاما خاکی لفافہ حبیبہ کے سامنے موجود شیشے کی ٹیبل پر رکھ دیا' بنا کھولے وہ جان چکی تھی کہ اس لفافہ میں کیا ہے؟ مگر ہاتھ بڑھا کر نہ اسے اٹھایا اور نہ ہی کھول کر دیکھا' سامنے کھڑی نازیہ نے ایک نظر سالار کے تنے ہوئے چہرے پر ڈالی اور دوسری حبیبہ پر' جو ساری دنیا سے بے نیاز اپنے موبائل میں بزی تھی شاید دل کا درد چھپانے کے لیے وہ خود کو ریلیکس ظاہر کر رہی تھی نازیہ کو بے اختیار ہی اس معصوم سی لڑکی پر ترس آ گیا۔

"حبیبہ۔۔۔"

وہ اس کے قریب رکھے صوفہ پر آن بیٹھیں۔

"دیکھو بیٹا ہمیں ہمیشہ زندگی میں وہ ہی ملتا ہے جو ہمارا نصیب ہو اور دعا کرنی چاہیے کہ نصیب ہمیشہ اچھا ہو۔"

وہ کیا کہنا چاہتی تھیں حبیبہ سمجھ نہ پائی بس ٹکر ٹکر ان کی جانب دیکھے گئی شاید طلاق کے صدمہ نے اس سے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیت چھین لی تھی نازیہ کو افسوس ہوا۔

"دیکھو بیٹا مجھے امید ہے تمہیں ایشال سے کئی گنا اچھا ہم سفر ملے گا بس تم اپنے رب سے کبھی مایوس نہ ہونا۔"

اپنے تئیں وہ اسے سمجھا رہی تھی۔

"اُفوہ آنٹی یہ آپ کیا بولے جا رہی ہیں؟"

نازیہ کی ساری باتیں اس کی سمجھ میں اب آئیں اور وہ بے اختیار ہنس دی۔

"فار گاڈ سیک نہ مجھے کوئی صدمہ ہے اور نہ ہی ایشال سے طلاق کا دکھ' وہ میری زندگی میں نہ کبھی تھا اور نہ ہی ہے اُسے اس کی زندگی مبارک ہو۔ میرے نزدیک وہ صرف اریشہ کا شوہر ہے دوسری حیثیت اسے میرے کزن کی حاصل ہے اور شاید وہ میری بہن کا دیور بھی ہے۔"

ایک ایک کر کے اس نے ایشال کے سارے رشتے گنوا دیے۔

"مگر میرا وہ کچھ بھی نہیں ہے اس لیے پلیز آپ اس مسئلے کو لے کر بالکل بھی پریشان نہ ہوں۔"

وہ نہایت اطمینان سے بولی' نازیہ نے دیکھا وہ واقعی سچ کہہ رہی تھی اس کے چہرے پر جو کیفیت تھی وہ کسی بھی طرح اسے پریشان ظاہر نہ کر رہی تھیں۔

"شکر ہے بیٹا ورنہ میں تو بہت ڈر رہی تھی۔۔۔" انہوں نے اپنا جملہ درمیان میں ہی چھوڑ دیا۔

"وقت بہت بدل گیا ہے آنٹی اب کوئی کسی پر زبردستی مسلط نہیں ہوتا' یہ فیصلہ اپنے دل اور خوشی سے کیا جاتا ہے جو اس کے لیے بہتر تھا۔ اس نے کیا اور اب جو میرے لیے بہتر ہوگا' میں کروں گی۔" اتنا کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"انکل مجھے لاہور جانا تھا فاطمہ آنٹی کی ڈیتھ ہو گئی ہے ان کا افسوس کر کے آنا ہے' اماں کی قبر پر بھی جانا ہے اور ہاں احسان ماموں سے میری بات ہوئی تھی وہاں چھوٹے کمرے میں اماں کا کچھ سامان موجود ہے وہ بھی لے کر آنا ہے اور میں نے سنا ہے آنٹی سکینہ بہت بیمار ہیں ان کی عیادت کو بھی جانا ہے۔" اس نے سالار کے قریب جا کر اسے اپنا پروگرام بتایا۔

"ہاں میں نے شاہ زین سے کہا ہے وہ تمہاری اور اپنی سیٹ کروا لے۔"

"اوکے اینڈ تھینک یو انکل' آپ ہمیشہ میرے کام آتے ہیں۔" وہ اظہار تشکر سے بولی۔

"بیٹا میں نے تمہارے لیے جو کچھ کیا وہ تم پر کوئی احسان نہ تھا وہ صرف ایک فرض تھا جو میں نے باپ ہونے کے ناطے ادا کیا۔"

سالار نے کھڑے ہو کر اس کے سر پر دست شفقت رکھا انہیں ویسے بھی یہ معصوم سی لڑکی بہت عزیز تھی وہ جب اسے دیکھتے ایسا محسوس ہوتا جیسے ان کے سامنے زینب کھڑی ہو وہ بالکل زینب جیسی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم فرہاد سے طلاق لے لو۔"

وجاہت نے میری طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"طلاق۔۔۔"

میں ایک لمحہ کے لیے سوچ میں پڑ گئی' بظاہر یہ چھوٹا سا لفظ اپنے اندر بڑی مشکلات رکھتا تھا' سب کچھ اتنا آسان نہ تھا جتنا ہمیں دکھائی دے رہا تھا ایک پل کے لیے میرے سامنے سفید دوپٹے میں ملبوس اپنی ماں کا نورانی چہرہ آ گیا' پھر اس پر یکے بعد دیگرے دونوں بھائیوں کے چہرے کی چھاپ دکھائی دی' پھر اپنی بچیاں' فرہاد اور اپنے سے منسلک وہ تمام رشتے جو وجاہت سے رشتہ جوڑنے کی صورت میں میرے لیے اجنبی ہو جاتے اس پل میرے سامنے سالار کا ہیولا آن کھڑا ہوا۔

"مجھ میں کیا برائی تھی زینب' جب یہ ہی آفر میں نے تمہیں دی تھی تو تم نے بنا سوچے ٹھکرا دی اور اب وجاہت میں ایسا کیا دکھائی دیا جو تم ہر رشتہ توڑنے کے لیے تیار ہو۔" اس کا شکوہ بجا تھا۔

"تم میں کوئی عیب نہ تھا سالار' فرق صرف یہ تھا کہ تم ایک بیوی کے شوہر تھے۔ بیوی بھی وہ جو مجھے اپنی بہن جیسا مانتی اور ویسے بھی میں لاکھ بری سہی' مگر شاید کسی دوسری عورت کا گھر اجاڑنے کا حوصلہ مجھ میں نہ تھا اور پھر سالار' تمہارا تعلق فرہاد کے خاندان سے تھا تم سے شادی کر کے میں تمہارے لیے مزید مشکلات کا باعث بنتی۔"

اتنے سالوں بعد آج میں اسے یہ سب وضاحت دے رہی تھی جب وہ میرے سامنے ہی نہ تھا۔

"کہاں کھو گئیں زینب میری بات کا جواب دو۔"

وجاہت نے میرا کندھا تھام کر مجھے ہلایا اور میں جیسے یکدم ہوش میں آ گئی۔

"ایک بات بتاؤ وجاہت کیا تمہارا خاندان مجھے قبول کرے گا۔" اپنے دل کا وسوسہ میں لبوں تک لے آئی۔

"مجھے کسی کی پروا نہیں سوائے تمہارے اگر تم میرے ساتھ ہو تو میں ساری دنیا چھوڑ سکتا ہوں۔" اس نے والہانہ انداز میں میرا ہاتھ تھام لیا۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں وجاہت۔"

مجھے ایک پل میں اپنی وہ بے عزتی یاد آ گئی جو پچھلے ہفتہ فرہاد کے ہاتھوں اس سے ہوئی' جب میری ماں اور بھابھی دعوت کا اہتمام کر کے مجھے فون کرتی رہیں اور فرہاد نے میرے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

"تمہاری اماں کو دعوت کا دن مجھ سے پوچھ کر رکھنا چاہیے تھا۔ آج تو میرے دوست مجھے اپنے ساتھ لے

جارہے ہیں۔ انہوں نے شاید میرے لیے کوئی اہتمام وغیرہ کیا ہے۔"

یہ جانے بنا کہ اس کا انکار میرے لیے کتنی تکلیف کا باعث بنا ہے وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اپنی ماں کو کس طرح منع کروں اور پھر فرہاد سے اجازت لیے بنا میں ٹیکسی کروا کر اپنی بچیوں کے ساتھ اماں کی طرف چلی گئی۔

"فرہاد گھر میں نہیں تھا اسے اپنے کسی دوست کے گھر جانا تھا۔"

میں نے گھر کے ہر فرد کے سوال کا ایک ہی جواب دیا اور پھر میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کسی نے مجھ سے مزید کوئی سوال نہ کیا۔ رات کو احسان نے مجھے گھر چھوڑ دیا جہاں اب مجھے فرہاد کا سامنا کرنا تھا۔ جو ایک الگ کہانی تھی، مگر سچ تو یہ تھا کہ اب مجھے اس کا کوئی ڈر و خوف نہ رہا تھا۔ اس دن اپنی ہونے والی بے عزتی یاد کرتے ہی میری آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

"مت رو زینب اگر تم نہیں چاہتیں تو میں دوبارہ تم سے ایسی کوئی بات نہیں کروں گا جو تمہیں تکلیف دے۔"

جانے میرے رونے سے وہ کیا سمجھا۔

"نہیں وجاہت میں تمہاری کسی بات پر نہیں رو رہی مجھے تو کچھ اور ہی یاد آگیا تھا۔"

اسے جواب دے کر میں اٹھ کھڑی ہوئی نیچے جا کر مجھے مریم کا ہوم ورک مکمل کروانا تھا کل اس کا پہلا پیپر تھا۔

"بہر حال زینب میری بات پر غور کرنا اور کوشش کرو جلد از جلد کسی فیصلہ پر پہنچ جاؤ اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اب مجھے بھی مزید فرہاد کے ساتھ نہیں رہنا تھا۔ اس لیے جو بھی کرنا تھا، جلد ہی کرنا تھا جس کے لیے ضروری تھا کہ میں پہلے فرہاد سے طلاق لوں کیوں کہ اس کے بغیر میں وجاہت سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

گھر کے اندر قدم رکھتے ہی وہ اپنی جگہ ساکت ہو گئی، سامنے موجود بڑا سا آم کا درخت جس کی چھاؤں میں تنہا کھیلتے، جانے اس کی کتنی دوپہریں گزری تھیں۔ وہ ہی باورچی خانہ جہاں آج بھی اسے اپنی ماں دکھائی دی۔ جو جلدی جلدی اس کے لیے کھانا تیار کر رہی تھی جانتی تھی۔ کہ کھانے کے نام پر جو بھی روکھی سوکھی ہو گی اس کی بیٹی نے اسکول سے آکر صبر و شکر کے ساتھ کھا لینا ہے۔

بے اختیار اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں اس کا ماضی بے شک تکلیف دہ تھا، مگر اپنی ماں کا ساتھ وہ کبھی نہ بھول سکتی تھی ابھی بھی اسے آلو کے پراٹھے کے ساتھ اچار کی تیز خوشبو نتھنوں میں گھستی محسوس ہوئی۔ وہ بے اختیار ہی کچن کی جانب بڑھی جو ویران سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ ہی گھر تھا، وہ ہی حبیبہ، سب کچھ وہ ہی تھا سوائے ایک ماں کے، جو اپنوں کے دیے ہوئے دکھ اور تکلیفیں بھگت کر راہ عدم سدھار گئی تھی، وہ رو پڑی وہ آنسو جو جانے کب سے رکے ہوئے تھے تمام بندھن توڑ کر آزاد ہو گئے۔

اسی دم کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش تسلی دینے کی کوشش کی، حبیبہ نے پلٹ کر دیکھا شاہ زین اس کے نہایت قریب کھڑا تھا حبیبہ کا دکھ اس کے چہرے پر بھی گڑا تھا اس نے اپنے دوپٹے سے آنکھوں میں آئے آنسو صاف کیے۔

"اس طرح مت رو حبیبہ تمہاری ماں کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔ جانتی ہو تمہاری آنکھ میں آیا ایک آنسو تمہاری ماں کو کس قدر پریشان کرتا تھا۔"

شبانہ بھابھی نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے سمجھایا۔

"آؤ میرے ساتھ گھر چلو امی آخری وقت تمہیں بے حد یاد کر رہی تھیں تمہاری امی کا دیا ہوا ایک باکس ان کے پاس رکھا تھا جو وہ مجھے دے گئیں۔ وہ تمہاری امانت ہے مجھ سے آکر لے لو۔"

شبانہ بھابھی نے اسے فاطمہ آنٹی کا حوالہ دیا اور وہ خاموشی سے ان کے ساتھ آگئی، بنا کوئی سوال و جواب کیے اور اپنی ماں کا وراثت میں چھوڑا وہ باکس ان کے ہاتھ سے تھام لیا جس میں کیا تھا؟ یہ جاننے کی جستجو میں اس کا سارا بچپن گزر گیا، مگر اماں نے کبھی وہ باکس حبیبہ کو نہ دیا اور آج اماں کی اس آخری جمع پونجی کی وہ واحد حق دار ٹھہری۔ وہ آج بھی جاننا چاہتی تھی کہ اس میں ایسا کیا ہے جو ماں نے ساری زندگی سنبھال سنبھال کر رکھا، مگر وہ باکس اسے تنہائی میں کھولنا تھا اس وقت کسی کے سامنے وہ اپنی ماں کی زندگی کا مزید کوئی راز کھولنا نہ چاہتی تھی۔

"یہ اس کی چابی ہے؟" شبانہ بھابھی نے کی چین کے ساتھ ایک چابی بھی اسی کی جانب بڑھائی جسے اس نے خاموشی سے تھام لیا۔

"اچھا شبانہ بھابھی اب میں چلتی ہوں پھر زندگی رہی تو آپ سے ملنے ضرور آؤں گی۔"

اس نے شبانہ بھابھی کے ہاتھ تھامتے ہوئے ان سے اجازت چاہی۔

"ارے اتنی جلدی کہاں جا رہی ہو، میں نے تمہارے لیے کھانا تیار کیا ہے کھا کر جانا۔" ان کے لہجہ میں پرانی محبت آج بھی جھلک رہی تھی۔

"میں ضرور کھانا کھاتی آپ کے گھر سے، مگر میری دو گھنٹہ بعد واپسی کی فلائٹ ہے اور مجھے قبرستان سے ہوتے ہوئے ایرپورٹ پہنچنا ہے۔"

انہیں آہستہ آہستہ اپنا پروگرام بتا کر وہ شاہ زین کی سنگت میں باہر نکل آئی جہاں سامنے ہی وہ گاڑی کھڑی تھی جس میں بیٹھ کر اس نے واپسی کا سفر شروع کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

مریم نے جگنو کو دھکا دے کر گرا دیا وہ زور زور سے رونے لگی، ایسے میں مجھے جانے کیا ہوا جو کچن سے باہر نکلتے ہی بے دردی سے مریم کو پیٹ ڈالا۔ اس کے رونے کی آواز سن کر فرہاد کمرے سے باہر نکل آیا اور مجھے اس طرح مریم کو پیٹتا دیکھ کر حیران رہ گیا کیوں کہ میں کبھی بھی بچوں کو اس بے دردی سے نہیں مارا کرتی تھی۔ اس وقت شاید میں اپنی ٹنشن میں تھی یا فرہاد سے نجات حاصل کرنے کے لیے شروع کی جانے والی کوششوں میں یہ میرا پہلا قدم تھا، وجہ جو بھی تھی، مگر میں یقیناً" اس وقت اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔

فرہاد نے تیزی سے آگے بڑھ کر مجھے بازو سے گھسیٹ کر پیچھے کیا مریم کو مار کھاتا دیکھ کر جگنو بھی چلا رہی تھی۔

"تم پاگل ہو گئی ہو کیوں اس طرح بے دردی سے بچی کو پیٹ رہی ہو۔" مریم کو اپنے پیچھے کرتے ہوئے وہ مجھ پر دھاڑا۔

"ہاں تم سب لوگوں نے مل کر مجھے پاگل کر دیا ہے۔"

میری آواز فرہاد سے بلند تھی ایک پل کو وہ حیران رہ گیا۔

"ہر وقت کی چخ چخ نے تھکا دیا ہے مجھے، فرہاد تمہیں احساس ہے کہ تمہاری کئی دنوں تک مجھ سے بلاوجہ ناراضی اس اکیلے گھر میں مجھے کتنی اذیت دیتی ہے۔ بجائے مجھ سے بات کرنے کے تم ٹی وی پر آنے والی بے ہودہ فلموں میں تسکین تلاش کرتے ہو اور اس وقت جب مجھے تمہاری ضرورت ہوتی ہے تم مصلے سنبھال کر نفلی عبادت میں مصروف ہو جاتے ہو۔ تمہیں شاید علم نہیں کہ حقوق اللہ پورے کرنے سے پہلے حقوق العباد کی ادائیگی ضروری ہے۔

تمہاری بیوی اپنی ضرورت کو ترستی ہے اور تم دنیا دکھاوے کے لیے اللہ کی عبادت میں مصروف ہوتے ہو تاکہ صبح اٹھ کر اپنی بہن کو بتا سکو کہ آج رات میں نے اتنے نفل ادا کیے اور وہ خراج تحسین کا تاج تمہارے سر پر پہنا دے واہ فرہاد واہ! میں اس گھر میں زندہ جاگتی ہستی اپنی ضروریات سمیت کہیں دفن ہو چکی ہوں اور تمہیں اس کا احساس نہیں۔" اپنے دل کا ہر دکھ آج مجھے اس ظالم شخص کے سامنے بیان کرنا تھا جو غلطی سے میرے مجازی خدا کے عہدے پر فائز تھا۔

"تم واقعی ہی پاگل ہو چکی ہو جو بچوں کے سامنے اس طرح کی گھٹیا بکواس کر رہی ہو اور میری نفلی عبادت پر انگلیاں اٹھاتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔" وہ ذرا بھی شرمندہ نہ ہوا۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں تمہاری کسی نے اچھی تربیت نہیں کی ورنہ تم کبھی بھی اسی طرح کی بات نہ کرتیں۔ ایسی باتیں بچوں کے سامنے کرکے تم انہیں بھی اپنے جیسا بے حیا بنانا چاہتی ہو۔"

مجھ پر پھنکارتا ہوا وہ کمرے کی جانب واپس پلٹا جب میں تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے راستے میں حائل ہو گئی۔

"مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا فرہاد مجھے تم سے طلاق چاہیے۔"

آج میں ہر قصہ ختم کرنا چاہتی تھی۔

"ہٹو میرے راستے سے۔" اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر دور ہٹانا چاہا۔

"مجھے تم سے طلاق چاہیے فرہاد ابھی اور اسی وقت۔" میں اپنے موقف پر سختی سے قائم رہتے ہوئے چلائی۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے زینب۔" وہ اپنی سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتا ہوا بولا۔

"اتنی ہوس کہ کچھ دن میں نے منہ نہ لگایا تو تم طلاق پر آ گئیں لعنت ہے تم پر۔" اس کے الفاظ تھے یا انگارے میں جل کر راکھ ہو گئی۔

"اور اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہیں طلاق دے کر آزاد کر دوں گا تو یقیناً یہ تمہاری بھول ہے۔"

میری گردن پکڑ کر اس نے مجھے دیوار سے لگا دیا' مریم اور زور زور سے رونے لگی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مجھے جان سے مار دے گا۔

"نہ اب تمہیں کبھی منہ لگاؤں گا اور نہ ہی طلاق دوں گا تمہاری کتے جیسی حیثیت کر دوں گا اس گھر میں پھر دیکھوں گا تم کیا کرتی ہو۔"

مجھ پر نفرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے وہ پھنکارا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے سامنے فرہاد کی شکل میں کوئی سانپ کھڑا ہو۔ اس کے چہرے پر میرے لیے اتنی حقارت اور نفرت تھی کہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔

اس دن پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ فرہاد مجھ سے نفرت کرتا ہے' بے حد نفرت۔ جس کی وجہ میری سمجھ میں صرف اتنی آئی کہ میں اس کی بہن کو پسند نہیں اور وہ میرے خلاف فرہاد کے کان بھرتی ہے جبکہ فرہاد مردوں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا جو کانوں کے کچے ہونے کے باعث اپنی زندگیاں دوزخ بنا لیتے ہیں اور شاید ایسا ہی کچھ اب اس کے ساتھ بھی ہونے والا تھا۔

☆ ☆ ☆

صبح سویرے ہی اماں احسان کو ساتھ لیے میرے گھر آن پہنچیں ان کا ستا ہوا چہرہ اس بات کا غماز تھا کہ دکان پر جاتے ہی فرہاد نے انہیں فون کرکے میری شکایت لگائی ہے احسان بھی ہمیشہ کی نسبت خاصا خاموش تھا۔

"زینب پتر یہ میں کیا سن رہی ہوں؟"

میرے سلام کے جواب میں انہوں نے تشویش زدہ لہجہ میں میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ایسے میں شاید میری پریشان حال ماں نے میری سوجی ہوئی سرخ متورم آنکھیں قطعی نظر انداز کردیں ورنہ وہ پہلا سوال یہ کرتیں کہ میری بچی تو کیوں اتنی دکھی ہے تجھے کیا ہوا ہے، مگر شاید بیٹیوں کے زبردستی گھر بسانے کی خواہش ماؤں کو ان کے دکھوں سے نظریں چرانے پر مجبور کردیتی ہے۔

"ایسا کیا سن لیا اماں جی آپ نے جو صبح سویرے جواب طلبی کے لیے آگئی ہیں۔" میں نے حتی الامکان اپنے لہجہ کو تلخ ہونے سے روکا۔

"دیکھو بیٹا لڑائی جھگڑے تو ہر گھر میں ہوجاتے ہیں کون سے میاں بیوی ہیں جو آپس میں نہیں لڑتے احسان اور اس کی بیوی کو ہی دیکھ لو ہر ہفتہ ہی جھگڑتے ہیں پھر صلح بھی ہوجاتی ہے۔" ان کی باندھی جانے والی تمہید نے مجھے سمجھادیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھیں۔

"مگر بیٹا اس طرح اتنا بڑا لفظ کوئی شریف عورت منہ سے نہیں نکالتی" ان کا لہجہ تاسف بھرا تھا۔

"عورت کا تو دوسرا نام ہی صبر و برداشت ہے سب کچھ جھیل کر اپنا گھر آباد کرنا ہی ایک شریف عورت کی نشانی ہے۔"

"اماں ایک بات تو بتائیں۔" میں ان کے سامنے نیچے زمین پر ہی بیٹھ گئی۔

"کیا گھر آباد کرنا صرف ایک عورت کی ذمہ داری ہے۔ کوئی مرد یہ کوشش کیوں نہیں کرتا کہ اس کا گھر آباد رہے کیا شرافت کا لفظ صرف عورت سے منسوب ہے یہ ہی شرافت مرد میں کیوں نہیں ہوتی۔"

"تو بہت جھلی ہے زینب سوچ ذرا اگر فرہاد شریف مرد نہ ہوتا تو تیرے طلاق کے مطالبہ پر تجھے نکال گھر سے باہر نہ کرتا؟"

اپنے تئیں انہوں نے فرہاد کو شریف ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"اور آپا میں تو تمہیں ویسے بھی بہت صبر و شکر کرنے والی سمجھتا ہوں کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ فرہاد بھائی کا رویہ تم سے کیسا ہے اور تم پھر بھی ہم سب کی عزت کے لیے اس کے ساتھ زندگی بسر کررہی ہو اب آپا اس عمر میں آکر ہماری عزت کو اس طرح خراب مت کرو۔"

مجھے احسان کے الفاظ سن کر حیرت کے ساتھ ساتھ دکھ بھی ہوا۔ میرے متعلق سب کچھ جان کر بھی مجھ سے امید کی جارہی تھی کہ میں اپنے سے منسوب تمام لوگوں کی عزت کا خیال رکھوں، سب کو اپنی عزت کی پڑی تھی، میں زندگی کس تکلیف سے گزار رہی ہوں اس کا کسی کو بھی احساس نہ تھا۔

"میری بیٹی بہت سمجھ دار ہے مجھے امید ہے اب یہ کبھی ہمیں شرمندہ نہ کرے گی۔"

میں اس وقت جس ذہنی کش مکش کا شکار تھی اس میں اماں کی بات کا جواب دینا میرے نزدیک قطعی اہم نہ تھا، مگر اب میرا ارادہ دوسروں کی عزت بچانے کے لیے اپنی زندگی خراب کرنے کا بالکل نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

"وہ مجھے کبھی طلاق نہیں دے گا۔"

میں نے وجاہت پر یہ بات واضح کرتے ہوئے کہا۔

"پچھلے ایک ماہ میں اس کا رویہ مجھ سے نہایت بدتر ہے شاید وہ اس امید میں ہے کہ میں اس سے اور یاسمین آپا سے معافی مانگوں۔ اپنی بہن کی بے عزتی اسے میرے قریب نہیں آنے دیتی میری حیثیت اس گھر میں ایک غیر ضروری اور فالتو شے سے زیادہ کچھ نہیں میں صرف وہاں ایک کونے میں پڑا کاٹھ کباڑ ہوں اور بس۔۔۔"

میں رو رہی تھی شاید اتنے عرصہ میں آج پہلی بار میں نے اپنا ایک ایک دکھ وجاہت کے سامنے کھول دیا، وہ حیرت سے منہ کھولے میری ہر بات سن رہا تھا۔

"وہ بہت ضدی انسان ہے وجاہت اسے جب سے یہ احساس ہوا کہ میں اپنی ضرورت کے لیے ترس رہی ہوں اور مجھے مزید ترسا رہا ہے وہ بہت گھٹیا مرد ہے۔" میں کیا کہنا چاہتی تھی وجاہت سمجھ چکا تھا۔

"میری ماں، میرا بھائی سب یہ کہتے ہیں کہ مجھے جھکنا چاہیے کیونکہ میں عورت ہوں اور عورت کے مقدر میں ہمیشہ جھکنا ہی لکھا ہے، جبکہ مرد تو ایک تناور درخت ہے جو سیدھا کھڑا رہ کر عورت کو چھاؤں ضرور دیتا ہے لیکن اگر اسے جھکانے کی کوشش کی جائے تو وہ ٹوٹ جاتا ہے اور پھر عورت اس کی چھاؤں سے محروم ہوجاتی ہے اب میں اپنی ماں کو کیسے سمجھاؤں کہ فرہاد تو ایک ایسا درخت ہے جس کی چھاؤں بھی صرف دوسروں کے لیے ہے۔"

میں آج وجاہت سے اپنے دل کی ہر بات کہہ دینا چاہتی تھی۔

"میں تمہاری ہر بات سمجھ گیا ہوں زینب، پھر بھی یہ سوچو کہ بنا طلاق تم مجھ سے نکاح کیسے کروں گی۔" اس کی پریشانی بجا تھی۔

"اس مسئلہ کا بھی میرے پاس ایک حل ہے۔"

فرہاد سے کس طرح نجات حاصل کرنی ہے یہ سب آج سوچ کر ہی میں وجاہت سے ملنے آئی تھی۔

"ہم دونوں یہاں سے بھاگ کر کسی دوسرے شہر چلے جائیں گے پھر میں کورٹ سے خلع لے لوں گی۔" میں طے کرچکی تھی کہ اب مجھے فرہاد کے ساتھ نہیں رہنا۔ میں نے مزید کہا۔

"تمہارے ساتھ بھاگنا ضروری ہے کیونکہ کوئی بھی غیرت مند مرد کسی ایسی عورت کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا جو کسی غیر مرد کے ساتھ تنہا دو یا تین دن گزارے اور جب میں ایسا کرلوں گی تو یقین جانو فرہاد مجھ پر لعنت بھیج دے گا۔ تمہارے ساتھ گھر چھوڑنے کے بعد وہ مجھے کبھی قبول نہ کرے گا اور میری ایک درخواست پر مجھے خود طلاق دے دے گا۔"

اب میری ساری پلاننگ وجاہت کی سمجھ میں آگئی۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں زینب تم جب کہو ہم یہاں سے حیدر آباد چلے جائیں گے وہاں میرا بھائی رہتا ہے۔"

"مجھ سے ایک وعدہ کرو وجاہت مجھے کبھی بری عورت سمجھ کر تنہا نہ چھوڑنا۔" میرے دل کا خوف لبوں تک آگیا۔

"تم بری عورت نہیں ہو زینب، تمہیں تو فرہاد جیسے مرد نے برا بننے پر مجبور کردیا۔ کوئی بھی شادی شدہ عورت اگر کسی غیر مرد کے ساتھ محبت کے مراسم استوار کرتی ہے نا تو اس کے پیچھے اس کا اپنا شوہر ہوتا ہے جو اسے ایسا کرنے پر مجبور کرتا ہے، ورنہ شوہر کا بخشا ہوا اعتماد اور محبت کبھی کسی عورت کو بھٹکنے نہیں دیتا۔" اس نے میرے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے مجھے یقین دلایا۔

ایک بات اور وجاہت اب تم کچھ عرصہ فائزہ کے گھر مت آنا اور نہ ہی مجھ سے ملنے کی کوشش کرنا اس وقت تک جب تک میں تمہیں فون کرکے خود نہ بلاؤں، دوسری بات یہ کہ جب تم مجھے لینے آؤ تو یہ بات ذہن میں رکھنا حبیبہ میرے ساتھ ہوگی میں اسے نہیں چھوڑ سکتی۔"

"تم چاہو تو مریم اور جاذبہ کو بھی لے لو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" وہ کھلے دل سے بولا۔

"نہیں صرف حبیبہ، وہ دونوں اپنے باپ کے ساتھ رہیں گی میں اسے کسی ذمہ داری سے آزاد چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

میں نے سخت لہجہ میں کہا۔

کاش! جس دن میں نے مریم کو مار کر اپنی بھڑاس نکالی تھی اس دن فرہاد مجھے سمجھ جاتا، مجھے منا لیتا اور اپنی ضد ختم کر دیتا مگر افسوس اس نے ایسا نہ کیا۔ اس کے غصہ اور نفرت نے میرا گھر برباد کر دیا۔"

اپنی کہانی سناتے سناتے وہ عورت اس طرح بلک بلک کر رونے لگی کہ سامنے بیٹھی لڑکی کا یکسوئی سے چلتا ہوا قلم رک گیا اسے سمجھ ہی نہیں آیا کہ وہ اس دکھی عورت کو کس طرح تسلی دے۔

"پلیز زینب آپ روئیں مت بلکہ اللہ سے اپنے ہر گناہ کی معافی مانگیں مجھے امید ہے کہ وہ نہ صرف آپ کو معاف کرے گا بلکہ آپ کی زندگی میں بہتری کا کوئی نہ کوئی وسیلہ بھی ضرور پیدا کرے گا۔"

اس لڑکی نے آگے بڑھ کر زینب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دینا چاہی۔

"اور آپ کا بہت شکریہ کہ نہ صرف آپ نے مجھ سے ملاقات کی بلکہ اس قابل بھی سمجھا کہ مجھے اپنے تمام حالات تفصیل سے بتائے ورنہ مجھے تو پہلے دن ہی یہ کہہ کر منع کر دیا گیا تھا کہ آپ کسی سے ملاقات نہیں کرتیں یہاں تک کہ جب سے آپ اس دارالامان آئی ہیں اپنے گھر کے کسی فرد سے بھی نہیں ملیں۔ جب کہ میں آپ کو یہ مشورہ دوں گی کہ پلیز ایک بار آپ اپنے شوہر سے ضرور ملیں کیونکہ جب میں یہاں آئی تھی وہ تب بھی باہر ہی بیٹھے تھے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں زینب آپ ایک بار ان سے مل کر تو دیکھیں۔ ہو سکتا ہے آپ کی آئندہ زندگی کے لیے کچھ اچھا راستہ نکل آئے۔" "میں نے کورٹ میں خلع کے لیے درخواست دے دی ہے اور اب میری اس سے جو بھی ملاقات ہو گی اس حوالے سے عدالت میں ہی ہو گی اس کے علاوہ میں اس شخص سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔"

اس لڑکی کی بات ختم ہوتے ہی زینب فرش سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اور ہاں اگر ممکن ہو تو جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے اور جو کچھ تم نے اپنے پاس لکھا ہے اس کی ایک کاپی مجھے اس دارالامان میں پہنچا دینا تاکہ میں اپنے سے منسلک لوگوں کو یہ بتا سکوں کہ فرہاد کس طرح کا مرد تھا۔ وہ باتیں جو میں کبھی کسی سے نہ کر سکی لکھے ہوئے مواد کی صورت میں تو انہیں دے سکتی ہوں نا اسی طرح شاید میری ماں میرے اندر کا دکھ جان سکے۔"

اتنا کہہ کر زینب وہاں رکی نہیں بلکہ انتظار گاہ سے باہر نکل گئی اس لڑکی نے جس کا تعلق غالباً" کسی اخبار سے تھا اپنے سامنے پھیلے تمام کاغذات سمیٹے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے یہ جان کر دکھ ہوا کس طرح ہمارے غلط رویے گھروں کی برباد کا سبب بنتے ہیں اور جب تک گھر مکمل طور پر برباد نہ ہو جائیں وہاں رہنے والے مکینوں کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

وہ باہر نکلی تو فرہاد ابھی بھی اپنی جگہ موجود تھا اس کا دل چاہا وہ ایک پل کو رکے اور فرہاد کے پاس جا کر اسے آئینہ دکھائے کہ دیکھو تمہاری بے اعتنائی، ضد، ہٹ دھرمی اور رشتوں کو اہمیت نہ دینے کی عادت نے کس طرح ایک عورت کو برباد کر دیا، مگر اس کا دل ہی نہ چاہا اور خاموشی سے اس کے پاس سے گزرتی ہوئی دارلامان کا بڑا سا گیٹ عبور کر گئی۔

☼ ☼ ☼

فتح محمد اپنی موٹر سائیکل کا پنکچر لگوا رہا تھا جب اچانک اس کی نگاہ سامنے کالی چادر میں لپٹی اس سرو قد عورت پر پڑی جس کی چادر سے جھانکتی بڑی بڑی کالی آنکھیں دیکھ کر وہ چونکا۔ وہ زینب تھی جو لاکھ خود کو چادر میں چھپائے کھڑی تھی مگر فتح محمد سے نہ چھپ سکتی تھی جس کی تصدیق اس کی گود میں موجود بچی سے باآسانی کی جا سکتی تھی۔

"یہ اس وقت تنہا کہاں جا رہی ہے؟" اس کے ذہن میں پہلا خیال یہ ہی آیا۔

جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا اتنے سالوں میں اس نے کبھی زینب کو یوں تن تنہا کہیں آتے جاتے نہ دیکھا تھا دل چاہا آگے بڑھ کر پوچھے مگر اس سے قبل کہ اپنے دل میں آئی بات کو وہ عملی جامہ پہناتا ایک دم ہی زینب کے پاس ایک سفید گاڑی آکر رکی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کا تعلق یقیناً" زینب کی فیملی سے نہیں تھا ورنہ وہ اسے کبھی یہاں سے پک نہ کرتا اپنی چادر سنبھالتی زینب بڑے استحقاق سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی، فراٹے بھرتی گاڑی فتح محمد کے قریب سے گزر گئی۔

جب ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کے نقوش اس پر واضح ہوئے اسے محسوس ہوا اس نے پہلے بھی اس شخص کو کہیں دیکھا ہے کہاں اس نے اپنے دماغ پر زور دیا گاڑی ہر لحہ اس سے دور ہوتی جا رہی تھی یک دم اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

گاڑی میں موجود شخص کو اس نے اپنی گلی کی ایک زیر تعمیر بلڈنگ میں دیکھا تھا۔ غالباً" وہ کوئی ٹھیکیدار تھا جس کا نام فی الحال اسے یاد نہ آیا مگر زینب اس شخص کے ساتھ اس طرح تن تنہا کہاں جا رہی ہے حیرت کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں ایک بے چینی سی ابھر آئی۔ اب وہ جلد از جلد گھر جانا چاہتا تھا تاکہ سادیہ کو بتا سکے کہ آج اس نے زینب کو ایک غیر مرد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر جاتے دیکھا ہے۔ وہ سادیہ کو جتانا چاہتا تھا کہ زینب کے بارے میں اس کے خیالات اتنے غلط نہ تھے جتنے آج تک وہ سمجھتی آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تمہاری ماں کہاں ہے؟"

فرہاد کو کافی دیر ہو گئی تھی گھر آئے ہوئے مگر اسے زینب کہیں دکھائی نہیں دی، کچن کا دروازہ بھی بند تھا باتھ روم بھی خالی پڑا تھا، آخر کچھ دیر انتظار کے بعد اسے نہ چاہتے ہوئے بھی مریم سے سوال کرنا پڑا جو وہیں برآمدے میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

"وہ حبیبہ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی ہیں۔"

مریم کے بتاتے ہی اسے یاد آیا صبح زینب نے ذکر کیا تھا شاید حبیبہ کی طبیعت خراب تھی اور وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا چاہتی تھی۔

"مگر میں نے تو شاید اسے ڈاکٹر کی فیس بھی نہیں دی پھر کس طرح وہ ڈاکٹر کے پاس گئی۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

"بابا مجھے بھوک لگی ہے۔"

جاذبیہ نے اس کا گھٹنا پکڑ کر ہلایا فرہاد نے دیکھا تین بجنے والے تھے جانے ابھی تک زینب واپس کیوں نہیں آئی تھی، وہ اٹھ کر کچن میں آیا چاول اور سالن تیار رکھا تھا برتن میں کھانا نکال کر وہ واپس برآمدے میں آگیا کھانا کھاتے ہی جاذبیہ سو گئی۔

چار بج گئے تھے ابھی تک زینب گھر نہ آئی تھی۔

اسے دکان پر واپس جانا تھا مگر اس کا دل نہ مانا اس طرح بچیوں کو اکیلا چھوڑ کر جانے کو۔

"دروازہ بند کرو مریم میں تمہاری ماں کو دیکھ کر آؤں کس ڈاکٹر کے پاس گئی ہے۔"

باہر نکل کر وہ گلی کے نکڑ پر موجود ڈاکٹر کے کلینک آیا جو اس وقت بند پڑا تھا، پھر وہ مین روڈ والی ڈسپنسری بھی دیکھ آیا زینب کہیں نہ تھی، غصہ کے ساتھ ساتھ اسے بے چینی بھی محسوس ہوئی۔

"ضرور سادیہ کے گھر ہو گی۔"

یہ خیال ذہن میں آتے ہی اس نے گھر جا کر مریم کو سادیہ کی طرف بھیجا جہاں سے وہ مایوس واپس آئی۔

"اماں ان کے گھر بھی نہیں ہیں۔"
اسے لگا شاید زینب ناراض ہو کر اپنے گھر چلی گئی ہے مگر وہ اس طرح بچیوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی، فرہاد اسے پچھلے کئی ماہ سے مسلسل نظر انداز کر رہا تھا۔ جس کا احساس اس پل ہوتے ہی اسے ہلکا سا تاسف ہوا جس کے زیر اثر اس نے قریب رکھا فون اٹھا کر اپنے سسرال کا نمبر ملایا۔
"زینب تو کافی عرصہ سے ہمارے گھر نہیں آئی کیوں خیریت تو ہے بیٹا کہاں ہے وہ" زینب کے بارے میں استفسار کرتے ہی اماں بی تشویش زدہ لہجہ میں بولیں۔
"پتا نہیں شاید حبیبہ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی تھی ابھی تک واپس نہیں آئی۔"
اتنا کہہ کر اس نے فون بند کر دیا، رات گئے تک وہ ہر اس جگہ زینب کو ڈھونڈ آیا جہاں سے اسے امید تھی۔ یہاں تک کہ اسفند بھائی کے ساتھ جا کر اس نے شہر کے سارے اسپتال بھی دیکھ لیے مگر زینب ایسی گم ہوئی کہ کسی کو مل کر ہی نہ دی رات کے اس پہر جب پریشانی کے عالم میں پورا خاندان اس کے گھر جمع تھا، مریم کی ایک بات نے اس کے ساتھ ساتھ سب کو چونکا دیا۔
"بابا آپ امی کو فون کریں اور پوچھیں کہ وہ کہاں ہیں۔"
"مگر بیٹا تمہاری امی کے پاس تو فون بھی نہیں ہے پھر بھلا کیسے پتا چلے وہ کہاں ہیں۔" فرہاد کے بجائے فضہ بھابھی نے اسے پیار کرتے ہوئے سمجھایا۔
"امی کے پاس فون ہے آپ انہیں فون کریں۔" وہ بضد تھی فرہاد نے اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔
"امی اپنا فون یہاں چھپاتی تھیں۔"
یہ جاذبہ تھی جس نے اپنی بہن کی بات کی تصدیق کے لیے آگے بڑھ کر الماری کے دونوں پٹ وا کر دیے۔ اپنی دونوں بیٹیوں کے اس انکشاف نے فرہاد کو گنگ کر دیا وہ تیزی سے آگے بڑھا الماری میں ہاتھ مار کر سارے کپڑے باہر پھینک دیے اور پھر اگلے چند سیکنڈوں میں اس کے ہاتھ میں ایک موبائل فون تھا جو یقیناً "زینب افراتفری میں گھر چھوڑ گئی اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا اسے محسوس ہوا جیسے سب کی موجودگی میں وہ ذلیل ہو گیا ہو۔
اسفند بھائی نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے فون لیا، میموری چیک کی اس میں صرف ایک ہی نمبر تھا جو کسی کے نام سے محفوظ نہ تھا انہوں نے فوراً "نمبر ملایا آگے کمپیوٹر کی ریکارڈنگ سن کر یہ واضح ہو گیا کہ مطلوبہ نمبر اس وقت بند تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں اپنا فون گھر بھول آئی ہوں۔"
ہائی وے پر پہنچتے ہی اچانک زینب کو یاد آیا اس کا فون تو گھر ہی رہ گیا ہے تو وہ بڑبڑا اٹھی۔
"وجاہت اپنی سم نکال کر پھینک دو اس میں صرف تمہارا ہی نمبر ہے اور اس طرح فرہاد تم تک پہنچ جائے گا جبکہ میں نہیں چاہتی کہ خلع کے کیس سے قبل تم تک پہنچے۔"
وجاہت نے اس کے گھبرائے ہوئے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور جیب سے موبائل نکال کر اس کے حوالے کر دیا جس میں سے سم نکال کر زینب نے باہر پھینک دی اس طرح اپنی طرف سے اس نے سارا مسئلہ حل کر دیا مگر درحقیقت ایسا نہ تھا وجاہت کے نمبر سے اس تک پہنچنا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

"زینب گھر سے بھاگ گئی ہے۔"

فضہ بھابھی کے اطلاع دیتے ہی صباحت نے نازیہ کو فون ملا کر یہ خبر سنائی۔
"صباحت باجی سالار کہاں ہیں وہ آپ کی طرف آئے تھے۔"
یہ صباحت کی بات کا جواب نہ تھا اسے نازیہ کچھ گھبرائی ہوئی لگی۔
"میرا خیال ہے وہ صمد کے ساتھ ہے اور تم نے شاید میری بات سنی نہیں، میں نے تمہیں بتایا کہ زینب کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے۔"
"میں نے آپ کی بات سن کر ہی سالار کا پوچھا کیوں کہ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سالار کے ساتھ نہ بھاگ گئی ہو۔"
"کیا مطلب۔"
اب حیران ہونے کی باری صباحت کی تھی۔
"جب میں پاکستان میں تھی تو مجھے کئی بار محسوس ہوا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی چکر چل رہا ہے، میں نے تو سالار کو اجازت بھی دی تھی کہ وہ زینب سے شادی کر لے۔" زینب کی گمشدگی نے نازیہ کو ہر راز کھولنے پر مجبور کر دیا اس کا کیا جانے والا ہر انکشاف صباحت کو حیران کرتا گیا۔
"مگر جانے کیوں وہ نہ مانا اور زینب نامی تلوار مجھ پر اس وقت تک لٹکتی رہی جب تک آپ نے میری گود میں شاہ زین نہ ڈالا پھر شاہ زین کے آتے ہی اس کا رویہ مجھ سے خاصا تبدیل ہو گیا اب اتنے سالوں بعد زینب کا غائب ہونا اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ وہ کوئی اچھی عورت ہی نہ تھی۔"
"فضہ بھابھی تو بتا رہی تھیں کہ حبیبہ بھی شاید اسی آدمی کی بیٹی تھی جس کے ساتھ وہ بھاگی ہے اسی لیے تو صرف اس کو ہی لے کر گئی ہے۔"
یہ دنیا تھی اور دنیا کے منہ میں جو آتا ہے وہ بولتی جاتی ہے۔ اسے اس بات سے کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ اس کی باتوں میں کتنی سچائی ہے اور کتنا مبالغہ آمیزی کا عنصر گھلا ہوا ہے اور ان کی یہ بے سروپا باتیں کہاں تک کسی کو نقصان پہنچاتی ہیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ میری بیوی ہے۔" وجاہت نے حیدر آباد اپنے بھائی کے گھر پہنچتے ہی زینب کا پہلا تعارف اپنی بیوی کی حیثیت سے ہی کروایا۔
"آپ نے شادی کر لی اور اتنا عرصہ ہمیں خبر بھی نہ کی خیریت ہے۔"
حبیبہ کو دیکھ کر ان دونوں میاں بیوی کے ذہن میں پہلا خیال یہ ہی آیا کہ وہ وجاہت ہی کی بیٹی ہے جبکہ زینب بالکل خاموش تھی اور صرف ایک دن اور ایک رات ہی انہوں نے وہاں سکون سے گزاری اگلی صبح آنے والے فائزہ کے فون نے ان دونوں کو پریشان کر دیا۔
"فرہاد اور اس کے گھر والوں نے زینب کے اغوا کا پرچہ آپ کے خلاف کٹوا دیا ہے کیوں کہ زینب کے موبائل سے آپ کا نمبر مل گیا تھا اور پھر ساویہ کے شوہر نے بھی گواہی دی کہ اس نے زینب کو آپ کی سفید کرولا میں بیٹھ کر جاتے دیکھا ہے۔"
فائزہ خود بھی بہت زیادہ پریشان تھی کیوں کہ پولیس اس کے پاس تفتیش کے لیے آچکی تھی اسے ڈر تھا کہ کہیں کسی بات کی زد میں وہ نہ آجائے جو بھی تھا ان دونوں کی ملاقات فائزہ ہی کے گھر ہوا کرتی تھی۔
"آپ لوگ وہاں سے کہیں اور چلے جائیں بنا نکاح اس طرح ساتھ رہنے کے جرم میں آپ کو سزا ہو سکتی

ہے۔"

زینب کا کورٹ جاکر خلع کا کیس دائر کرنے کا ارادہ دھرا کا دھرا رہ گیا فی الحال سب سے ضروری تھا کہ خود کو متوقع گرفتاری سے بچایا جائے لیکن اس سے قبل کہ وہ وہاں سے نکلتے پولیس نے انہیں دھر لیا گرفتاری کے بعد پتا چلا کہ پولیس کو یہاں کا پتا رابعہ نے دیا تھا جسے وجاہت کے زینب کے ساتھ تعلقات بالکل پسند نہیں تھے۔

☼ ☼ ☼

آج اس کی پیشی تھی کمرہ عدالت لوگوں سے کچھا کچھ بھرا ہوا تھا ان میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جنہیں کبھی زینب سے رشتہ داری کا شرف حاصل تھا اس نے دیکھا سب سے آگے والی سیٹ پر فضہ بھابھی کے بالکل ساتھ فرہاد سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اسے یاد آیا رات جیل پہنچتے ہی اس سے سب سے پہلی ملاقات فرہاد نے ہی کی تھی جو اس کے سامنے کھڑا اس طرح گڑگڑا رہا تھا کہ یاد آتے ہی زینب کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی اسے محسوس ہوا جیسے فرہاد ابھی بھی اس کے سامنے کھڑا کہہ رہا ہے۔

"دیکھو زینب ہم سب کی عزت اسی میں ہے کہ تم صبح کورٹ میں یہ بیان دے دینا کہ تمہیں وجاہت نے اغوا کیا تھا اس طرح تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی اور تم بری ہو جاؤ گی۔"

"اچھا پھر۔" اس کی بات سن کر زینب نے جیسے مزا لیا۔

"پھر میں تمہیں گھر لے جاؤں گا اور کوشش کروں گا آئندہ مجھ سے کوئی ایسی غلطی نہ ہو جو تمہیں اتنا بڑا قدم اٹھانے پر مجبور کردے۔" وہ منت کرتا ہوا بولا۔

"شکر ہے تم نے اعتراف تو کیا کہ تمہاری غلطیوں نے مجھ سے یہ سب کروایا ہے مگر فرہاد وقت گزرنے کے بعد یاد آنے والی غلطی پر صرف معافی مانگی جاسکتی ہے کیوں کہ غلطی ہو جانے کے بعد اسے سدھارنا اتنا آسان نہیں جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے اب میری اور تمہاری بھلائی اس میں ہے کہ مجھے طلاق دے دو۔"

وہ اب کوئی بات ماننے کو تیار نہ تھی اور فرہاد جب تک وہاں رہا اس کی ہر بات کا زینب نے ایک ہی جواب دیا اور وہ تھا "طلاق" فرہاد کے علاوہ زینب نے کسی بھی فرد سے ملنے سے انکار کردیا یہاں تک کہ وہ احسان اور اپنی ماں سے بھی نہیں ملنا چاہتی تھی اور اب عدالت میں پیش ہوتے ہی اسے وہ تمام لوگ نظر آئے جو رات جیل میں اس سے ملاقات کرنے پر بضد تھے۔

احسان اماں کے ساتھ ہی بیٹھا تھا اس کی ماں کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید تھا جس پر شرمندگی گڑی ہوئی تھی اور سب کا ذمہ دار صرف ایک ہی فرد تھا اور وہ تھا فرہاد۔ زینب نے ایک نفرت بھری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔

"مسز زینب فرہاد۔" وکیل نے اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے پکارا۔

"میری عدالت سے درخواست ہے مجھے صرف ام مریم کے نام سے ہی پکارا جائے اس کے علاوہ میری کوئی اور پہچان نہیں کچھ بھی پوچھے بغیر میں یہ واضح کردوں کہ مجھے کسی نے اغوا نہیں کیا تھا میں اپنی مرضی سے بقائمی ہوش و حواس وجاہت کے ساتھ گئی تھی۔ جس پر مجھے کوئی شرمندگی نہیں ہے۔"

"اس کے باوجود کہ آپ کسی شخص کے نکاح میں تھیں۔"

"یہ صرف نام کا نکاح تھا اس کے علاوہ میرا سامنے بیٹھے اس شخص سے کوئی تعلق نہیں جس کا گواہ یہ خود ہے۔" چہرے کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھی سخت تھا۔

"ویسے بھی وجاہت نے مجھے اکیلی جان کر صرف اپنے گھر میں پناہ دی تھی جس میں اس کا کوئی قصور نہیں محترم جج صاحب مجھے طلاق چاہیے کیوں کہ میں اپنی زندگی خود جینا چاہتی ہوں۔ سمجھوتے والی زندگی نے اب مجھے تھکا

رہا ہے۔"

زینب نے خلع کا کیس عدالت میں دائر کر دیا۔ وہ کسی کی کوئی بات سننے اور ماننے کو بالکل تیار نہیں تھی اس کے بیان کے بعد دوسری پیشی میں ہی عدالت نے وجاہت کو بری کر دیا۔

"جب تک آپ کے مقدمہ کا فیصلہ نہ ہو آپ اپنی والدہ کے ساتھ جا سکتی ہیں۔"

اسے رہائی کے بعد جیل چھوڑنا تھی جس کے لیے عدالت نے اس کی ماں کا گھر منتخب کیا۔

"لیکن مجھے ان کے ساتھ نہیں جانا۔" اس نے نہایت اطمینان سے انکار کر دیا۔

"کیوں۔"

جج نے حیرت سے زینب کی جانب دیکھا۔

"میں اپنا فیصلہ کسی بھی دباؤ کے بغیر چاہتی ہوں۔" اور جج اس کی بات فوراً" ہی سمجھ گیا۔

"ٹھیک ہے آپ کو اختیار ہے آپ جہاں چاہے رہ سکتی ہیں۔"

"میری عدالت سے درخواست ہے کہ مجھے دارالامان بھیج دیا جائے کیوں کہ میرا اس دنیا میں کوئی ایسا سہارا نہیں جہاں جا کر میں رہ سکوں مزید یہ کہ جب تک میں وہاں رہوں کسی کو بھی مجھ سے ملاقات نہ کرنے دی جائے کیوں کہ میں کسی سے نہیں ملنا چاہتی۔"

زینب کی درخواست قبول کر لی گئی اور اسے فوراً" ہی دارالامان بھیج دیا گیا ابھی وہ کمرہ عدالت سے باہر نہ نکلی تھی کہ اس کے راستے میں فرہاد آن کھڑا ہوا ایک عجیب بے بسی اس کے چہرے پر درج تھی۔

"میرے ساتھ چلو زینب تم جو کہو گی وہ ہی ہو گا' مگر خدا کے لیے دارالامان مت جاؤ کیوں کہ تم نہیں جانتی وہ کیسی جگہ ہے۔"

دارالامان سے منسوب کہانیوں نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔

"وہاں میرے علاوہ اور بھی بہت سی عورتیں رہتی ہیں جو کسی کی بہن اور بیٹیاں ہیں۔" فرہاد کو جواب دے کر وہ آگے بڑھ گئی۔

اور پھر ایک دن دارالامان میں اس سے ملنے سالار آیا جس کے چہرے پر زینب کے لیے دکھ آج بھی موجود تھا۔

"یہ میرا فون نمبر ہے زینب تمہیں جب بھی میری ضرورت ہو پکار لینا میں ہمیشہ تمہیں اپنے ساتھ کھڑا ملوں گا۔" جاتے جاتے وہ اسے اپنا کارڈ دے گیا۔

ایک دن اماں بھی آئیں جو اس کے لیے بے حد پریشان تھیں۔

"نہ اتنی ضد کر زینب مان جا ابھی بھی وقت ہے فرہاد بہت شرمندہ ہے۔ وہ اپنی ہر غلطی کا ازالہ کرنے کو تیار ہے اسے معاف کر دے۔ وہ تو سب جاننے کے باوجود حبیبہ کو بھی اپنانے کو تیار ہے۔" اماں کی بات سنتے ہی وہ چونکی۔

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں اماں کھل کر کہیں۔"

"دیکھ پتر اب تو سب کو پتا لگ گیا ہے کہ حبیبہ وجاہت کی بیٹی ہے تو جانے کب سے فائزہ کے گھر اس سے چھپ کر ملتی تھی۔"

اس کی ماں کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ زینب بالکل خاموش ہو گئی کیوں کہ وہ ایک جھوٹی بات کی وضاحت دے کر اسے سچا کرنے کے حق میں نہ تھی۔ اسے افسوس ہوا لوگوں نے بنا سوچے سمجھے کتنی من گھڑت باتیں یہاں وہاں پھیلا دی تھیں۔

"جب تک خلع کا فیصلہ ہونے کے بعد میں عدت پوری نہ کر لوں تم مجھ سے ملنے یہاں مت آنا۔"

ماں کے جاتے ہی اس نے وجاہت کو فون کر کے دارالامان آنے سے منع کر دیا۔

☼ ☼ ☼

وہ گھر آیا تو دروازے کے باہر کھڑی کالی گاڑی دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"کرم دین کون آیا ہے؟"

اندر داخل ہوتے ہی اس نے گیٹ پر کھڑے چوکیدار سے سوال کیا۔

"حبیبہ بی بی کے کوئی رشتہ دار ہیں جی ان سے ملنے آئے ہیں۔"

"حبیبہ کے رشتہ دار۔!"

کریم دین کے جواب نے اسے حیران کر دیا۔ وہ ڈرائنگ روم کا پردہ ہٹا کر جیسے ہی اندر داخل ہوا سامنے صوفہ پر موجود عمیر لغاری کو دیکھتے ہی ناگواری کی ایک لہر سی اس کے چہرے پر ابھر آئی جبکہ اس کے ساتھ موجود سادہ سی خاتون اسے پہلے بھی کہیں دیکھی ہوئی لگیں۔

"السلام علیکم!" نہ چاہتے ہوئے بھی اسے سلام کرنا پڑا۔ اس نے دیکھا حبیبہ کے علاوہ کمرے میں موجود دیگر افراد کچھ پریشان سے تھے۔

"وعلیکم السلام!" اس خاتون کا انداز خاصا مشفقانہ تھا۔

"تمہیں شاید یاد نہیں شاہ زین یہ میری آنٹی فائزہ ہیں جن سے تم پہلے بھی ایک بار مل چکے ہو۔"

"اوہ۔" حبیبہ کے یاد کراتے ہی وہ انہیں فوراً" پہچان گیا۔

"عمیر لغاری ان ہی کا بیٹا ہے۔"

یہ انکشاف اس لیے خاصا حیران کن تھا کیوں کہ حبیبہ نے ایسا ذکر اس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔

"بیٹھ جاؤ شاہ زین۔"

سالار نے اسے کھڑے دیکھ کر اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کچھ بے چین سا تھا' وجہ شاید یہ تھی کہ اسے عمیر لغاری کا اس طرح اپنے گھر آنا ذرا اچھا نہیں لگا تھا۔

"یہ لوگ حبیبہ کے رشتہ کے لیے آئے ہیں۔"

"واٹ..."

اپنے پاپا کی فراہم کردہ اطلاع سن کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ ویسے تو حبیبہ جب سے اس کی زندگی میں آئی تھی اس کا ہر دن ایک نئے انکشاف کا دن ہوتا' مگر ان میں یہ انکشاف بالکل ناقابل یقین تھا۔

"ہاں..."

پاپا نے آہستہ سے اس کا ہاتھ دبایا۔

"اور ان کی یہاں آمد حبیبہ کی منشا کے عین مطابق ہے کیوں کہ وہ خود بھی یہ ہی چاہتی ہے۔"

سالار نے اپنے بیٹے سے نگاہیں چراتے ہوئے مکمل وضاحت دی۔

"پھر میں آپ کے جواب کی منتظر رہوں گی۔"

وہ لوگ غالباً" کافی دیر سے آئے ہوئے تھے اسی لیے شاہ زین کے آتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ حبیبہ' پاپا اور ماما جب انہیں باہر گیٹ تک چھوڑ کر واپس آئے تو شاہ زین ابھی تک اسی حال میں اپنی جگہ کھڑا تھا۔

"یہ کیا مذاق ہے حبیبہ..."

حبیبہ کے اندر داخل ہوتے ہی وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور اس دن سے کر رہا ہوں جب میں نے پہلی بار تمہیں

دیکھا تھا پھر یہ لوگ درمیان میں کہاں سے آگئے۔"
اپنے مماپاپا کی وہاں موجودگی وہ قطعی نظرانداز کر بیٹھا۔
"ریلیکس شاہ زین میں تمہیں سب کچھ بتاتی ہوں۔"
اپنے بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے وہ اسے پرانی والی حبیبہ نظر آئی جو اس کے ساتھ لاہور گئی تھی بالکل اجنبی پر غرور اور اپنے خول میں بند حبیبہ۔
"میں جانتی ہوں تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔"
دھیمے دھیمے بات کرتے ہوئے وہ مسکرا رہی تھی۔
"اور یہ بات میں اس دن سے جانتی ہوں جس دن میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ اور آج بھی مجھے تمہاری محبت سے کوئی انکار نہیں، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ تم سالار انکل کے بیٹے نہیں ورنہ یقین جانو تمہاری محبت میری خوش قسمتی ہوتی۔ دکھ تو صرف یہ ہے کہ تمہارا تعلق اس خاندان سے ہے، جو میری ماں کی بربادی کا ذمہ دار تھا۔ تم میرے سگے چچا کے بیٹے ہو، تم ایشال کے سگے بھائی ہو اور میں کسی بھی صورت اس خاندان سے اپنا کوئی رشتہ باقی رکھنا نہیں چاہتی۔"
"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے حبیبہ جو بلاوجہ دوسروں کے پیچھے اپنی زندگی برباد کر رہی ہو۔ بھول جاؤ کہ ایشال اور اس کے خاندان سے میرا کوئی تعلق ہے۔ صرف یہ یاد رکھو کہ میں شاہ زین سالار ہوں جو تم سے اپنی جان سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے۔ نہ کرو حبیبہ میرے ساتھ ایسا، شاید تمہارے بغیر میں مر جاؤں گا۔"
حبیبہ کے چہرے پر نظر آنے والی ضد نے اسے گڑگڑانے پر مجبور کر دیا اس سمے سالار کو ایسا لگا جیسے اس کے سامنے زینب کھڑی ہو بالکل ایسی ہی ضدی اور خود سر۔ وہ جان چکا تھا کہ اب حبیبہ نے شاہ زین کی کوئی بات نہیں ماننی اپنے بیٹے کی سامنے نظر آنے والی شکست اس سے دیکھی نہ گئی اور وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

اس کا مقدمہ عدالت میں چل رہا تھا جب اسے ایک لرزہ خیز خبر نے ہلا دیا۔
فرہاد کو نیند کی حالت میں آنے والا ہارٹ اٹیک جان لیوا ثابت ہوا۔ فرہاد مر گیا۔ اس کی موت کی خبر نے زینب کو لرزا دیا وہ دارالامان کے کمرے میں تنہا پھوٹ پھوٹ کر رو دی جب اس سے ملنے اماں جی آگئیں۔ فرہاد کی بے وقت موت نے انہیں بھی دکھی کر دیا تھا۔
"میں کہتی تھی نا زینب وہ تجھ سے بہت محبت کرتا ہے، مگر کچھ مرد شاید اپنی محبت اپنے اندر چھپا کر رکھنا مردانگی سمجھتے ہیں۔ وہ بھی ان ہی مردوں میں سے تھا اسی لیے تیرے طلاق کے مطالبے نے اسے مار دیا۔"
"پتا نہیں اماں میرے مطالبے نے اسے مارا یا دنیا کی بے عزتی کے خوف نے اس کی جان لی۔" وہ ابھی بھی بے اعتبار تھی۔
"نہیں زینب میرا بھائی تم سے بہت محبت کرتا تھا۔"
اماں کے پیچھے روتی ہوئی یاسمین آپا بھی اندر آگئیں۔
"اپنے شوہر کی بے اعتنائی کا بدلہ میں نے ہمیشہ اسے تم سے متنفر کر کے لیا کیوں کہ وہ میری بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتا تھا۔
مگر میں نہ جانتی تھی کہ یہ سب کچھ ہو جائے گا میری چھوٹی چھوٹی غلطیوں نے تم دونوں کو برباد کر دیا خدا مجھے معاف کرے۔"

وہ اس وقت رو رہی تھیں جب ان کے رونے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔
طلاق یافتہ نہ سہی وہ بیوہ تو ہوئی تھی نا، اس حوالے سے عدت اس کا حق ٹھہری اپنی عدت کی مدت اس نے دارالامان میں ہی رہ کر پوری کرنے کا فیصلہ کیا وہیں اسے پتا چلا کہ اسفند بھائی ساری جائیداد بیچ کر کراچی چلے گئے۔ جاتے ہوئے فضہ بھابھی مریم کو بھی اپنے ساتھ لے گئیں جبکہ جازبہ کو صباحت وہیں لے گئی۔ اس طرح اس کا آشیانہ تنکوں کی طرح بکھر گیا۔ عدت ختم ہوتے ہی اس سے اماں ملنے آئیں تو بے حد کمزور اور بیمار سی لگیں۔
"احسان اپنے بیوی بچوں کے ساتھ سعودیہ جا رہا ہے، میں بھی اس کے ساتھ جا رہی ہوں۔"
آتے ہی اماں نے زینب کو اطلاع دی وہ خاموشی سے اپنا سر گھٹنوں پر دھرے بیٹھی تھی۔
"یہ میرے گھر کی چابیاں ہیں زینب ہم شاید اسی ہفتہ چلے جائیں تو جب چاہے یہاں سے اپنے گھر جا سکتی ہے۔"
چابیوں کا گچھا اس کے سامنے رکھ کر اماں واپس چلی گئیں۔ زینب نے گھٹنوں پر رکھا اپنا سر اٹھایا اسے ایک مدت چاہیے تھی یہ فیصلہ کرنے میں کہ اس سود و زیاں کے سفر میں اس نے کیا کھویا اور کیا پایا، شاید کچھ حاصل کیے بنا ہی اس نے سب کچھ کھو دیا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے معاف کرنا وجاہت میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔"
وجاہت کو سفید دوپٹے میں ملبوس وہ عورت زینب نہ لگی۔ یہ تو کوئی اور ہی عورت تھی جس کی صرف شکل زینب سے ملتی تھی۔
"میں جو ساری زندگی فرہاد کی محبت کے لیے ترستی رہی مرتے مرتے وہ مجھے اپنی محبت کا ایسا احساس دے گیا کہ شاید اب زندگی بھر کوئی محبت اس کی بخشی ہوئی محبت پر حاوی نہیں ہو سکتی۔ جانتے ہو۔۔۔ جس رات وہ اس دنیا سے گیا اس صبح وہ مجھ سے ملنے آیا تھا اس دن پہلی بار اس نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور یہ کہ میرے بنا وہ مر جائے گا، مگر میں نے اس کی کسی بات پر یقین نہ کیا۔ اس کی کہی ہوئی ہر بات کو جھٹلا دیا اس دن وہ میرے سامنے جھک گیا تھا، وہ رو رہا تھا وجاہت۔" زینب کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔
"ماں نے صحیح کہا تھا جھکنے والا درخت ٹوٹ جاتا ہے۔"
وجاہت کو لگا ابھی وہ صدمہ کے زیر اثر ہے کچھ دنوں میں خود ہی ٹھیک ہو جائے گی، مگر ایسا نہ ہوا۔
"اگر ہو سکے تو مجھے اور حبیبہ کو اماں کے گھر چھوڑ دو اس کی چابیاں میرے پاس ہیں اب ساری زندگی ہم دونوں ماں بیٹیوں نے وہاں ہی گزارنی ہے۔"
وجاہت نے اسے اس کی خواہش کے مطابق وہاں پہنچا دیا جہاں سے نکلتی زینب کو دیکھتے ہی وجاہت کسی زمانے میں اس کے عشق میں گرفتار ہوا تھا پھر جب تک وہ زندہ رہا اس نے اپنا فرض سمجھ کر زینب اور حبیبہ کا خیال رکھا۔
حبیبہ چھ سال کی تھی جب ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہونے والی وجاہت کی موت نے زینب کی زندگی کا یہ باب بھی ختم کر دیا۔ صرف ایک فائزہ تھی جس نے اپنے بھائی کی موت کے بعد بھی زینب سے کوئی تعلق نہ توڑا، زمانے کی مصروفیات نے اسے زینب سے دور ضرور کیا، مگر وہ اسے کبھی بھولی نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

عمیر کے پہلو میں بیٹھی حبیبہ نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی۔
"اللہ اسے ہمیشہ خوش رکھے۔"

اس کے اس فیصلے سے ناخوش مریم نے دل کی گہرائیوں سے بہن کے لیے دعا کی حالانکہ ان سب کی خواہش تھی کہ حبیبہ عمیر کو ٹھکرا کر شاہ زین سے شادی کرے مگر اس نے کسی کی بات نہ مانی اور سب کو اس کی ضد کے آگے ہار ماننی پڑی۔

ابھی بھی مریم کو سامنے دیکھتے ہی اس نے اشارے سے اپنے قریب بلایا مریم اسٹیج پر اس کے پاس جا کھڑی ہوئی جب حبیبہ نے اپنے پاس رکھا چھوٹا سا شاپر اٹھا کر اس کی جانب بڑھایا۔

"یہ کیا ہے؟"

مریم نے حیرت سے دریافت کیا اور حبیبہ کے جواب دینے سے قبل ہی شاپر کھول کر اندر جھانکا جہاں ایک چھوٹی سی کتاب رکھی تھی۔ مریم نے اسے باہر نکال لیا کتاب کو پلٹ کر اس کے ٹائٹل پر نظر ڈالی۔

"اک ساگر ہے زندگی" "مصنفہ حبیبہ شاہ" وہ اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ وجاہت کی نسبت استعمال کرتی۔

"تم لکھتی بھی ہو۔" مریم کو خوش گوار حیرت ہوئی۔

"نہیں۔"

اس نے اطمینان سے اپنی گردن نفی کے انداز میں ہلائی اور کتاب کا پہلا صفحہ پلٹا۔ "ایک سچی کہانی جس کا مرکزی کردار کوئی اور نہیں بلکہ میری ماں ہے اور اس میں لکھا ہر لفظ ان کا اپنا لفظ ہے جو ان کے ہر دکھ کی عکاسی کر رہا ہے۔" مریم اتنا پڑھتے ہی ہر بات سمجھ گئی۔

"اماں کے باکس میں ان کی فوٹو اسٹیٹ حالت میں ایک کہانی موجود تھی اور مجھ سے انہوں نے التماس کی تھی کہ میں یہ سب کچھ چھپوا دوں تاکہ دنیا کو حقیقت کا علم ہو سکے۔"

حبیبہ نے بھیگی آنکھوں سے مریم پر ہر بات واضح کی۔

اور پھر عمیر کی کوششوں سے ہم اسے کتابی شکل دینے میں کامیاب ہو گئے۔ اب یہ کتاب آپ کے اور جازبیہ باجی کے لیے ہے ٹائم نکال کر اسے پوری پڑھیے گا پھر آپ کو علم ہو گا میں نے شاہ زین کو کیوں ٹھکرایا۔" مریم نے دیکھا ماں کی محبت کا نور حبیبہ کے چہرے پر بکھرا ہوا ہے وہ شرمندہ ہو گئی۔

جانے اس کہانی میں کس کا قصور تھا تیرا یا میرا
سارا رونا صرف انا کا تھا
تو بھی انا پرست تھا
میں بھی انا کی ماری تھی
اور اس انا کے کھیل میں ہم دونوں نے بازی ہاری تھی

کتاب کے دوسرے صفحہ پر موجود ان الفاظ کو پڑھتے ہی مریم کی آنکھیں بھی پانی سے بھر گئیں اس نے کتاب بند کر کے واپس رکھ دی اسے پڑھے بنا بھی وہ جان سکتی تھی کہ اس کی ماں کی زندگی کیسی تھی۔

٭٭ ٭٭

صدف آصف

امر جیسی عیدی

ناولٹ

"نانی جی۔۔۔ یہاں تھوڑا سنبھل کر وضو کیا کریں۔ ایسے پھسل نہ جائیں۔" حرمت کی کئی دفعہ کی گئی پیش گوئی کو خاطر میں نہ لانے کا انجام یہ ہوا کہ احمدی بیگم گرتے گرتے بچیں' شکر ہے کہ ایک ہاتھ سے دروازہ پکڑا ہوا تھا' ورنہ اس عمر میں کوئی ہڈی چٹخ جاتی تو بہت برا ہوتا۔

"توبہ۔۔۔ یہ۔۔۔ فہمیدہ کی لڑکی۔۔۔ اس کی زبان تو بڑی کالی ہے۔" احمدی بیگم نے پاؤں میں اٹھنے والی ٹیسوں پر جلبلا کر شکایت لگائی۔

"اماں۔۔۔ کیا بول رہی ہیں؟" ناصرہ نے ماں کو تھام کر بستر پر لٹاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"ولی۔۔۔ میں نے کون سی غلط بات کی؟" احمدی بیگم نے کمی کمی کرتی حرمت کو گھورا۔۔۔ عفان نے اسے تنبیہہ کرنی چاہی' مگر وہ متوجہ ہی نہیں ہوئی۔

"نانی۔۔۔ جی۔۔۔ آپ کو پہلے بھی حرمت نے بتایا کہ ممی کے واش روم میں احتیاط سے جایا کریں۔ مگر آپ ہمیشہ بیسن میں پاؤں اٹھا کر دھوتی ہیں' اسی کا یہ انجام ہے۔" عفان نے نانی کے انگوٹھے کا مساج کرتے ہوئے دھیرے سے اس کی سائیڈ لی۔

"ہاں تو کیا ہو گیا۔۔۔ یہ ہے ہی کالی زبان کی۔۔۔ جو بات منہ سے نکالتی ہے' جھٹ سے پوری ہو جاتی ہے۔" احمدی بیگم نے ہاتھ نچا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روکا۔

"ہیں۔۔۔ ایں۔۔۔" حرمت اپنی گلابی زبان نکال کر چیک کرنے لگی۔ عفان کی ہنسی نکل گئی تو حرمت کو برا لگا' اس نے بھنویں اچکا کر عفان کو وارن کیا۔

"نانی۔۔۔ اب دو دن آرام کرنا ہے۔" عفان نے دوا مل کر ایک پٹی باندھ دی۔

"تائی اماں۔۔۔ کل میرا ٹیسٹ ہے۔۔۔ مجھے پڑھنا ہے میں جاؤں؟" حرمت نے احمدی بیگم کے الزامات سے بے زار ہو کر جلدی سے دودھ کا گلاس ان کے سرہانے رکھا اور باہر نکل گئی۔ احمدی بیگم نے ٹیڑھا منہ بنا کر اس کی نقل اتاری۔

"نانی۔۔۔ بھی۔۔۔ بچوں کی طرح حرمت سے لگی رہتی ہیں اور وہ میڈم بھی کسی سے کم نہیں۔" عفان کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"اماں۔۔۔ دراصل یہاں آپ کے داماد نے نئے ٹائلز لگوائے ہیں' جس کی وجہ سے بہت پھسلن ہے' حرمت نے اسی لیے آپ کو کئی بار ہوشیار کیا' ورنہ اور کوئی بات نہیں۔" ناصرہ نے سہولت سے ماں کو سمجھانا چاہا' مگر انہوں نے ناراضی سے اپنا رخ موڑ لیا۔

"ممی۔۔۔ یہ گولی نانی کو کھلا دیجیے گا۔ شام تک درد ختم ہو جائے گا۔" عفان نے پہلے نانی کو بستر پر سیدھا لٹایا' پھر ماں کو ہدایت دی۔ پاؤں میں درد کی وجہ سے ان کا خود سے ہلنا جلنا مشکل ہو رہا تھا۔ عفان لنچ کے لیے آیا ہوا تھا' اسے آفس واپس جانا تھا' وہ ہاتھ ہلاتا باہر نکل گیا۔

"یہ شازیہ نگوڑی کہاں رہ گئی۔ اتنا خیال نہیں کہ دو گھڑی نانی کے پاس بیٹھ جائے۔ آج کل کے بچوں کا خون سفید ہو گیا ہے۔" احمدی بیگم جو پیر میں لگنے والی چوٹ کی وجہ سے خاصی زود رنج ہو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد منہ موڑے موڑے بولیں۔

"اماں۔۔۔ آپ آرام کریں میں۔۔۔ شازیہ کو بھیجتی ہوں۔" ناصرہ نے خالی گلاس اٹھایا اور ماں کو تسلی دے کر باہر نکل گئیں۔

☆ ☆ ☆

"حرمت۔۔۔ ایسا کرو۔۔۔ یہ سارے کپڑے۔۔۔ تم لے لو۔۔۔ اب گرمیاں شروع ہو گئی ہیں۔ مجھے تو لان کے نئے سوٹ بنوانے ہیں۔" شازیہ نے آدھی وارڈ روب خالی کی اور شان بے نیازی سے کہا۔

"تھینک یو۔۔۔ آپی۔۔۔" حرمت نے بڑی دقتوں سے منہ کھولا۔ اتنے ڈھیر سارے اسٹائلش کپڑے تھام کر بھی اس کا دل خوش نہیں ہوا۔ پتا نہیں کیوں اسے عام لڑکیوں کی طرح کپڑے' زیور کا کریز نہ تھا۔ وہ سارا دھیان پڑھائی پر لگاتی تاکہ جلد از جلد اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکے۔

"تمہیں۔۔۔ کتنی بار منع کیا ہے کہ مجھے آپی نہ بولا کرو۔۔۔ بھلا میں کہاں سے تمہاری آپی ہو گئی۔ ہم دونوں میں بہت زیادہ فرق تھوڑی ہے۔ سیدھے سیدھے نام لے لیا کرو۔" شازیہ نے مبالغہ آرائی سے کام لیا۔ وہ اپنی عمر کے حوالے سے بہت کانشس رہتی تھی۔

"نہ بابا۔۔۔ نہ۔۔۔ مجھ سے ایسی گستاخی نہیں ہو گی۔ عفان بھائی مجھ سے چھ سال بڑے ہیں۔۔۔ تائی اماں بتاتی ہیں کہ آپ ان سے ایک سال چھوٹی ہیں۔ یوں ہمارے درمیان پورے پانچ سالوں کا فرق ہے۔" حرمت نے پانچوں انگلیاں لہرا کر اسے دکھاتے ہوئے صاف جواب دیا۔ شازیہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اگر اس کے حرمت سے بہت سارے کام نکلتے نہیں ہوتے تو وہ اسے اتنا برداشت بھی نہیں کرتی' فی الحال بگاڑ پیدا کرنے میں اپنا نقصان ہو جاتا۔

"اچھا تم سے ایک کام تھا۔" شازیہ نے ملتجانہ انداز میں کہا۔

"سچ آپی۔۔۔ آج تو۔۔۔ بالکل ٹائم نہیں ہے۔" حرمت نے سکون سے جواب دیا۔ وہ جانتی تھی کہ شازیہ بہت ضدی ہے۔ اب جو سوچ لیا ہے وہ کر کے رہے گی۔

"کوئی مسئلہ نہیں۔۔۔ تھوڑی دیر کا کام ہے' تم فری ہو کر اوپر آجانا اور میرے چہرے کا مساج کر دینا۔ اسکن بہت رف ہو رہی ہے۔ اب اتنی گرمی میں میرا پارلر جانے کا بالکل موڈ نہیں بن رہا ہے۔" شازیہ نے بستر پر ریلیکس ہو کر لیٹنے کے بعد حکم دیا۔ حرمت نے اسے دانت کچکچا کر دیکھا۔

"شازیہ آپی کی بات نہ ماننے پر تائی اماں اور نانی کا کئی دنوں تک سوجا ہوا منہ دیکھنے سے اچھا' ان کا ہی منہ سجا دیا جائے۔" حرمت نے دل میں سوچا اور مسکرائی۔

"اوکے۔۔۔ میں یہ کام کر دوں گی۔۔۔ مگر آپ ذرا نانی کے پاس جا کر ان کے پاؤں کا مساج کر دیں۔ انہیں کافی درد ہو رہا ہے۔" حرمت نے فوراً" ہی بدلہ لینے کی ٹھانی۔

"حرمت۔۔۔ پلیز۔۔۔ تم کر دو۔۔۔ سچ نیند سے آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔" شازیہ نے کاہلی سے کمر کے نیچے تکیہ ٹکایا۔

"میں۔۔۔ تو کر دوں۔۔۔ پر عفان بھائی نے ہی مجھے آپ کے پاس یہ حکم دے کر بھیجا تھا۔ وہ شاید نانی کے پاس آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" حرمت نے سوچنے کی ایکٹنگ کی۔ عفان کے نام پر شازیہ ایک دم الرٹ ہو گئی۔

"عفان نے مجھ سے کہا تھا۔" وہ تیزی سے بستر سے نیچے اتری۔

"تو کیا میں جاؤں نانی کے مساج کرنے؟" حرمت نے بکا منہ بنا کر پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ میں جا رہی ہوں نا۔" وہ بال سنوارتی کمرے سے نکلی تو حرمت کی باچھیں چر گئیں' کپڑوں کا ڈھیر اٹھا کر پچھلی طرف واقع اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

"وہ ناصرہ کے دیور کی لڑکی۔۔۔ کیا نام ہے اس کا؟" احمدی بیگم نے نواسی سے بات کرتے ہوئے ذہن پر جان بوجھ کر زور دیا۔

"اف۔۔۔ نانی۔۔۔ اس کا نام۔۔۔ حرمت ہے۔" شازیہ کو ان کی ہر وقت کی نصیحتوں سے الجھن ہوتی۔

"ہاں وہ ہی نگوڑی حرمت نے اپنی سلیقہ مندی دکھاتے ہوئے داماد جی کی نظروں میں جگہ بنالی ہے اور۔۔۔ ایک تم ہو۔۔۔ کھانے اور سونے کے علاوہ کچھ آتا ہی نہیں۔" احمدی بیگم نے نواسی کو کس کر ایک دھموکا دیا۔

"نانی۔۔۔ کیا کروں؟ مجھ سے نہیں ہوتے یہ کام وام۔۔۔" شازیہ جو مرے ہاتھوں سے ان کے پاؤں دبا رہی تھی بھنا اٹھی۔

"ارے۔۔۔ بیٹا۔۔۔ لڑکی کا "چام نہیں کام پیارا ہوتا ہے۔" عفان سیدھا سادھا لڑکا ہے۔ اس کے سامنے تھوڑا سا ہاتھ پیر ہلا لیا کرو۔ وہ خوش ہو جائے گا۔" نانی نے نواسی کو گر سکھانا چاہا۔

"یعنی اب عفان سے شادی کرنے کے لیے کیا مجھے نوکرانی بننا پڑے گا؟" وہ منہ بسورے رہی۔

"بیٹا اس میں نوکرانی بننے والی کیا بات ہے؟ عورت کو اپنے گھر کا کام کرنا ہی پڑتا ہے۔ اب دیکھو ناصرہ تمہاری سگی خالا ہے، مگر ساس بننے کے بعد وہ بھی تمہیں بھانجی نہیں، بہو سمجھے گی۔ اس لیے ابھی سے خود میں سدھار پیدا کرلو۔ ہم نہیں چاہتے کہ بعد میں تمہیں یا ہماری بچی کو کوئی تکلیف ہو اور رشتوں میں دراڑیں پڑ جائیں۔" احمدی بیگم نے شازیہ کو آنے والے وقت کے لیے تیار کیا۔

"اچھا نانی! کوشش کروں گی۔" شازیہ نے سر ہلایا، صاف لگ رہا تھا کہ بات کو ٹالا جارہا ہے۔

احمدی بیگم کی دو ہی بیٹیاں تھیں۔ ناصرہ اور آئشہ وہ ایک ایک مہینہ دونوں گھروں میں گزارتیں، وہ جب بھی بڑی والی ناصرہ کی طرف آتیں تو چھوٹی کی شازیہ کو بھی ساتھ لے آتیں۔ جو اوپر ان کے کمرے میں ساتھ ہی ٹھہرتی۔ احمدی بیگم کی شدید خواہش تھی کہ نواسے اور نواسی کی شادی ہوجائے، مگر وہ ابھی تک کامیابی حاصل نہیں کرپائیں۔ الٹا بیٹی کے گھر میں اس کی دیورانی فہمیدہ اور حرمت کا اتنا عمل دخل دیکھ کر وہ کلستی رہتیں۔

"چاہے کچھ بھی ہوجائے، میں شازیہ کو ہی عفان کی دلہن بناؤں گی۔" انہوں نے برابر میں لیٹی ہوئی شازیہ کے ماتھے پر سے بال ہٹاتے ہوئے سوچا۔

"انسان کی زندگی کا کیا بھروسا۔ جنے۔ کتنی لمبی عمر ہے۔ ہمیں اپنا بڑھاپا خراب تھوڑی کرنا ہے۔" انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے پاندان کو اپنی طرف گھسیٹا۔ احمدی بیگم کا شوہر کے انتقال کے بعد اب ان دو گھروں میں ہی ٹھکانا تھا۔ وہ ڈرتی تھیں۔ عفان کی دلہن غیروں سے آگئی تو ان کا یہاں رہنا مشکل ہوجائے گا۔ اسی لیے شازیہ اور عفان کی شادی میں ہی انہیں اپنی بقا نظر آتی۔

انسانی سوچ بھی عجیب ہے۔ ان باتوں کا بھی فیصلہ کرنے کی سعی کرتی ہے جس پر اسے اختیار ہی نہیں ہوتا۔ احمدی بیگم نے بھی کچھ ایسا ہی کرنے کا سوچا۔

☼ ☼ ☼

"حرمت۔ آرام سے۔ مساج کررہی ہو یا میرے چہرے کا بھرکس نکال رہی ہو۔" اس نے مساج کے نام پر تیز تیز ہاتھوں سے ٹکا ٹکا کر شازیہ کے گالوں پر ایسے تھپڑ مارے کہ وہ بلبلا اٹھی۔

"آپی۔ یہ نئی فیس تھراپی آئی ہے۔ اس سے تھوڑا درد تو ہوگا، مگر اسکن فریش ہوجائے گی۔" حرمت نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے سنجیدگی اختیار کی۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ ایسی کوئی تھراپی میں نے تو نہیں سنی۔ اسکن اتنی نازک چیز ہے۔ ایسا تشدد برداشت نہیں کرسکتی۔" شازیہ نے مڑ کر اسے دیکھا جو آرام دہ کرسی کے پیچھے کھڑے ہو کر اس کی امپورٹڈ موئسچرائزنگ کریم بے دردی سے اپنے ہاتھوں پر مل رہی تھی۔

"آپی جی۔ میں نے کل ہی ایک مارننگ شو میں دیکھا تھا۔ اس طرح کرنے سے چہرہ کھلے گلاب کی طرح ہوجاتا ہے۔" وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔

"نہیں۔ بھئی میں ایسے مساج سے باز آئی۔" شازیہ نے منع کردیا۔ یوں پانچ منٹ میں ہی اس کی جان چھوٹ گئی۔

"آپ کو میری بات پہ یقین نہیں ہے تو ایک منٹ ادھر آیئے۔" حرمت نے اس کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا اور زبردستی آئینے کے سامنے لے جاکر کھڑا کردیا۔

"کہہ تو سچ ہی رہی ہے۔" شازیہ کی گوری رنگت تھپڑوں کے مسلسل مساج کے بعد گلابی ہوگئی تھی۔ اس نے نرمی سے حرمت کے کاندھے کو تھپکا۔

☼ ☼ ☼

"عفان ولا۔" تیمور علی نے اپنے لاڈلے بیٹے "عفان تیمور" کے نام پر بنوایا، جتنا بڑا یہ گھر تھا۔ اس سے بڑا تیمور علی کا دل تھا۔ وہ سب سے محبت کرنے والے انسان تھے۔ ان کی نصف بہتر ناصرہ کی خوبیوں کا بھی کمال تھا کہ وہ سارے کنبے کو ساتھ لے کر چل رہی تھیں۔ ایک بیٹا، عفان اور بیٹی زویا تھی، جس کی شادی ان کے دوست کے بیٹے سے ہوچکی تھی۔ وہ رخصت ہو کر دوسرے شہر چلی گئی تھی۔ سال دو سال میں چکر لگاتی ویسے بھی وہ اپنے گھر میں خوش و خرم زندگی گزار رہی تھی۔

فہمیدہ جنہیں تیمور علی نے بڑی عزت و احترام کے ساتھ یہاں لاکر رکھا۔ ان کے چھوٹے بھائی شعور علی کی بیوہ تھیں۔ تیمور علی کی جان اپنے چھوٹے بھائی کی بیٹی حرمت میں تھی۔ وہ بیٹے کی شادی بھتیجی سے کرنا چاہتے تھے۔ عفان کے دل میں شروع سے حرمت سمائی ہوئی تھی۔ زویا کو بھی اپنی اس پیاری سی کزن سے بہت لگاؤ تھا، مگر ان کی نانی کی وجہ سے معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ اس چکر میں ناصرہ گھن چکر بنی ہوئی تھیں۔ کہتے ہیں "گھٹنا پیٹ کی طرف ہی جھکتا ہے۔" ناصرہ کا ووٹ بھی اپنی بھانجی کی طرف ہی تھا۔

☼ ☼ ☼

"اگر نانی کی زبان اور ان کے ہاتھوں میں چلنے والی قینچی کی تیزی کا موازنہ کیا جائے تو بہت مشکل ہوجائے۔ کیوں وہ دونوں سے بیک وقت کام لینے کی عادی ہیں۔" حرمت کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی احمدی بیگم کی تیز آواز کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے مسکرا کر سوچا۔ حرمت نے بیگ ٹیبل پر رکھا اور بڑے کمرے میں داخل ہوئی۔ جہاں وہ تخت پر بچھانے والی سفید چاندنی کو کاٹتے ہوئے دنیا زمانے کے قصے سنائے چلی جارہی تھیں۔ فہمیدہ اور ناصرہ بھی وہیں پر بیٹھی سر ہلائے جارہی تھیں۔

"اے ہے لڑکی۔ میں پوچھتی ہوں۔ پوری دوپہر گزار کر اب کہاں سے آرہی ہو؟" حرمت کو دیکھتے ہی ان کو کچھ ہوا۔ فوراً" ٹوکا۔ ان کے انداز تخاطب پر وہ کرتے کرتے بچی۔

"نانی۔ آج میرا اکنامکس کا ٹیسٹ تھا۔ اسی لیے دیر ہوگئی۔" حرمت نے نہ چاہتے ہوئے بھی صفائی دی۔

"اوہ۔ ہو۔ اماں۔ کالج میں دیر ہوجاتی ہے۔ ویسے بھی ابھی صرف ڈھائی تو بجے ہیں۔" ناصرہ نے ماں کو مزید کچھ کہنے سے روکا۔ حرمت نے وہاں سے اٹھنے ہی میں عافیت جانی، اس کا نیند سے برا حال ہورہا تھا۔ وہ پچھلے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"میں کہتی ہوں فہمیدہ لڑکی کو اور کتنا پڑھاؤ گی۔ بس کرو۔ اور گھر میں بٹھاؤ۔ میری شازیہ کو دیکھا ہے کتنی گوری چٹی ہے۔ بی اے کرتے ہی گھر بٹھالیا تھا۔ ایک تمہاری حرمت ہے پڑھ پڑھ کر کالی ہوتی جارہی ہے۔" انہوں نے بلاوجہ اس کے سنہری رنگ کو کالا بنا ڈالا۔

"بس خالا۔ اسے پڑھائی کا شوق ہے۔" فہمیدہ نے کنی کترائی۔ وہ جٹھانی کی وجہ سے بڑی بی کا کافی لحاظ کرتی آرہی تھیں۔

"اے لو۔ یہ کوئی بات ہوئی۔ شازیہ سے بڑی نازیہ کی تو ہم نے میٹرک کرتے ہی شادی کروادی تھی۔" احمدی بیگم کی لن ترانی جاری تھی۔ فہمیدہ کیا جواب دیتیں کہ اتنی جلدی شادی کرنے کی وجہ سے نازیہ بے چاری مشکلات کا شکار ہے، شوہر کو پڑھی لکھی سوسائٹی میں موو کرنے والی بیوی کی خواہش ہے۔ جبکہ نازیہ کی جھجک ختم ہی نہیں ہوتی۔ اب وہ میکے آکر ماں سے لڑتی ہے کہ میری تعلیم مکمل ہونے کا تو انتظار کیا ہوتا۔

"اماں۔ چھوڑیں۔" ناصرہ نے اشارے کیے، مگر وہ سنی ان سنی کیے ٹکا ٹکا کر فہمیدہ کو سنانے میں لگی ہوئی تھیں۔

"لڑکیوں کے یوں واہی تباہی پھرنے سے شکلوں پر پھٹکار برسنے لگتی ہے۔" احمدی بیگم نے چاندنی کے کنارے کی ترپائی کرتے ہوئے مسخر اڑایا۔

"بس خالا۔ ایک ہی بچی ہے، چاہتی ہوں خوب پڑھ لکھ جائے۔ اس کے دل میں کوئی حسرت نہ رہے۔" فہمیدہ نے نرمی سے جواب دیا۔ ماں کی باتوں پر ناصرہ پہلو بدلنے کے علاوہ کچھ نہیں کرپائیں۔

"زمانہ کتنا خراب ہوگیا ہے؟ ہمیں کون سا لڑکیوں سے نوکری کرانی ہے۔ جلدی سے کوئی مناسب لڑکا دیکھ کر ہاتھ پیلے کردو۔" احمدی بیگم نے چاندی کو پلیٹ کر ایک جانب رکھا اور فہمیدہ کے چہرے کو چشمے میں سے بغور جانچا۔

ممانی نے وہ بات کر ہی دی، جس کے لیے اتنی لمبی تمہید باندھی گئی۔ حرمت جو گرمی سے پریشان ہو کر ٹھنڈے پانی کی بوتل لینے آئی تھی۔ "مسکرا کر سوچنے لگی۔

"خالا... مجھے کیا سوچنا۔ حرمت کی ماں یہ بھابھی اور باپ، تیمور بھائی ہیں۔ وہ جو اچھا سمجھیں گے وہ ہی کریں گے۔" فہمیدہ نے بھی سادگی سے کہا تو احمدی بیگم کے کان کھڑے ہوگئے۔ ناصرہ اس بحث سے پریشان ہو کر ایک دم تخت سے اٹھیں۔

"تائی اماں دیکھ کر کہیں گر نہ جائیں۔" ابھی حرمت کے منہ میں الفاظ ہی تھے کہ ناصرہ چاروں شانے چت پڑی ہائے ہائے کرنے لگیں۔

"ارے... ناس پٹی... کیسی کالی زبان والی ہے۔ کتنی بار پہلے بھی ٹوکا... آخر میری بچی کو گرا کر دم لیا۔" احمدی بیگم نے ناصرہ کو تخت پر لٹاتے ہوئے حرمت کو ایک دھموکا دیا۔

"اس میں میرا کیا قصور... تائی اماں اتنی گھسی ہوئی پرانی چپل پہنتی ہیں... کب سے بدلنے کا کہہ رہی ہوں۔ پانی پڑا ہوا تھا۔ اب سلپ تو ہونا ہی تھا۔" حرمت نے بلبلا کر صفائی دی، مگر وہ ماننے کو تیار ہی نہیں ہوئیں۔ اسے کچا چبا جانے والی نگاہوں سے تکتی رہیں۔

☼ ☼ ☼

"بس... عید کے بعد کی کوئی تاریخ طے کرلو۔" احمدی بیگم نے چھالیہ کترتے ہوئے بیٹی پر زور دیا۔

"زویا... کے عید پر آنے کا ہو رہا ہے۔ وہ بھی بھائی کی شادی میں شرکت کرنے کی خواہش مند ہے۔ بس اس کی جانب سے کوئی اطلاع آجائے تو... سوچتے ہیں۔" ناصرہ نے آم کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

"میں آئشہ کو تیاری کا کہہ دوں؟" احمدی بیگم نے کچھ لمحہ سوچنے کے بعد بیٹی سے پوچھا۔

"اماں... عفان نہیں مانتا۔ اسے شازیہ پسند نہیں ہے۔" ناصرہ نے دھیرے سے کہا۔

"ہاں تو... جب گھر میں ایسی ادائیں دکھانے والی موجود ہوں تو اسے میری سیدھی سادی بچی کیوں پسند آئے گی؟" احمدی بیگم نے سروتہ فضا میں لہراتے ہوئے بلاوجہ کی تہمت دھری۔

"اماں... دھیرے... کہیں آپ کے داماد کے کانوں تک یہ باتیں پہنچ گئیں، تو اس عمر میں مجھے بھی چلتا کردیں گے۔" ناصرہ نے گھبرا کر ماں کا ہاتھ دبایا۔

"بی بی... ان سے تم ڈرو۔ مگر میں تو خدا لگتی کہوں گی۔ ایسی تیز کالی زبان والی لڑکی کو بہو بنا کر تم تاعمر سر پر ہاتھ رکھ کر روتی پھرو گی۔" احمدی بیگم نے پان پر چونا پھیرا۔ حرمت جو تائی سے کھانے کا پوچھنے آئی تھی۔ اپنا نام سن کر ایک دم آڑ میں ہوگئی۔ ساری باتیں سنتے ہوئے اسے خود سے شرمندگی ہونے لگی۔ اپنا وجود دنیا میں سب سے بے کار شے لگا۔

"اماں کیا کروں... روؤں... یا ہنسوؤں؟ میں تو عفان کے ہاتھوں... مجبور ہوگئی ہوں۔ اسے آپ کے داماد کی بھی شہ حاصل ہے۔ ورنہ مجھے بھی شازیہ سے زیادہ کوئی پیارا نہیں۔" ناصرہ نے آخر میں ماں کو مسکا لگایا۔

"اے... کیا نانی کا کوئی حق نہیں ہوتا، میں بھی دیکھتی ہوں تیمور علی کیسے نہیں مانتے؟" احمدی بیگم پان دانتوں تلے دبا کر بڑبڑاتی رہیں۔

"یا اللہ... نہیں... ان دونوں کی ان بن ہوگئی تو اماں کا یہاں رہنا مشکل ہوجائے گا۔ مجھے ہی کوئی تدبیر کرنی پڑے گی۔" ناصرہ نے سر کو تھام کر سوچا۔

"بیٹی سن لو اگر حرمت تمہاری بہو بنی تو میں ہمیشہ کے لیے چھوٹی کے گھر چلی جاؤں گی۔" احمدی بیگم نے دھمکی دی۔ ناصرہ پریشان ہو اٹھیں، حرمت کو نانی کے لہجے میں اپنے لیے حقارت اچھی نہیں لگی۔

"پاپا... کاش آج آپ زندہ ہوتے تو... میں ایسے ذلیل نہیں ہو رہی ہوتی۔" حرمت باپ کو یاد کرتی وہاں سے بھاگی۔

"حرمت... یہ میں کیا سن رہا ہوں؟" وہ رنجیدہ سا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"کیا... میں سمجھی نہیں؟" حرمت جان کر انجان بنی۔ اس گھڑی کا سامنا کرنے کے لیے وہ خود کو دو دن سے تیار کر رہی تھی۔ اس کے باوجود عفان کی جانب دیکھنا قیامت کی گھڑی لگی۔

"تم نے شادی سے انکار کردیا ہے؟" عفان الجھا ہوا تھا۔

"شادی کے لیے نہیں جناب... آپ سے شادی کرنے کے لیے انکار کیا ہے۔" حرمت نے شوخ ہونے کی بھونڈی سی کوشش کی، مگر گلے میں پھندا سا لگا۔

"تمہیں پتا ہے کہ میں نے ممی کو کتنی مشکل سے اس بات کے لیے منایا تھا... اور تم نے ابا جان کے پوچھنے پر صاف انکار کردیا۔" عفان کا بس چلتا تو وہ اس وقت حرمت کی اور اپنی جان ایک کردیتا۔

"تم میرے لیے کیا ہو... اگر جان جاتیں تو کبھی انکار نہ کرتیں۔" عفان کی آنکھیں بول اٹھیں، حرمت نے منہ پھیر کر خود پر قابو پایا۔

"آپ میرے لیے کیا ہیں۔ اگر جان جاتے تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ مگر اس گھر میں اور بھی لوگ رہتے تھے۔ جن کا حکم ٹالنا میرے بس کی بات نہیں۔" اس کی آنکھوں کی زبان، مگر وہ پڑھ نہیں پایا۔

"میں نے جو بھی کیا بہت سوچ سمجھ کر کیا۔ آپ تائی اماں کے فیصلے کو مان جائیں۔ شازیہ آپی بہت اچھی ہیں۔" حرمت نے پیٹھ موڑ کر بڑی مشکل سے یہ الفاظ ادا کیے۔

"ایسے مشورے... اپنے پاس ہی رکھو... تم نے مجھے مارنا تھا۔ مار دیا... بس... اب خوشیاں مناؤ۔" عفان نے غصے میں اس کا رخ اپنی جانب پھیرنا چاہا، مگر حرمت ہاتھ چھڑاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ وہ غصے میں دروازے کو ٹھوکر مارتا باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"میڈم... اس سے خوب صورت اور قیمتی ویڈنگ ڈریس ہماری شاپ پر تو نہیں۔" سفینہ نے منہ چڑھا کر کہا اور بھاری موو رنگ کے عروسی لباس کو نگاہوں سے پرکھا۔ "بعض کسٹمر تو جان کو آجاتے ہیں۔" وہ اس بوتیک کی کافی پرانی ڈیزائنر تھی۔ اس نے شازیہ کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر سوچا۔

"خالا... میں نے آپ کو ایک ڈیزائنر کا بتایا تھا نا جہاں سے میری پھوپھی کی بیٹی کا ویڈنگ ڈریس بنوایا گیا تھا۔ آپ وہاں کیوں نہیں چل رہیں۔" شازیہ نے بچوں کی طرح پیر پٹخا۔ ناصرہ کو ایئر کنڈیشن کی خنکی میں پسینہ آگیا۔ شازیہ جہاں سے شادی اور ولیمہ کا لباس خریدنا چاہتی تھی۔ اس کی قیمت لاکھوں میں تھی۔ بھانجی کی فرمائش پوری کرنے کے بعد تیمور علی نے تو انہیں کچا چبا جانا تھا۔

"بیٹا... خالا کو تنگ نہ کرو... ابھی یہاں سے ہی ڈریس لے لو... شادی کے بعد ساری من مانیاں پوری کرتی رہنا۔" آئشہ نے ناصرہ کی مشکل آسان کرتے ہوئے بیٹی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کیے۔ تو وہ نیم رضامند ہوگئی۔

"مجھے... اصل میں کچھ یونیک سا ڈریس چاہیے۔" شازیہ نے شاپ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر کہا۔

"میں سمجھ گئی... پچھلے دنوں ہمارے پرانے کسٹمر جو مشہور صنعت کار ہیں انہوں نے اپنی بیٹی کے لیے ایک ڈریس ڈیزائن کروایا تھا۔ جس کا چرچا کافی عرصے تک اخبارات میں رہا۔ ہمارے پاس اس کی فرسٹ کاپی ہے۔ یقیناً" آپ کو پسند آئے گی۔" سفینہ نے اپنی چرب زبانی کا کمال دکھاتے ہوئے بے بی پنک کلر کی میکسی ان کے سامنے پھیلائی۔ جس پر سلور نگوں سے بہت باریک کام کیا ہوا تھا۔ ان سب کی آنکھیں لمحے بھر کو خیرہ ہوئیں، پھر ایک دم ستائش ابھری۔

"یہ ڈریس ولیمہ کے لیے ٹھیک رہے گا۔" شازیہ کے منہ سے نکلنے والے جملے سے دونوں بہنوں کے دل پر ٹھنڈ پڑ گئی۔

"ہم اپنے کلائنٹ کو ہر طرح سے مطمئن کرنا جانتے ہیں۔ آپ کو ہمارے یہاں کے ڈیزائن کہیں اور نہیں ملیں گے۔" سفینہ نے بہت خوب صورت شرارہ سوٹ پہنی ڈمی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ تو شازیہ اس لباس کو قریب سے دیکھنے لگی۔ کئی گھنٹوں کی پریشانی کے بعد خدا خدا کرکے شادی اور ولیمہ کا لباس خریدا گیا۔

"میرے لیے۔۔۔ اپنی مرضی کے خلاف جاکر کمپرومائز کرنا بہت مشکل ہے۔" شازیہ نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے کہا تو ناصرہ کی نگاہیں ڈرائیونگ سیٹ پر بے زار بیٹھے عفان سے الجھیں۔

"یا اللہ۔۔۔ میرے بیٹے کی خوشیوں کی حفاظت فرمانا۔" ناصرہ نے دل سے دعا مانگیں۔۔۔ مگر وہ یہ بات بھول گئیں۔ دوسروں کی خوشیاں چھین کر وہ کیسے سب کچھ ٹھیک رہنے کی تمنا کرسکتی ہیں۔

☼ ☼ ☼

رکشے نے حرمت کو بڑی سی بلڈنگ کے سامنے اتارا۔ ابھی صرف دس ہی بجے تھے، مگر دھوپ کی تمازت ناقابل برداشت ہورہی تھی۔ اس نے کئی دنوں تک اخبارات کے اشتہارات پڑھنے کے بعد یہاں اپلائی کیا۔ اتفاق سے انٹرویو کی کال بھی آگئی۔ وہ فہمیدہ کو بتاکر کے گھر سے نکلی۔ جب سے عفان کی منگنی شازیہ سے ہوئی تھی فہمیدہ بجھ سی گئی تھیں۔ انہوں نے بیٹی کو عفان سے شادی کے لیے بہت منایا تھا، مگر اس کی ایک نہ۔۔۔ ہاں میں نہیں بدل سکیں۔ انہیں بلاوجہ جیٹھ کے آگے شرمندگی اٹھانی پڑی۔ وہ اسی وجہ سے حرمت سے ناراض رہنے لگی تھیں۔

وہ لفٹ سے سیکنڈ فلور پر پہنچی۔ آفس کا دروازہ کھولتے ہی دل خوش ہوگیا۔ گرمی میں لمبا سفر طے کرنے کے بعد مزاج پر جو چڑچڑا پن چھایا تھا اندر کے پرسکون خنک ماحول کی وجہ سے خوشگوار ہوگیا۔ ہاتھوں سے بال درست کیے اور ٹشو پیپر سے چہرہ صاف کرنے کے بعد وہ ریسپشن کی طرف بڑھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی اسے باسط علی کے کمرے کی طرف بھیج دیا گیا جو یہاں کا ڈائریکٹر تھا۔ اسے ایک کوآرڈینیٹر کی ضرورت تھی۔ حرمت نے اسی جاب کے لیے اپلائی کیا تھا۔ عفان کے زندگی سے جانے کے بعد، وہ خود کو اتنا مصروف رکھنا چاہتی تھی کہ اسے کچھ سوچنے کی فرصت بھی نہ ملے۔

"آج حرمت کہیں گئی ہوئی ہے۔ تم ذرا کچن میں جاکر ممی کی ہیلپ کرو۔" عفان نے شازیہ کو لیٹے دیکھا تو چڑ گیا۔ وہ آفس سے واپس آیا تو چچی کی طبیعت خرابی کی وجہ سے ماں کو اکیلے کچن میں مصروف دیکھ کر شازیہ پر سختی دکھائی۔

"میں۔۔۔ میں جاؤں؟" شازیہ نے چڑایا۔ وہ نانی کی ساری نصیحتیں منگنی کے بعد بھول چکی تھی۔ وہ تفاخر محسوس کرتی کہ عفان تیمور کو فتح کرچکی ہے۔

"اب سے یہ سارے کام تمہاری ذمہ داری ہوں گے۔" عفان نے بھی جل کر جتایا۔

"آپ کی چچی اور ان کی بیٹی کچن کے کام سنبھالنے کے لیے کافی ہیں۔ پھر میری ذمہ داری کیوں ہوں گے؟" اس نے ڈھٹائی سے دوبدو جواب دیا۔

"واہ۔۔۔ مجھ سے محبت کا دعوا ہے۔ مگر میری ذمہ داری اٹھانے سے احتراز برت رہی ہو۔ چچی اور حرمت اس گھر کے فرد ہیں کوئی نوکر نہیں۔ شادی کے بعد تمہیں بھی سارے کام برابری سے کرنے ہوں گے۔" عفان نے غصے سے کہا۔

"میں شازیہ ولاور۔۔۔ آپ کی منگیتر۔ کوئی نوکرانی نہیں۔۔۔ مجھ سے اتنی توقعات نہ رکھیں۔" شازیہ نے چڑ کر کہا۔

"عفان کیا ہوگیا، کیوں شور مچا رہے ہو؟ اور شازیہ بیٹے۔۔۔ تم ہی کچھ خیال کرلو۔۔۔ تمہارے خالو اپنے روم میں ہیں۔" ناصرہ ان دونوں کی بحث سن کر تیزی سے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ دونوں سے بازپرس کی۔

"خالا۔۔۔ یہ چاہتے ہیں کہ شادی کے بعد یہاں گدھوں کی طرح کام کروں۔" شازیہ، ناصرہ کو دیکھ کر پھٹ پڑی۔ وہ ہکابکا رہ گیا۔

"ابھی میری بھانجی اس گھر میں آئی نہیں اور تم اس پر حکم چلانے لگے۔" ناصرہ کو بھی بیٹے کی بات بری لگی۔ انہوں نے اسے ہی لتاڑ دیا۔

"مما اور کیسے آیا جاتا ہے، ہر وقت تو محترمہ یہیں نظر آتی ہیں۔" عفان نے بھی طنز کیا۔

"خالا۔۔۔ میں تو آپ کی اور نانی کی وجہ سے یہاں آجاتی ہوں سو ورنہ مجھے بھی کوئی شوق نہیں۔ ابھی مما کو فون کرتی ہوں کہ ڈرائیور بھیج دیں۔ مجھے واپس جانا ہے۔" شازیہ کا منہ اپنی بے عزتی پر کھلا کا کھلا رہ گیا۔ پیر پٹخ کر بولی۔

"شازیہ بیٹے اس کی تو عادت ہی ہے، چھوڑو۔" انہوں نے معاملہ نپٹانا چاہا۔

"مما۔۔۔ ان کو سمجھادیں۔۔۔ یہ چچی جان اور حرمت کے لیے بلاوجہ کی باتیں نہیں بنایا کریں۔" عفان کی بات پر ناصرہ کو حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ وہ خود گواہ تھیں کہ شازیہ اور احمدی بیگم اکثر ان لوگوں کے ساتھ زیادتی کر جاتی ہیں۔ "شازیہ یہ بات ٹھیک نہیں۔ اب جبکہ تمہیں اسی گھر میں آنا ہے۔ حرمت اور فہمیدہ کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کیا کرو۔" ناصرہ نے پریشانی سے بھانجی کو سمجھانا چاہا تو اس نے کاندھے اچکادیے۔

"یہ محترمہ سمجھنے والی نہیں۔" عفان کا انداز تضحیک آمیز ہوا۔

"ہونہہ۔۔۔ تم کیا بے کار کی بحث میں الجھے ہوئے ہو۔ جاؤ اپنے کمرے میں جاکر چینج کرو۔" ناصرہ نے بیٹے کو گھورا۔

یہ محترمہ ہی فضول میں بات کو طول دے رہی ہیں۔ بات کچھ تھی۔ بن گئی کچھ۔۔۔ خیر میں کس سے فریاد کررہا ہوں۔ جبکہ "میرا منصف ہی میرا قاتل ہے۔" عفان نے ماں کو دیکھ کر کہا۔ ناصرہ کو ایک دم شرمندگی نے آگھیرا۔

شازیہ کو حرمت اتنی ناپسند بھی نہیں تھی۔ مگر احمدی بیگم کی مسلسل مخالفت اور عفان کی بے جا حمایت کی وجہ سے اب وہ اسے زہر سے بھی بدتر لگنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"خالا۔۔۔ مجھے گولڈ کا یہ ہلکا سا سیٹ نہیں چاہیے۔ میری ساری سہیلیوں کی بری میں بہت شاہانہ اور بھاری زیورات آئے ہیں۔ پلیز آپ اسے جاکر چینج کروادیں۔" شازیہ نے ناک چڑھا کر کہا۔

"بیٹا۔۔۔ یہ کافی مہنگا اور اچھا سیٹ ہے۔" انہوں نے اندر کا غصہ دبایا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ لوگ تو اپنی بہو کو ہیرے موتی میں تول دیتے ہیں۔ آپ ڈھنگ کا ایک سیٹ نہیں چڑھا رہی۔" شازیہ نے نخوت سے کہا۔

"ہاں۔۔۔ تو ہم بھی کون سی کمی چھوڑ رہے ہیں۔ ابھی منہ دکھائی کے لیے ایک چھوٹا سیٹ الگ خریدا جائے گا۔ زویا نے بھی کہا ہے وہ سونے کے کڑے دیں گی۔ اب اور کیا چاہیے؟" ناصرہ نے رسانیت سے سمجھانا چاہا۔ وہ بھانجی کی فرمائشوں سے ناک تک بھر چکی تھی۔ بہن سے تعلقات خراب کرنا مشکل تھے۔ اسی لیے ناصرہ کا سارا غصہ احمدی بیگم کے سامنے نکلتا تو وہ افتاں و خیزاں کبھی ادھر، تو کبھی ادھر معاملہ سلجھانے بیٹھ جاتیں۔

"آپا۔۔۔ بیٹے کی شادی کرنے چلی ہو۔ اب ایسی بھی کیا کنجوسی۔ بری میں بھاری سیٹ رکھوگی تو خاندان بھر میں تمہارا ہی نام ہوگا۔" آئشہ نے بھی اس معاملے میں بیٹی کی حمایت کی۔

"نہیں۔۔۔ بہن میرا میاں پہلے ہی فضول خرچیوں پر ناراض ہورہا ہے۔ اب یہ زیور واپس کرکے دوسرا بنوانے کا کہوں گی تو ہتھے سے اکھڑ جائیں گے۔" ناصرہ نے اس بات پر مجبوراً بہن کو ہری جھنڈی دکھائی۔

"وہی تو۔۔۔ دولہا بھائی کو میری شازی کے لیے کون سے ارمان ہیں۔ ابھی ان کی بھتیجی عفان کی دلہن بن کر

آرہی ہوتی۔ تب میں دیکھتی کہ وہ کیسے کوئی اعتراض اٹھاتے؟" آئشہ نے منہ بگاڑ کر بہن کو سنائی۔

"عفان کی شادی۔۔۔ حرمت سے ہو رہی ہوتی تو مجھے ایسی کوئی پریشانی ہی نہیں ہوتی۔ وہ بڑی صابر بچی ہے۔" ناصرہ نے دھیرے سے سوچتے ہوئے اعتراف کیا۔ شازیہ نے بری کی تیاری میں انہیں ناکوں چنے چبوا دیے۔ تب جا کر انہیں حرمت کی قدر آئی۔ ان کی کتنی خواہش تھی کہ زوبا بھائی کی بری تیار کرے مگر وہ عید سے چار دن قبل کراچی پہنچ رہی تھی۔ شازیہ اور آئشہ۔۔۔ اتنے دن انتظار کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ درزی نہیں لے گا۔ رمضان میں رش بہت ہو گا۔ اس قسم کی باتیں کرکے دونوں ماں، بٹی ناصرہ کو لے کر شاپنگ پر نکل جاتیں اور پھر وہ وہ فرمائشیں ہوتی کہ ناصرہ کان پکڑنے لگ جاتیں۔

"ہائے۔ اماں آپا کو دیکھ رہی ہیں۔ انہیں بھی اب وہ حرمت عزیز ہو گئی۔ جانے اس کلی زبان والی میں ایسا کیا ہے؟ سارا گھر اس کے گن گاتا ہے۔" آئشہ نے پاس بیٹھی ماں کو ساتھ ملاتے ہوئے حرمت کے بخیے ادھیڑے۔

"توبہ۔۔۔ توبہ۔۔۔ اے بیبیوں۔۔۔ تم دونوں تو شادی سے پہلے ہی سمدھنیں بن گئی ہو۔ کچھ عقل کو ہاتھ مارو۔ بچوں کی خوشی کو دولت کے ترازو میں تو نہ تولو۔" احمدی بیگم کی پر جلال انداز پر وہ دونوں دبک کر خاموش ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

"مس حرمت۔۔۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کو یہاں کام کرنے میں کسی بڑی مشکل کا سامنا نہیں ہو گا۔" اپنی جوائننگ کے ہفتے بھر بعد وہ باس کے سامنے بیٹھی ایک رپورٹ بنا رہی تھی کہ اچانک باسط خان نے سوال کیا۔ حرمت چونکی۔ اس نے ہونٹوں میں دبا پین نکال کر نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا۔۔۔ یعنی ہمارے ساتھ خوش ہیں۔" باسط خان کا لہجہ شرارت سے بھرپور تھا۔

"جی۔۔۔ سر۔۔۔ یہاں کا ماحول اتنا صاف ستھرا ہے کہ مجھے کام کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی۔" حرمت نے نرمی سے کہا۔ اسے پڑھا لکھا، سلجھا ہوا، اپنا باس بہت پسند آیا۔ جو اسے ہمیشہ بہت عزت سے مخاطب کرتا۔ باسط خان اس سے عمر میں چند سال ہی بڑا ہو گا۔ مگر اس کے چہرے سے ٹپکتی ذہانت اور وقار اسے بڑا بردبار بناتی۔ حرمت کے مسلسل دیکھنے پر ایک دلکش سی مسکراہٹ باسط کے لبوں پر پھیل گئی۔

"سر میں اس کو کمپوز کر لوں؟" حرمت نے شرمندہ ہو کر جلدی سے جانے کی اجازت طلب کی۔

"او کے۔۔۔ یہ رپورٹ تیار ہو جائے تو شہزاد صاحب کو دے دیجیے گا۔" باسط خان نے سر ہلا کر تاکید کی اور وہ باہر نکل گئی۔

"سر۔۔۔ مجھے کتنی عزت دیتے ہیں۔ سچ ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو عزت دے کر عزت کروانا جانتے ہیں۔" حرمت نے اپنے کیبن میں داخل ہوتے ہوئے سوچا اور بے اختیار روم کے کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔ باسط خان فون پر کسی سے ہنس ہنس کر بات کرتا ہوا بہت خوبرو لگ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ محبت بھی کیا عجیب شے ہے۔ بے وفائی، جدائی، اداسی اور تنہائی کیا کیا تحفے دے کر جاتی ہے۔" عفان نے حرمت کی طرف دیکھ کر کہا اور ٹھنڈی آہ بھری۔

"جی۔۔۔ ایک اور چیز بھی دے سکتی ہے۔ وہ ہے تائی اماں کی پٹائی جو آپ کو میرے ساتھ دیکھ کر لگ سکتی ہے۔" وہ طنزیہ انداز میں کہتی ہوئی وہاں سے جانے لگی۔ عفان نے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔

"تم نے جاب کر لی اور مجھے بتانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ کیا میں اتنا غیر ہو گیا ہوں؟" عفان کے لہجہ میں ٹوٹ پھوٹ سی تھی۔

"کیا کرتی، آپ اپنی شادی کی تیاریوں میں اتنے بزی تھے۔ میں اپنی زندگی بنانے میں لگ گئی۔" حرمت نے لطیف سا طنز کیا۔

"یہ بھی آپ کی مہربانی ہے ورنہ حالات کچھ اور ہوتے۔" عفان کی آنکھوں کی سرخی نمایاں ہونے لگی۔ ایک لمحے کو حرمت کا دل بھی ڈولا۔ آخر اسے بھی عفان سے بہت پیار تھا۔ مگر کیا کر سکتی تھی۔

"آپ سے شادی کرنے کے بعد مجھے کتنے لوگوں کا مقابلہ کرنا پڑتا۔" وہ سوچ میں گم ہو گئی۔ پہلے ہی احمدی بیگم کے حقارت بھرے انداز پر اس کی اندر کی ضدی لڑکی بے دار ہو گئی تھی۔ پھر عزت نفس نے کہرام برپا کر دیا۔ اس نے من میں جاگتے جذبوں کو تھپک دیا۔

"حرمت۔۔۔ اب بھی وقت ہے تمہارے بغیر جو پل بھی گزریں گے میرے اندر سے زندگی کی رمق کو نچوڑ کر رکھ دیں گے۔ اپنا ساتھ دے کر مجھے زندہ کر دو۔" عفان کا گلوگیر اور دکھی لہجہ حرمت کے دل پر چابک کی طرح پڑا۔ وہ مجبور تھی۔ روتی ہوئی باہر نکلی تو احمدی بیگم ایک دم سائیڈ میں ہو گئیں۔ پہلی بار انہیں احساس ہوا کہ اپنی دونوں بیٹیوں کو جوڑے رکھنے کی خواہش میں وہ پتھر بن کر شیشے سے بنے دو نازک دلوں کو توڑنے کے گناہ میں ملوث ہو چکی ہیں۔

☼ ☼ ☼

"مس حرمت۔۔۔ کیا کھا رہی ہیں۔۔۔ اگر برا نہیں مانیں۔۔۔ تو ہم بھی اس میں شریک ہو جائیں۔" باسط علی جو لنچ کے لیے باہر نکل رہا تھا۔ ایک دم اس کے کیبن میں داخل ہوا۔ وہ گھبرا گئی۔ چمچہ پلیٹ میں رکھا اور ٹشو سے ہاتھ پونچھا۔

"سر۔۔۔ میں آج پاستا بنا کر لائی ہوں۔ پلیز ٹرائی کریں۔" حرمت نے ٹفن اور ایک صاف پلیٹ چمچہ اس کے سامنے سرکایا۔

"واؤ۔۔۔ امیزنگ۔۔۔ میں نے اتنا مزے دار پاستا پہلے کبھی نہیں کھایا۔ کس نے بنایا؟" باسط علی نے بڑے اچھے انداز میں تعریف کی۔

"جی۔۔۔ میں خود کوکنگ کرتی ہوں۔ یہ بھی میں نے بنایا ہے۔" حرمت نے مسکرا کر کہا۔

"نائس۔۔۔ ویسے مجھے ایک شخص پر بہت رشک آنے لگا ہے۔" باسط علی نے مزے سے کھاتے ہوئے کہا۔ وہ بلیک سوٹ میں بہت ہینڈسم دکھائی دے رہا تھا۔

"کون سا شخص؟" حرمت نے بھی ایک بائٹ لیا۔

"بھئی۔۔۔ وہ شخص جو آپ کا جیون ساتھی بنے گا۔ آپ ہر فن مولا ہیں۔ ہر لحاظ سے پرفیکٹ لڑکی ہیں۔ کسی خوش نصیب کی قسمت کا ستارہ بنیں گی۔" باسط علی کی بات پر وہ بلش ہو گئی۔

"سر۔۔۔ پلیز۔۔۔" اس کی پلکیں جھک گئیں۔

"او۔۔۔ رئیلی۔۔۔ آئی مین اٹ۔۔۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ایک بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ آپ میری آئیڈیل لڑکی ہیں۔ میں اپنی ہونے والی لائف پارٹنر میں ایسی ہی خوبیاں دیکھنا چاہتا ہوں۔" باسط علی نے ٹشو سے ہاتھ پونچھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ حرمت ہکا بکا رہ گئی۔ باسط علی نے اس سے پہلے بھی کئی بار حرمت پر ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ مگر اب کی دفعہ تو ایسے کھلے لفظوں میں سب کہہ دیا۔ حرمت کنفیوز سی ہلتے دروازے کو دیکھنے لگی جہاں سے باسط علی باہر نکلا تھا۔

☼ ☼ ☼

"حرمت۔۔۔ مجھے تو آج کل بہت ڈر لگ رہا ہے۔" فہمیدہ نے بیٹی کے سامنے بیٹھتے ہی بات شروع کی۔

"کس بات سے امی؟" وہ ایک میگزین لیے بیٹھی تھی۔ لاپروائی سے پوچھا۔

"پتا نہیں کیا بات ہے۔ پر بھابھی بہت زیادہ پریشان رہنے لگی ہیں۔ اکثر ان کی اور خالا کی تو تو۔۔۔ میں میں ہونے لگی ہے۔"

"وہ کیوں۔۔۔ نانی۔۔۔ نے اب کون سا نیا شوشہ چھوڑا۔" حرمت نے میگزین سائیڈ میں رکھا۔

"بس وہ ہی عفان کی شادی مسئلہ کشمیر بن گئی ہے۔ وہ اب شازیہ کو برت رہی ہیں تو سارے عیب دکھائی دینے لگے ہیں۔" فہمیدہ نے پریشانی کا اظہار کیا۔

"چھوڑیں نا امی۔۔۔ وہ جانیں ان کی ہونے والی بہو

جانے سانوں کی؟" حرمت نے بظاہر لاپروائی دکھائی۔ مگر اس کا رواں رواں کان بن کر سن رہا تھا۔ "ویسے مجھے یہ بیل منڈھے چڑھتی دکھائی نہیں دے رہی۔۔۔ عفان۔۔۔ ہر دم بے زار رہنے لگا ہے۔ شازیہ سے ایک لمحے کو نہیں بنتی ہے۔ بھائی صاحب الگ خفا ہیں۔" فہمیدہ کا انداز حتمی تھا۔

"اوہ۔۔۔ اچھا۔" حرمت نے سر ہلایا۔

"اسی لیے تو کہا تھا کہ انکار مت کرو۔ مگر تم بھی ضد میں آگئیں۔ بھائی۔۔۔ بھابھی میرے محسن ہیں۔ ان کے بیٹے کی زندگی تباہ ہوئی تو۔۔۔ میں اس کے لیے تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔" فہمیدہ کی بات کا لب لباب بیٹی کو مورد الزام ٹھہراتا تھا۔ وہ غصہ کرتی ہوئی لیٹ گئیں۔

"اس میں۔۔۔ میرا کیا قصور ہے؟ ویسے بھی تائی اماں کو اپنے کیے کا کچھ تو خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔" وہ سوچ کر بولی۔

"بیٹی۔۔۔ ہمیں ہر بات کا منفی پہلو نہیں دیکھنا چاہیے۔ میں بھابھی کی مزاج آشنا ہوں۔ وہ نان کے کہنے میں آکر اور جوش میں اس وقت تو شازیہ کے لیے راضی ہو گئیں۔ مگر ان کے لیے ایسی باتیں برداشت کرنا تھوڑا مشکل کام ہے۔" فہمیدہ نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔

"میری۔۔۔ دی ہوئی قربانی کہیں ضائع نہ ہو جائے۔" ماں کی باتیں سن کر حرمت کے من میں کچھ غلط ہونے کا احساس جاگا۔

شازیہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی کھلکھلاتی ہوئی "پاورپف گرل" دیکھ رہی تھی۔ اس کے سامنے چپس کے خالی پیکٹ، چاکلیٹ کے ریپر بکھرے ہوئے تھے۔۔۔ عفان جو آفس سے آیا تھا۔ وہیں صوفے پر لیٹ گیا۔ اس کے سر میں ٹریفک کے شور کی وجہ سے شدید درد اٹھا تھا۔ کچھ لمحے یوں ہی سرک گئے۔

"ابھی اگر۔۔۔ حرمت ہوتی تو بغیر کہے میرے لیے چائے اور سر درد کی گولی لے آتی۔" عفان نے دکھ سے آنکھیں میچ لیں۔ ان دونوں کا موازنہ کرنے پر اتر آیا۔

شازیہ کی نظریں اسکرین پر جمی تھیں۔ اس کی تکلیف کا رتی بھر احساس نہیں ہوا۔

"وہ۔۔۔ جیسی بھی سہی۔۔۔ پر میری ہر تکلیف کو بنا کہے جان جاتی ہے اور یہ جو اب زندگی کی ساتھی بننے جا رہی ہے۔۔۔ کتنی ناسمجھ بنی ہوئی ہے۔" عفان کا درد ایک دم بڑھ گیا۔ اچانک چائے کی خوشبو آس پاس پھیل گئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو زرد لباس میں حرمت دکھائی دی۔ اس کی جانب دیکھے بغیر ٹیبل پر سر درد کی گولی کے ساتھ چائے رکھ دی۔ عفان کی تشکر بھری نگاہیں اس کی جانب اٹھیں، مگر وہ کچھ کہے بنا واپس لوٹ گئی۔ وہ سر اٹھا کر اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ شازیہ نے ہونٹ چبائے۔

"وہ جا چکی ہے۔" شازیہ کے طنز پر وہ اسے گھورنے لگا۔ اس کے چہرے کے نقوش بگڑے ہوئے دکھائی دیے۔ عفان خاموشی سے چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ ایک سرور سا دجود میں دوڑ گیا۔

"یہ شرٹ۔۔۔ کیسی لگ رہی ہے؟" شازیہ نیا سوٹ پہن کر اترا اترا کر خالا کو دکھا رہی تھی۔ عفان اس کے بناوٹی انداز پر کوفت میں مبتلا ہوا۔

"میری۔۔۔ بیٹی۔۔۔ بہت اچھی لگ رہی ہے۔" ناصرہ نے اس کی تعریف کی۔ احمدی بیگم نے بھی چھالیہ پھانکتے ہوئے سر ہلایا۔

"عفان آپ بتائیں۔۔۔ مجھ پہ یہ نیلا رنگ کھل رہا ہے نا؟" شازیہ نے تھوڑی دیر تو برداشت کیا، مگر جب وہ کچھ نہیں بولا تو خود ہی پوچھنے لگی۔

"مجھے نہیں پتا۔" عفان منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔۔۔ کچھ تو رائے دیں۔" شازیہ پیچھے ہی پڑ گئی۔

"یہ رنگ۔۔۔ مجھے زہر لگتا ہے۔" اس نے نروٹھے پن سے کہا اور باہر نکل گیا۔ شازیہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، وہ جانتی تھی کہ اسے شروع سے نیلا رنگ پسند ہے۔ مگر آج اس کا بیان ہی بدل گیا، وہ سوچنے لگی۔

باہر نکل کر عفان ماتھے پر انگلی پھیرتے ہوئے اپنے جذباتی پن پر شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ یہ حقیقت

تھی کہ اسے ہمیشہ سے نیلا رنگ ٹھنڈک کا احساس بخشتا تھا۔ اس رنگ سے اسے نیلے پانیوں کی تراوٹ اور نیلے امبر کی نرماہٹ محسوس ہوتی تھی۔

چار دن قبل جب حرمت نے ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ پہنا تو وہ اسے دیکھتا رہ گیا اور آج وہ ہی رنگ شازیہ پر بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ کوئی اس کو سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ بس سب کو اپنی پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

"حرمت۔۔۔ آخر تم چاہتی کیا ہو؟" شازیہ نے غصے سے اس کا چہرہ اپنی جانب موڑا۔ وہ آفس جانے کی تیاری میں مشغول تھی۔ فہمیدہ کچن کی طرف چلی گئیں۔ اچانک شازیہ ڈرامائی انداز میں اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"آپی۔۔۔ اب میں نے کیا کیا ہے؟" وہ شازیہ کے اچانک حملے پر گھبرا کر پوچھنے لگی۔

"تم نے عفان کے دل پر ایسے قبضہ جمایا ہوا ہے کہ وہاں میرے لیے کوئی جگہ ہی نہیں بن پا رہی ہے۔" شازیہ کا انداز شکست خوردہ سا تھا۔

"آپ کو اس بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" حرمت نے نگاہیں چرائیں اور جلدی سے بال بنانے لگی۔

"میں نے سب کر کے دیکھ لیا ہے۔ وہ میری جانب متوجہ ہوتا ہی نہیں۔ اس کی ہر پسند اپنائی۔ مگر اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی ہر بات تم سے شروع ہو کر تم پر ہی ختم ہوتی ہے۔ کل مجھے کہتا ہے۔ مرد کی محبت حاصل کرنے کے لیے لڑکی کا صرف چمکتا حسن ہی کافی نہیں۔ اس کی روح بھی صاف و شفاف ہونی چاہیے۔ حرمت کی طرح۔" شازیہ ہسٹریائی انداز میں بولی تو حرمت کو اس پر ترس آیا۔

"آپی۔۔۔ میں ایسا کچھ نہیں چاہتی ہوں۔ جس سے آپ دونوں کے بیچ کوئی دوری پیدا ہو۔" وہ ایک دم افسردہ ہوئی۔

"اچھا۔۔۔ اگر تم واقعی سچ بول رہی ہو تو اس گھر سے۔۔۔ میری اور عفان کی زندگی سے کہیں دور چلی جاؤ۔" شازیہ نے سرگوشی کی اور حرمت جہاں کی تہاں رہ گئی۔

حرمت کا دل آفس میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ شازیہ کی باتوں نے اس کے اندر توڑ پھوڑ مچا دی تھی۔ وہ ان دونوں کی زندگی سے تو دور چلی گئی تھی، مگر اب اس گھر کو چھوڑ کر کہاں جاتی۔ اس نے بال پین کو اٹھا کر میز پر مارنا شروع کر دیا۔ کمرے میں آواز گونجنے لگی۔ ایک دم پین اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا۔ وہ اٹھانے کے لیے جھکی تو اس کی نگاہیں دو چمکتے کالے جوتوں سے ٹکرائیں۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہوئی۔ سامنے باسط علی کا مسکراتا چہرہ تھا جو کسی کام سے اس کے کیبن میں آئے تھے۔

"وہ۔۔۔ سر۔۔۔ سو۔۔۔ سوری۔۔۔" حرمت ایک دم شرمندہ سی ہو گئی۔

"خیر تو ہے۔۔۔ ہم نے تو آپ کو دل میں جگہ دینی چاہی اور آپ ہیں کہ قدموں میں بیٹھی جا رہی ہیں۔" وہ شرارتی انداز میں بولا۔

"سر مجھ سے کوئی کام تھا۔" اس کے حواس درست ہو چکے تھے۔ اب متانت سے گویا ہوئی۔

"جی۔۔۔ مہتاب ٹریڈرز کی فائل جلدی سے مکمل کر کے سائن کروائیں۔ مجھے آج ایک میٹنگ کے لیے باہر جانا ہے۔" باسط علی نے اس کے انداز پر پیشہ ورانہ سنجیدگی اختیار کی۔

"اوکے سر۔۔۔ ابھی لاتی ہوں۔" وہ مستعد ہو کر بولی۔

"ویسے میری دل والی آفر برقرار ہے۔" باسط علی جاتے ہوئے مڑ کر واپس آئے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔ وہ کنفیوز سی انہیں تکتی رہی۔

"شازیہ کے خدشات۔۔۔ دور کرنے کے لیے اگر میں سر سے شادی کر لوں۔ اتنے پیسے والے ہیں۔ امی کو بھی اپنے ساتھ ہی رکھ لوں گی۔" حرمت کے دماغ میں

جھمکا کے ہوئے۔ اس نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے باسط علی جاتا دیکھ کر اس نے دل ہی دل میں منصوبہ بندی کی۔

☼ ☼ ☼

"سر۔ کب آئے؟" حرمت نے گھبرا کر ٹیبل پر اپنا بیگ رکھا اور آفس کلرک شہزاد سے سوال کیا۔

"جی۔ مس۔ آدھا گھنٹہ ہوا ہے۔ آپ کو دوبار پوچھ چکے ہیں۔" شہزاد نے کمپیوٹر سے نگاہ اٹھائے بغیر بتایا۔

"مجھے۔ آج سر سے شادی کی فائنل بات کر لینی چاہیے؟" حرمت نے اپنے بالوں کو سنوارا اور اتھل پتھل سانسوں کو درست کرتے ہوئے قدم بڑھائے۔

"یس۔ کم۔ ان" اس کی دستک پر انتہائی مہذب لہجے میں اجازت دی گئی۔

"سر۔ وہ۔ گھر میں ایک مسئلہ چل رہا تھا۔ اس لیے کچھ دیر ہو گئی۔" حرمت نے بن مانگے دیر سے آمد کی صفائی دینی چاہی۔

"مس۔ کوئی بات نہیں۔ ایسے بڑے شہروں میں یہ سب ہوتا رہتا ہے۔" باسط علی کا شیریں لہجہ اس کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ بلیک سوٹ پر آسمانی ٹائی باندھے وہ بہت خوبرو لگ رہا تھا۔

"سر مجھے ایک بہت ضروری بات کرنی تھی۔" حرمت نے تیزی سے مدعا بیان کیا۔

"بات بھی ہو جائے گی۔ پہلے۔ ان سے ملیے۔ یہ کل ہی امریکہ سے آئی ہیں۔ میری کزن۔ سمیطہ۔" باسط علی نے ہنستے ہوئے اشارہ کیا تو اسے احساس ہوا کہ کمرے میں ان دونوں کے علاوہ بھی ایک ذی روح موجود ہے۔

"ہیلو۔ میم۔" حرمت جو بات کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لیے تنہائی درکار تھی۔ وہ چپ ہو کر سمیطہ کا بغور جائزہ لینے لگی۔ وہ ٹراؤزر پر اونچی شرٹ پہنے۔ گوری گردن پر اسکارف نما دوپٹا لپیٹے۔ سبک نقوش کے ساتھ غیر معمولی حسن کی مالک تھی۔ اس کے۔ کھلے ہوئے بال اڑ اڑ کر گالوں کو چھو رہے تھے۔ اس کا چہرہ کسی خاص جذبے سے تمتما رہا تھا۔

"یو۔ چیٹر۔ صرف کزن!؟" سمیطہ نے بڑے استحقاق سے اس کو وارننگ دی تو وہ بڑی دلکشی سے ہنستا چلا گیا' حرمت کے اندر کسی انہونی کا احساس جاگا۔

"مس حرمت۔ اگر میں نے مزید تعارف نہیں کروایا تو یہ مجھے چھوڑے گی نہیں۔ دراصل۔ یہ میری فیانسی بھی ہے۔" باسط خان نے سمیطہ کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ حرمت کا چہرہ ایک دم سپید پڑ گیا۔ سمیطہ نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا پھر معنی خیز مسکراہٹ لبوں پر سجائے باسط کی جانب متوجہ ہوئی۔

"سمیطہ۔ آپ کو کیسی لگی۔" حرمت کو بت بنا دیکھ کر وہ بھی تھوڑا گھبرا گیا۔

"میم۔ بہت۔ اچھی ہیں۔" حرمت نے اخلاقی تقاضے نبھائے۔

"مس حرمت۔ یہ کچھ رپورٹ بنانی ہیں۔ پلیز ان کو شہزاد کو چیک کر کے دے دیں۔ اور عبدل سے کہہ کر دو کپ اچھی سی کافی اندر بھیج دیں۔" باسط نے اب اس کو منظر سے ہٹانے میں ہی عافیت جانی۔

"اوکے سر۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور باہر چل دی۔ جیسے ہی دروازے سے باہر نکلی فائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔ وہ جھک کر کاغذات سمیٹنے لگی تو کانوں میں اپنا نام پڑا۔ کاغذات سمیٹتے ہاتھ لمحہ بھر کو ٹھہر گئے۔

☼ ☼ ☼

"تو۔۔۔ میری غیر موجودگی میں یہ مزے اڑائے جا رہے ہیں۔ کیا نام ہے تمہاری سیکریٹری کا۔۔۔ حرمت؟" سمیطہ نے مذاق اڑایا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ بے چاری غریب سی لڑکی ہے۔ اپنے تایا کے در پر پڑی ہے۔ میں نے ترس کھا کر رکھ لیا ہے۔" باسط کا انداز صفائی دینے والا تھا۔

"ویسے اتنی بھی گئی گزری۔ جتنا تم بتا رہے ہو"

سمیطہ کا لہجہ تلخ ہوا۔

"ممی۔ کیا مصیبت ہے۔ یہ تمہاری شک کی بری عادت کب ختم ہوگی۔ کہاں وہ۔ اور کہاں تم۔" باسط نے زچ ہو کر کہا۔ حرمت کانپی۔ "ویسے۔ شکل کی بڑی پیاری ہے۔" سمیطہ کی آواز نے اسے چونکایا۔

"ہاں۔۔ یہ تو ہے۔۔۔ نکاہیں۔۔ بڑی قاتل ہیں۔۔۔ ہم نے تو رام کرنے کی کوشش کی مگر لڑکی اسٹرونگ نکلی۔" باسط نے سمیطہ کا موڈ ٹھیک ہوتا دیکھا تو ایک ٹھٹا لگایا۔

"یو فلرٹ۔۔" وہ باسط دیکھتے ہوئے ہنس کر بولی۔

"ایک نمبر کا فراڈی۔۔۔ دھوکے باز۔۔۔ اور ڈھونگی انسان ہے۔" حرمت کا دل ایک دم خراب ہونے لگا۔ وہ اسے کیا سمجھتی تھی اور وہ کیا نکلا۔ وہ سرہلاتی ہوئی اٹھی فائل ہاتھوں میں دبائے، واپس پلٹ گئی۔

"میں ہر اس جگہ پر کیوں پہنچ جاتی ہوں جہاں میرا ذکر بد ہو رہا ہوتا ہے۔" حرمت کو خود سے نفرت محسوس ہوئی۔

"یا اللہ۔۔۔ یہ وہ ہی باسط ہے۔۔۔ جو مجھ سے شادی کرنے کے لیے مچل رہا تھا۔ شکر ہے کہ میں اس کے جال میں نہ آئی۔" حرمت نے اپنی پندار نسوانیت کے ثابت رہ جانے پر شکر ادا کیا۔

اس کی، چکراتے سر کے ساتھ اپنی سیٹ پر واپس ہوئی۔ کچھ سوچ کر انگلیاں کی بورڈ پر چلنے لگی اور حرمت نے جلدی جلدی اپنا استعفیٰ ٹائپ کیا۔

چلچلاتی دھوپ اس کا مزاج پوچھ رہی تھی۔ گلی سنسان ہو رہی تھی، مگر وہ یوں تیز تیز چل رہی تھی۔ جیسے اس کے پیچھے کوئی بھوت لگ گیا ہو۔ مڑ کر دیکھنے کی بھی روادار نہ تھی۔ ایسے ہی جیسے کوئی مڑ کر دیکھے اور جادو کے زور سے پتھر کا بنا دیا جائے۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ باسط علی کے الفاظ اس کے کانوں میں ابھی تک گونج رہے تھے۔ اس نے بے اختیار ہو کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہ بڑا سا کالا گیٹ جو آج تک اسے جیل خانے کا دروازہ دکھائی دیتا تھا۔ ایک دم جائے اماں بن گیا۔ حرمت نے دروازے کے دائیں طرف لگی کال بیل پر ایک دم ہاتھ رکھ دیا اور جب تک نہ ہٹایا، جب تک دروازہ کھلا نہیں۔

☆ ☆ ☆

"شازیہ نے خود ہی یہ منگنی توڑ دی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ عفان۔۔۔ کبھی بھی۔۔۔ حرمت کے خیالوں سے باہر نہیں آئے گا۔ وہ ساری زندگی حرمت اور شازیہ کا موازنہ کرتا رہے گا۔ ایسی زبردستی کی محبت کرنے کا کیا فائدہ۔ یہ شادی زیادہ دن چل نہیں پائے گی۔۔۔ تو خود پر ایک دھبا لگانے سے کیا فائدہ۔" فہمیدہ نے گھر میں گھستے ہی دبے دبے جوش سے بیٹی کو یہ خبر دی۔

"اوہ۔۔۔ یہ تو بہت برا ہوا۔۔۔ تائی اماں کا کیا حال ہے؟" حرمت نے ماں کو کریدا اور سینڈل اتار کر پاؤں پھیلائے۔

"لو۔۔۔ ناصرہ نے تو سکون کا سانس لیا۔۔۔ وہ اب خود بھانجی کو بہو بنانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ شازیہ نے انہیں منگنی کے بعد اتنا تنگ کیا کہ وہ کانوں کو ہاتھ لگا بیٹھیں۔ انہیں بیٹے کا مستقبل مسائل کے انبار تلے دبا دکھائی دیا تو سر پر آئی بلا کے ٹل جانے پر خوش ہوئیں۔" فہمیدہ نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"اچھا۔۔۔ اور تائی؟" حرمت نے سر تکیہ سے ٹکایا۔

"وہ کیا بولتیں۔۔۔ چور سی ہو گئیں۔۔۔ ناصرہ نے تو بہن کو بھی بہت سنایا کہ شازیہ نے ہم سب کا تماشا بنا کر رکھ دیا۔ اگر شادی نہیں کرنی تھی تو بلاوجہ کا کھڑاک کیوں پھیلایا؟" فہمیدہ نے جوش میں جٹھانی کے لہجے کی نقل کر کے بیٹی کے سامنے پورا اسین کھینچا۔

"چلیں سب کچھ یوں ہی ہونا تھا۔" حرمت نے ماں کو دیکھ کر کہا۔

"اچھا۔ ایک بات تحمل سے سننا۔" وہ کچھ ہچکچا کر بولیں۔

"کیا۔ ابھی کچھ اور بھی رہ گیا ہے سنانے کو؟" وہ ہنسی۔

"میرے پاس زوبیا کا فون آیا تھا۔۔۔ وہ بھی اس منگنی کے ٹوٹنے پر بہت خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر تمہیں سمجھانے کے لیے کہا ہے۔ وہ کہتی ہے ہمارے گھر کو حرمت جیسی لڑکی کی ضرورت ہے۔" فہمیدہ نے بیٹی کی طرف امید بھری نگاہ ڈالی۔

"امی۔۔۔ پلیز۔ میں ایک بار منع کر چکی ہوں۔۔۔ پھر دوبارہ وہ ہی بات۔۔۔" حرمت نے بے زاریت دکھائی۔

"بیٹا۔ اب تو ناصرہ بھی میرے پاؤں جوڑ رہی ہیں۔" فہمیدہ نے لجاحت سے کہا۔

"کیا مطلب ہے۔۔۔ میں کوئی چابی کی گڑیا ہوں۔۔۔ اب شازیہ، عفان سے شادی کرنے کو تیار نہیں تو۔۔۔ تائی اماں میرا رشتہ طے کرنے پر تل گئیں۔۔۔ آپ بھول گئیں۔۔۔ یہ تائی اماں ہی تھیں تا جنہوں نے سب کی نظروں میں اچھا بننے کے لیے مجھے گندا کر دیا۔۔۔ عفان کو تو مجھ سے شادی کی اجازت دے دی۔ مگر اکیلے میں یہاں آ کر اس رشتے سے انکار کرنے کا کہا۔" حرمت نے ماں کی بات پر حیران ہو کر پوچھا۔

"بیٹا مجھے سب یاد ہے۔ کچھ بھی نہیں بھولی۔" فہمیدہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

وہ رات ان کی نگاہوں میں پھر گئی۔ جب ناصرہ نے اکیلے میں آ کر حرمت سے درخواست کی تھی کہ جب تیمور علی بھتیجی سے عفان کے رشتے کے لیے اس کی مرضی پتا کریں تو وہ صاف انکار کر دے۔

پوری رات۔۔۔ حرمت گھٹ گھٹ کر روئی۔ وہ بیٹی کے دل کی بات جانتی تھی۔ عفان اور حرمت شروع سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ مگر احمدی بیگم کی وجہ سے جٹھانی نے یہ سفاک قدم اٹھایا۔

فہمیدہ نے بھی اس وقت خود غرض بن کر بیٹی کو یہ ہی مشورہ دیا تھا کہ وہ تایا کو انکار نہ کرے۔ ناصرہ شوہر کے آگے کچھ نہیں کر پائیں گی۔ مگر حرمت کو زبردستی ان کی بہو بننے کا وبال اپنی جان پر لینا ہی نہیں تھا۔ اس نے تایا کو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ ابھی شادی نہیں کرے گی۔ پہلے اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگی۔ اس کے بعد شادی کا سوچے گی، جس کے لیے اسے ابھی پانچ چھ سال درکار ہیں۔ اس بات پر تیمور علی نے کئی ہفتے بھتیجی سے بات چیت بند رکھی۔ فہمیدہ کو بھی بیٹی پر اسی بات کا غصہ تھا۔ عفان الگ منہ پھلائے پھرتا۔ حرمت نے اتنا مشکل وقت بڑے صبر و تحمل سے گزارا۔۔۔ جس کے پیچھے ناصرہ کا ہاتھ تھا۔

"امی۔۔۔ پلیز۔۔۔ اب کی باری۔۔۔ آپ تائی اماں کو خود جا کر انکار کر دیں۔" حرمت نے ماں کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو ان کے خیالوں کی مالا ٹوٹ گئی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" فہمیدہ نے اس کے ہسٹریائی انداز پر پچکارا۔

"میری بیٹی کی عزت نفس کو شدید دھچکا پہنچا ہے۔ اسے تھوڑا ٹائم دینا پڑے گا۔" فہمیدہ اس کی دلی کیفیت کو سمجھ رہی تھیں۔

"بیٹا۔۔۔ کل سے رمضان شروع ہیں۔ تمہارے آفس کا کیا ٹائم ہوگا؟" فہمیدہ نے اس کا ذہن بٹانے کو پوچھا۔

"امی۔۔۔ میں نے وہاں ریزائن کر دیا ہے۔ کل سے آفس نہیں جاؤں گی۔" حرمت نے جلدی سے کہا اور آنکھیں موند لیں۔۔۔ وہ ماں کے کسی سوال جواب کا سامنا کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ فہمیدہ منہ کھولے بیٹی کو گھورتی رہیں۔

☆ ☆ ☆

رمضان المبارک کا تیسرا عشرہ شروع ہو چکا تھا۔ ہر ایک عبادتوں میں مشغول ہو کر اس ماہ مبارک کی رحمتوں سے فیض یاب ہونا چاہ رہا تھا۔ حرمت بھی روزہ کھولنے کے بعد ٹیرس پر چلی آئی۔ پہلے نماز پڑھی اور اس کے بعد سستی سے وہاں بچھی تایا ابا کی آرام وہ کرسی پر بیٹھی گئی چاروں جانب اداسی ہی اداسی تھی۔ ایک سکوت سا چھایا ہوا تھا۔ اس کے دل پر اداسی کی ایک دبیز تہ جمی جا رہی تھی۔ تائی اماں کو نیچا دکھانے کے لیے ایک بار خود سے شادی کے لیے منع کر کے بھی وہ خوش نہیں رہ سکی۔ اس نے ٹھنڈی آہ بھر کر آنکھیں

سونديں تو عفان کا چہرہ نگاہوں میں پھر گیا۔ وہ آج کل گھر سے غائب ہی رہنے لگا تھا۔ ان دونوں کا سامنا سحری یا افطاری کے وقت ہی ہوتا۔ منگنی ٹوٹنے کے بعد شازیہ نے بھی یہاں آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ احمدی بیگم بھی روزہ کھولنے کے بعد خاموشی سے اپنے کمرے میں پڑی رہتیں۔ ایک بات خلاف توقع یہ ہوئی کہ ان کا رویہ حرمت کے ساتھ پہلے سے اچھا ہو گیا تھا۔

"توبہ۔۔۔ میرے مالک۔۔۔ زندگی کتنی۔۔۔ بے درد اور بوجھل ہو گئی ہے۔" حرمت اندر کی خاموشی سے گھبرا کر با آواز بلند بولی۔

"زندگی کو بدلا جا سکتا ہے۔۔۔ خوشیاں ہاتھ پھیلائے۔۔۔ تمہاری منتظر ہیں۔۔۔ بس ایک بار ہاں کہہ دو۔۔۔ میں اب بھی صرف تمہارا ہوں۔" عفان کا گمبھیر لہجہ کانوں میں ٹکرایا تو اس کا دل دھڑکا 'فورا" آنکھیں کھول دیں۔ وہ سامنے کھڑا اسے بڑی پیاسی نگاہوں سے تک رہا تھا۔

"آپ کب آئے؟" حرمت فورا" سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"اس وقت۔۔۔ جب آپ ہمارے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔" عفان نے شرارت سے کہا اور سر سے ٹوپی اتاری' وہ شاید تراویح پڑھ کر آیا تھا۔ آسمانی کرتے پاجامے میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"منہ دھو رکھیے۔" حرمت کے اندر کی شرارتی لڑکی بیدار ہوئی۔

"منہ کیا ہم نے تو مکمل وضو کیا ہوا ہے۔" وہ بھی شرارت سے بولا۔

"ایک بات مان جاؤ۔۔۔ اب سارے گلے شکوے دل سے نکال کر صرف میری بن جاؤ۔" وہ اس کی گہری آنکھوں میں جھانک کر مسکرایا۔ اسے چچی کے ذریعے ماں اور نانی کی ساری باتیں پتا چل چکی تھیں۔ وہ اب حرمت کو حق بجانب سمجھتا تھا۔

"عفان۔۔۔ میرے لیے اپنی بے عزتی بھلانا بہت مشکل ہے۔" حرمت نے کہہ تو دیا مگر عفان کی آنکھوں میں امید و بیم کے دیے بجھتے دیکھ کر افسوس ہونے لگا۔ ان سارے حالات میں اسے عفان کی استقامت پر فخر محسوس ہوتا۔

"اوکے۔۔۔ محبت رہے نہ رہے۔۔۔ تمہاری انا سلامت رہے۔" عفان غصے سے دیوار پر مکا مارتے ہوئے بولا اور پاؤں پٹختا وہاں سے چلا گیا۔ حرمت سر تھام کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

"کیا۔۔۔ میں اتنی بری ہوں کہ میری وجہ سے یہ ہنستا کھیلتا گھرانہ اداسی کی لپیٹ میں آگیا۔ غیروں سے دھوکا کھانے سے بہتر نہیں کہ اپنوں کی سچائی پر ایمان لے آیا جائے۔" حرمت نے کھڑکی سے جھانک کر ماں کو اداس دیکھا اور اپنا محاسبہ کیا۔

کل عید تھی۔ مگر ہمیشہ کی طرح گھر کے ماحول سے شوخی و شرارت مفقود تھی۔ ناصرہ کے منگائے گئے بادام پستے ویسے کہ ویسے ہی میز پر سوکھے پڑے تھے۔ انہوں نے بھگوئے بھی نہیں تھے۔ ہر سال شہاب احمد کی فرمائش پر وہ بڑے اہتمام سے دودھ اور میوے والی سویاں پکاتی تھیں۔ مگر اس بار کام کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ فہمیدہ نے بھی ابھی تک چھولے نہیں چڑھائے تھا۔۔۔ نہ ہی ماش کی دال بھگوئی تھی۔ سب کو عید والے دن ان کے ہاتھوں کی بنی چاٹ کھانی ہوتی تھی۔ عفان جو چاند رات کو گھس گھس کر تیمور علی اور اپنے کرتے شلوار کو استری کرنے میں مصروف رہتا۔ اب کمرے میں لیٹا اداس غزلیں سن رہا تھا۔ تیمور علی 'خاموشی سے صوفے پر سر نیہوڑائے بیٹھے تھے۔ ٹی وی بند' نہ چاند دکھائی دینے کا شور' نہ بار بار چائے کی فرمائش۔ احمدی بیگم کے سروتے اور زبان کی کترنی' دونوں خاموش تھیں۔ وہ بھی تخت پر خاموش بیٹھی۔۔۔ خلاؤں میں گھور رہی تھیں۔

"سب نے پرانی بلیک اینڈ وائٹ فلموں والا ماحول بنا کر رکھ دیا ہے۔" حرمت سے یہ نظارہ ہضم نہ ہوا تو اس کی کھی کھی کھی شروع ہو گئی جو بند ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ سب چونک اٹھے۔ فہمیدہ کے

چہرے پر ایک دم روشنی پھیل گئی۔ حرمت کو اچھی طرح سے جانتی تھیں۔ خوشی خوشی بستر چھوڑا اور جٹھانی کے کمرے کی جانب لپکیں۔

"آپا۔ سنبھل کر کہیں گر نہ جائیں۔" وہ ابھی اتنا ہی بول پائی تھی کہ فہمیدہ جٹھانی کے دروازے کے آگے لم لیٹ ہو گئیں۔

"توبہ۔۔۔ کیسی کالی زبان لڑکی ہے۔۔۔ اپنی اماں کو بھی نہ چھوڑا۔" احمدی بیگم نے سر اونچا کیا اور مسکرا کر بولیں۔۔۔ مگر اس بار ان کے لہجے میں حرمت کے لیے بے زاریت کی جگہ شفقت تھی۔ وہ جان گئی تھیں کہ قسمت سے لڑنا انسان کے بس کی بات نہیں۔۔۔ حرمت نے مسکرا کر نانی کو دیکھا اور ماں کو اٹھانے دوڑی۔

"ارے۔۔۔ زوئی۔۔۔ شکر کرو۔۔۔ بن باس ختم ہوا۔۔۔ حرمت مان گئی۔" عفان نے دوڑ کر بہن کو فون ملایا جو۔۔۔ بھائی کی شادی رک جانے کی وجہ۔۔۔ اپنی سیٹ کینسل کرانے والی تھی۔

"بھئی۔۔۔ واہ۔۔۔ عید تو۔۔۔ اب منائی جائے گی۔" ہر ایک کے دل کی ایک ہی صدا تھی۔

"ایک منٹ۔۔۔ میرے ساتھ اندر چلو۔" عفان نے زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ کھینچا۔ احمدی بیگم نے مسکرا کر نگاہیں چرائیں۔ ناصرہ اور فہمیدہ جلدی جلدی مہمانوں کی لسٹ بنانے میں لگ گئیں۔ تیمور علی فون گود میں رکھ کر جانے کن کن لوگوں سے معاملات طے کرنے میں مصروف ہو گئے۔

"یہ دیکھو۔۔۔ تمہاری عیدی کا نیا سوٹ۔۔۔ اور باقی لوازمات۔۔۔ ممی کافی دن پہلے خرید کر لائی تھیں۔۔۔ مگر محترمہ کے مزاج ہی ٹھکانے نہیں آرہے تھے۔ اس لیے میں نے دینے سے منع کر دیا تھا۔" عفان نے مسکرا کر "ایمرجنسی عیدی" کے کپڑے اسے پکڑائے۔ وہ سارے کام فاسٹ اینڈ فارورڈ انداز میں ہوتا دیکھ کر پھر سے ہنسنے لگی۔

"میرے دل کو یقین تھا' تم مان جاؤ گی۔ اسی لیے عیدی کی تیاری مکمل کر رکھی تھی۔ اب صبح تم نے میری پسند کا یہ نیلا سوٹ پہننا ہے۔" عفان نے اس کے ہاتھ میں ایک بہت خوب صورت اور اسٹائلش سوٹ تھمایا' تو وہ مسرور ہو گئی۔ ایمرجنسی عیدی وصولنے پر۔۔۔ خوشیوں کے سارے رنگ اس کے گرد بکھرتے چلے گئے۔

☆ ☆

مکمل ناول

چاند رات

نایاب جیلانی

رات دھیرے دھیرے پھیل رہی تھی۔ پارک میں اس وقت اکا دکا لوگ تھے۔ شام ڈھلتے ہی لوگ اپنے بچوں کو رلاتے دھلاتے، زبردستی کھینچ کھسیٹ کر لے گئے تھے۔ اس وقت گراؤنڈ میں بچوں کے کھیل کا مختلف سامان جگہ جگہ بکھرا پڑا تھا۔ کہیں بال، کہیں ہاکی، کہیں وکٹ اور کہیں بھالو، پکچین، گڑیا اور مختلف قسم کے کھلونے گرے ہوئے تھے۔ یہاں پہ چوری چکاری کا مسئلہ نہیں تھا۔ صبح تک بھی یہ سامان کوئی نہ اٹھاتا۔ رات سے پہلے عصر کے وقت بچے آتے تھے، کھیلتے کودتے ہنگامہ کرتے اور پھر اپنا سامان یہیں پھینک کر گھر چلے جاتے تھے۔ چیزوں کو اٹھا کر گھر لے جانے کا تکلف کبھی نہیں کرتے تھے۔

اور اس وقت جا بجا بکھری چیزوں کو دیکھ کر اسے اپنا بچپن اور لڑکپن یاد آرہا تھا۔ وہ بھی اسی پارک میں کھیلنے دادا کے ہمراہ آیا کرتی تھی۔ وہ سائیکلنگ کرتی اور میران فٹ بال کھیلتا تھا۔ کبھی کبھی اڑتی ہوئی بال گولی کی طرح اس کی سائیکل سے ٹکراتی تھی۔ تب وہ بھاں بھاں کرکے رونے لگتی۔ پھر دادا کتنی منتوں کے بعد اسے چپ کرواتے تھے۔ دو دو آئس کریم اور کون لے کر دیتے۔ تب کہیں جا کر اس کا بھونپو بند ہوتا تھا۔ آج وہ دادا کو سوچتے سوچتے کچھ اور بھی سوچ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں ہلکا سا اضطراب بھی نظر آتا تھا، سر نے کہا تھا وہ نوٹس خود بخود دے جائیں گے، وہ پریشان نہ ہو، اور پارک میں ہی انتظار کرے کیوں کہ وہ جلدی میں تھے۔ اور تب سے لے کر اب تک وہ سر جواد کا انتظار کر رہی تھی۔ نوٹس تو گھر پر بھی دے سکتے تھے، لیکن کیا پتا وہ زیادہ جلدی میں ہوں۔ اس نے سوچا تھا وہ خود جا کر اکیڈمی سے لے آتی ہے، کیوں کہ نوٹس ملتے تو وہ ٹیسٹ کی تیاری کرتی۔ گو کہ اس وقت شام کے گہرے سائے، رات میں ادغام کر رہے تھے اور اسٹریٹ لائٹس بھی روشن تھیں۔ کالونی کی سڑکیں کافی حد تک سنسان ہو چکی تھی۔ وہ کچھ سوچ کر گھر جانے کی بجائے اس سڑک کی طرف مڑ گئی تھی۔ جو اکیڈمی کی طرف جاتی تھی۔ صرف چند فرلانگ پہ اکیڈمی کی چھوٹی سی عمارت تھی۔ سب ایک ہال اور ایک چھوٹے سے آفس پہ مشتمل۔ اس وقت باہر کوئی سائیکل بائیک یا کوئی چھوٹی موٹی کار دکھائی نہیں دے رہی تھی جس کا مطلب تھا۔ سب بچے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ البتہ چھوٹے سے آفس کی لائٹس روشن تھیں۔ وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی مین روڈ تک پہنچ گئی تھی اور ابھی اس نے ہینڈل پہ دباؤ ڈالنا چاہا ہی تھا، جب اندر سے آتی آوازوں پہ ٹھٹک کر رک گئی تھی اور اگر وہ نوٹس لینے یہاں نہ آئی ہوتی تو ...؟ چند لمحوں بعد اندھا دھند گھر کی طرف جاتے ہوئے وہ بے ساختہ گھٹی گھٹی چیخوں کو دباتی سوچ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

باہر سرمئی شام پھیل رہی تھی۔ اس کا نقطہ ارتکاز سامنے موجود کلرڈ شیشوں والی کھڑکی تھی، جس کی اونچائی پہ سلور ڈائل والی گھڑی لٹک رہی تھی۔ اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ اس کا دل بھی ٹک ٹک کرتا، خوف کے مارے دبک رہا تھا۔ وہ شدید تفکر اور گھبراہٹ کا شکار تھی۔

"میرا ابھی نہیں آیا...؟" اس کی آنکھوں میں

"فکر" کا سایہ ہلکورے لے رہا تھا کیوں کہ "میر" کبھی بھی بلاوجہ گھر سے باہر نہیں رہتا تھا جب سے وہ جاب میں گیا تھا عموماً" وقت سے گھر آجاتا تھا، لیکن اب حالات کچھ اور ہی تھے۔ نہ "میر" پہلے والا میر تھا، نہ حالات پہلے والے حالات تھے۔ وہ چھ بجے ٹیوشن پڑھ کے سامنے والے فلیٹ سے اپنے فلیٹ میں آگئی تھی۔ اور تب سے لے کر اب تک گھڑی پر نگاہ جمائے بیٹھی تھی، لیکن وقت نے اپنی چال بدل لی۔ پہلے سوئی آگے نہیں بڑھ رہی تھی اور اب آگے پیچھے بھاگ رہی تھی یوں کہ نو سے دس بجتے پتا ہی نہیں چلا تھا۔

زونی نے پہلے سوچا وہ دوبارہ سامنے والی نائلہ آنٹی کے فلیٹ میں چلی جائے۔ نائلہ آنٹی پچھلے کئی سالوں سے سامنے والے فلیٹ میں رہائش پذیر تھی۔ اس کمپاؤنڈ میں آمنے سامنے دونوں فلیٹ زونی کے دادا حشمت کریم کی ملکیت تھے۔

کافی سال پہلے سامنے والا فلیٹ دادا نے کرائے پر چڑھا دیا تھا۔ تب نائلہ اپنے عمر رسیدہ شوہر کے ساتھ کسی دوسرے شہر سے مائیگریٹ ہو کر آئی تھی۔ اس کا بڈھا شوہر دادا کا ہم عمر تھا، پھر جلد ہی چل بسا۔ تب نائلہ نو عمر چھوٹی سی لڑکی تھی۔ بعد میں نائلہ نے شوہر کے بینک بیلنس کو بروئے کار لاتے ہوئے اعلا تعلیم حاصل کی اور پھر بہترین جاب بھی مل گئی۔

تب سے لے کر اب تک نائلہ یہیں تھی۔ وہ تینتیس سالہ انتہائی ینگ اسمارٹ اور طرح دار عورت تھی۔ میرڈ تو لگتی ہی نہیں تھی۔ پھر اس کا اخلاق، بول چال، کردار، شائستگی اور سب سے بڑھ کر زونی کی فیملی سے اٹیچ منٹ اپنی مثال آپ تھی۔

نائلہ نے ان کی فیملی کو ہر کرائسس میں سپورٹ کیا تھا۔ دادا بھی نائلہ کو بہت عزت اور مان دیتے تھے۔ دادا نے نائلہ کو بیٹی بنا رکھا تھا اس لیے نائلہ کی ان کے گھر آمد و رفت ایسے ہی تھی جیسے وہ اسی گھر کا فرد ہو، ہر مشورہ ہر رائے میں ہمیشہ نائلہ کو دادا بہت اہمیت دیتے تھے۔ کیوں کہ دادا کو نائلہ میں بہت زیرکی اور سمجھ بوجھ نظر آتی تھی۔

لیکن جب دادا کا اچانک انتقال ہوا تب نائلہ یہاں نہیں تھی۔ وہ آفس ورک کے لیے دبئی گئی ہوئی تھی۔ اس کا چار ماہ دس دن کا ٹور تھا اور اس دوران دادا کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہ چار ماہ زونی نے تڑپتے، روتے اور اکیلے ہی دادا کے سوگ میں گزارے تھے۔ کیوں کہ دادا کا اکلوتا پوتا میران دادا کو دفنانے کے بعد ایسا مصروف ہوا تھا کہ اسے گھر میں موجود دادا کی لاڈلی، ڈرپوک چھوٹی سی پوتی تک بھول گئی تھی۔

میران یعنی زونی کا میران دنوں اپنی نئی نئی جاب میں بہت بزی تھا۔ اس کی پوسٹنگ ان دنوں گجرانوالہ میں تھی سو وہ صبح نکلتا اور رات گئے واپس آتا تھا۔

زونی صبح تو اسکول چلی جاتی تھی۔ واپس آتی تو کبھی سو جاتی اور کبھی بدلتے حالات، بدلتے رشتوں پہ خوف کے مارے رونے لگتی یا پریشانی کے عالم میں چکر لگا لگا کر اپنی ٹانگوں کو تھکاتی رہتی تھی۔ پھر جب نائلہ دبئی سے واپس آئی تب زونی کی تنہائی خود بخود ختم ہو گئی تھی، لیکن دادا کی جدائی والا خلا بھرتا نہیں تھا۔ نائلہ کو بھی دادا کی ناگہانی موت کا بہت دکھ تھا لیکن چونکہ ان کا وقت پورا ہو چکا تھا اس لیے کوئی کیا کر سکتا تھا۔

نائلہ کے ہی ہمت دلانے، حوصلہ دینے اور پیار کرنے سے زونی میں ہلکی پھلکی سی جینے کی امنگ پیدا ہوئی تھی ورنہ وہ تو دادا کے بعد اپنی زندگی سے بے زار ہو چکی تھی۔ اس کا دل تو اسکول کے لیے بھی نہیں مانتا تھا لیکن یہ نائلہ کی کوشش اور ہمت کی بدولت تھا جو زونی نے دوبارہ اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ اسکول کے بعد وہ گھر میں اکیلی ہوتی تھی، نائلہ پانچ بجے کے قریب آتی اور نائلہ کے ہی مجبور کرنے پہ زونی کتابیں لے کر اس سے ٹیوشن لینے چلی جاتی۔ یوں اس کا دل بھی بہل جاتا تھا اور میر کے آنے تک کا وقت بھی گزر جاتا تھا۔ اور ابھی وہ لاؤنج میں بیٹھی گھڑی پہ نگاہیں جمائے نائلہ کی کچھ دیر پہلے والی باتوں کو سوچ رہی تھی جب وہ بڑے متفکر انداز میں اسے سمجھا رہی تھی۔

"زونی! تم تو بہت چھوٹی اور ناسمجھ ہو۔ کم عمر اور ناداں ہو۔ تمہارے دادا چلے گئے۔ جانے سے پہلے وہ

تمہارے لیے کوئی فیصلہ کر جاتے۔" نائلہ کا انداز خاصا متفکر تھا۔ زونی اپنی معصوم بڑی بڑی غلافی آنکھوں سے ٹکر ٹکر نائلہ کو دیکھتی رہی۔ وہ اس کی بات کا مفہوم سمجھنا چاہتی تھی لیکن اس میں اتنی سمجھ بوجھ نہیں تھی۔ وہ بس نائلہ کے خوب صورت چہرے کو ہی دیکھتی رہی۔ وہ نائلہ سے بہت متاثر رہا کرتی تھی۔ نائلہ کا حسن، ادائیں، دلکشی۔ ایک خاص انداز مقناطیسی کشش مقابل کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ وہ کہیں سے بھی "آنٹی" کہلوانے کے لائق نہیں تھی۔ چونکہ نائلہ جب یہاں آئی تھی تب زونی بہت چھوٹی تھی سو اس نے نائلہ کو آنٹی کہنا شروع کیا تو نائلہ نے بھی روکا نہیں۔ اور اب تو یہ عادت بہت پختہ ہو چکی تھی۔ اور اس وقت زونی کیمسٹری کی کتاب کھولے بڑی حیرت سے نائلہ کو دیکھ رہی تھی۔ نائلہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سہلانا شروع کر دیا تھا۔

"زونی! میں تمہارے لیے بہت فکر مند ہوں۔" نائلہ کی آواز میں گہری سوچ کا عکس تھا۔ زونی پریشان ہو گئی جیسے نائلہ کا تفکر اس کے لیے باعث تکلیف تھا۔ بھلا اتنی اچھی نائلہ آنٹی کیوں اس کے لیے متفکر تھیں؟ جسے متفکر ہونا چاہیے تھا۔ اسے تو پروا نہیں تھی۔ بلکہ وہ تو دادا کے بعد بجائے اسے جذباتی سہارا دیتا اور بھی مگن، بے نیاز اور اجنبی ہو گیا تھا۔ اور زونی کے لیے دادا کی جدائی کے بعد میران کا اجنبی رویہ دوسرا جذباتی دھچکا تھا۔

"تمہارے اکیلے پن کا سوچتی ہوں تو دل بہت گھبراتا ہے۔ تمہارے دادا ایسے سوجھ بوجھ والے تھے۔ انہوں نے تمہیں کسی محفوظ ٹھکانے پہ کیوں نہیں پہنچایا۔" نائلہ کا انداز خود کلامی سا تھا زونی کا دل دھک سے رہ گیا۔

"محفوظ ٹھکانہ؟" تو کیا زونی کا ٹھکانہ محفوظ نہیں تھا؟ اگر یہ ٹھکانہ محفوظ نہیں تھا تو پھر کہیں اور جائے پناہ یا امان تھی؟ اگر اپنے مکان اپنے گھر ہی محفوظ نہیں تھے تو پھر باہر کہیں تحفظ تھا؟ وہ متوحش سی نائلہ کو دیکھتی رہ گئی۔ جو کسی غیر مرئی نکتے پر نگاہ جمائے، کھوئے کھوئے انداز میں کہہ رہی تھی۔

"زونی! تم تو بہت چھوٹی ہو۔ ابھی نینتھ کلاس میں پروموٹ ہوئی ہو۔ تمہارے دادا چل بسے۔ اب تم اکیلی ہو مطلب اپنے گھر میں بالکل تنہا ہو۔ گو کہ تم بہت چھوٹی ہو۔ لیکن بالغ اور باشعور ہو۔ اتنا تو سمجھتی ہو نا کہ تمہارا اکیلا رہنا بہت غیر مناسب ہے۔" نائلہ اس کا ملائم مکھن سا ہاتھ سہلاتی نرمی سے سمجھا رہی تھی اور زونی جیسے متعجب اور حیران رہ گئی تھی۔

وہ اکیلی یا تنہا کیسے تھی؟ میران تھا تو۔ گو کہ صبح کا گیا رات کو واپس آتا تھا لیکن وہ رات کو آتو جاتا تھا۔

"تو پھر؟" کافی دیر بعد زونی کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا اتنی سی کوشش میں ہی اس کا حلق سوکھ گیا تھا اور زبان تالو سے چپکنے لگی تھی۔

"پھر زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنا بہت ضروری

ہے۔" نائلہ دھیمی آواز میں کہتی جارہی تھی۔
"ایک عرصہ تم لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے تم لوگوں سے انسیت ہوگئی ہے۔ میں یہی چاہتی ہوں۔ تم کسی بڑی مصیبت میں مت پھنسو۔" نائلہ کا انداز ناصحانہ تھا۔
"میں کیا کرسکتی ہوں آنٹی!" وہ رودینے کو ہوچکی تھی۔ بس لحہ ہی لگتا اور آنسو چھلک پڑے۔
"تم۔" نائلہ لحہ بھر کے لیے سوچ میں ڈوب گئی۔
"میران سے کہو تمہیں کسی رشتے دار کے گھر چھوڑ دے۔ تمہارا اکیلا رہنا بالکل ٹھیک نہیں۔ دیکھو آگ تیل کا کوئی جوڑ نہیں ہوتا۔ انسان جتنا بھی شریف ہو۔ اسے حیوان بنتے دیر نہیں لگتی۔ لحوں میں سالوں کی تپسیا بے کار چلی جاتی ہے۔" نائلہ اب کھل کے اس موضوع کو ڈسکس کررہی تھی۔ یوں کہ زونی کا سانس تک رک گیا تھا۔ حواس سلب ہونے لگے تھے۔ اسے لحوں میں میران کوئی جنگلی درندہ یا حیوان صفت انسان لگنے لگا تھا۔
"ہم۔ ہمارا تو کوئی رشتے دار نہیں جو تھے وہ بہت دور پار کے۔ بس دادا کے علاوہ تو کوئی نہیں ہے۔" زونی کی غلافی آنکھوں میں ڈھیروں آنسو اتر آئے تھے۔ نائلہ لحہ بھر کے لیے پھر سے سوچ میں ڈوب گئی تھی۔
"اچھا۔؟ پھر یہ آپشن تو ریجیکٹ ہوا۔" نائلہ نے زیر لب بڑبڑا کر کہا۔
"ایک اور آئیڈیا بھی موجود ہے۔" کچھ دیر بعد نائلہ پھر سے پرجوش ہوگئی تھی۔ زونی خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ "کیا؟"
"تم کسی ہاسٹل میں شفٹ ہوجاؤ۔" نائلہ نے چٹکی بجا کر جیسے بڑے کام کا آئیڈیا سوچا تھا۔ زونی کے بھی کچھ کچھ دل کو لگا۔ وہ جیسے سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ اور تب کی سوچوں میں گھری زونی ابھی تک ایک ہی زاویے پہ بیٹھی ایک ہی نکتے پہ نگاہیں جمائے ایک ہی بات کو باربار سوچ رہی تھی۔
"مجھے یہاں نہیں رہنا۔"

☆ ☆ ☆

حشمت کریم کے صرف دو ہی بیٹے تھے۔ بیٹی تھی نہیں۔ محکمہ زراعت میں حشمت کریم اعلا عہدے پر فائز تھے۔ پراپرٹی کے نام پر یہ دو کافی کھلے، وسیع اور کشادہ فلیٹ تھے۔
انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کے لیے اچھے وقتوں میں بنوائے تھے لیکن بدقسمتی سے ان کے دونوں بیٹوں کو رہنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ ایک فضائی حادثے کا شکار یہ خاندان ایک وقت میں لوگوں کے ترحم کا شکار ہوگیا تھا۔ دونوں کی بس ایک ایک اولاد تھی۔ جو اپنے ماں باپ سے محروم دادا کے مہربان سائے تلے، پلے اور بڑے ہوئے تھے۔ دادا نے کبھی بھی ان دونوں کو کسی محرومی کا شکار ہونے نہیں دیا تھا۔
میران اور زونی دونوں ان کی زندگی کا سرمایہ تھے۔ ان دونوں میں دادا کی جان بند تھی۔ میران بڑا تھا۔ سنجیدہ سرد اور کچھ کچھ اکڑو سا۔ وہ زونی سے کم ہی بے تکلف ہوتا تھا کیوں کہ ایج ڈیفرنس کے ساتھ ساتھ دونوں کے مزاج بھی بہت الگ اور مختلف تھے۔
گو کہ زونی بھی چلبلی ٹائپ نہیں تھی پھر بھی جب تک دادا زندہ رہے۔ گھر میں رونق کا احساس ہوتا تھا۔ زونی اور دادا کبھی لڈو کھیل رہے ہوتے۔ کبھی شطرنج کبھی کارڈ۔ میران ان کی گیمز میں شامل نہیں ہوتا تھا۔ وہ دونوں دادا پوتی خود ہی رونق لگائے رکھتے تھے۔ اور خوب ہی ہنگامہ بپا رہتا۔
دادا نے زونی کو جلدی کوکنگ بھی سکھادی تھی۔ تھوڑا بہت سینا پرونا بھی جان گئی تھی اور پھر دادا یہ بھی چاہتے تھے اس کی شادی جلدی کردیں اور زونی اپنی شادی کے نام پر ایک ہنگامہ بپا کردیتی تھی، لیکن شاید دادا کو اپنی موت کی آہٹیں سنائی دینے لگی تھیں۔ وہ زونی کو اپنی زندگی میں ہی گھربار کا ہوتا دیکھنا چاہتے تھے اور اس ضمن میں دادا نے....
اور وہ سوچوں میں ڈوبی بہت دور ماضی تک کا سفر کرنا چاہتی تھی۔ وہ ماضی جو ابھی چار ماہ پہلے ماضی نہیں تھا لیکن اب ماضی کا حصہ لگنے لگا تھا۔
زونی دادا کی تصویر کو دیکھتی اچانک چونک گئی تھی۔

گھڑی نے گیارہ کے ہندسے کو کراس کیا اور تب ہی فلیٹ کے دروازے پہ کھٹ پٹ ہوئی تھی چونکہ میران اپنے پاس چابی رکھتا تھا اس لیے زونی کو اٹھ کر دروازہ کھولنے کا تردد نہیں کرنا پڑا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد میران اپنی ہی جون میں اندر آتا دکھائی دیا تھا۔ اس کی ٹائی گلے میں جھول رہی تھی۔ کندھے پہ کوٹ لٹک رہا تھا۔ ہاتھ میں لیپ ٹاپ بیگ تھا اور وہ جمائی روکتا تیزی سے اپنے کمرے کی طرف جاتا لحہ بھر کے لیے رک گیا۔ سامنے کارپٹ پہ زونی گھٹنوں میں منہ دیے بیٹھی تھی۔ اور اس کا ہولے ہولے کانپتا وجود بتا رہا تھا جیسے وہ رو رہی ہے۔ یا رونا دبانے کی کوشش کررہی ہے۔
اندر بڑھتا میران ٹھٹک گیا تھا۔ پھر وہ اپنے کمرے کی طرف جا ہی نہیں سکا تھا۔ زونی کی طرف آیا وہ کچھ دیر کے لیے اعدادوشمار میں گم ہوا۔ آج پندرہ دن بعد وہ نہ صرف زونی کو دیکھ رہا تھا بلکہ بات کرنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ اسے اپنی کوتاہی پہ کچھ افسوس ہوا۔ وہ اتنا لاپروا ہرگز نہیں تھا، نہ وہ زونی سے بے نیاز تھا۔ بس نئی نئی جاب نے اسے خاصا گھن چکر بنا رکھا تھا۔ صبح وہ زونی کے اٹھنے سے پہلے ہی نکل جاتا تھا اور رات کو جب وہ سوجاتی تب گھر آتا۔ ان دونوں سائٹ کا بہت کام تھا۔ دن بھر دھوپ سے جھلسنا پڑتا۔ ورکرز سے کھپائی۔ بھاگ دوڑ، کام کا لوڈ اور بے انت مصروفیت کی وجہ سے میران اپنے لیے بھی وقت نہیں نکال پارہا تھا۔
یہ اور بات تھی کہ دادا کی دائمی جدائی کے بعد وہ اپنے گھر سے بے نیاز ہرگز نہیں تھا۔ زونی کے کہے بغیر وہ ہر دو ہفتے بعد راشن ضرور لے آتا تھا۔ اتوار کے اتوار انڈے، جیم، بریڈ، پھل، گوشت وغیرہ بھی آجاتا۔ کھانا زونی ہی پکاتی تھی اور بلاشبہ بہت اچھا پکاتی تھی۔ گو کہ وہ اتنی عمر کے لحاظ سے بڑی نہیں تھی پھر بھی اس نے دادا کے بعد گھر کو احسن طریقے سے سنبھال لیا تھا۔ پہلے تو ہر چیز کی طرف دادا کا دھیان ہوتا تھا۔ صفائی ستھرائی، کچن کی دیکھ بھال ... ٹوٹی چیزوں کی مرمت، خراب مشینری کو ٹھیک کروانا لیکن اب زونی بہت نہ سہی، کچھ نہ کچھ گھر میں دلچسپی لینے لگی تھی ورنہ دادا

کے بعد تو صدمے اور غم کی کیفیت میں وہ ہر چیز سے لاتعلق ہو چکی تھی۔

پہلے ایک جز وقتی ملازمہ کام کے لیے آتی تھی، پھر بعد میں وہ اپنا علاقہ بدل گئی تو دادا کو کوئی اور پسند ہی نہ آئی۔ اب گھر کی ذمہ داری بھی زونی کے سر پہ تھی اور اس کا اسکولنگ سلسلہ؟ وہ بھی کسی قدر لاپروا ہو چکا تھا۔ زونی کے اسکول کا پوچھا ہی نہیں۔ جانے وہ ریگولر اسکول جا رہی تھی یا نہیں؟ جانے اس کی وین آ رہی تھی یا نہیں؟ وہ کافی حد تک خود کو ملامت کرتا کارپٹ پہ دو زانو ذرا جھک کر زونی کے قریب ہوا تھا اور اپنے ہی خیالوں میں کھوئی زونی، میران کو اپنے اتنا قریب پورے چار ماہ بعد دیکھ کر بدکتی ہوئی گھبرا کر پیچھے ہٹی تھی۔ اس کا انداز بڑا بے ساختہ اور ناقابل فہم قسم کا تھا۔ وہ شدید گھبراہٹ اور خوف کا شکار ہوئی تھی۔ چلو اس کی گھبراہٹ تو بنتی ہی تھی مگر یہ خوف...؟

میران کچھ الجھا الجھا سا زونی کا چہرہ دیکھتا رہا کیا وہ ڈر رہی تھی؟ اکیلے پن سے؟ تنہائی سے؟ باہر خطرناک ہوتے موسم سے یا میران سے؟

وہ اپنی سنجیدہ نگاہیں زونی کے چہرے پہ جمائے بیٹھا تھا اور وہ مارے گھبراہٹ کے لاشعوری طور پر پیچھے کی طرف کھسکتی صوفے سے جا لگی تھی۔ مزید پیچھے جانے کی گنجائش نہیں تھی کیوں کہ پیچھے صوفہ رکھا ہوا تھا۔

"تم ٹھیک ہو زونی!" اس کی بھیگی، دھلی دھلی غلافی آنکھوں پہ اٹکے موتی بتا رہے تھے کہ وہ کافی دیر سے رو رہی تھی وہ خاصا متفکر ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میران سمجھ نہیں پا رہا تھا وہ زونی سے کس طرح دریافت کرے۔ زونی کو چپ کروانے کا پہلے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ یہ شعبہ دادا نے ہی سنبھال رکھا تھا۔ وہ ناراض ہوتی، لڑتی، خفا ہوتی، روتی تو دادا ہی اسے چپ کروا کر منانے کی کوشش کرتے تھے۔ آج سے پہلے زونی اس طرح روتی ہوئی میران کو دکھائی بھی نہیں دی تھی۔ بس دادا کی وفات کے وقت اور بعد میں... لیکن تب تو صورت حال کچھ اور تھی۔ اس نے جان سے پیارے دادا کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا اور اس وقت سسکتی زونی خود بخود ایسے چپ ہوئی جیسے کسی نے بٹن دبا دیا ہو۔ اچانک میران کو دیکھ کر، جیسے اسے میران کے اس وقت یہاں ہونے کی اور اس کے قریب بیٹھنے کی توقع نہیں تھی۔ اس کی غلافی آنکھیں بالکل ساکت تھیں۔ پتلیوں کا عکس ٹھہرا ہوا اور پلکیں یوں کھلی تھیں جیسے کبھی جنبش نہ لیں گی۔

"کیا دادا یاد آ رہے ہیں؟" میران نے اسے ساکت دیکھ کر خود ہی اندازہ لگایا تھا۔ تب زونی کا سر میکانکی انداز میں خود بخود ہل گیا۔ جیسے وہ سر اثبات میں ہلا کر اپنی جان چھڑوانا چاہتی تھی۔ تب گہرا سانس کھینچ کر میران نے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔ پھر آدھا گھنٹہ اسے نرمی اور ملامت سے سمجھاتا رہا۔ گو کہ وہ بہت تھکا ہوا تھا اور کھانا کھانے کے لیے بھی رکنا نہیں چاہتا تھا۔ بس بستر اور نیند کی ضرورت تھی پھر بھی وہ اپنے اتنے مہینوں کی لاپروائی اور کوتاہی کی کسر نکالنا چاہ رہا تھا۔ بہت دیر تک اسے دادا کی جدائی کے غم سے نکالنے کے لیے مختلف مثالیں دینے کے بعد وہ بڑی سنجیدگی اور روانی سے بولا۔

"بے شک دادا تمہیں بہت عزیز تھے اور وہ کبھی بھول بھی نہیں سکتے۔ لیکن فی الحال تم دادا کے لیے پریشان یا غم زدہ نہیں تھیں وجہ کچھ اور ہے۔ اب آرام سے وجہ بتا دو نہ میرا وقت ضائع کرو نہ اپنا..." وہ اس قدر اچانک زونی کو گھیر لے گا اسے امید نہیں تھی۔ وہ لمحہ بھر میں ہی ہکا بکا رہ گئی نہ تو وہ اتنی باشعور تھی نہ جہاندیدہ اور نہ ہی کوئی باکمال اداکارہ... اسے اپنے تاثرات چھپانے نہیں آتے تھے۔ وہ جیسے گڑبڑا سی گئی تھی۔

"ہری اپ زونی! مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔ یہ نہ ہو میں ادھر ہی ڈھیر ہو جاؤں۔" میران کے دھمکانے پہ وہ اس کی بات کو سچ سمجھتی اور بھی گھبرا گئی تھی۔ پھر اسی گھبراہٹ میں بے ساختہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں بھاگتی ہو رکو تم۔" وہ اس کا ارادہ بھانپ گیا تھا اور جس بے ساختگی میں زونی اٹھ کر جانے لگی تھی اسی بے ساختگی میں میران نے، شاید زندگی میں پہلی

مرتبہ اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ خود بھی حیران رہ گیا تھا۔ یہ وہی زونی تھی اس کی نگاہوں کے سامنے پلی بڑھی... روتی دھوتی نخرے دکھاتے۔ دادا کو ستاتی۔ دو پونیاں جھلا کر کالونی کی سڑکوں پہ بھاگتی دوڑتی... ضدیں کرتی۔ اٹھلاتی... لیکن پہلے کی زونی اور اب کی زونی میں کس قدر فرق تھا۔ یا شاید پہلے کی نگاہ اور اب دیکھنے والی نگاہ میں فرق تھا۔ پہلے کوئی اور نظر تھی۔ اب کوئی اور نظر تھی۔ پہلا وقت کچھ اور تھا اب کچھ اور وقت تھا۔ اس کا ملائم مکھن سا ہاتھ میران کے ہاتھ میں دب گیا۔ اتنی شدت کے ساتھ کہ زونی کو چھڑوانا بھی مشکل لگا اور میران کی اپنی کیفیت کس قدر عجیب اور ناقابل فہم قسم کی ہو رہی تھی۔ زونی کے خوب صورت دودھیا ہاتھ کی ساری نرماہٹ اور ملائمت میران کی انگلیوں میں اترنے لگی تھی۔ ایک ان جانا سا احساس دل میں گدازیت بھرتا اپنی جگہ بناتا اٹھا اور لمحوں میں دور دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ کیا یہ چار ماہ پہلے والی زونی تھی؟ لیکن چار ماہ پہلے تو کبھی وہ میران کو اس انداز میں اچھی نہیں لگی تھی۔ وہ ہمیشہ دادا کے سامنے اسے ایک ناسمجھ، کچھ کچھ بدھو اور احمق بچی سمجھتا رہا تھا۔ لیکن وہ اس وقت میران کو پندرہ سالہ احمق بے عقل اور ناسمجھ بچی نہیں لگ رہی تھی۔

اس کے دیکھنے کا انداز بدلا تو جیسے زونی پوری کی پوری بدل گئی۔ یا اسے ہی "بدلاؤ" بڑی گہرائی سے دکھائی دے رہا تھا۔ اور یہ بدلاؤ اسے برا نہیں لگ رہا تھا بلکہ بڑا اچھوتا اور منفرد لگ رہا تھا۔ دل میں خواہشات ابھارتا زونی کا خوب صورت سراپا... دودھ چھلکاتا چہرہ، جو سرتاپا گلابوں میں ڈھلا لگتا تھا۔ غلافی آنکھیں، خوب صورت کٹاؤ دار ہونٹ، وہ اسے لمحوں میں بہت ہی بڑی بڑی سی لگی تھی اور بہت اپنی اپنی سی بھی لگی تھی۔ اس نے بمشکل ہی اپنی نظریں زونی کے حسین کچی کلیوں سے سراپے کی خوشبوؤں سے ہٹائی تھیں، لیکن زونی کا کسمساتا ہاتھ ابھی تک میران کے ہاتھ میں دبا تھا۔ جسے چھوڑنے کا فی الحال اس کا کوئی ارادہ تک نہیں تھا۔

ادھر زونی کی حالت ناقابل فہم سی ہو رہی تھی۔ وہ شدید خوف اور الجھن کا شکار تھی۔ یہ میران کو کیا ہو رہا تھا؟ میران ایسا تو نہیں تھا؟ اس نے زونی کی طرف کبھی غور سے دیکھا تک نہیں تھا۔ کبھی اس قابل ہی نہیں جانا تھا۔ کبھی بات کرنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ کبھی اک نگاہ التفات نہیں ڈالی تھی۔

اور اب کچھ نیا کیا تھا؟ کیوں تھا؟ کیوں ہو رہا تھا؟

اس کے دل میں خدشات کی لہریں اٹھنے لگی تھیں۔ وہموں کے اژدھے پھیل رہے تھے۔ خوف کا سایہ ابھر رہا تھا۔

کیا نائلہ کے وسوسے بے بنیاد نہیں تھے؟

کیا نائلہ ٹھیک تحفظات کا شکار تھی؟

کیا نائلہ ٹھیک کہہ رہی تھی؟

اسے میران کی آنکھوں کے رنگ وہ پہلے سے نہیں لگ رہے تھے۔ بہت بدلے بدلے تھے۔ زونی گھبراہٹ اور خوف کے مارے سپید پڑ رہی تھی اور اس کا کپکپاتا ہاتھ ابھی تک میران کے ہاتھ میں تھا۔

"بتاؤ زونی! تم پریشان کیوں ہو؟" میران نے مختصر سا درمیانی فاصلہ بھی سمیٹ دیا تھا۔ وہ اس کے انتہائی قریب کھڑا تھا۔ اتنا قریب کے اس کی گرم سانسیں زونی کے رخساروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اور زونی کی جیسے جان پہ بن آئی تھی۔

"میں ٹھیک ہو میر!" وہ بمشکل ہکلا کر جان چھڑوانے والے انداز میں بولی تھی۔ لیکن میر کی تسلی نہیں ہو سکی تھی۔ اس نے بے ساختہ نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ جیسے اسے یقین نہ آیا ہو۔

"دیکھو زونی! اگر کچھ پرابلم ہے تو شیئر کرو۔ میں تمہارا اپنا ہوں۔ کوئی اجنبی نہیں۔ اب دادا کے بعد ہم دو ہی تو ہیں اور تو ہمارا کوئی بھی نہیں... تو ہمیں ایک دوسرے سے اپنی پرابلمز شیئر کرنا چاہئیں۔" میران نے ملائمت سے زونی کے کندھے پہ ہلکا سا دباؤ ڈال کر نیچے صوفے پہ بیٹھا دیا تھا اور وہ میکانکی انداز میں بیٹھ گئی تھی۔ پھر وہ خود بھی اس کے برابر بیٹھ گیا۔ ترچھے انداز

میں' ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے تھے۔ بہت قریب۔ میران کا گھٹنا زوفی کے گھٹنے سے مس ہو رہا تھا اور زوفی کی جیسے روح تک کانپ رہی تھی۔ اسے نائلہ کے خدشات پھن پھیلاتے دکھائی دے رہے تھے۔

"تم مجھ سے ناراض ہوگی۔ میں پچھلے چار ماہ سے بہت لاتعلق رہا ہوں۔ لیکن یقین مانو۔ نئی جاب کی مصروفیت نے گھن چکر بنا رکھا تھا۔ لیکن میں تم سے بے نیاز ہرگز نہیں۔" میران کی وضاحتیں زوفی کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں اور مارے اضطراب کے زوفی اندر ہی اندر پیچ و تاب بھی کھا رہی تھی۔

"لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ تمہیں مجھ سے شکایت نہیں ہوگی۔" اس نے زوفی کی آنکھوں میں جھانک کر بڑی گہری سنجیدگی سے کہا تھا۔ زوفی اور بھی بے چین ہو اٹھی تھی۔

"مجھے کوئی شکایت اب بھی نہیں۔" زوفی کے منہ سے بے ساختہ پھسل پڑا۔ میران کچھ چونک گیا تھا۔

"لیکن شکایت تو ہونی چاہیے۔ آفٹر آل میں تمہارا۔" وہ کچھ بولتے بولتے رک سا گیا تھا۔ اور زوفی نائلہ کے خدشے ظاہر کرتی کرتی تھم سی گئی تھی۔

"اینی وے۔ صبح ملاقات کرتے ہیں۔ باقی باتیں کل پہ اٹھا رکھو۔ کل میرا ریسٹ بھی ہوگا۔ ابھی میں سوتا ہوں۔ تم بھی آرام کرو۔ مجھے بھی سخت نیند آرہی ہے۔ اور ہاں سونے سے پہلے کچن کی لائٹس اور برنر وغیرہ چیک کرکے سونا۔ گڈ نائٹ مائی سویٹ اینڈ سائلنٹ بے بی!" میران لمحوں میں سارے "فسوں" کو سمیٹتا اپنا کوٹ' بیگ اور موبائل اٹھا کر اندر چلا گیا تھا جبکہ زوفی کتنی ہی دیر تک اس کی پشت دیکھتی رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے گلاس ونڈو سے باہر کھلتی دھوپ کو بکھرتے دیکھا اور مسکرا دی تھی۔ ہاتھ میں پکڑا نفیس سا کافی مگ لیے وہ کارڈلیس اٹھائی ایک مرتبہ پھر گلاس ونڈو میں آکھڑی ہوئی تھی۔ باہر پارک میں اس وقت ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی بھی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ دور دور تک سناٹا پھیل رہا تھا۔ اس نے کارڈلیس پہ ایک جانا پہچانا نمبر ملایا اور کارڈلیس کان سے لگالیا۔ کچھ دیر بعد کال پک کرلی گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے بڑی نرمی اور حلاوت سے کہا۔

"کافی دن ہوئے۔ تم مجھے دستیاب نہیں ہو رہے تھے۔ آئی تھنک بہت بزی ہو۔ مجھے تم سے کچھ ڈسکس کرنا تھا۔" حال احوال پوچھنے کے بعد اس نے کمال شائستگی کے ساتھ مطلب کی بات دوہرائی تو دوسری طرف فون سننے والا لمحہ بھر کے لیے چونک گیا تھا۔

"ہوں۔ تم ٹھیک سمجھے ہو۔ مجھے اسی کے بارے میں بات کرنا تھی۔" اس نے کافی کا سپ بھرا اور بے ساختہ مسکرا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ کھلتی دھوپ اب زرد دھوپ میں بدلتی جارہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سنجیدگی بھی بڑھتی گئی۔

"نہیں۔ نہیں تھینکس کس بات کا؟ یہ تو میرا فرض تھا۔ پھر ہمارے برسوں کے تعلقات ہیں۔ میں اتنا بھی نہ کرتی؟ تم اب بھی بے فکر رہو۔ میں اس پہ چیک رکھا کروں گی۔ یو ڈونٹ وری۔ بٹ میں اس کی اسٹڈیز کے لیے کچھ کانشس ہو رہی تھی۔" وہ مطلب کی بات پہ آہی گئی۔ کچھ دیر تک دوسری طرف کی بات سننے کے بعد اس نے مزید کہا تھا۔

"تم جانتے تو ہو۔ حشمت انکل کی ڈیتھ پہ میں ادھر نہیں تھی۔ ایکچوئلی میں دبئی نہیں گئی تھی بلکہ اپنے آبائی گاؤں گئی تھی۔ اپنے پیرنٹس سے ملنے۔ جو اب اس دنیا میں نہیں۔ میں نے کبھی اپنی ذات سے پردہ نہیں اٹھایا۔ لیکن تم لوگوں سے کیا چھپانا؟ تم لوگ تو میرے "اپنے" لوگ ہو۔ ان فیکٹ ناصر سے شادی کے بعد میرے پیرنٹس سے تعلقات ختم ہوگئے تھے۔ ایک طویل مدت تک کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔ لیکن ان دنوں جب حشمت انکل کی ڈیتھ ہوئی تب میرے چھوٹے بھائی نے مجھ سے کانٹیکٹ کیا۔ یوں ہمارے

پچھلے کلیش ختم ہوگئے۔ امی ابو سے تو قع نہیں۔ ایک بھائی کا سہارا تھا۔ وہ جب اس شہر میں آیا تو مجھ سے ملا بھی۔ ان دنوں ہماری ہی کالونی میں اس نے چھوٹی سی ٹیوشن اکیڈمی بنائی ہے۔ کافی اچھی شہرت بھی رکھتی ہے۔ میں خود سیکنڈ ٹائم وہاں کلاسز لوں گی۔ تو اگر تم چاہو۔ میں زوفی کا بھی ایڈمیشن کروادوں۔ تم تو دن بھر گھر نہیں ہوتے۔ رات کو بھی دیر سے آتے ہو۔ وہ اکیلی رہ رہ کر خبطی ہو رہی ہے۔ باہر نکلے گی تو فریش ہو جائے گی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟" ایک لمبی تمہید کے بعد نائلہ نے وہ بات کرلی تھی جو اسے کرنا ہی تھی۔ پھر وہ دوسری طرف میزان کی بات سننے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد اس کے چہرے پہ ایک خوب صورت مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"تھینک یو سو مچ مجھ پر بھروسا کرنے کا شکریہ۔ ارے کیوں نہیں۔ میں اس کا خیال نہیں رکھوں گی تو کون رکھے گا؟ تم بس فکر مت کرو۔ زوفی کی ذمہ داری مجھ پر چھوڑ دو۔" نائلہ نے انتہائی ملائمت اور شائستگی سے کہتے ہوئے فون بند کردیا تھا۔ اب وہ مسکراہٹ دبا کر ایک اور نمبر ڈائل کر رہی تھی۔

پہلی ہی بیل پہ کال ریسیو کرلی گئی تھی۔ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"کہاں تھے؟ کیا اکیڈمی۔؟"

"ہوں ٹھیک ہے۔" پھر وہ اثبات میں سر ہلا کر سنجیدگی سے بولی تھی۔ کافی دیر تک وہ دوسری طرف کی بات سنتی رہی۔

"جواد! تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔ میرا سرمایہ تمہیں کیا خبر۔ میں تمہیں دوبارہ پاکر کس قدر خوش ہوں۔ ناصر نے مجھے ورغلا کر بھٹکا دیا تھا۔ میں اپنے والدین سے دور ہوگئی تھی۔ صد شکر کہ تمہیں میرا خیال آیا۔ تم نے اپنا دل صاف کرلیا۔ میرے لیے یہی احساس کافی ہے۔" نائلہ کی آنکھوں میں نمی بھر گئی تھی۔ اس نے آنکھیں مسلتے ہوئے دوسری طرف سے آتی آواز سنی تھی' پھر دوبارہ بولی۔

"میں جانتی ہوں۔ یہ شہر تمہارے لیے نیا ہے تمہیں یہاں قدم جمانے میں بہت وقت لگے گا۔ مگر تم فکر مت کرو۔ میں ہوں نا۔ تمہیں سپورٹ کروں گی۔" نائلہ کی آواز میں جوش بھر گیا تھا۔ پھر وہ ذرا جھنجلا گئی تھی۔

"ارے بابا! تعداد بھی بڑھ جائے گی۔ ابھی تو آغاز ہے۔ اور کالونی کے لوگ بے شک تمہیں نیا اور اجنبی جان کر تم پہ اعتماد نہ کریں۔ اپنے بچے نہ بھیجیں۔ لیکن مجھ پہ ضرور اعتبار کریں گے۔ دیکھنا دنوں میں کام چل جائے گا۔" نائلہ نے اسے بھرپور تسلی دی تھی۔

"ہوں ٹھیک ہے بابا! تم کرائے کے جھنجھٹ میں خود پڑے ہو۔ ورنہ میرا فلیٹ بھی بہت کشادہ تھا۔ جب کام چل گیا تو اکیڈمی فلیٹ میں شفٹ کرلیں گے۔" وہ اپنا اگلا لائحہ عمل بتا رہی تھی۔

"میں تمہارے لیے کسی بھی حد تک جاکر کوشش کروں گی۔ اور میں نے مزید بھی تمہارے لیے "اسٹوڈنٹس" گھیر لیے ہیں۔" نائلہ اب ہلکے پھلکے لہجے میں اس کی ٹینشن ریلیز کرنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ جو اپنی اکیڈمی کی کامیابی پہ اتنا پر یقین نہیں تھا۔

"ارے۔ وہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔ دیکھنا میں تمہارے لیے آسمان کا تارا توڑ لاؤں گی۔" نائلہ کا جوش قابل دید تھا۔

"اسے میری بے پر کی مت سمجھو۔ تم دیکھ لینا۔ آزما لینا۔ بس دنوں میں سب کچھ بدل دوں گی۔ تم ساری عمر مجھے دعائیں دیتے رہو گے۔ پھر عمر بھر کام دھام کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔" وہ کافی کا مگ میز پر رکھ کر مسکرائی تھی۔ پھر اس نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ سامنے والے فلیٹ کی طرف دیکھا تھا۔ آج فلیٹ میں خاموشی نہیں تھی۔ نہ تالا لگا ہوا تھا۔ آج تو معمول سے ہٹ کر چہل پہل تھی۔ نائلہ کا فطری تجسس عود آیا۔

☼ ☼ ☼

اور جب گھڑی گیارہ کے ہندسے پہ پہنچی تب وہ ٹی وی کا والیم کچھ اونچا کرتا کوئی اٹھارویں مرتبہ صوفے

سے اٹھ کر زونی کے کمرے تک آیا تھا۔ جیسے ہی دروازے کی جھری سے اندر کا منظر نظر آتا وہ گہرا سانس کھینچتا واپس پلٹ جاتا تھا۔ زونی بے خبر سوئی ہی دکھائی دیتی تھی۔

اس وقت بھی پیر کی ٹوہ سے اس نے دروازے کو دھکیلا تو دروازہ کھلتا چلا گیا تھا۔ پھر اس نے زونی کے پیر کا انگوٹھا ہلایا۔ اور یہ ہلانا کچھ 'کام' آگیا تھا۔ زونی مندی مندی آنکھیں کھولتی اٹھی تھی پھر میران کو سامنے دیکھ کر جیسے اچھل ہی پڑی۔

"آپ...؟" اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز برآمد ہوئی تھی۔ یعنی ایک اور انوکھا واقعہ۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میران کا اس کے کمرے تک آنا۔ ہاتھ پکڑنے کے بعد کمرے تک چلے آنا کیا معنی رکھتا تھا۔

وہی پھن پھیلاتے نائلہ کے کہے الفاظ اس کی آنکھوں کے سامنے گول گول ناچنے لگے تھے۔ وہ لمحوں میں خوفزدہ ہوگئی تھی۔ پھر جلدی سے کچھ سنبھل کر دوپٹا اٹھاتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ تاہم اس دفعہ وہ میران کو جتلائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"یہ تو مینرز کے خلاف ہے۔" اس کا انداز برہم سا تھا۔ منہ بھی سوج گیا تھا۔ یا پھر میران کو ہی ایسا لگا۔ وہ خاصا چونکتا ہوا سیدھا ہوتے ہوئے بولا تھا۔

"کیا؟" میران کی آنکھوں میں حیرانگی تھی۔ جیسے وہ اس کی بات کا مطلب نہ سمجھا ہو۔ گوکہ وہ سمجھ تو گیا تھا پھر بھی۔ "کسی کے کمرے میں بنا پرمیشن کے آنا۔" زونی نے سابقہ برہم انداز میں کہہ ہی دیا تھا۔ وہ بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپا سکا۔

"لیکن میں کسی کے کمرے میں تو نہیں آیا۔" اس نے جان کر انجان بنتے ہوئے کہا تھا۔ زونی اور بھی برہم ہوئی۔

"یوں آنا مناسب نہیں لگتا۔" زونی سے کچھ بات نہ بن پڑی تو وہ محض زیرلب بڑبڑا کر رہ گئی تھی۔

"تو پھر کس طرح آنا مناسب لگتا ہے۔ تم مجھے طریقہ بتادو۔" یکایک میران کو اس بحث میں لطف آنے لگا تھا۔

"مجھے نہیں پتا۔" وہ روہانسی ہوگئی تھی۔ میران بے مزا ہوا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟ تمہیں کیوں نہیں پتا؟" اس نے بلاوجہ بحث کو طول کرنا چاہا تھا۔ اسے پہلی مرتبہ پتا چلا تھا زونی اچھی بھلی گفتگو بھی کرلیتی ہے۔ اور اختلاف رائے بھی رکھتی ہے۔ خاصی گہرائی میں جانے کی حد تک محتاط بھی ہے۔ میران کو اس کا محتاط انداز بہت بھلا لگا تھا۔ اسی لیے وہ بڑی شفافیت سے مسکرادیا۔

"میں تو تمہیں جگانے کے لیے آیا تھا۔ گیارہ بج چکے ہیں۔ مجھے مارکیٹ بھی جانا تھا۔ راشن بھی ختم ہے کچن سے ہم لسٹ بنادو۔ مگر پہلے ناشتے کا بندوبست کرو۔ میں پچھلے چار ماہ سے سوکھے توس کھا کھا کر تنگ آچکا ہوں۔ دادا چلے گئے تو سارے مزے بھی گئے۔ تم اچھا بھلا ناشتا بنادیا کرتی تھی۔" اس نے آنے کی "وجہ تسمیہ" بیان کی تو زونی بھی سر پہ ہاتھ مار کر جلدی سے واش روم کی طرف بھاگی تھی۔

"پھر جب وہ ہاتھ منہ دھو کر واپس لاؤنج میں آئی تو میران صوفے پر لیٹا تھا۔ ٹی وی کا والیم بہت بلند تھا۔ زونی نے ریموٹ اٹھا کر والیم کم کیا۔

"نائلہ آنٹی گھر پہ ہیں آج۔ وہ ڈسٹرب ہوں گی شور سے۔" اس نے قدرے خفگی سے "جتا" کر کہا تھا تب میران کو بھی خیال آیا۔

"تمہاری آنٹی کی صبح کال آئی تھی۔" وہ جو کچن کی طرف والیم کم کرکے جارہی تھی لمحہ بھر کے لیے رک گئی تھی۔ پھر حیرت سے مڑی اور بے چینی سے بولی تھی۔

"کیوں؟" اس کے دل میں وسوسے سے جاگ گئے تھے۔ کہیں آنٹی نے اپنے خدشات تو نہیں میران کے سامنے کھول دیئے تھے؟

"کیا تمہیں اسٹڈیز میں پرابلم ہے؟" اس نے الٹا سوال کیا تھا۔ زونی کا سر بے ساختہ اثبات میں ہل گیا۔ اس کی اسٹڈیز پرابلم کا میران کو کیسے پتا چلا؟ وہ کچھ حیران ہوئی تھی۔

"ہے تو۔ پہلے نائلہ آنٹی پڑھا دیتی تھیں۔ لیکن اب وہ اپنے بھائی کی اکیڈمی جوائن کریں گی۔" اس نے تفصیل بتائی تو لمحہ بھر کے لیے وہ سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

"آنٹی نائس خاتون ہیں۔ اگر وہ اکیڈمی جائیں تو تم بھی ساتھ چلی جانا۔ میں ایڈمیشن کروا دوں گا۔ پیسوں کا مسئلہ نہیں' بس بندہ بھروسے والا ہونا چاہیے۔ آنٹی ساتھ ہوں گی تو مجھے بھی فکر نہیں ہوگی۔" کچھ دیر بعد میران نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ زوفی بھی مطمئن ہو گئی تھی۔ کیونکہ بائیو اور فزکس میں اسے بہت پرابلم تھی۔ دادا کی ڈیتھ کے دوران اس کی پڑھائی کا بہت حرج ہوا تھا۔ نائلہ جب تک ٹائم دے رہی تھی ٹھیک تھا۔ اب آگے تو ویسے بھی زوفی کو ٹیوشن پڑھنا تھی کسی بھی اکیڈمی کو جوائن کرنا تھا۔ پھر یہ تو اپنی کالونی میں ہی تھی۔ اور آنٹی کی گارنٹی بھی موجود تھی سو میران کو بھی تسلی ہو گی اور زوفی بھی مطمئن تھی۔

ویسے بھی اسکول کے بعد کا ٹائم اچھا نکل جاتا۔ گھر میں قید رہ رہ کر وہ بہت قنوطی ہوتی جا رہی تھی۔ ناشتا بناتے ہوئے وہ مسلسل یہی باتیں سوچ رہی تھی۔ تب تک میران بھی نہا کر فریش ہونے کے بعد کچن میں آگیا تھا۔ آج اس کا ریسٹ تھا۔ سو اس کی گھر میں موجودگی زوفی کے دل کو اندر ہی اندر بہت انوکھی سی خوشی سے ہم کنار کر رہی تھی۔

دادا کے بعد اس کا واحد رشتہ اور واحد سہارا میران ہی تھا۔ بہت بچپن سے لے کر اب تک وہ ایک دوسرے کے کبھی قریب نہیں تھے۔ دادا کی لاکھ کوششوں کے باوجود میران کا رویہ ہمیشہ لیا دیا رہتا تھا۔ پھر دادا کے انتقال سے پہلے وہ افرا تفری والی ناگہانی سچویشن۔ جس میں دادا نے میران کو سخت مجبور اور بے بس کر دیا تھا۔ وہ چاہ کر بھی مرتے ہوئے دادا کی خواہش نہ رد کر سکا۔ وہ سب بہت اچانک ہوا تھا۔ دنوں ذہن قبول ہی نہ کر سکا۔ پھر دادا کا انتقال' گھر کی ذمہ داری' جاب کی مصروفیت۔۔۔ میران آج تک زوفی کو نظر انداز کرتا آرہا تھا۔

دادا کے بعد زوفی اس کی ذمہ داری تھی۔ اس کی ہر ضرورت پوری کرنا ہر لحاظ سے میران کا فرض تھا۔ اس کے حقوق پورے کرنا' اس کا خیال رکھنا اس کی ضرورتوں پہ نظر رکھنا میران کا اخلاقی شرعی اور انسانی فرض تھا۔ اور فرض سارے قضا ہوتے جا رہے تھے۔

وہ شدید ندامت میں مبتلا ہوا۔ اگر وہ اپنے منہ سے جھجک کے تحت یا فطری حیا شرم کی وجہ سے نہیں کہہ رہی تھی تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا میران بھی جان بوجھ کر نظر انداز کرتا۔ نہ وہ ایسا بچہ تھا کہ ان نزاکتوں کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ چھبیس سال کا انتہائی سمجھ دار' باشعور اور خاصا زیرک جوان تھا۔ جیسے ہی اس نے بہت ساری چیزوں پہ غور کیا تو اپنی بے شمار غلطیاں نظر میں آگئی تھیں۔ سو اس نے مزید وقت ضائع کیے بغیر ان غلطیوں پہ قابو پانا شروع کر دیا تھا۔ اور یہی "فہم" کا تقاضا بھی تھا۔

جب زوفی نے نہایت مہارت کے ساتھ بل دار خستہ پراٹھا اور آملیٹ اس کے سامنے رکھا تب وہ بے ساختہ خوش اور حیران ہوا تھا۔

"زوفی! تم واقعی ہی بڑی ہو گئی۔" وہ اتنے اچھے گول سنہرے پراٹھے پہ غور و فکر کرتے ہوئے بولا تھا۔ تب زوفی نے اس کی حیرانی کم کرتے ہوئے کہا۔

"جب دادا زندہ تھے۔ میں تب بھی ایسے پراٹھے بناتی تھی۔"

"لیکن تب میرے حصے میں جلا ہوا پراٹھا کیوں آتا تھا۔؟" اس کی آنکھوں میں شرارت بھری ہوئی تھی۔ رات کے وقت اور ابھی بھی زوفی سے باتیں کرنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ اور وہ سمجھ بھی رہا کہ زوفی اچھی باتیں کر لیتی ہے۔ وہی کبھی فیض یاب نہیں ہوا تھا۔ اور اسے اس بات پہ خاصا افسوس بھی ہو رہا تھا۔

"جلے ہوئے لوگوں کو ہر چیز جلی دکھائی دیتی ہے۔" زوفی نے اطمینان سے دوسرا پراٹھا اس کی پلیٹ میں رکھتے ہوئے اسے خاصا بے اطمینان کر دیا تھا۔ میران کو پانی پیتے پیتے اچھو لگ گیا تھا۔

"میں جلتا ہوں۔" میران کو اپنی اس خامی کا ابھی

ابھی ادراک ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرانگی سی بھر گئی تھی۔ زوفی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مگر کس سے؟" اس نے بے ساختگی میں پوچھا۔

"مجھ سے۔" زوفی نے دکھی دل کے ساتھ اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔ میران بڑا ہی مضطرب ہوا اور بمشکل اپنی ہنسی کو چھپا سکا تھا۔

"کیسے؟" اس کی آنکھوں میں مزے دار سی شرارت بھری تھی۔

"میں جانتی ہوں۔ آپ میری اور دادا کی محبت پہ جلتے تھے اور آپ کو لگتا تھا میں آپ کی محبت پر قابض ہو چکی تھی۔" زوفی نے اپنے انداز اور سمجھ کے مطابق بڑی گہری بات کی تھی۔ میرانی کو پھر سے کھانسی لگی تھی۔ وہ بمشکل بول پایا۔

"لیکن تم نے میرے حصے کی محبت پر قبضہ نہیں کیا تھا۔" میران نے اسے گلٹ سے نکالنا چاہا۔ زوفی نے اپنی بات پر زیادہ زور دیتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا تو تھا۔ دادا مجھے ہی زیادہ چاہتے تھے۔" وہ اپنی بات پہ سنجیدگی کے ساتھ قائم تھی۔ کچھ سوچ کر میران نے بھی تسلیم کر لیا۔

"اگر تم یہ سمجھتی ہو تو ایسا ہی ہوگا۔ اب اس کا ازالہ کر دو۔"

"مگر کیسے؟" میران کے دوبارہ دوہرانے پر وہ ذرا ہکلا ہی گئی تھی۔ وہ تو اس پر ثابت کرنا چاہ رہی تھی کہ دادا زوفی کو زیادہ چاہتے تھے۔ وہ زوفی کو اتنا گیا گزرا بھی نہ سمجھے۔ دادا کے بعد جیسے وہ منہ لگانا بھی پسند نہیں کرتا تھا اور چار ماہ بعد جس زوفی کا اسے خیال آیا تھا کہ وہ بھی اس گھر میں موجود ہے۔ اور زندہ بھی ہے۔ دادا ہوتے تو زوفی کی ایسی "ناقدری" کبھی نہ ہونے دیتے چار ماہ تک دادا کے اس مغرور پوتے نے زوفی سے کلام کرنا پسند نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب تو یہی تھا وہ زوفی سے جلتا ہے۔ اور یہ بھی سوچتا ہوگا۔ اچھا ہے۔ دادا کے بعد تنہا اکیلی اور خود میں گم صم رہ کر قنوطی ہوتی رہے۔ دادا کی زندگی میں جتنی زبان چلاتی تھی اتنا اب خاموش رہے۔ یہ جلن اور کھولن نہیں تھی تو اور کیا تھا؟ زوفی کو پکا گمان تھا۔ دادا کے بعد' وہ اس سے پچھلے بدلے گن گن کر لے گا۔ دادا بھی تو زوفی کی خاطر میران کو بہت ڈانٹا کرتے تھے۔ وہ زوفی کو ہوم ورک نہ کرواتا تب بھی ڈانٹ پڑتی۔ وہ اسے ٹیسٹ یاد نہ کرواتا تب بھی ڈانٹ پڑتی۔ وہ اسے سہیلی کے گھر نہ لے کر جاتا تب بھی ڈانٹ پڑتی۔ اس کا من پسند لزانیہ نہ لے کر آتا تب بھی ڈانٹ پڑتی۔ ماضی تو بھرا پڑا تھا ایسے واقعات سے جس میں میران کو زوفی پہ بہت تب چڑھا کرتی تھی وہ زوفی سے بہت چڑتا تھا اسے غصہ بھی ہوتا اور کبھی کبھار ایک آدھ چانٹا بھی لگا دیتا تھا۔ دادا سے نظر بچا کر۔ زوفی کو یاد تھا آج بھی یاد تھا۔ ایک مرتبہ چاند رات کو دادا نے میران سے کہا۔

"زوفی کو مہندی لگوا لاؤ۔ اور چوڑیاں بھی خرید لاؤ۔" وہ جو بن ٹھن کر اپنے دوستوں کے ہمراہ چاند رات کی رونقیں دیکھنے جا رہا تھا اس "حکم نامے" پہ بری طرح چڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا غصہ بھر گیا تھا۔ اور ماتھے پر سلوٹیں بھی ابھر آئی تھیں۔

"زوفی کے کپڑے آج بلکہ ابھی درزن نے سلائی کر کے بھیجے ہیں۔ ساتھ لے کر جائے گی تو میچنگ چوڑیاں لے کر آئی گی۔ مہندی کس کے ساتھ جاتی لگوانے۔ تم صبح سے گھر نہیں تھے کب سے تمہاری راہ تک رہی تھی۔ تم ابھی آئے اور ابھی چل دیے میں تو بائیک چلانے سے رہا۔ ورنہ تمہیں کبھی نہ کہتا۔ خود چلا جاتا۔"

"آپ اتنے رش میں بازار جا سکتے ہیں؟ بیمار ہونا ہے کیا؟ آرام سے گھر بیٹھیں۔ میں لے جاتا ہوں۔" میران نے پھولے منہ کے ساتھ تب دادا سے تو کہہ دیا تھا۔ وہ بے ساختہ خوش بھی ہو گئے تھے' لیکن سارے رستے میران نے زوفی کو وہ کھری کھری سنائی تھیں کہ آج تک اسے وہ چاند رات نہیں بھولی تھی۔ وہ بائیک ایسے چلا رہا تھا جیسے ہوا میں اڑ رہا ہو۔ اوپر سے اس کی سڑی ہوئی جلی کٹی باتیں۔ آسمان کو چھوتا غصہ۔

"اتنا لمبا پروگرام تھا۔ آؤٹنگ اور ڈنر کا۔ بیڑہ غرق کر کے ستیاناس کر دیا۔" میران نے پارکنگ میں بائیک ایک جھٹکے

سے روکتے ہوئے کلس کر کہا تھا۔

"ابھی تو بہت ٹائم ہے میں جلدی فارغ ہو جاؤں گی۔" زونی خوف زدہ سی بولی تھی پھر واقعی ہی اس نے منت سماجت کر کے جلدی پارلر سے جان چھڑوالی تھی۔ چوڑیاں بھی خرید لیں۔ تب ہی دادا کی کال آگئی تھی۔ انہوں نے میران سے دعولس بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"زونی کو لزانیہ بھی کھلا کر لانا۔ آئس کریم بھی۔ اسے بہت پسند ہے۔" وہ آرڈر دے کر فون بند کر چکے تھے۔

مرتا کیا نہ کرتا۔ دادا کے سامنے انکار کی جرات نہیں تھی۔ لیکن فون بند کر کے وہ زونی پہ الٹ پڑا تھا۔

"اچھی جان کو چمٹ گئی ہو۔ تمہارے کام ہی ختم نہیں ہوتے۔ زونی کا یہ کرو' زونی کا وہ کرو۔ زونی کا گلا نہ دبا دوں۔؟" وہ پھر سے اسے بٹھا کر بائیک اڑاتے ہوئے چیخ رہا تھا۔ زونی آنکھیں میچے خوف سے دہری ہوتی آیت الکرسی پڑھ رہی تھی۔ کم از کم عید دیکھے بغیر وہ مرنا نہیں چاہتی تھی۔ اور اتنا پیارا جوڑا۔ سینڈل اور یہ چوڑیاں۔ ابھی تو اس نے انہیں پہنا ہی نہیں تھا۔

اور پھر جب وہ لوگ واپس آرہے تھے تب ٹریفک میں پھنس گئے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد واپسی ہوئی تب تک رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ دادا نے میران کو دوبارہ نکلنے ہی نہ دیا تھا۔ کیونکہ رات گئے وہ میران کے باہر جانے گھومنے پھرنے کو مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

یوں زونی کی وجہ سے میران کا پروگرام چوپٹ ہو گیا تھا۔ اس کے دوست کال کر کے تھک چکے تھے۔ میران نے غصے میں فون بند کر دیا تھا اور اس کا سڑا بسا منہ دیکھ کر دادا بار بار بڑے لاڈ سے میران کو کہتے تھے۔

"اتنے سڑے ہوئے کیوں بیٹھے ہو۔ آج چاند رات ہے۔ ہنسو کھیلو۔" تب وہ غصے سے چیخ پڑا تھا۔

"کیسے کیسے ہنسو کھیلوں۔ چاند رات باہر ہے اندر نہیں۔" اس کا غصہ کم نہ ہوتا تھا۔ وہ ٹی وی لگا کر منہ پھلا کر بیٹھ گیا تھا۔ تب دادا نے بڑی محبت اور لاڈ سے اسے سمجھایا۔

"چاند رات باہر نہیں۔ دل کے اندر ہی ہوتی ہے میری جان۔ بس دل کا خوش ہونا ضروری ہے۔ دل کا تاروں سے سجا ہونا ضروری ہے۔ پھر تم اکیلے کہاں ہو۔ زونی ہے نا تمہارے ساتھ۔ اس کو اپنی باتیں سناؤ۔ کچھ اس کی سن لو۔ تم دو نہیں۔ تم سے تو کئی اور زیادہ ہوں گے۔ اس گھر میں تم دونوں سے ہی آگے بھی رونق لگے گی۔ یہ گھر آباد ہوگا۔ تم دونوں سے ہی آباد ہوگا۔ میں نہ بھی ہوا تب بھی۔" وہ چمکتی آنکھوں سے اکھڑے اکھڑے پوتے کو دیکھتے تھے تب وہ جلتا' کلستا خاموش ہو جاتا تھا۔ کسی گہری سوچ میں گم ہو جاتا تھا۔ یعنی وہ تب بھی دادا کی ہر معنی خیزیات کی گہرائی کو سمجھ لیتا تھا لیکن تب زونی ان باتوں کو نہیں سمجھتی تھی۔ اسے بس اتنا محسوس ہوتا تھا کہ میران اس سے جلتا ہے۔ اور اسی تناظر میں غائب دماغی سے اس نے میران کو وہی پچھلی باتیں جتلا دی تھیں اور ابھی وہ اس "جتلانے" کے باعث بری طرح سے پھنس چکی تھی۔ کیونکہ میران نے اس کی بات کو پکڑ لیا تھا۔

"تو اب ازالہ کرو۔ یہ تو تمہارا فرض بنتا ہے۔ کیونکہ تمہاری وجہ سے دادا نے مجھے ہمیشہ ڈانٹا' غصہ کیا اور کبھی پیار نہیں کیا۔" میران مبالغہ آمیزی کی حد کر رہا تھا۔ زونی تھوڑا جھنجلا گئی تھی۔ اب ایسا بھی نہیں تھا۔ دادا کو میران بھی بہت پیارا تھا۔

"میں کیسے ازالہ کروں؟" وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"یہ تو تمہیں پتا ہونا چاہیے۔" میران معصوم بنا تھا۔

"دادا تو اب نہیں۔" زونی نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ میران ترنت بولا۔

"ان کی پوتی تو ہے نا۔" اس کے لبوں پر زچ کر دینے والی مسکراہٹ تھی۔

"میں کیا کر سکتی ہوں؟" وہ جیسے ہونق ہوئی۔

"تم پیار تو کر سکتی ہو نا۔؟" میران آنکھوں میں ڈھیروں شرارت بھرتے ہوئے بولا تھا۔ پہلے تو زونی سمجھ ہی نہیں پائی تھی پھر جیسے ہی اس کی بات سمجھ

آئی۔ زونی نے پیڑا ہاتھ سے رکھا اور اور حواس باختہ سی کچن سے باہر نکل گئی تھی جبکہ میران بھی ناشتا ادھورا چھوڑ کر اس کے پیچھے بھاگتا ہوا چلا گیا تھا۔ اس انداز میں کہ چہرے پہ اب بھی مسکراہٹ تھی۔

میران کے الفاظ اب بھی اس کا دل دھڑکا رہے تھے۔ اس پہ شدید گھبراہٹ طاری تھی۔ اور دل کی حالت بہت عجیب تھی۔ یوں پسلیاں توڑنے میں ہلکان ہو رہا تھا جیسے ابل کر باہر آگرے گا۔

اس کا چہرہ بہت گرم اور سرخ ہو رہا تھا۔ اور ہتھیلیاں پسینے سے تر بتر تھیں۔ دل پہ وارد ہونے والی کیفیت بہت اجنبی تھی۔ بہت الگ تھی۔ بہت ان چھوئی اور معصوم تھی۔ اسے دھڑکنوں کے تال بدلنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ بہرحال اسے یوں لگ رہا تھا جیسے میران کے الفاظ کی گداز یت دل میں نرم نرم سی ہلچل مچا رہی ہے۔ اس نے بہت دفعہ چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نادیدہ سے احساس کو مٹانا چاہا تھا جو چہرے پہ سرخی کی طرح چھاتا جا رہا تھا۔

اور پھر میران دوبارہ بولتا ہوا اس کے پیچھے چلا آیا۔ وہ مارے گھبراہٹ کے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔ میران ڈور فریم میں جم کر کھڑا رہ گیا۔ وہ پچھلے چار ماہ والے میران سے الگ تھا۔ بالکل الگ اور مختلف۔ بہت اپنا اپنا سا۔ بہت خیال رکھنے والا۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی اسے پہلے والے میران کی ضرورت تھی یا اب والے میران کی؟

"زونی! آج تم انیس سو اکہتر والی ہیروئن کیوں بن رہی ہو؟ میں جہاں جاتا ہوں۔ تم آگے بھاگ جاتی ہو۔ کم آن یار مذاق کو سمجھا کرو۔ اتنا سنجیدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔؟ میں زبردستی تھوڑی "پیار" وصول کروں گا۔" اس کا انداز اب بھی شرارتی تھا۔ زونی کا دل پھر سے سرپٹ بھاگنے لگا۔ دھڑ دھڑ دھڑکنے لگا تھا۔

یہ میران کو کیا ہو گیا تھا؟ میران کو کیا ہو رہا تھا؟ یہ ایک ہی رات میں اتنا کیسے بدل گیا تھا؟ یا پھر نائلہ آنٹی کے خدشات؟ کیا خبر یہ دوسرے سچ ہونے کے قریب ہوں؟ اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے خوف اتر آیا تھا۔

"اب کس مراقبے میں کھڑی ہو۔ چلو لسٹ بناؤ۔ کچن کے لیے کیا کیا چیزوں کی ضرورت ہے؟ فریج بھی خالی ہے۔ جوس تک پینے کے لیے نہیں۔ انڈے بریڈ سب ندارد۔ کم از کم اتنا تو بتا دیا کرو۔ فلاں فلاں چیز کی ضرورت ہے۔" وہ بولتا ہوا باہر نکلا تو زونی بھی پنسل کاپی اٹھا کر حواسوں میں آتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔

پھر ان دونوں نے مل کر اتنی لمبی لسٹ بنالی تب میران بوکھلا سا گیا۔

"آج تو پورا دن اسی کام میں لگ جائے گا۔" اس کا انداز زرسوچ قسم کا تھا۔ زونی نے اسے مشورہ دیا۔

"کچھ چیزیں اگلے ہفتے پہ اٹھا رکھتے ہیں۔"

"اوں ہوں۔" میران نے نفی میں سر ہلایا۔

"نیکسٹ ویک کیا پتا کوئی اور کام نکل آئے۔ آج کا کام' آج ہی ہونا چاہیے۔ تم ناشتا کرو پھر اکھٹے نکلتے ہیں۔" وہ اسے کچن کی طرف بڑھتے دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ زونی کو اچنبھا ہوا۔ پراٹھے پہ اچار کی پھانک رکھ کر نوالہ توڑتی زونی کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔

"کیا مطلب؟ میں بھی جاؤں گی؟" اسے حیرت کے مارے غش آنے لگے تھے۔ ابھی ایک ہی نوالہ توڑ کر منہ میں رکھا تھا۔ جو حلق میں ہی پھنس گیا۔

"لیکن آپ کہاں جا رہے ہو؟" وہ رو دینے کو ہو گئی تھی۔ میران اس کی کیفیت پہ بات کرتے کرتے اچانک رک گیا تھا۔ پھر اس کی غلافی آنکھوں میں پیار سے دیکھ کر نرمی سے بولا۔

"میں دادا کے پاس نہیں جا رہا۔ سلی گرل!" زونی کے آنسوؤں نے اس کا دل اور ابھی ملائم کر دیا تھا۔ وہ میران کے لیے کانشس ہوتی اسے اپنے دل کے کچھ اور قریب لگی تھی۔

"آپ مجھے چھوڑ کر جا بھی کیسے سکتے ہو؟" زونی نے دل ہی دل میں خفگی سے جتلایا تھا۔ میران لسٹ کو تہہ کر کے ٹراؤزر کی پاکٹ میں رکھتا اس کے قریب آگیا۔ پھر اس نے زونی کا سر نرمی سے سہلایا تو وہ بے ساختہ کچھ چونک کر گھبرا گئی تھی۔

"میں نے ناشتا کرلیا ہے چلتے ہیں میر!" زونی نے برتن اٹھا کر سنک میں رکھ دیے تھے۔ گھر آکر انہیں دھونے کا ارادہ رکھتی تھی۔ فی الحال تو وقت نہیں تھا۔ باہر گرمی بھی بہت تھی۔ مزید دیر ہونے کی صورت میں سورج اور بھی گرم ہو سکتا تھا۔

میران اپنا والٹ اور کار کی چابی اٹھا کر لے آیا۔ یہ نئی کرولا اس نے حال ہی میں خریدلی تھی۔ جو نائلہ کو بھی بہت پسند آئی تھی اور وہ بھی چاہتی تھی سوزوکی بیچ کر کرولا خریدلے۔ پھر جیسے ہی وہ دونوں آگے پیچھے اپنے فلیٹ سے باہر نکلے تب نائلہ کسی نوجوان کے ساتھ سوزوکی میں جاتی دکھائی دی تھی۔ ان کی گاڑی کمپاؤنڈ سے باہر نکلی تو میران نے زونی کو بتایا۔

"یہ جواد ہے۔ نائلہ کا بھائی۔ نائلہ کے اپنی فیملی سے کچھ کلیش تھے۔ پیرنٹس کی ڈیتھ کے بعد ان کے بھائی نے تعلقات بحال کرلیے ہیں۔ اس کی اکیڈمی میں تمہارا ایڈمیشن کروادوں گا۔ ٹھیک ہے نا؟" وہ زونی سے رائے لے رہا تھا وہ بھلا کیا جواب دیتی؟ اگر نائلہ آنٹی کا بھائی تھا۔ تو پھر ٹھیک ہی تھا۔

"اور دیکھو زونی! تمہیں دھیان سے پڑھنا ہے۔ محتاط رہ کر۔ آنٹی کے ساتھ ہی جانا اور آنٹی کے ساتھ ہی آنا۔" میران مزید بھی اسے سمجھا رہا تھا۔ اس نے اثبات میں سرہلادیا۔ کرولا ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے رکی تو میران باہر نکلتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں نیچے اسٹور سے راشن خرید تا ہوں۔ تم اوپر جاؤ۔ اپنی ضروری چیزیں خرید لو۔" میران نے نرمی سے اسے دیکھا تو وہ سرہلا کر رہ گئی تھی۔ تو گویا میران اسے گھر سے اسی مقصد کے تحت لایا تھا تاکہ وہ اپنے لیے ضرورت کی چیزیں خرید سکے۔ وہ دل ہی دل میں میران کی سمجھداری اور زیرکی کی قائل ہو گئی تھی۔

اور جب وہ ٹرالی گھسیٹتی نیچے آئی تو سامنے ہی نائلہ سے ٹکراؤ ہو گیا۔ وہ اپنے ہینڈسم بھائی کے ہمراہ آئی ہوئی تھی۔ زونی کو دیکھ کر نائلہ قریب آگئی۔ پھر اس نے اپنے بھائی سے زونی کا تعارف کروایا۔

"یہ زونی ہے جواد! جس کی میں نے اتنی تعریفیں کی تھیں۔ بتاؤ تعریف کے قابل ہے نا۔" نائلہ اس کے حسین مکھڑے پہ چمکتے پسینے کو دیکھ کر اپنے ازلی بے تکلفانہ کھلے ڈلے انداز میں تعارف کی رسم نبھا رہی تھی۔ نائلہ کا بھائی بھی اسی کی طرح خوش مزاج اور بے تکلف تھا۔ اس نے اپنی بہن کی طرح ہی جواب دیا۔

"تعریف سے بہت اوپر سویٹ اینڈ انوسینٹ۔ میری نیو اسٹوڈنٹ۔" جواد نے گہری نظر سے زونی کا مطالعہ کیا تو وہ کچھ گھبرا گئی تھی۔

"جواد اتنا ہی فرینڈلی اور جولی ہے۔ دنوں میں بچے اس کے گرویدہ ہو چکے ہیں۔ اینی وے جان! تم آئی کس کے ساتھ ہو؟" نائلہ اس کی گھبراہٹ کو سمجھ کے بات بدلنے والے انداز میں بولی تھی۔ زونی نے اپنے ماتھے سے پسینے کے قطرے پونچھ کر بتایا۔

"میران کے ساتھ۔" اس کی آواز بھی کپکپا رہی تھی۔ جانے وہ اس قدر لوگوں کے سامنے کنفیوژ کیوں ہو جاتی تھی۔ اور پھر نائلہ کا بھائی اس کی گرم سی نگاہیں۔ بہت تفصیلی ایکسرے کرتی ہوئیں۔ گو کہ وہ خاصا نفیس اور ڈیسنٹ تھا پھر بھی زونی کو تھوڑا عجیب ہی لگا۔ وہ بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی نگاہوں سے زونی کو الجھن ہو رہی تھی۔

"میران بتا رہا تھا۔ تم سنڈے سے اکیڈمی جوائن کرلوں گی۔" نائلہ نے اس کی گھبراہٹ کو کم کرنا چاہا تھا۔ تب اس نے اثبات میں سرہلادیا۔

"ویری گڈ مجھے انتظار رہے گا۔ اور ہاں دیکھنا جواد دنوں میں تمہارا سلیبس کور کروائے گا۔ ماشاءاللہ سے ایم ایس سی گولڈ میڈلسٹ ہے۔" نائلہ نے بڑے فخریہ انداز میں اپنے خوب صورت بھائی کو دیکھتے ہوئے بتایا تھا۔ جیسے اس کا بھائی اس کے لیے کسی "میڈل" سے کم نہ ہو۔ زونی بھلا کیا تبصرہ کرتی؟ بس مسکرادی تھی۔ اسی پل میران بھی فارغ ہو کر پہنچ گیا۔ تب اس کی نگاہ جواد پر پڑی تو دونوں طرف سے خاصی گرم جوشی اور اخلاق کا مظاہرہ ہوا تھا۔ جواد کچھ زیادہ ہی خوش مزاج تھا۔ منٹوں میں بے تکلف ہو گیا۔ جبکہ میران مزاجا" کچھ الگ تھا۔ وہ اتنی جلدی کسی سے گھلتا ملتا نہیں

تھا۔ ابھی تو یہ اخلاق بھی محض نائلہ کی وجہ سے تھا کیونکہ نائلہ کی بہرحال وہ بہت ریسپکٹ کرتا تھا۔

یوں پہلا تعارف جواد سے ڈپارٹمنٹل اسٹور میں ہوا تھا۔ جو بڑھتا ایک حد پہ آکر رک گیا۔ جواد بہت ذہین اور حاضر دماغ تھا۔ نائلہ نے اس کی ٹھیک ہی تعریف کی تھی۔ اس نے دنوں میں اپنا سکہ جمالیا۔ اور اسٹوڈنٹس بھی اس سے مانوس ہو چکے تھے۔ اس کے پڑھانے کا طریقہ اتنا منفرد الگ اور بہترین تھا کہ ایک ہی دفعہ میں لیکچر سمجھ میں آجاتا تھا۔ اس کے پاس بے شمار آئیڈیاز تھے۔ اور وہ کانسپٹ کی مشین تھا۔ ایسے ایسے طریقوں سے سمجھاتا کہ دماغ میں جم جاتا تھا۔ پھر بھولتا ہی نا۔

زونی دل ہی دل میں جواد سے متاثر ہو چکی تھی۔ اور اس دن والی جواد کی نظروں کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔ کیونکہ بعد میں کبھی جواد نے ایسی نگاہوں سے دیکھ کر زونی کو چوکنا ہونے کا موقع نہیں دیا تھا۔ یوں دنوں میں ہی جواد کے نام کا پوری کالونی میں طوطی بولنے لگا تھا۔ اور اس نے اپنے قدم اچھی طرح سے جمالیے تھے۔

☼ ☼ ☼

اتوار کے دن باہر رم جھم شروع ہوئی تو پھر رکی ہی نہیں۔ موسم بڑا خوشگوار ہو گیا تھا۔ بادل گھر گھر کے آرہے تھے۔ ہلکی پھلکی بارش نے گرمی کا کچھ توڑ کر ہی دیا تھا۔

جیسے ہی بارش رکی تو زونی نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ نائلہ کا فلیٹ سامنے تھا جس کا دروازہ بھی کھلا تھا۔ کچھ دیر بعد جواد اندر جاتا دکھائی دیا۔

"سر جواد آئے ہیں۔۔؟" زونی نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور پھر کچن میں آگئی تھی۔ کچھ دیر پہلے اس نے بریانی بنائی تھی۔ کباب بھی فرائی کرکے رکھے تھے اس نے ایک ٹرے میں بریانی کی پلیٹ رکھی کباب اور رائتہ ڈالا۔ ٹرے ڈھک کے وہ دروازہ بھیڑ کے سامنے والے فلیٹ میں آگئی تھی۔ اسے دیکھ کر نائلہ اور جواد کھل اٹھے تھے۔

"زہے نصیب! آج تو بڑے بڑے لوگ آئے ہیں۔" جواد خوش دلی سے مسکرادیا تھا۔ زونی کچھ جھینپ گئی تھی۔

"زونی! تم تو نظر ہی نہیں آتی۔" نائلہ بھی کچن سے نکل آئی تھی۔ اسے دیکھ کر نائلہ نے بے ساختہ شکوہ کیا۔

"آپ بھی تو بہت بزی ہو چکی ہیں۔ ایک ہفتے سے اکیڈمی بھی نہیں آرہیں۔" زونی نے بھی جوابا" جتلایا تھا۔

"آفس میں کام بہت ہوتا ہے گڑیا! آؤ تم بیٹھو نا۔" نائلہ نے پیار سے کہا۔ تب ہی جواد کی نظر ٹرے پہ پڑی تھی۔

"کیا لائی ہو زونی!۔" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"بریانی۔" زونی نے بتایا تھا۔

"کس کے لیے؟" جواد نے ٹرے اٹھالی تھی۔ پھر کچن سے اسپون اور پانی کی بوتل نکال لایا۔

"ظاہر ہے تمہارے لیے کیوں کہ زونی جانتی ہے میں نے کبھی چاول نہیں کھائے۔" نائلہ کے جواب پر زونی کچھ جھینپ کر اثبات میں سرہلانے لگی تھی۔

"اور زونی نے آج تک ہمارے گھر چاول نہیں بھیجے۔ تو پھر یہ تمہارے لیے ہوئے نا۔ کیوں کہ تمہیں بریانی پسند ہے۔" نائلہ نے مزید بھی جواد کو یقین دہانی کروائی تھی۔ اسے جیسے یقین آگیا تھا۔

"یہ عنایت ہم پہ ہی کیوں؟" جواد نے چپ کھڑی زونی کو مخاطب کیا تھا۔

آپ میرے "سر" جو ہیں۔۔" زونی سادگی سے بولی۔

"اور اگر سر کے تاج بن گئے تو؟" جواد نے برجستگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ زونی عادتا" سمجھ ہی نہیں سکی تھی۔ ہونقوں کی طرح مسکراتی رہی تھی۔ عام طور پر بھی وہ بروقت سوچنے والی باتوں کو کافی عرصے بعد سوچا کرتی تھی اور بہت بعد میں غور و فکر کرنے والے عقل مند نہیں گنے جاتے۔ احمق ترین شمار ہوتے ہیں۔

"جواد! ابھی نہیں۔۔" نائلہ نے کچن سے ہی تنبیہہ

کی تھی۔

"آپا! اسے کچھ سمجھا رہا ہوں۔ سر کے تاج کا مفہوم۔" جواد نے شرارت سے ہانک لگائی تھی۔

"زونی بہت سادہ ہے۔ اسے تنگ مت کرو۔" نائلہ نے خفگی سے جواد کو ڈپٹا تھا۔ وہ بریانی کھاتے ہوئے برابر تعریف بھی کرتا رہا۔

"تو ڈاؤٹ یقین نہیں آتا۔ اتنی اعلا بریانی تم نے بنائی ہے۔ زونی تم تو کمال کی بندی ہو۔"

"تمہاری زونی میں بہت خوبیاں ہیں جس گھر میں جائے گی چار چاند لگا دے گی۔ انتہائی سگھڑ سلیقہ مند۔"

نائلہ کی بے تحاشا تعریفوں نے اسے خفت سے سرخ کر دیا تھا۔ دادا بھی ایسے ہی زونی کے پکائے کھانوں کی تعریفیں کرتے تھے۔ کیوں کہ کوکنگ تو زونی نے بہت جلدی سیکھ لی تھی اور بہت اعلا قسم کی سیکھی تھی۔ البتہ تعریف کے معاملے میں میران بہت کنجوس تھا۔ خال خال ہی تعریف کرتا۔ بہت موڈ میں ہوتا تب۔ ورنہ نہیں۔

اور یہ دونوں بہن بھائی بہت کھلے دل اور کھلی زبان والے تھے۔ تعریفوں کے بے دریغ ڈونگرے برساتے تھے۔ زونی دل ہی دل میں بہت خوش ہوتی تھی۔ اپنی تعریف کسے بری لگتی ہے؟ اور زونی کو صحیح معنوں میں اب ادراک ہوا تھا کہ اس میں اتنی پوشیدہ خوبیاں موجود تھیں جن کی اسے خود خبر نہیں تھی۔

ایک دن زونی کلیوں والی سرخ فراک پہن کر اکیڈمی گئی تو خاص طور پر سر جواد نے اس کی تعریف کی۔ پوری کلاس کے سامنے۔ زونی شدید خفت زدہ ہوئی تھی۔ پھر جب وہ گھر آنے لگی تو سر جواد نے اکیڈمی سے باہر نکلتے ہوئے جنگلی گلاب کا پودا دیکھ کر ایک گلاب کو توڑا اور زونی کی سمت بڑھا دیا تھا۔

سرخ گلاب کے لیے سرخ گلاب کا تحفہ۔" سر جواد کا انداز بہت شائستہ اور محبوبانہ قسم کا تھا۔ زونی مسکرا دی تھی۔ پھر اس نے گلاب بھی پکڑ لیا۔

چھٹی کے وقت وہ سر جواد کے ساتھ واپس آتی تھی۔ کیوں کہ اندھیرا پھیل جاتا تھا اور سر جواد کو بھی نائلہ کے فلیٹ تک آنا ہوتا تھا۔ دونوں کا روٹ ایک تھا سو وہ پیدل مارچ کرتے گھر پہنچ جاتے تھے۔ اس دوران جولو زونی سے ڈھیروں باتیں کرتا تھا۔ وہ بہت باتونی تھا۔ اسے بھی بولتے رہنے کا کریز تھا۔ سو وہ ہر ٹاپک پہ بے دریغ بول سکتا تھا۔

جواد کو گفتگو کرنے کا سلیقہ بھی تھا۔ پرسنالٹی بھی چارمنگ تھی۔ تعلیم بھی تھی۔ سو وہ دلوں کو "موہ" لینے کے فن سے آشنا تھا۔

کبھی کبھی اکیڈمی میں جلدی کام ختم ہو جاتا تو جواد اسے پارک کی طرف لے آتا۔ وہ پارک کے رستے سے ہوتا ہوا آئس کریم کارنر سے کون پکڑتا اور زونی کو لیے پارک میں آ جاتا۔ وہ واک کرتے کرتے ڈھیروں باتیں کرتے تھے ہر موضوع پہ، ہر ٹاپک پہ۔ ہر انداز سے وہ گفتگو میں کمال رکھتا تھا۔ پھر ایک دن پارک کے قریب سے گزرتے ہوئے جواد نے محبت کا موضوع چھیڑ لیا۔

"تم پیار پہ یقین رکھتی ہو زونی!" اس نے اچانک موضوع بدل کر "پیار" کی بحث چھیڑی تھی کہ زونی کچھ ہونق سی ہو گئی۔ وہ تو آزاد میڈیا پہ بات کر رہے تھے، بیچ میں محبت کہاں سے آ گئی تھی؟ بیچ میں پیار کہاں سے آ گیا تھا؟ زونی نے حیرانگی سے زیر لب بڑبڑا کر کہا۔

"پیار؟" اسے یہ لفظ اتنا اجنبی سا نہیں لگا تھا۔ یہ لفظ بہت دفعہ دادا بھی استعمال کرتے تھے اور ایک مرتبہ میران بھی کر چکا تھا۔ یہ لفظ اجنبی تو ہرگز نہیں تھا۔ دادا تو اکثر میران اور زونی کی موجودگی میں کہا کرتے تھے۔ جب وہ دونوں دادا کے پاس بیٹھ کر بھی ایک دوسرے سے گفتگو نہیں کرتے تھے۔ بلکہ میران ٹی وی لگائے رکھتا اور زونی اخبارات کھنگالا کرتی تھی۔ وہ دونوں بہت کم آپس میں بولتے تھے اور دادا چاہتے تھے وہ دونوں ان کے سامنے ہنسا بولا کریں۔ باتیں کیا کریں۔ لیکن ہنسنا بولنا تو بہت کم ہوتا تھا البتہ اکثر میران کو اس پہ غصہ آ جاتا تھا۔ کبھی ٹیسٹ خراب ہونے پہ، کبھی اس کا پڑھایا ہوا جب زونی کو ٹھیک سے

سمجھ نہ آتا تب وہ غصے میں بولنے لگتا تھا اس دوران دادا لاٹھی ٹیکتے باہر نکل آتے تھے۔

"کبھی تو ہنس بول لیا کرو۔ کبھی تو آپس میں "پیار" سے بات کر لیا کرو۔" دادا "پیار" پہ بہت زور دیا کرتے تھے۔ ان کی ہر بات کی تان پیار پہ آ کر ٹوٹ جاتی تھی۔ وہ ان دونوں میں "پیار" دیکھنا چاہتے تھے اور پیار تھا کہ ہوتا ہی نہیں تھا۔ پیار تھا کہ درمیان میں آتا ہی نہیں تھا۔ اور میران "پیار" کے نام پہ جز بز ہو جاتا تھا۔

"تم کبھی زونی سے پیار نہیں کرتے۔ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔" دادا جب میران کو "گھیر" لیتے تو اس کی "بچت" ناممکن ہو جاتی تھی۔ وہ بری طرح سے پھنستا تھا۔

"زونی سے پیار آپ کو دکھا کر کروں؟" وہ چڑ جاتا تھا۔ خفا ہو جاتا تھا۔ پھر اٹھ کر باہر نکل جاتا اور یہ دادا کی وفات سے چند دن پہلے کی باتیں تھیں۔ وہ اس دن بھی بڑی آزردگی کے ساتھ میران کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بیٹھے تھے اور بار بار ایک ہی بات دوہراتے۔

"میرے بعد زونی کا خیال رکھنا۔ میرے بعد زونی سے پیار کرنا۔" اور تب میران نے پہلی مرتبہ بہت خفگی سے جتلایا تھا۔

"آپ کو زونی کی فکر رہتی ہے۔ میری کوئی پروا نہیں۔" گو کہ وہ ایسا شکوہ کر کے انہیں آزردہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر بھی زونی کے "پیار" والے موضوع سے ہٹانے کے لیے ان کا دھیان بٹانا ضروری تھا۔

"تم سمجھدار ہو میرو! زونی ناسمجھ ہے۔ معصوم ہے۔ اسے پل پل رہنمائی کی ضرورت رہے گی۔ تمہاری مجھے فکر نہیں۔ زونی کے لیے دل پریشان رہتا ہے۔ اسے سوجھ بوجھ نہیں۔ اسے اچھائی برائی کا پتا نہیں۔ اس نے "دنیا" کو دوسری نگاہ سے دیکھا ہی نہیں۔ اس کی دنیا ہم تینوں تک محدود ہے۔ اسی لیے تو کہتا ہوں۔ زونی کا خیال رکھنا۔ زمانہ بہت اور ہے۔ یہ دور بہت اور ہے۔ لوگ اوپر سے کچھ اندر سے کچھ ہوتے ہیں۔ کسی کے "اندر" کی کیا خبر۔ بس تم میری زونی سے پیار کرتے رہنا۔" دادا کی ہر نصیحت ہر بات ہر دلیل کی تان زونی سے "پیار" کرنے کی تسلی پہ آ کر ٹوٹ جاتی تھی۔ تب میران بھی ماحول کی کثافت کے اثر کو زائل کرتے ہوئے بولتا تھا۔

"آپ فکر مت کریں۔ میں زونی کو آپ والا پیار دوں گا۔" اس کی شرارت کو دادا خوب سمجھ لیتے تھے۔ پھر ان کے زرد بیمار ویران چہرے پہ مسکراہٹ آ جاتی تھی۔

"نہیں۔ تم زونی کو بس "اپنے" والا پیار ہی دینا۔" دادا کی کمزور نحیف آواز کی بازگشت ابھی تک زونی کے کانوں میں گونجتی تھی اور اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر جاتی تھیں۔ پھر ایک مرتبہ میران نے بھی زونی سے کہا تھا۔ "تو تم اپنے پیار سے ازالہ کر دو۔" گویا لفظ "پیار" ایسا اجنبی نہیں تھا جس پہ زونی کو چونک جانا پڑتا۔ یا وہ حیران ہو کر جواد سے پوچھتی کہ لفظ پیار ہوتا کیا ہے؟ اور اس وقت گھر کی طرف جاتی فٹ پاتھ پہ دھیرے دھیرے چلتی زونی پیار کے گورکھ دھندے میں الجھ رہی تھی اور جواد اس سے پیار کی تشریح چاہتا تھا۔ زونی اسے یہ نہیں کہہ سکی تھی کہ "پیار" اس کے سلیبس کا حصہ نہیں تھا۔ نہ نصاب میں شامل تھا۔ البتہ اس نے ایک مختلف بات ضرور کی تھی۔

"مجھے پیار پہ یقین ہے۔" اس کا جواب حیران کن تھا۔ اگر جواد اس سے پوچھ لیتا "کیسے یقین ہے؟" تو زونی بھلا کیا جواب دے سکتی تھی؟ اس کے پاس ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل بھی نہیں تھی۔ کوئی جواز بھی نہیں تھا لیکن جواد نے ایسا سوال نہیں کیا تھا بلکہ اس نے کوئی بھی سوال نہیں کیا تھا بس اس نے ایک حیران کن بات زونی کو بتائی تھی۔ اتنی حیران کن کہ زونی لمحہ بھر کے لیے بھونچکی رہ گئی تھی۔

یہ سر جواد کیا کہہ رہے تھے؟ کیا؟۔۔۔ وہ چونک کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"زونی! اکچولی! مجھے پیار ہو گیا ہے۔" سرمئی پھیلتی شام میں ایک سایہ سا اس پہ ٹھہر گیا تھا۔ زونی ہکا بکا سی جواد کا چہرہ دیکھتی رہی۔

وہ اپنی لیسنر کلاس کی اسٹوڈنٹ سے کیسی بات کر رہا تھا؟ کیوں؟ آخر کیوں؟

اسے یہ بات اپنی "آپا" کو بتانی چاہیے تھی۔ زونی کو کیوں بتا رہا تھا؟

"میں اتنا بے بس ہوں کہ بتا نہیں سکتا۔ یہ سب اچانک ہوا۔ بہت اچانک۔ تمہیں کیا خبر زونی! یہ پیار محبت کی "واردات" بالکل اچانک ہوتی ہے۔" وہ بالوں کو انگلیوں میں جکڑ تا کسی کرب ناک اذیت میں مبتلا تھا۔ زونی کو اس پہ ترس آنے لگا۔ وہ اس کی تکلیف کو کیسے کم کر سکتی تھی؟ وہ اس کی اذیت کو کس طرح سے کم کر سکتی تھی؟

"اف سر جواد نے یہ کیسا روگ پال لیا تھا۔" زونی دکھی دل کے ساتھ سوچ رہی تھی سرمئی شام اس پہ عکس تان رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

دنوں کو جیسے "پر" لگے ہوئے تھے۔ ابھی کل اتوار گزرا تھا اور آج پھر اتوار سر پہ کھڑا ہو گیا۔ اتوار والے دن اکیڈمی سے چھٹی ہوتی تھی۔ میران بھی پورا دن گھر میں رہتا تھا۔ بس اس وقت گھر سے نکلتا جب مارکیٹ سے سامان وغیرہ لانا ہوتا تھا۔ زونی ہفتہ وار صفائی منا رہی تھی۔ ہر اتوار وہ پورا گھر صاف کرتی تھی۔ پردے کشن کورز وغیرہ جھاڑتی پونچھتی۔ لیکن آج اس نے مشین نکالی تھی اور سارے پردے کورز چادریں وغیرہ مشین میں ڈال دی تھیں۔ جب تک میران سو کر اٹھا تھا تب تک زونی نے آدھے سے زیادہ کپڑے دھو لیے تھے وہ فریش ہو کر تولیہ گلے میں ڈالتا باہر آیا تو زونی دھڑا دھڑ کپڑے بالٹی میں نکال رہی تھی۔ میران کے ہونٹوں پہ اس کا "سگھڑاپا" دیکھ کر مسکراہٹ آگئی تھی۔

"زونی! تم بہت گھر ہستن ہوتی جا رہی ہو۔" وہ سیڑھی کے نچلے اسٹیپ پہ بیٹھ گیا تھا۔ زونی الجھے بکھرے بالوں کو کانوں پیچھے اڑستی چونک گئی تھی۔ پھر میران کو دیکھ کر سادگی سے بولی۔

"تو پھر کون کرے؟ کپڑوں کا اتنا ڈھیر جمع ہو رہا تھا۔"

"تم آنٹی سے کہو نا۔ کسی میڈ کا بندوبست کر دیں۔" میران نے ذرا سنجیدگی سے مشورہ دیا تھا۔ زونی نے نفی میں سر ہلایا۔

"آنٹی کو خود نہیں مل رہی۔"

"پھر تو یہ مسئلہ ہوا نا۔" وہ متفکر ہو چکا تھا۔ زونی بے چاری پہ کس قدر کاموں کا بوجھ تھا۔ اسے آج اندازہ ہو سکا تھا۔ کچن میں پریشر ککر چل رہا تھا۔ سلیب پہ پرات میں گیلا کیا آٹا رکھا تھا۔ پانی ڈال کر تاکہ نرم ہو سکے اور آسانی سے گوندھا جائے۔ میز پہ زونی کے نوٹس رکھے تھے۔ گاہے بگاہے وہ ان پہ بھی نظر ڈال رہی تھی۔ ساتھ کپڑے بھی دھو رہی تھی۔ جب سوکھ جاتے تو استری الگ کرنے پڑتے۔ میران اس کی ننھی جان پہ اتنا "بار" دیکھ کر رہ نہیں سکا تھا۔ اوپر سے دادا کی بازگشت نے بھی اچانک دھاوا بول کر پریشان کیا تھا۔

"میری زونی کا بہت خیال رکھنا۔"

اسے زونی پہ بڑا ترس اور پیار آیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر زونی کے پاس آگیا۔ پھر اس نے بالٹی اٹھا کر زونی سے کہا۔

"میں یہ پھیلا آتا ہوں۔" وہ پچھلی طرف لگی الگنی پہ کپڑے ڈالنے چلا گیا تھا۔ زونی کے ہزار انکار اور نہ نہ کے باوجود بھی۔ پھر اس نے زبردستی زونی کو اٹھایا۔

"جاؤ تم ناشتا بناؤ۔ میں مشین سے کپڑے نکالتا ہوں۔"

"میرو! آپ کس طرح....." وہ تذبذب کا شکار تھی۔ ہکلا رہی تھی۔ میران نے نرمی سے اسے کچن کی طرف دھکیلا۔

"میں پراٹھا نہیں بنا سکتا۔ ورنہ خود بنا لیتا۔"

"آپ بھی نا میر!" زونی جھنجلا کر کچن میں چلی گئی تھی۔ پھر جب تک وہ آملیٹ پراٹھا اور چائے بنا کر لائی تب تک میران نے مشین دھو کر سکھا بھی دی تھی۔ اب وہ کپڑے الگنی پہ ڈالنے گیا تھا۔ واپس آیا تو سوکھے کپڑوں کا ڈھیر اٹھا رکھا تھا۔ زونی نے میران کے ہاتھ سے کپڑے پکڑ لیے۔ اب وہ کارپٹ پہ بیٹھ کر تہیں لگا

رہی تھی اور میران ناشتا کرتے ہوئے بغور زونی کو بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے دھیان میں گم تھی۔ لیکن میران کی نظروں کا ارتکاز اس نے جلدی محسوس کر لیا تھا۔ وہ ذرا گھبرا سی گئی تھی۔ پھر ایک تہہ اٹھا کر اندر رکھ آئی جب وہ دوبارہ واپس آئی تب میران گہری سوچ میں تھا۔ زونی ایک دو مرتبہ چور نگاہ ڈال کر اپنے کام میں لگ گئی تھی۔ لیکن اس کا دھیان میران کی طرف ہی تھا۔

تھوڑی دیر بعد زونی نے خود ہی میران کو مخاطب کیا۔

"چائے ٹھنڈی ہوتی جا رہی ہے۔" اس کی آواز سن کر میران چونک گیا تھا۔ پھر وہ گہری سوچوں کے بھنور سے بھی نکل آیا تھا۔ اس نے چائے کا کپ بھی اٹھا لیا تب زونی نے دوبارہ کہا۔

"گرم کر لاؤں؟"

"نہیں۔ بہتر ہے۔" میران نے اشارے سے منع کر دیا تھا۔ زونی خائف سی بیٹھ گئی۔ نجانے کیا مسئلہ تھا؟ وہ کیوں اتنا سنجیدہ ہو گیا تھا؟ وہ دل ہی دل میں جوڑ توڑ لگانے لگی تھی۔ معاً میران کی بہت سنجیدہ سی آواز ابھری تھی۔ زونی چونک کر دیکھنے لگی۔

"زونی! تمہاری اسٹڈیز کمپلیٹ ہونے میں کتنا عرصہ درکار ہو گا؟" اس کا سوال زونی کو حیران کر گیا تھا' یہ زونی سے پوچھنے والی بات تو نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا زونی کی تعلیم مکمل ہونے میں کتنا عرصہ لگ سکتا تھا' پھر اس سے کیوں پوچھ رہا تھا۔ زونی بس اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

"تقریباً" چار سال تو کیے ہیں۔۔۔ مزید اگر تم چاہو گی تو دو سال اور۔۔۔ اور کل ملا کر چھ سال یہ تو بہت لمبا عرصہ ہو گا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟" وہ بولتا ہوا زونی کے ہونق چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ زونی بھلا کیا جواب دیتی؟ وہ ٹکر ٹکر اس کی صورت تکتی رہی تھی۔ وہ اس وقت خاصا سنجیدہ لگ رہا تھا۔

"کبھی کبھی ناگہانی سچویشن میں انسان کو بروقت اسٹینڈ لینا چاہیے مجھے لگتا ہے۔۔۔ دادا کا فیصلہ بالکل ٹھیک تھا۔" وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا اور پھر سابقہ سنجیدگی سے دوبارہ شروع ہو گیا تھا۔ زونی جانتی تھی وہ دادا کے کس فیصلے کی تعریف کر رہا تھا؟ وہ دادا کے کس فیصلے کو اس وقت درست کہہ رہا تھا۔

"زونی! انسان کبھی بھی اپنی عمر سے بڑا نہیں ہوتا۔ انسان کو تجربہ بڑا کرتا ہے۔" میران کی سنجیدگی ہنوز برقرار تھی۔

خالی کپ کو ٹیبل پہ کھسکا کر سیدھا ہوا۔

"تمہارا کوئی بھی بڑا اب اس دنیا میں نہیں۔۔۔ کوئی قریبی عزیز بھی نہیں۔۔۔ میں اس وقت تمہارا "بڑا" ہوں۔۔۔ تم سے بڑا بھی ہوں۔۔۔ اور تمہارا قریبی عزیز بھی ہوں۔" وہ تمہید سے قریب تر اصل بات کی طرف آ رہا تھا۔ زونی کا دل دھک دھک دھڑکنے لگا۔

"زونی! میں نے بہت سوچ کر ایک فیصلہ کیا ہے۔" میران نے لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد کہا تھا۔ زونی کا روم روم کان بن گیا۔ وہ بڑے غور اور دھیان سے میران کو سن رہی تھی۔ میران کیا کہنے والا تھا؟ وہ کون سا دھماکا کرنے والا تھا؟

"گو کہ یہ قبل از وقت ہے۔ پھر بھی میں چاہتا ہوں۔ تمہیں اس کمرے سے اپنے کمرے تک لے آؤں۔" میران نے جیسے دو جملوں میں بات مکمل کر دی تھی' زونی ہکا بکا سی اسے دیکھتی رہ گئی۔ میران کا واضح اشارہ کس بات کی طرف تھا۔

☼ ☼ ☼

باہر چلچلاتی دھوپ لشکارے مار رہی تھی۔ آج غضب کی گرمی تھی۔ بارشوں کے بعد والا حبس ناقابل برداشت تھا۔ پسینہ پانی کی طرح بہتا اور لوڈشیڈنگ کے طفیل رات رات بھر لائٹ نہیں آتی تھی۔ یوں نیند تو بالکل پوری نہ ہوتی۔ اس کی طبیعت بھی کچھ خراب تھی۔ رات سے فلو ہو رہا تھا۔ اوپر سے رات بھر بجلی کی وجہ سے ٹھیک طرح نیند بھی نہیں آئی تھی۔ سر بہت بھاری تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔

جب وہ کچن میں آئی تو سر چکرا رہا تھا اوپر سے میران کی کل والی باتیں ذہنی انتشار کا باعث تھیں اور جب وہ میران کی باتوں کو سوچتی تو الجھنے لگتی۔ کہاں تو وہ دادا کے

ہر فیصلے پہ اختلاف رکھتا تھا۔ ان کے آخری دم تک مخالفت اور انکار کرتا رہا۔ بعد میں جیسے تیسے "سہی مجبورا" جو بھی اس نے کیا' انتہائی بے بسی کی حالت میں کیا۔ لیکن زونی تو جانتی تھی میران نے دل سے کوئی بھی فیصلہ قبول نہیں کیا تھا۔ اور وہ میران پہ کیوں زبردستی مسلط ہوتی؟ ٹھیک ہے وہ وقت ایسا تکلیف دہ تھا جب وہ خود بھی کسی انکار یا اعتراض کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ لیکن اب حالات ویسے نہیں تھے۔ اس کے ذہن میں سر جواد اور نائلہ آنٹی کی باتیں گونج رہی تھیں۔

"زونی! تم بہت انٹیلی جینٹ ہو۔ اسٹڈیز کو ڈراپ کبھی بھی نہ کرنا۔ تمہیں بہت آگے تک جانا ہے۔" سر جواد کی باتیں اس کے حوصلے اور ہمت کو بڑھاتی تھیں۔ وہ اور بھی ولولے اور جوش سے پڑھتی۔ سر جواد کہتے تھے۔ "اسے دوسروں پہ انحصار نہیں کرنا چاہیے۔" دوسروں میں "میران" ہی شامل تھا۔ جس پہ زونی انحصار کرتی تھی اور ہر قدم اس سے پوچھ کر اٹھاتی تھی۔ لیکن سر جواد کہتے تھے اسے ان ڈیپنڈنٹ ہونا چاہیے۔ خود مختار ہونا چاہیے۔ اپنے ڈیسیژن خود لینے چاہیے۔ وہ دوسروں کی انگلی پکڑ کر چلنا چھوڑ دے۔" وہ بااعتماد نہیں تھی۔ لیکن سر جواد کہتے تھے "وہ بااعتماد ہو سکتی تھی اگر وہ پہلے مڑ مڑ کر میران کی طرف دیکھنا چھوڑ دیتی تو۔"

"میران تمہاری زندگی پہ بہت حاوی ہے۔" ایک دن کلاس کے بعد سر جواد نے باتوں باتوں میں زونی سے کہا تو اس نے اندر ہی اندر تسلیم کر لیا تھا۔ واقعی ہی میران اس کی زندگی پہ بہت حاوی تھا۔ لیکن اب ایسا ہونے والا نہیں تھا۔ میٹرک کے رزلٹ کی کامیابی کے بعد ایف ایس سی میں ایڈمیشن پہلی مرتبہ اس نے میران کی مخالفت کے بعد لیا تھا' اس نے کالج بھی اپنی پسند کا چوز کیا تھا' جو گھر سے بہت دور تھا اور سبجیکٹ بھی من پسند رکھے تھے۔ میران چاہتا تھا وہ آئی سی ایس کرلے۔

کیوں کہ اگر وہ میڈیکل میں جاتی تو اسے گھر اور اسٹڈیز کو مینیج کرنا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ لیکن یہاں پہ زونی نے پہلی مرتبہ اس سے اختلاف کیا تھا۔ وہ نہ صرف سختی کے ساتھ اپنی ضد پہ اڑی رہی تھی بلکہ اس نے میران کو بھی مجبور کر دیا تھا' تاکہ وہ اس کی بات مان سکے۔ اور یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ جو زونی اتنا روڈلی بی ہیو کرتی رہی تھی۔ میران اچھا بھلا شاکڈ رہ گیا تھا۔

"زونی! تم میری بات کیوں نہیں سمجھ رہیں۔۔۔ میں جو بکواس کر رہا ہوں وہ تمہارے دماغ میں کیوں نہیں سماتی۔" وہ تپ کر بولا تھا۔

"کاش کہ ہمارے ماں باپ ہوتے یا صرف تمہارے ہی ہوتے یا دادا ہی نہ مرتے۔ کم از کم کوئی تو تمہیں سمجھانے والا ہوتا۔ اب میں تمہیں کون کون سی "باریکیاں" سمجھاؤں؟" میران غصے میں کھول رہا تھا۔

"تم کچھ نہیں مینیج کر سکوں گی۔ میڈیکل کی تعلیم بہت مشکل ہے اور ایک گھر بار والی لڑکی کے لیے اور بھی مشکل۔ جس کو سپورٹ کرنے کے لیے کوئی بزرگ عورت بھی نہ ہو۔ آخر میں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟" وہ بری طرح سے چڑ گیا۔

"ابھی بھی تو پڑھتی ہوں۔ گھر بھی دیکھتی ہوں۔" اس نے پہلی مرتبہ تیز لہجے میں بات کی تھی۔ میران غصے بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"اب اور تب میں فرق ہو گا۔ محض دو مہینے تک تمہاری زندگی میں تبدیلی آجائے گی۔"

"کیسی تبدیلی؟" وہ بھی غصے میں بولی تھی۔ "ابھی مجھے کوئی تبدیلی قبول نہیں۔ مجھے پڑھنا ہے۔" زونی ضدی انداز میں گویا ہوئی تھی اور یہ ضد کسی اور کی ودیعت کردہ تھی۔ اس کی اپنی سرشت میں "ضد" تو تھی نہیں۔ میران چونکتا یا ٹھٹکتا کیوں نا۔

"تو پڑھتی رہنا۔ میں کب روک رہا ہوں۔ لیکن میڈیکل نہیں۔" اس کا انداز فیصلہ کن تھا۔

"کیوں نہیں! آپ خرچہ کرنے سے ڈرتے ہیں۔" زونی نے ایک بے تکی بات کر کے اسے اور بھی غصہ دلا دیا تھا۔ میران سرخ آنکھوں سے اسے گھورتا رہا۔

اب تو اسے یقین ہو چکا تھا زونی کسی کی باتوں میں آکر بکواس کرتی جا رہی ہے۔

"جسٹ شٹ اپ زونی!" وہ بہت شدت کے ساتھ چلایا تھا۔ "میرا میٹر مت گھماؤ۔ ورنہ ایک طمانچہ دے ماروں گا۔ بس دادا کی وجہ سے لحاظ کرتا جا رہا تھا ابھی تک۔۔۔ ورنہ تمہیں اس بدتمیزی کا مزا چکھا دیتا۔ تمہیں تکلیف ہوئی تو دادا کو بھی تکلیف ہو گی۔ اور تم میری نرمی کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔" اس کا انداز وارننگ دینے والا تھا۔

"اور جو تم نے طعنہ دیا ہے وہ نرا فضول ہے۔ میں تمہارا ایف ایس سی میں ایڈمیشن کرواتا ہوں۔ لیکن آگے تم بی ایس کرو کی میڈیسن نہیں پڑھو گی دیٹس آل۔" وہ غصے میں بھناتا اٹھ کر چلا گیا تھا۔ لیکن اس نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ نائلہ سے ضرور بات کرے گا تاکہ وہ زونی کو سمجھائے کیوں کہ نائلہ کی بات وہ سمجھ سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ کالج سے باہر نکلی تو وین کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ جانے آج وین کہاں رہ گئی تھی؟ وہ قدرے پریشان سی ہو گئی۔ ابھی اس نے موبائل پرس سے نکالنا چاہا ہی تھا کہ میران کو کال کر سکے۔ جب اچانک اس کے قریب بائیک آرکی تھی۔ زونی ڈر کر تھوڑا پیچھے ہٹی تھی۔ سامنے دیکھا تو سر جواد نظر آئے۔ زونی کی جیسے جان میں جان آگئی تھی۔

"اوف اس وقت تو کچھ اور بھی مانگ لیتی تو مل جاتا۔" اس نے بے ساختہ تشکر بھرا سانس خارج کیا تھا جواد نے اس کی خوشی اور جوش کو دل سے محسوس کیا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے زونی اسے دیکھ کر غیر معمولی خوش ہوئی ہے۔ جواد کے لیے یہ احساس بہت دلنشین قسم کا تھا۔

"تشریف رکھیے محترمہ!" جواد نے اک ادا سے کہا تھا۔ زونی کھلکھلاتے ہوئے بیٹھ گئی تھی۔ بیگ اس نے گود میں رکھ لیا تھا تاہم جواد کے ساتھ بیٹھنے میں کچھ فاصلہ برقرار تھا جو جواد کو بڑی شدت کے ساتھ کھلا تھا۔

"آج وین نہیں آئی۔" وہ جواد کو بتا رہی تھی۔

"یہ میری خوش نصیبی ہے۔" جواد نے مسکرا کر کہا تھا۔ زونی بغیر سمجھے مسکرا دی۔

"میں میرو کو فون کرنے لگی تھی تب ہی آپ دکھائی دے گئے۔"

"کہا نا۔۔۔ یہ میری خوش نصیبی ہے۔" اس نے دوبارہ اپنی بات دہرائی تھی۔ پھر ذرا چونک کر بولا۔

"یہ تم میرو پہ انحصار کرنا کب چھوڑوں گی؟ تم کالج گرل ہو؟ سمجھدار ہو یار! یہاں سے کوئی رکشہ پکڑتی اور گھر چلی جاتی۔"

"اور میرو سے ڈانٹ کون کھاتا؟" اس نے تھوڑا خوف زدہ انداز میں کہا۔

"ایک تو تمہارا میرو حد سے زیادہ حاوی ہے تم پر۔۔۔ ہر جگہ بے جا مداخلت کرتا ہے جو مجھے پسند نہیں ہے۔" جواد کے لہجے میں سخت قسم کی بے زاریت تھی۔ جسے زونی نے محسوس نہیں کیا تھا۔

"تم اسے روکتی کیوں نہیں۔ ایک مرتبہ منہ توڑ جواب دو تو صاحب بہادر کو مزا آجائے۔"

"کیسے روک سکتی ہوں؟ ہمارے گھر میں شروع سے وہی فیصلے کرتے ہیں۔" زونی نے بے بسی دکھائی تھی۔ جواد کو بے طرح سے تاؤ آگیا۔

"مائنڈ مت کرنا زونی! تمہارے دادا کی ڈیتھ کے بعد تمہارا میران کی موجودگی میں ایک چھت کے نیچے رہنا بنتا ہی نہیں۔" وہ کب سے اس موضوع پہ بات کرنا چاہتا تھا۔ صد شکر کے آج یہ موقع مل گیا تھا۔ جس طرح زونی ہر بات نائلہ اور جواد کی دل سے مان لیتی تھی۔ اسے امید تھی یہاں بھی فوراً" عمل کرے گی۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی آنکھ سے دیکھتی تھی اور دوسروں کی انگلی پکڑ کر چلتی تھی۔

"یہ بات تو آنٹی نے بھی سمجھائی تھی۔" اس نے تسلیم کر لیا۔

"تم نے پھر عمل کیا۔" اس کا انداز گہرا کاٹ دار طنزیہ تھا۔ زونی ہونٹ کاٹتی رہ گئی تھی۔

"اپنا گھر چھوڑ کر بندہ کہاں جائے؟ ہم شروع سے اکٹھے رہتے آئے ہیں۔" اس نے اپنے تئیں کمال کا جواز پیش کیا تھا جسے جواد نے رد کر دیا۔ وہ اس کی ہر بات ایسے ہی رد کر کے اپنی منواتا تھا۔ دراصل محض ان تین چار مہینوں میں آنٹی اور جواد اس کی زندگی پہ خاصے حاوی ہو چکے تھے۔ یوں لگتا زونی ان کے زیر تسلط تھی۔ وہ اس کا خیال بھی رکھتے تھے۔ احساس بھی کرتے تھے۔ مشورے بھی دیتے تھے۔ زبردستی عمل بھی کروالیتے تھے اور زونی کو پتا بھی نہیں چلتا تھا جیسا کہ میڈیکل میں جانے کا مشورہ سراسر جواد کا تھا۔

"وہ انسان ہوتا تو خود ہی کہیں اور شفٹ ہو جاتا۔" جواد نے زہر خند لہجے میں کہا تھا۔

"اور حیرت کی بات ہے۔ یہ پوری کالونی والے ویسے تو کسی کی چھوٹی سی غلطی کو معاف نہیں کرتے' لیکن تم لوگوں کے معاملے میں بولتے ہی نہیں۔" شدید غصے میں جواد نے بائیک کے ہینڈل پہ ہاتھ مار کر غصہ نکالنا چاہا تھا۔

زونی جب لگنے کی وجہ سے اسے "ٹھوس" جواب دیتے دیتے رہ گئی تھی۔ اس کا دھیان ہٹ گیا تھا۔ ورنہ وہ اسے بتا دیتی کہ کالونی والے کیوں نہیں کسی قسم کا اعتراض کرتے تھے۔

"زونی! تمہیں اب اسٹینڈ لے لینا چاہیے۔" کچھ دیر بعد جواد کا غصہ اتر گیا تو اس نے زونی کو مزید سمجھانا چاہا۔

"کیسا اسٹینڈ؟" وہ تو فرائی چکس کی بلڈنگ دیکھ کر ہکلا گئی تھی۔

"یہ ہم کہاں آ گئے؟" وہ مارے گھبراہٹ کے ہونق ہو گئی تھی۔

"فرائی چکس تمہیں لزانیہ پسند ہے نا۔۔۔؟" جواد نے اب کہ بڑی ملائمت سے کہا تھا۔ زونی نے بے ساختہ آنکھیں میچ کر نفی میں سر ہلایا۔ اس کا چہرہ اچانک سپید پڑ گیا تھا۔

"نہیں۔۔۔" وہ گھبراہٹ میں برابر سر ہلاتی رہی تھی۔ دائیں اور بائیں۔ کچھ سوچ کر جواد نے بائیک کا رخ موڑ لیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے وہ لزانیہ پیک کروانے اندر چلا گیا جب واپس آیا تو زونی ٹپ ٹپ آنسو بہا رہی تھی۔ جواد بری طرح سے چڑ گیا۔

"اب کیا ہوا ہے؟"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میرو کو پتا چلا تو ناراض ہوں گے۔" وہ سسکتی رہی۔

"اسے کون بتائے گا؟ تم فکر مت کرو۔ ویسے بھی میں جلدی تمہارے اس "خوف" کا سدباب کرتا ہوں۔ اس میران نام کے "ہولے" سے تمہاری جان چھڑواتا ہوں۔" جواد نے پر عزم لہجے میں کہا تو زونی رونا بھول کر ہکابکا رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

کمپاؤنڈ کے ایک طرف گرھل کا سایہ دار درخت تھا۔ جس کا پھل ان دنوں پک رہا تھا۔ گرمیوں میں یہ پتوں سے لد جاتا تھا۔ اس کا پھل بھی بے بہا لگتا۔ گرھل کا پھل گر گر کے زمین پہ گرتا اور وہیں گل سڑ کے ڈھیر ہو جاتا تھا۔ کبھی مہینوں بعد کمپاؤنڈ کی صفائی جمعدار کرتا تھا۔ زونی سے رہا نہ گیا تو جھاڑو پکڑ کر پورے کمپاؤنڈ کی صفائی کر ڈالی تھی۔ وہ تھک کر باہر سیڑھیوں پہ ہی بیٹھ گئی تھی۔ پھر یوں ہی خیال آیا تو دادا کے ہاتھ سے لگائے پودوں کو پانی دینے لگی۔ کتنے خشک بے جان اور مرجھا رہے تھے۔ زونی کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ کس قدر لاپروا تھی۔ دادا کی محنت سے لگائی چیزوں کی حفاظت نہیں کر پا رہی تھی۔ ان دنوں اس کا دل بہت رنجیدہ تھا۔ نجانے کیوں یوں لگتا تھا جیسے کچھ برا ہو کر رہے گا۔ ایسے ہی دل کو ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ وہ سارے گملوں میں پانی لگا کر دوبارہ وہیں سیڑھیوں پہ آ بیٹھی تھی۔ میران اپنے آفس سے جلدی اٹھ آیا تھا۔ جب کمپاؤنڈ میں داخل ہوا تو سامنے ہی گھٹنوں میں سر دیے زونی کو بیٹھا پایا تھا۔ پورا احاطہ چمک رہا تھا۔ گملوں میں پانی موجود تھا۔ میران کو اک گونا سکون کا احساس ہوا۔ بہت دن بعد زونی نے گھر کو پہلی والی توجہ سے نوازا تھا۔ وہ کیوں نا خوش ہوتا؟ کرولا کو روک

کر کے وہ جیسے ہی زونی تک آیا زونی خود ہی قدموں کی آہٹ پا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔ پھر وہ دونوں آگے پیچھے ہی اندر داخل ہوئے تھے۔ میران نے اپنا بیگ' موبائل اور ٹائی اتار کر زونی سے کہا۔

"جلدی سے کھانا لگا دو۔ سخت بھوک لگی ہے۔"

وہ سر ہلا کر کچن میں چلی گئی تھی۔ اس کے ایڈمیشن والی تلخ کلامی کے بعد آج پہلی مرتبہ دونوں کی بات ہو رہی تھی۔ ورنہ زونی کے من پسند کالج میں ایڈمیشن کروا کر وہ قطعی طور پہ لاتعلق ہو چکا تھا۔ اور یہ اس کی خفگی کا اظہار تھا۔ اتنے دنوں سے کھانا وغیرہ بھی نہیں مانگ رہا تھا۔ کپڑے استری ہوتے تو ٹھیک ورنہ خود الٹے سیدھے پریس کرتا اور پہن کر چلا جاتا تھا۔ اسے کہاں کپڑے پریس کرنا آتے تھے۔ چائے بھی خود بنا کر پیتا تھا۔ زونی کو زحمت نہ دیتا۔ کافی دنوں سے یہی سلسلہ چل رہا تھا۔ جو انجام بخیر ہوا۔ زونی بھی بالکل ٹھیس بنی رہی تھی۔ منانے کی کوشش میں نہیں پڑی تھی۔ اسے جواد نے سمجھایا تھا۔

"اتنا میران کو سر چڑھانے کی ضرورت نہیں۔ غلطی میران کی ہے وہی تسلیم کرے۔ زونی کو جھکنے کی ضرورت نہیں۔۔۔" جواد کی باتوں پہ عمل پیرا زونی اندر سے خاصی مضطرب تھی گھر کی ہر چھوٹی بڑی بات جواد سے ڈسکس کرنے کے بعد دل ضرور ہلکا ہو جاتا تھا تاہم اندر کہیں کچھ "کلک" بھی لازمی کرتا۔ جو ایسا خوش کن نہیں تھا۔ وہ چاہ کر بھی اندر پنپتے احساس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی تھی اور آج میران نے خود ہی ناراضی ختم کر دی تھی۔ وہ نہ صرف زونی سے مخاطب ہوا بلکہ بڑے انداز میں مسکراتے ہوئے بتا رہا تھا۔

"جس پروجیکٹ پہ کام ہو رہا تھا۔ وہ ختم ہو چکا تھینک گاڈ' اب میں فی الحال فارغ ہوں۔ اور اس فراغت کو کچھ اور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔" اس کا انداز ہلکا پھلکا تھا اور پچھلی ناراضی کا کوئی شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا۔

"مثلاً" کیسے؟" زونی کے منہ سے بے ارادہ ہی پھسل پڑا۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے مسکرایا تھا۔ جیسے وہ سب کچھ پہلے سے طے کر چکا تھا اور محض زونی کو اطلاع دی جا رہی تھی۔ زونی کو اندر ہی اندر پریشانی سی ہوئی۔

"ابھی تو تمہیں صرف اتنا کرنا ہے رات کو گھر میں کھانا مت پکانا۔ پھر سہ پہر کے بعد شاپنگ کرنے چلیں گے۔ تم اپنے لیے گرمیوں کے کپڑے خرید لو۔ اور کچھ مزید بھی۔ وہ بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی میں سونے جا رہا ہوں۔ جب اٹھوں گا تو مزید تمہارے سر پر بجلیاں گراؤں گا۔" میران مسکراتا ہوا اٹھا تھا پھر اس کا سر سہلاتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ آج اس کی ترنگ ہی نرالی تھی۔ زونی کا دل دھک سے رہ گیا تھا اس کی آنکھیں کھلنے لگیں۔ دماغ الگ کوئی گھنٹی بجا رہا تھا۔ اس کے اندر بھی کچھ کلک کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا کچھ ہونے والا تھا؟" زونی کی آنکھوں میں تارے سے ناچنے لگے۔

پچھلے دو دن سے مسلسل نائلہ و جواد اسے ایک بات کے لیے اکسا رہے تھے۔ اس کا کل اور آج کا دن تو بڑا مصروف گزرا تھا۔ کالج میں ٹیسٹ چل رہے تھے۔ وہ سلسلہ ختم ہوا تو میران اسے شاپنگ پہ لے گیا اور شاپنگ بھی ایسی کہ زونی نے زندگی میں نہ کی ہوگی۔ ایسے ایسے فینسی' ایمبرائڈڈ اور خوب صورت کپڑے جوتے' میک اپ باکس زونی حیران ہوتی جا رہی تھی۔ میران نے خود ہی ساری شاپنگ مکمل کی تھی۔ رات کو اچھا سا ڈنر اور رومانٹک ماحول۔ زونی کے دل کو تب سے ہی کھٹکے لگ گئے تھے۔

میران کے انداز و اطوار بہت مختلف تھے۔ پہلے سے بے انتہا الگ اور منفرد۔ یوں لگتا تھا وہ کچھ ٹھان چکا ہے۔ کچھ ہونے والا ہے؟ یا کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟

زونی دل ہی دل میں سخت متوحش تھی۔ تاہم پہلی مرتبہ اس نے جواد اور نائلہ کو اپنے خدشات اور میران کے بدلتے اطوار کا نہیں بتایا تھا۔ شاید بتا دیتی تو وہ لوگ کچھ پیش بندی کر دیتے۔ کم از کم زونی کے لیے وہ

دونوں بہن بھائی بہت مخلص ثابت ہوئے تھے۔ اور ابھی وہ پالک کے پتے چنتی سخت ہراساں تھی۔ اس کا ذہن بہت الجھنوں کا شکار تھا۔ بار بار خیالی رو بھٹک جاتی تھی۔ دل میں عجیب سے وسوسے تھے۔

آج صبح جب وہ دودھ والے سے دودھ لے کر اندر آرہی تھی تب نائلہ آنٹی نے اسے راستے میں ہی روک لیا تھا۔ وہ اپنے دروازے کے باہر کھڑی تھیں۔ زونی اندر جاتے جاتے رک گئی تھی۔ پھر نائلہ کے پاس آگئی۔ نائلہ اس وقت خاصی پریشان لگ رہی تھی۔ زونی بھی کچھ متفکر ہو گئی۔

جانے نائلہ کیوں پریشان تھی؟

زونی نے خود ہی نائلہ سے پوچھ لیا تھا' لیکن وہ اس کا سوال نظر انداز کر کے بولی۔

"تم کل اسٹائل ان میں گئی تھیں زونی...!" نائلہ کا انداز کچھ کھوجتا ہوا تھا۔ ہلکی سی برہمی بھی جھلک رہی تھی۔ زونی کا سر اثبات میں ہل گیا اور ساتھ ہی نائلہ کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔

"کس کے ساتھ؟"

"میران اور میں..." زونی نے کچھ جھجکتے ہوئے بتایا تھا۔ نائلہ کی آنکھوں میں سخت ناگواری بھر گئی تھی۔ اس نے گہرا سانس کھینچ کر بے ساختہ ہی کہا تھا۔

"تب ہی تو..." نائلہ کچھ کہتے کہتے اچانک رک گئی تھی۔ زونی اس کے ادھورے جملے پہ گھبرائی۔

"کیا بات ہے آنٹی!" اس نے متفکر انداز میں پوچھا تھا کیوں کہ نائلہ کے تاثرات بتا رہے تھے۔ بات کچھ بڑی ضرور ہے۔

"کچھ نہ ہی پوچھو تو بہتر ہے۔ تمہارا دل ہی جلے گا۔ تمہیں تکلیف ہی ہوگی اور میں تمہیں کسی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔" نائلہ کی آواز بھرا گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی نمکین پانی بھر گیا تھا۔ جو اس بات کی واضح نشانی تھا کہ نائلہ' زونی کے ساتھ کس حد تک مخلص تھی۔

"آنٹی بتائیں نا۔ اب تو مجھے اور گھبراہٹ ہو رہی ہے۔" زونی نے اصرار کیا۔ اب تو وہ کسی بھی صورت آنٹی سے پوچھ کر دم لینا چاہتی تھی۔ جانے بات کیا تھی؟ اسے لگ رہا تھا۔ کوئی معمولی بات تو ہرگز نہیں ہوگی۔

"سن کر اور بھی گھبراہٹ ہوگی۔ نہ پوچھو مجھ سے۔ اپنی اس زبان سے کیسے وہ الفاظ ادا کروں جو ابھی ابھی سن کر آئی ہوں۔" نائلہ نے دوپٹے کا کونا پکڑ کر اپنی آنکھیں مسلتے ہوئے کہا تھا۔ زونی کا دل اور بھی گھبرا گیا۔

"کیا سنا ہے؟ کس نے کیا کہہ دیا...؟"

"بس لوگوں کی لمبی زبانیں ہیں۔ کس کس کو پکڑ سکتے ہیں؟ کس کس کو روک سکتے ہیں۔" نائلہ نے ترشی سے کہتے ہوئے زونی کے ہاتھ سے دودھ لے کر اندر فریج میں رکھ آئی تھی۔ پھر زونی کا بازو پکڑ کر صوفے پہ بٹھا دیا۔ نائلہ کس بات کی طرف اشارہ کر رہی تھی؟ زونی کو سمجھ آرہا تھا اور اس کا دماغ بھی گھوم رہا تھا اور اس کے ہر حفاظتی لفظ کی دیوار گرتی جا رہی تھی۔ وہ اپنی سپورٹ کے لیے ایک جملہ بھی نہیں بول سکی۔ وہ بس ٹکر ٹکر نائلہ کو دیکھتی ہوئی ایک عجیب اذیت کا شکار ہو رہی تھی۔

"ہر ایک کی زبان روکی نہیں جا سکتی' لیکن اپنا عمل تو ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔ جو تمہارے بس میں ہے۔ تم وہ تو کر لو۔" نائلہ نے بات کے اختتام پر اسے اکسایا تھا۔ زونی ایک اذیت ناک سانس باہر نکال کر بمشکل بولی۔

"اور میرے بس میں کیا ہے؟" اس کے آنسو بنا تردد ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ وہ نائلہ کے بازو پہ سر رکھے بے تحاشا رونے لگی۔

"تم ہاسٹل شفٹ ہو جاؤ۔" نائلہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ اب زونی سے عمل کروانا باقی تھا۔

☆ ☆ ☆

پرات میں پالک کے پتوں کا ڈھیر لگ چکا تھا اور زونی اپنے خیالوں میں گم پالک چنتی غائب دماغی سے چھری اٹھا کر کاٹتی بھی جا رہی تھی۔ کٹتی ہوئی پالک کی اونچی

سی پہاڑی بن چکی تھی۔ اب سارا "کترا" نیچے فرش پہ گر رہا تھا' لیکن زونی کو احساس تک نہیں تھا۔ اس کے دماغ میں نائلہ کے الفاظ بھاری ضرب کی طرح لگ رہے تھے۔ ایک ایک لفظ نوکیلا تھا۔ جہاں لگتا' کھب جاتا تھا۔ زخم چھوڑ دیتا تھا۔ خون رسنے لگ جاتا تھا۔ تو کیا اس کالونی میں ہر کوئی زونی کے "کردار" کو نشانہ بنا رہا تھا۔ اس کے دادا کی بنائی عزت کو درپردہ کچوکے لگائے جا رہے تھے۔ ہر کوئی میران اور زونی کے "تعلق" کو ابھار کر دوسروں کی نظروں میں سوالیہ نشان بنا رہا تھا؟ اور لوگ زونی کو کیا سمجھ رہے تھے؟ وہ ان کی نگاہوں میں کس "سطح" تک آرہی تھی؟

زونی کو لگ رہا تھا۔ وہ دہکتے انگاروں پہ چل رہی ہے اور لوگ اس کے راستوں میں آگے بڑھ بڑھ کے کوئلے بکھیر رہے تھے۔

اسی لیے جب میران اچانک گھر آیا اور اس نے زونی کو چھیڑ دینے کی غلطی کر لی۔ تب زونی بھی جیسے پھٹ پڑی تھی۔ گو کہ اس نے بس چائے مانگنے کی غلطی کر لی تھی۔ زونی تو سات پتھر اٹھا کر پیچھے لپکی۔

"میں کسی کی نوکر نہیں ہوں۔" اس نے جل بھن کر بے انتہا غصے میں کہا تھا۔ میران اس کے قریب صوفے پہ بیٹھتا بیٹھتا چونک گیا۔

"ایں...؟ یہ زونی کو کیا ہوا؟ اس طرح کیوں ری ایکٹ کیا؟ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" وہ خاصا متفکر ہو چکا تھا۔

"زونی! تم ٹھیک ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا... اٹھ کر چائے بنا دو۔" میران نے نرمی سے دوبارہ پوچھ لینے کی غلطی کر لی تھی۔ زونی کا پارہ اور بھی سوا نیزے تک پہنچ گیا تھا۔

"مجھے ایک سو ستر ڈگری بخار چڑھا ہوا ہے۔ آئی سمجھ میں بات۔ مجھ سے چائے نہیں بنتی۔ نہ میں کسی کی نوکر ہوں۔" اس نے کٹی ہوئی پالک کا اور بھی کترا کرنا شروع کر دیا تھا۔ میران "دق" بیٹھا رہ گیا۔ پھر اس نے کچھ سنبھل کر کہا تھا۔

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ تمہیں ایک سو ستر ڈگری بخار ہی ہوگا۔ ورنہ ایسا غصہ تو کبھی نہیں چڑھا۔" وہ ملائمت سے بولا تھا۔ "اور جہاں تک نوکر کی بات ہے۔ تو میری نوکر تو تم ہی ہو۔ چاہے مانو یا نہ مانو۔" اس نے جان بوجھ کر ہلکا پھلکا انداز اپنایا تھا تاکہ اس کا پارہ کم کر سکے' لیکن یہ پارہ کم ہونے کی بجائے اور بھی چڑھ گیا تھا۔

"مجھ سے کچھ نہیں ہوتا۔ اپنی چائے خود بنالیں۔" اس نے تڑختے ہوئے کہا تھا۔ میران گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔ وہ اس کے غصے کی وجہ تلاشنا چاہتا تھا؟ پہلے تو کبھی زونی کو اس طرح کا غصہ نہیں آیا تھا۔ وہ تو اچھی بھلی بدتمیز لگ رہی تھی۔ جانے اسے کیا ہوا تھا؟ کالج میں تو کوئی مسئلہ نہیں تھا؟ وہ سوچتا ہوا کچھ متفکر ہو گیا تھا۔

"آج چائے خود بنا لیتا ہوں۔ کل کو کھانا بھی خود بنالو۔ پھر کپڑے بھی خود دھونے پڑیں گے۔ خیر تو ہے نا...؟" میران نے کچھ خفگی کا اظہار کیا۔

"تو عادت ڈالیں۔ اپنا کام خود کرنے کی۔" اس کا منہ پھول گیا۔ غصہ اب قدرے کم تھا' لیکن انداز وہی سابقہ تھا ہنوز برہم۔ وہ اچھا بھلا اٹھتے اٹھتے دوبارہ بیٹھ گیا تھا۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟" اس کے لہجے میں واضح طور پر اچنبھا اور برہمی تھی۔ زونی نے ترچھی نگاہ سے اسے دیکھا۔

"آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔"

"مطلب؟" میران نے بھنویں سکیڑ لی تھیں۔ جو اس کے واضح طور پر ناگواری کی طرف اشارہ تھا۔

"مطلب یہ کہ آپ مجھے کسی ہاسٹل شفٹ کروا رہے ہیں۔" اس کا انداز دوٹوک تھا۔ میران کا میٹر ہی گھوم گیا۔ اس کے حواسوں پہ جیسے بم گرا تھا۔ وہ آنکھوں میں بے یقینی بھرے اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ جیسے اسے زونی کی دماغی حالت پہ شبہ ہو۔

"ہاسٹل؟ مگر کیوں؟" میران نے بمشکل حواس درست کر کے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔

"میں اب اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ پوری کالونی

میں لوگ باتیں بناتے ہیں۔ میری بے عزتی کر رہے ہیں۔ وہ ہم دونوں پہ انگلی اٹھاتے ہیں۔ ہر ایک کے سامنے ہم سوالیہ نشان ہیں کیوں کہ ہمارا ایک گھر میں رہنا قطعی طور پہ مناسب نہیں ہے۔ لوگوں کی زبانیں نہیں روکی جاسکتیں' لیکن میں اپنے اوپر کسی کو "گند" گرانے نہیں دوں گی۔" زونی جیسے پھٹ پڑی تھی۔ اب کہ میران کے تنے تاثرات بھی کچھ ڈھیلے پڑے تھے۔ وہ کیا سمجھ رہا تھا۔ اور بات کیا نکل رہی تھی؟ اور یہ زونی کو کس نے کہا؟ کس نے بکواس کی؟ اور کیوں کی؟ وہ تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کالونی میں کوئی میران پہ انگلی اٹھائے۔ ان کے دادا اس کالونی کی معزز شخصیات میں شمار ہوتے تھے۔ پوری کالونی میں ان کی بہت عزت تھی۔ لوگ دادا کو جھک کر سلام کرتے تھے۔ اسی طرح میران سے بھی بہت محبت اور عزت سے ملتے۔ اس نے تو آج تک کسی کی زبان سے کوئی برا لفظ نہیں سنا تھا۔ پھر یہ زونی کیا کہہ رہی تھی؟ اس کا ذہن قبول نہیں کر پا رہا تھا اور ابھی کل کی بات ہے۔ بخاری صاحب کی بیوی میران کو روک کر زونی کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔

وہ کیسے زونی کی بے رخی پہ ایمان لے آتا؟

"یہ بکواس کس نے کی؟ تم تک کس نے پہنچائی؟" میران نے لب بھینچ کر غصہ کنٹرول کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ تب زونی بھرائی آواز میں بمشکل بولی۔

"ہر کوئی کر رہا ہے۔ میں کس کس کا نام لوں؟"

"کسی ایک کا نام لے کر بتاؤ تو سہی۔۔۔ میں انتڑیاں نہ نکال لاؤں اس کی۔ یہ بکواس کرنے کی جرأت کس نے کی آخر؟" وہ دھیمے سلگتے لہجے میں پھنکارا تھا۔ زونی قدرے سہم سی گئی تھی۔ اسے میران بہت غصے میں لگ رہا تھا۔ زونی نے پہلے کبھی میران کو اس قدر غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ گھبرانے لگی تھی۔ پھر وہ نائلہ کا نام لیتے لیتے جھجک کر رک گئی۔ کیا خبر' میران نائلہ سے پوچھنے یا لڑنے کے لیے پہنچ جائے؟ دونوں میں تلخ کلامی ہو جائے پھر نائلہ نے کہا بھی تھا۔ وہ میران کے سامنے اس کا نام مت لے۔ اب اگر وہ نائلہ کا نام لیتی تو کس قدر برا ہوتا۔ نائلہ دوبارہ کبھی بھی اس پہ بھروسا نہ کرتی۔

"سب کے نزدیک ہمارا "تعلق" سوالیہ نشان ہے۔ دادا کے مر جانے کے بعد ہمیں ایک گھر میں نہیں رہنا چاہیے تھا۔" وہ سوں سوں کرتی نائلہ کی ایک ایک بات کو دوہرا رہی تھی۔

"میری کس قدر انسلٹ ہو رہی ہے۔" اس کی سوئی ادھر سے ہٹ نہیں رہی تھی۔ میران نے گہرا سانس کھینچ لیا۔ پھر اس نے روتی ہوئی زونی کی طرف دیکھا۔ اس کے انداز میں اب غصہ یا برہمی نہیں تھی کیوں کہ وہ سمجھ گیا تھا زونی کو کسی نے حسد میں آکر بھڑکایا ہے۔ زونی کو سمجھانا اس کی ذمہ داری تھی بلکہ اس کی آنکھیں اور دماغ کھولنا زیادہ بڑی ذمہ داری تھی۔

"میں مان ہی نہیں سکتا۔ ہماری کالونی کے لوگ یا کوئی بھی میرے اور تمہارے اوپر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کریں۔ زونی! تم اتنی عقل مند ہوتی تو بات کرنے والے کو منہ توڑ جواب دے کر آتیں۔ اس کی آنکھیں کھول کر آتیں کہ ہماری کالونی کا کوئی بزرگ تو کیا بچہ تک بھی میرے اور تمہارے ایک گھر میں رہنے پہ "اعتراض" نہیں کر سکتا۔ تم کہنے والے کو بتا کر آتیں۔ ہماری اس کالونی کے ہر بزرگ مرد اور ہر بزرگ عورت نے دادا کے انتقال سے دو دن پہلے ہم دونوں کے نکاح میں شرکت کی تھی۔ اور اسی کمپاؤنڈ میں ٹینٹ لگوا کر دادا نے ارجنٹ کھانے کا انتظام بھی کروایا تھا۔ نکاح کے بعد جو "طعام" کا اہتمام تھا وہ محض نکاح کا نہیں بلکہ "ولیمہ" کا اعلان تھا اور دادا نے سب مہمانوں کو بطور خاص اس لیے بلوایا کر کھانا کھلایا تھا تاکہ اس نکاح کا بطور ولیمہ اعلان کر سکیں۔

سو ولیمہ کے بعد پیچھے کچھ نہیں رہ جاتا۔ گو کہ سب کچھ بہت اچانک ہوا تھا' لیکن دادا نے اپنی طرف سے ہم دونوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کروا کر اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ ہم دونوں اس دن کے بعد میاں بیوی ہیں۔ یہ اور بات تھی کہ دادا کے چالیسویں کے بعد بھی

مجھے تم پہ ترس اور رحم ہی آتا رہا۔ میں نے سوچا تم ذرا دادا کے غم اور جدائی کے فیز سے نکل لو کچھ سنبھل جاؤ۔۔۔ میں تم پر وقت سے پہلے ذمہ داریاں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ یہ میرا تم پہ "ترس" تھا۔ سنا تم نے۔ رحم تھا یہ۔۔۔

جہاں تک بخاری صاحب کی بیگم کا تعلق ہے تو بلاشبہ وہ تیز خاتون ہیں' لیکن کسی کی کردار کشی وہ کبھی نہیں کرتیں۔ ابھی کل وہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔ "زونی پڑھائیاں ہی کرتی جا رہی ہے۔ کوئی "خوشخبری" تو ابھی تک نہیں سنائی۔۔۔؟" اس بات کا مطلب تمہاری ناقص عقل میں سما سکتا ہے تو پلیز تھوڑا سا دھیان دے لینا۔ امید ہے بھوسے بھرے دماغ میں کوئی نہ کوئی بات ضرور اٹک جائے گی اور جس نے تمہارے دماغ کو جو پہلے سے ہی فارغ شدہ ہے۔ بھرنے کی کوشش میں اپنا وقت ضائع کیا ہے اس کا منہ بند کروانے کا میں خود بندوبست کر لوں گا۔ تم بس خاطر جمع رکھو۔ بہت من مانی کر چکی ہو۔ اب مجھے خود ہی کوئی اسٹینڈ لینا ہو گا۔ ورنہ تو اپنا ٹائی ٹینک خود ڈبو ڈالو گی۔۔۔"

وہ بڑے دھیمے رواں اور پر اثر لہجے میں اس کے آٹھ آٹھ طبق روشن کرتا اٹھ کر چلا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کئی سوالیہ نشان چھوڑ کر اور مزید وہ اس پہ واضح بھی کر چکا تھا کہ "آزادی" کے دن اب خواب ہیں اسے اپنا مائنڈ میک اپ کر لینا چاہیے اور اپنے کمرے سے میران کے کمرے تک "ہجرت" کے لیے بھی ذہنی طور پر تیار ہو جانا چاہیے۔

لیکن ان ساری کھری باتوں کو ایک طرف رکھ کر وہ محض ایک سوئی پہ پھنس چکی تھی۔ اس کا ذہن وہاں سے ہٹ نہیں رہا تھا۔ میران کے لفظوں کو نظر انداز کر ہی نہیں رہا تھا۔

"یہ میرا تم پہ ترس تھا۔" زونی کو یہ الفاظ چابک کی طرح لگ رہے تھے۔ کوڑوں کی طرح پڑ رہے تھے۔ کیا میران نے اس پہ "ترس" کھایا تھا؟

☼ ☼ ☼

اور یہ چند ماہ پہلے کی تو بات تھی جب اچانک دادا کی طبیعت اتنی بگڑی کے وہ اپنی زندگی سے بالکل مایوس ہو گئے تھے۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی وہ بہت دفعہ بیمار ہو کر بالکل بھلے چنگے اسپتال سے گھر آجاتے تھے' لیکن ان دنوں انہیں اپنی موت کی آہٹیں پہلے ہی سنائی دے چکی تھیں۔ وہ انتہائی زود رنج ہو گئے تھے۔ بات بے بات رو پڑتے۔ غم زدہ ہو جاتے اور سب سے زیادہ زونی کے لیے متفکر نظر آتے۔ انہیں زونی کا غم مارے ڈال رہا تھا۔ ان کے بعد زونی کا کیا ہو گا؟ وہ کہاں جائے گی؟ وہ کیسے رہ پائے گی؟ پھر دادا اپنے محلے داروں' کالونی والوں اور دور پرے کے رشتہ داروں کو بلوا کر مشورے کرنے لگے تھے یا پھر اپنا کوئی فیصلہ ان کے گوش گزار کرنا چاہتے تھے۔

ایسے ہی ایک دن دادا کی طبیعت زیادہ بگڑی تو انہوں نے میران سے وہ بات کر لی تھی جسے اتنے دنوں سے وہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہے تھے بلکہ یہ بات نہیں "ایک مستحکم فیصلہ تھا جو انہوں نے میران کے سامنے رکھا تو وہ فورا" ہی بدک گیا۔ بلکہ چیخ پڑا تھا اور اس نے فورا" انکار بھی کر دیا تھا۔

"یہ کیسے ممکن ہے دادا! میں نے کبھی نہیں سوچا۔ زونی کو تو بالکل بھی نہیں۔ وہ ابھی کل کی بچی ہے۔ اس میں عقل نام کو نہیں۔ وہ نا سمجھ ہے۔۔۔ میں نے اپنا لائف پارٹنر اسے نہیں بنانا۔ یہ پوری زندگی کا فیصلہ ہوتا ہے۔ میں اپنی زندگی برباد نہیں کر سکتا۔" اس کا دو ٹوک انکار دادا کو بے قرار کر گیا تھا اور پردے کی اوٹ میں چھپی زونی تک کو بھی ہلا گیا تھا۔ جبکہ وہ انتہائی سفاکی سے مسلسل بول رہا تھا۔ اس کی آواز بلند نہیں تھی۔ شاید دادا کی خرابی طبیعت کے سبب۔۔۔؟

"دادا! یہ قطعا" زیادتی ہے۔۔۔ دیکھیں' میرا اور اس کا کوئی میچ نہیں۔۔۔ وہ ابھی پڑھ رہی ہے۔۔۔ میں پریکٹیکل لائف میں ہوں۔ میں ایک آدھ سال تک شادی کر لوں گا۔ زونی کو تعلیم مکمل کرنے میں بہت ٹائم لگے گا۔" وہ ہر قسم کی دلیل اٹھا اٹھا کر لا رہا تھا تاکہ کسی بھی طرح سے دادا کو قائل کر سکے۔

"زونی کم عمر ضرور ہے۔۔۔ نا سمجھ نہیں۔ ذمہ داری

بھی ہے۔ وہ جلدی ساری ذمہ داریوں کو سمجھ لے گی۔ تمہاری دادی چودہ سال کی ماں بھی بن گئی تھیں اور ہمارا ایج ڈیفرنس بھی بہت تھا۔" دادا نے نحیف آواز میں مسلسل اسے سمجھانا شروع کر رکھا تھا۔ وہ کسی بھی طرح ہتھیار نہیں پھینک رہے تھے۔

"آپ کا اور وقت تھا دادا! اب تو لائف پارٹنر کا ایج فیلو ہونا ضروری ہے اس سے زیادہ انڈر اسٹینڈنگ ہوتی ہے جبکہ میری اور زوفی کی ذہنی مطابقت نہیں ہے۔" وہ چڑ کر بولتا رہا۔

"جب میاں بیوی ایک رشتے میں بندھ کر قریب آجاتے ہیں تو انڈر اسٹینڈنگ خود بخود ہو جاتی ہے۔ دیکھنا، تم دونوں بہت اچھی زندگی گزار رو گے۔" دادا نے ملائمت سے کہا تھا۔

"میں نے زندگی میں تم سے کچھ اور نہیں مانگا۔" ان کے آنسو بھی جھر جھر بہنے لگے تھے۔ یعنی جذباتی حربے؟ وہ اور بھی چڑ گیا تھا۔

"تو کیا کروں؟ مجھے جو نظر آرہا ہے وہ تمھیں نہیں آسکتا۔ میری زوفی "رل" جائے گی۔" ان کی آواز کھانسی کے شدید دورے میں کھو گئی تھی۔

"کیسے رلے گی۔۔۔؟ میں ہوں نا۔۔۔ زوفی کا خیال رکھوں گا۔ اس کی اچھی جگہ شادی کروں گا۔"

"میرو! تجھے میرا احساس نہیں۔ تجھے کسی کا احساس نہیں۔" دادا نے مایوسی سے آنکھیں موند لی تھیں۔ وہ اس کے مسلسل انکار پر دل چھوڑ بیٹھتے تھے۔ انہیں یقین تھا میران کبھی نہیں مانے گا۔

"تمہیں اس یتیم پر رحم اور ترس بھی نہیں آتا؟ وہ میرے بعد اس گھر میں تمہارے ساتھ کیسے رہے گی؟" دادا کے تڑپتے لہجے میں جو نزاکت تھی جو باریکیاں نظر آرہی تھیں۔ انہیں پہلی مرتبہ میران سمجھ پایا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے چپ کر گیا تھا۔ کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

"میں بھی تو یتیم ہوں۔۔۔" اب کہ میران کا لہجہ کمزور تھا۔ احتجاج بھی کمزور تھا۔ "آپ کو میرا خیال نہیں۔۔۔ اور میں نے جیسے یتیموں کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔ بس آپ کی خاطر اس پر "رحم" اور "ترس" کھا رہا ہوں۔ آپ اسے مجھ پہ زبردستی مسلط کر رہے ہیں۔ جب بھی چانس بنا، اپنی پسند کی شادی کر لوں گا۔" وہ دبے دبے غصے میں بولتا جا رہا تھا اور بستر مرگ پہ پڑے دادا کو جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی۔ وہ اتنے خوش تھے کہ میران کی ساری بکواس کو نظر انداز کر چکے تھے، لیکن پردے کے پیچھے کھڑی زوفی کے دل پہ ایک ایک لفظ کندہ تھا لکھا ہوا تھا۔ کھدا ہوا تھا۔ وہ نہ کل بھولی تھی اور نہ آج بھولی تھی۔ بھول سکتی ہی نہیں تھی۔ میران نے اس پہ ترس کھایا تھا۔ اس پہ رحم کیا تھا۔ دادا کے مجبور کرنے پہ اس سے رشتہ جوڑا تھا۔ وہ اس کے لیے کل بھی ناپسندیدہ تھی۔ وہ اس کے لیے آج بھی ناپسندیدہ تھی اور زوفی کو کسی کی زندگی میں زبردستی گھسنا گوارا نہیں تھا۔ وہ کل بھی زبردستی کے اس نکاح پہ راضی نہیں تھی وہ آج بھی راضی نہیں تھی۔ اور سر جواد کہتے تھے۔

"انسان کو زندگی اس کے ساتھ گزارنی چاہیے تھی۔ جو اسے چاہتا ہو، عزت کرتا ہو اور بخوشی اپنی زندگی میں خوش آمدید کہے۔" سر جواد کا ہر قول اس کے پاس سنہری حرفوں میں لکھا تھا۔ وہ اور کسی بات پہ عمل کرتی یا نہ کرتی سر جواد کی ہر بات کو گرہ میں باندھ کر اس پہ عمل کرتی تھی۔ کیوں کہ سر جواد ہی وہ انسان تھے جنہوں نے زوفی کا اعتماد بحال کیا تھا۔ اس کی پوشیدہ خوبیوں کو اجاگر کیا تھا۔ اسے بتایا تھا وہ کس قدر ذہین ہے۔ وہ کس قدر مکمل ہے۔ وہ کس قدر حسین ہے۔ وہ ایسی لڑکی تھی جس کے لوگ طلب گار بن بن کر آتے، اس کی منتیں کرتے اور اسے اپنی زندگی میں شامل کرنا ایک اعزاز سمجھتے۔ تعریف کسے بری لگتی ہے؟ تعریف تو اچھے بھلوں کا ذہن گھما دیتی ہے اور جس کا پہلے سے ہی ذہن گھوما پھرا ہو عقل میں پورا ہو۔ اس کا بھلا کیا حال ہوتا ہوگا؟

زوفی نے ایک فیصلہ کیا اور مطمئن ہو گئی جس طرح دادا کے سامنے میران بار بار اس کے وجود کی نفی کرتا رہا تھا۔ اس میں سو سو کیڑے نکال کر ریجیکٹ کرتا رہا

تھا۔ زونی نے بھی اسے بذات خود "ریجیکٹ" کر کے اپنی توہین کا بدلہ لینے کے متعلق سوچ لیا تھا۔ فیصلہ کر لیا تھا۔ اور وہ اپنے فیصلے پہ بہت مطمئن تھی۔ اسے یقین تھا۔ جیسے ہی میران کو اس کے فیصلے سے آگاہی ہوئی۔ وہ خود بھی زونی سے جان چھڑوانے میں لحہ نہیں لگائے گا' کیونکہ زونی اس کے آئیڈیل سے کسی طور پہ بھی میچ نہیں کرتی تھی' وہ اس کی توقعات پہ پورا نہیں اتر سکتی تھی۔ وہ ایک یتیم لڑکی تھی۔ جسے قبول کرنا میران کی مجبوری تھی۔ وہ دادا کے لیے مجبور ہو گیا تھا' لیکن اب دادا نہیں تھے۔ نہ دادا کی کوئی مجبوری تھی۔ میران آزاد تھا اور وہ آزادانہ کوئی بھی فیصلہ کر سکتا تھا' لیکن پھر ہوا کیا؟ زونی کی توقعات سے اس قدر برعکس ہوا کیسے؟

☼ ☼ ☼

اسٹائل ان کا ماحول خاصا رومانٹک اور فسوں خیز تھا۔ بیک گراؤنڈ میں دھیما دھیما میوزک چل رہا تھا۔ دبیز پردوں کے پار زندگی مصروف تھی' لیکن اندر کا ماحول ساکت اور رکا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ یہ تو محض زونی کا خیال تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ کالج میں تھی۔ آج اس نے کوئی بھی کلاس نہیں لی تھی۔ طبیعت بہت بے زار تھی۔ رات بھر مختلف سوچوں میں گم وہ نیند بھی نہیں لے سکی تھی۔ ابھی آنکھیں جل رہی تھیں۔ سر بہت بھاری ہو رہا تھا اتنی سستی تھی کہ حد نہیں۔ وہ بس جلد از جلد گھر جانا چاہتی تھی۔ گو کہ گھر کا تصور بھی سوہان روح تھا' لیکن فی الوقت گھر سے بہتر جائے پناہ کوئی نہیں تھی۔ پھر کون سا اس وقت میران گھر پہ تھا۔ وہ آرام سے جا کر سو جاتی' لیکن کچھ ہی دیر میں اس کا موبائل بج اٹھا تھا۔ کال پک کی تو دوسری طرف سر جواد تھے۔ زونی کچھ حیران ہوئی کیونکہ سر جواد کی عام طور پر کال نہیں آتی تھی۔ بس اکیڈمی میں ہی بات ہو جاتی تھی۔ اس وقت وہ کال کر کے اسے باہر بلا رہے تھے۔ باہر یعنی کالج گیٹ کے باہر؟ زونی کچھ حیران ہو گئی تھی۔ پھر وہ بیگ اٹھا کر اپنی

سہیلی کو بتانے کے بعد باہر نکل آئی۔ سامنے ہی سر جواد کھڑے نظر آ گئے تھے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی۔

"ارجنٹ کام تھا تم سے۔ اسی لیے آنا پڑا۔ یہ تو کچھ معیوب بات۔ آپ بھی ناراض ہوں گی' لیکن مجبوری تھی۔" وہ اتنی شائستگی سے کہہ رہے تھے۔ زونی انکار نہ کر سکی۔ کیا پتا' کتنا ضروری کام ہو؟ وہ سوچتی ہوئی بائیک کے پیچھے بیٹھ گئی تھی' لیکن اس وقت "اسٹائل ان" میں بیٹھ کر اس کا دل بہت مضطرب ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اس نے یہاں آکر غلطی کی ہے۔ اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ کم از کم کالج کے اوقات میں تو نہیں۔ اگر کوئی دیکھ لیتا... میران نہ سہی... اس کی کالونی کا ہی کوئی فرد؟ تو پھر اس کی عزت کیا رہ جاتی؟ وہ کوڑی سے بھی کم تر؟ اور دادا کی بنی بنائی عزت خراب ہو جاتی تھی۔ زونی کا مارے اضطراب اور گھبراہٹ کے برا حشر ہو رہا تھا۔

"سر! آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟" اس نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے گہرے مضطرب لہجے میں پوچھا تھا۔ جواد اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہاں بے چینی تھی۔ گھبراہٹ تھی۔ پریشانی تھی۔ یقیناً" وہ میران کے خوف سے گھبرا رہی تھی۔ جواد کا تنفر ایک لمحے میں ہی امڈ آیا تھا۔ پھر وہی میران؟ اس کا ہوا؟ اور خوف؟

"تمہارا ڈر دور کرنے۔" جواد نے فرائز کھاتے ہوئے اطمینان سے کہا تھا۔ اس کی آنکھیں اور بھی حیرانی اور خوف سے پھیلنے لگی تھیں۔

"کیسا ڈر؟" وہ ہکلا کر بمشکل بول سکی۔ کوئی بھی چیز اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ نہ سر جواد' نہ ان کی باتیں نہ سامنے رکھا لزانیہ' نہ اس کا فیورٹ مشروب...

"پہلے یہ کھاؤ... پھر بتاتا ہوں۔" اس کے لہجے میں بلا کی نرمی اور ملائمت تھی۔ زونی کا دل ادب سا گیا۔ اس کی بھوک مٹ چکی تھی۔ وہ بالکل اس انداز میں بیٹھی تھی جیسے اس کی بات سنتے ہی اٹھ کر بھاگ جائے گی۔

"میرا موڈ نہیں۔ آپ بات پوری کریں سر! مجھے گھر جانا ہے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔" اس نے

انتہائی لجاجت سے کہا تھا۔ جواد کچھ پل کے لیے آنکھیں سکیڑے اسے دیکھتا رہا تھا۔ پھر اس نے دوبارہ اپنی بات دہرائی تھی۔

"تمہارے اسی ڈر کا خاتمہ کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ تم کھل کر آزادی کا سانس لے سکو۔ اپنی مرضی سے جی سکو۔ ہنسو' کھیلو۔ جہاں مرضی جاؤ۔ تم پر سے ہر پابندی دور کرنے کے لیے' تمہیں حقیقی خوشیوں بھری زندگی دینے کے لیے۔ تمہیں غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرنے کے لیے میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ صرف تمہارے لیے' تمہاری خوشی کے لیے اپنے دل کی پوری رضامندی کے ساتھ۔" وہ بڑے خواب آگیں لہجے میں بولتا ہوا لحہ بھر کے لیے رکا تھا اور زونی کی بے ترتیب سانسیں بھی لحہ بھر کے لیے رک گئی تھیں۔ جیسے کچھ ہونے والا تھا؟ جیسے جواد کچھ انوکھا بولنے والا تھا؟

زونی کا دل خوف کے مارے پسلیاں توڑنے پہ مجبور گیا۔ اس کا حلق تک سوکھ گیا۔ اور اس کی آنکھوں میں پورب سے اٹھتی ریت بھر گئی تھی۔

وہ آنکھیں مسل مسل کر سامنے دیکھتی رہی تھی۔ اسے ہر چہرہ دھندلا نظر آ رہا تھا۔ اسے ہر عکس دھندلا نظر آ رہا تھا۔ ہر منظر پھیکا تھا۔ بے جان تھا۔ خشک اور بنجر تھا۔

"زونی! تمہارے لیے یہ کچھ عجیب ہو گا۔ لیکن سچ یہی ہے۔ مجھے تم سے پیار ہو چکا ہے۔ اور میں تمہیں بہت جلد تمہارے اس "اکڑو خان" کزن سے مانگنے والا ہوں۔" جواد نے زونی کے سر پر بالا خر دھماکا کر دیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس دیکھتی رہ گئی تھی۔ جیسے اسے کوئی بات سمجھ نہ آ رہی ہو۔ جیسے اسے جواد کا کوئی لفظ پلے نہ پڑ رہا ہو۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ ایسا بالکل نہیں تھا۔ وہ جواد کا لفظ لفظ سن چکی تھی۔ اس کا لفظ لفظ سمجھ چکی تھی۔ لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے سر پہ ہتھوڑا مار دیا ہو۔ جیسے سر پہ گہری ضرب لگی ہو۔

یہ کیسے ممکن تھا۔؟ یہ کس طرح ممکن تھا؟ سر جواد اس کے بارے میں ایسا کس طرح سے سوچ سکتے تھے؟ وہ جیسے ہکا بکا رہ گئی تھی۔ اس کی حلق خشک ہو گیا تھا۔ وہ انگلیاں چٹخاتی مضطرب تھی۔ بے انتہا مضطرب تھی۔

"سر! یہ ممکن نہیں۔" بہت دیر بعد زونی نے بمشکل پھڑ پھڑاتے لہجے میں دو لفظ منہ سے نکالے تھے۔ جواد جو اس سے کچھ اور ہی سننے کی امید رکھتا تھا لحہ بھر کے لیے بھونچکا رہ گیا۔

اتنا تو وہ جانتا تھا۔ زونی میران کو پسند نہیں کرتی۔ وہ اس کے خلاف باتیں کرتی تھی۔ گھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں اسے بتاتی تھی۔ میران کے گلے کرتی۔ اس کے ڈانٹنے پہ غصہ کرتی۔ غرض میران کہیں بھی زونی کی "گڈ بک" میں نہیں تھا۔ تو پھر ممکن کیا نہیں تھا۔"

جواد کی آنکھوں میں ناگواری بھرتی چلی جا رہی تھی۔

"کیا ممکن نہیں؟" وہ اپنے کھردرے لہجے پہ قابو نہیں پا سکتا تھا۔ تب زونی نے سر جھکا کر بڑی بھرائی آواز میں درد سے چور لہجے' تکلیف وہ انداز میں جواد کے سر پر بم گرایا تھا۔

"ممکن اس لیے نہیں کہ دادا اپنی زندگی میں میری اور میران کی شادی کر چکے تھے۔" اور ابھی وہ جواد کو شادی کی باقی تفصیل بھی بتانا چاہتی تھی۔ کہ یہ شادی کس طرح زبردستی ہوئی تھی۔

وہ یہ ساری باتیں سر جواد سے شیئر کرنا چاہتی تھی۔ انہیں ایک ایک بات بتانا چاہتی تھی۔ اپنے اندر کے دکھ' تنہائی۔ تکلیفوں کو۔ جس طرح دادا کے بعد میران نے اسے نظر انداز کیا تھا۔ وہ اکیلی دادا کے سوگ میں گھٹ گھٹ کر جیتی اور مرتی تھی۔ میران نے کبھی اسے پوچھا تک نہیں تھا۔ منہ تک نہیں لگایا تھا۔

آخر کیوں لگاتا۔؟ میران نے اس پہ "ترس" اور "رحم" جو کیا تھا۔ وہ اس کے سر پہ مسلط جو کر دی گئی تھی۔ لیکن وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکی تھی۔ کچھ بھی نہیں بتا سکی تھی۔

کیونکہ اچانک کوئی بڑے آرام اور خاموشی کے ساتھ اس کی دائیں طرف آکر کھڑا ہو گیا تھا جواد ایک دم حواس باختہ ہو کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے

چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

معاً زونی نے خوف کی آخری حد تک پہنچتے ہوئے دائیں طرف دیکھنے کی کوشش میں سر کو ذرا سا اوپر اٹھایا اور پھر زمین و آسمان اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم اٹھے تھے۔

وہ میکانکی انداز میں اٹھنا چاہتی تھی جب کسی نے اس کا بازو اپنے آہنی شکنجے میں جکڑا اور گھسیٹتا ہوا باہر نکلتا چلا گیا تھا۔ جبکہ وہ اسے گھسٹتی جا رہی تھی جیسے صدیوں سے اس کے ساتھ گھسٹ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ غصے میں پورے لاؤنج کا چکر کاٹتا سخت آگ بگولا تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ تمہارے ذرائع کہاں مر گئے تھے آپا! اتنی بڑی بات ہوئی اور تمہیں پتا ہی نہیں چلا۔" جواد کا مارے تنفر کے سانس پھول رہا تھا۔ آنکھوں میں غصہ ناچ رہا تھا۔ جبکہ نائلہ خود دم بخود تھی۔ جبکہ نائلہ خود متوحش تھی۔ یہ انکشاف کوئی معمولی انکشاف نہیں تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ بالکل یقین نہیں آ رہا تھا۔

"تمہیں زونی نے خود بتایا؟" نائلہ نے کوئی چوتھی مرتبہ ہونقوں کی طرح سوال کیا تھا۔ جواد جیسے پھٹ پڑا۔

"ہاں۔" اس نے آگ بگولا ہو کر کہا تھا۔

"اور مجھے نہیں لگ رہا تھا وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ پھر میں نے کالونی کے ایک دو بندوں سے تصدیق بھی کروائی۔ باتوں باتوں میں پوچھنا چاہا تو انہوں نے کہا۔ 'اس شادی کو تو سات آٹھ ماہ ہو چکے۔' اور تمہیں آپا! خبر تک نہیں۔"

"میں تو ابھی تک شاکڈ ہوں۔ ویسے تو بابا مجھے بیٹی بیٹی کہتے تھکتا نہیں تھا۔ پوتی کا نکاح کر کے بتایا نہیں۔ حالانکہ تب میں نے ایک دو مرتبہ کال کر کے بابے کا حال بھی پوچھا تھا۔ مجھ سے چھپالیا۔ اور میں تب یہاں نہیں تھی۔ بس واپس آ کر بھی اتنی مصروفیت رہی کہ کالونی کی کسی عورت سے میل ملاپ نہیں ہو سکا۔ اور دیکھو اس "گھنی" زونی نے ہوا تک لگنے نہیں دی۔" نائلہ کو بھی زونی پہ تاؤ چڑھ رہا تھا۔

"زونی کا کیا قصور؟ آپا! تمہیں ہی باتوں باتوں میں پوچھ لینا چاہیے تھا۔" جواد تڑخا۔

"مجھے الہام تو نہیں ہوا تھا۔" نائلہ چڑ کر بولی تھی۔

"میں تو اچھا بھلا اسے یہاں سے کسی اور جگہ شفٹ ہو جانے کے مشورے دے رہی تھی۔"

"تو پھر کیا بنا؟" جواد نے تلخی سے طنز کیا۔

"تم غصہ کیوں کھا رہے ہو؟" نائلہ بھی تلملائی تھی۔

"تو اور کیا کروں۔" میں زونی کے لیے ذہن بنا چکا تھا۔ سب کچھ چوپٹ ہو کر رہ گیا۔" جواد کا دکھ کسی طور کم نہیں ہو پا رہا تھا۔

"تم ریلیکس فیل کرو۔ ٹینس مت ہو۔ میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گی۔" نائلہ کا انداز حوصلہ افزا تھا۔

جواد نے ترشی سے اسے دیکھا۔

"کیا کر لو گی۔؟ جب نکاح ہو چکا۔ پیچھے کیا رہ جاتا۔"

وہ زہرخند ہوا تھا "جہاں تک میرا تجربہ ہے۔ نکاح سے آگے کچھ بھی نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی نہیں کرتے۔" نائلہ نے جواد کا دھیان ایک دوسرے رخ کی طرف کیا تو وہ بے ساختہ چونک کر خوش ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں لہری اٹھی تھی۔

"واقعی آپا! زونی' میران کو پسند نہیں کرتی۔" اس کا لہجہ پریقین تھا۔ گویا اسے پکا اندازہ تھا کہ زونی' میران کو بالکل اچھا نہیں سمجھتی۔

"دونوں ایک دوسرے سے بے زار نظر آتے ہیں۔ میرڈ لائف ایسی نہیں ہوتی۔ نہ شادی شدہ لوگ اتنے ایک دوسرے سے اکھڑے اکھڑے' بے زار اور تنگ دکھائی دیتے ہیں۔ دونوں کی روٹین بھی ہمارے سامنے ہیں سات آٹھ ماہ پہلے اگر یہ شادی ہوئی بھی ہے تو کامیاب ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔" نائلہ نے گہرے پرسوچ انداز میں کہا تھا۔ جیسے وہ زونی اور میران کی

گزشتہ زندگی کو تصور کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی اور اسے اس شادی میں کوئی نیا پن نظر نہیں آ رہا تھا۔

"تو اس کا مطلب ہے۔ میں پر امید رہوں؟" جواد کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"آف کورس' امید تو ہمیشہ تر و تازہ رہنی چاہیے۔" نائلہ مسکرائی۔

"کامیابی کے چانسز کتنے ہیں؟" اتاؤلے پن سے بولا تھا۔

"ہنڈریڈ پرسنٹ۔" نائلہ کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی تھی۔

"تم کرو گی کیا؟ ہو گا کیسے؟" جواد اس کا لائحہ عمل پوچھنا چاہتا تھا۔

"یہ تم مجھ پہ چھوڑ دو۔" نائلہ نے کالر اکڑائے تھے۔ جیسے اسے اپنی صلاحیتوں پہ پورا بھروسا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک تیز لپک تھی۔ ایک تیز چمک تھی۔ جیسے شکاری کی اپنے "شکار" کو دیکھ کر آنکھوں میں اڈلی ہے۔ لپکتی ہے اور پھر "شکار" کو جھپٹ لیتی ہے۔

☼ ☼ ☼

میران کے بیڈ روم میں اس وقت موت کا سناٹا پھیل رہا تھا۔

بس گھڑی کی ٹک ٹک گونج رہی تھی۔ یا پھر باہر سرسراتی ہلکی سی ہوا۔ جو شیشوں سے ٹکراتی تو پردے ہلکے ارتعاش سے پھول جاتے تھے۔

وہ کب سے ایک ہی زاویے پہ بیڈ کے کونے سے چمٹ کر بیٹھی تھی۔ اس بیڈ پر میران اسے دھکا دے کر پھینکنے کے بعد خود باہر نکل گیا تھا۔ جانے کہاں؟

اور اب تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

کچھ دیر پہلے وہ اسی کمرے میں زونی پہ گرج گرج کر گیا تھا۔ اپنا سارا اشتعال' غصہ اور زہر اگل کر گیا تھا۔ جو کچھ اس نے دیکھا تھا۔ وہ اس کے ضبط' تحمل اور برداشت سے بہت اوپر تھا۔ پھر اس نے زونی کو بے نقط سنائی تھی۔ بے تحاشا غصہ انڈیلا تھا۔ بس ہاتھ اٹھانے کی کسر رہ گئی تھی۔ اشائل ان سے واپسی پہ زونی پورا راستہ روتی ہوئی آئی تھی۔ گھر آ کر بھی روتی رہی تھی۔ اور پھر جب میران نے اسے اپنے کمرے میں لا پھینکا تھا۔ وہ تب بھی بے تحاشا روتی رہی تھی۔

پھر میران کا غصہ جو وہ اس پہ الٹ رہا تھا۔ زہر میں بجھے الفاظ۔ جو ایک ایک کر کے زونی کے دل میں پیوست ہو چکے تھے۔ اس کا گرجنا' برسنا کوئی معمولی نہیں تھا۔ وہ غصے میں گرم پانی کی طرح کھول رہا تھا۔ آگ کی طرح بھڑک رہا تھا۔

"بہت افسوس کا مقام تھا میرے لیے۔ تمہیں وہاں دیکھنا۔ میری برداشت سے بھی بہت اوپر۔ تم جواد کے ساتھ وہاں کیا کر رہی تھیں؟ کیوں گئی تھیں؟ تمہیں شرم نہیں آئی۔" وہ کتنے ہی لمحے چنگھاڑتا رہا تھا۔ غصہ کرتا رہا تھا۔ بولتا رہا تھا۔ اس کا طیش کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

"مجھے شرم آئی تمہیں وہاں دیکھ کر۔ دل چاہ رہا تھا۔ طمانچے مار مار کے تمہارا منہ رنگ دوں۔ کاش دادا ہوتے اور اپنی پوتی کی خود سریاں دیکھتے۔" میران زہرخند ہوا۔ اسے بار بار گھورتا اور جھنجوڑتا رہا۔

"کالج ٹائم میں تمہارا جواد کے ہمراہ ہوٹلوں میں گھومنا کیا معنی رکھتا ہے زونی!۔" وہ شدت غیض سے چلا رہا تھا۔ تب گھٹنوں میں سر دیے بے تحاشا گھٹ گھٹ کر روتی زونی الزام در الزام پہ چیخ اٹھی تھی۔

"نہیں کوئی ضروری کام تھا۔ مجھے کال کر کے بلایا۔ میں باہر آئی تو انہوں نے کہا۔ وہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے پتا نہیں چلا اور اشائل ان آ گیا۔ میں ہرگز نہیں جانا چاہتی تھی۔ مگر سر نے مجھے فورس کیا۔ میں نے سوچا۔ میرے استاد ہیں۔ بات سن لیتی ہوں۔ اور بس۔" زونی سسکیوں کے دوران بمشکل بول سکی تھی۔ میران کا غصہ اس وضاحت پہ بھی نہیں اترا تھا۔

"استاد؟ بھاڑ میں گیا استاد۔ تمہیں وہ کنویں میں چھلانگ لگانے کا کہتا اور تم لگا دیتیں؟ تمہیں کب عقل آئے گی زونی! پھر تم نے مجھ سے اجازت کیوں نہیں

لی۔؟" وہ یکدم دہاڑا تھا۔

"یہ میری زندگی ہے۔ اور میں کسی کی پابند نہیں۔" زوفی کے اگلے الفاظ اس کا دماغ اور بھی تپا گئے تھے۔

"میں اپنی زندگی میں خود سے مخلص لوگوں کے ساتھ میل جول بھی نہیں رکھ سکتی؟" زوفی بھی تڑخ کر بولی تھی۔ میران کا دماغ گھوم گیا۔

"میل جول سے کس نے منع کیا ہے۔" تم اس ہوٹل میں کیوں گئیں؟ جواد کو جو ضروری بات کرنا تھی۔ وہ اکیڈمی میں کرتا یا نائلہ کے توسط سے۔ وہ تمہیں ہوٹل کیوں لے کر گیا؟"

"میں خود گئی تھی سر نے مجبور نہیں کیا تھا۔" اس نے بے دھڑک کہا۔

"لیکن آئندہ نہیں جاؤ گی۔ نہ کہیں باہر اور نہ ہی اکیڈمی۔ اور جواد سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ بس اکیڈمی کی حد تک تھا۔ اکیڈمی ختم تو یہ تعلقات بھی ختم۔ جہاں تک نائلہ یعنی کرائے داروں کا تعلق ہے۔ تو میں انہیں فلیٹ خالی کرنے کا نوٹس بھجوانے والا ہوں۔" میران کے اگلے الفاظ نے زوفی کو ہکا بکا کر دیا تھا۔ "نائلہ آنٹی کا اس معاملے میں کیا قصور ہے؟ انہیں کس بات کی سزا دے رہے ہیں. آپ! وہ تو ایک طویل عرصہ سے یہاں رہ رہی ہیں۔" وہ روتے روتے روہانسی ہو گئی تھی۔

"آپ ان کے ساتھ اس طرح نہیں کر سکتے۔"

"اب وہ یہاں رہنے کے قابل نہیں۔ اوکے! تم بلاوجہ حمایت مت کرو۔ اور ہاں' اگر تم نائلہ یا اس کے بھائی سے ملی تو تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔ ابھی اکیڈمی چھڑوائی ہے۔ پھر کالج بھی چھڑوا دوں گا۔ اور آخری بات تمہیں اس کمرے تک لانے کا یہ مقصد نہیں کہ میں غصے میں تمہیں ادھر لے آیا ہوں۔ کان کھول کر سن لو۔ یہ کمرہ تمہاری "حدود" تم پر واضح کرتا رہے گا تمہیں بتاتا رہے گا کہ تم "پابند" ہو۔ میری پابند۔ میں نے تمہیں ڈھیل دے کر سر چڑھا لیا ہے۔ تم اپنی من مانیاں کرنے لگ گئی ہو۔ خبردار' جو تم یہاں سے باہر نکلی۔ اور اس "غلطی" کو تمہاری نادانی سمجھ کر پہلی اور آخری مرتبہ معاف کر دیتا ہوں۔ آئندہ ایسا ہوا تو میرے ہاتھوں قتل ہو جاؤ گی۔" وہ تن فن کرتا وارننگ دیتا باہر نکل گیا تھا۔ اور تب سے لے کر اب تک واپس نہیں آیا تھا۔ زوفی رو رو کر تھک چکی تھی اوپر سے بھوک نے بھی نڈھال کر رکھا تھا۔ سر اٹھاتی تو چکر آنے لگتا تھا۔ اوپر سے کبھی سر جواد کی باتیں دماغ گھما دیتی تھیں اور کبھی میران کا غصہ۔

زوفی کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ سر جواد نے اس سے اظہار محبت کیا ہے۔ ان کے الفاظ؟ اف۔ زوفی نے ایسا انداز پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ جانے وہ خوش تھی یا نہیں البتہ حیران ضرور تھی۔

ویسے بھی تعریف' نرم الفاظ' محبت بھرے جملے کسے برے لگتے ہیں۔ زوفی کو لگ رہا تھا۔ اسے سر جواد کے الفاظ بہت اچھے نہ سہی تو بہت برے بھی نہیں لگے تھے۔

اور اس وقت وہ میران کا سارا گرجنا چمکنا بھول کر سر جواد کو سوچ رہی تھی۔ اور شاید دل کو دل سے راہ ہوتا اسی کو کہتے تھے کہ سر جواد کی اچانک کال آ گئی۔

زوفی نے کچھ ڈرتے ڈرتے کال ریسیو کر لی تھی۔ جواد کی بے قراری کو جیسے قرار آ گیا تھا۔

"زوفی! شکر ہے تمہاری آواز سننے کو ملی۔ میری جان پہ بن گئی تھی۔ میران کے تیور بہت خراب تھے اس نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں۔؟" وہ شدید پریشان تھا۔ زوفی کے لیے انتہائی متفکر تھا۔ زوفی کو اس کا خیال رکھنا پسند آیا تھا۔

"کیسا ظالم درندہ ہے زوفی یہ تو۔ میں تو غم سے مر رہا ہوں۔ تمہیں اس دیو کے چنگل سے کیسے آزاد کراؤں۔" جواد کے لہجے میں زوفی کی تکلیف کا اثر بول رہا تھا۔ جبکہ زوفی نے روتے ہوئے اسے ساری کتھا سنا ڈالی تھی۔

"زوفی! تم فکر مت کرو۔ میں تمہاری کنڈیشن سمجھتا ہوں۔ میں جلدی تمہیں اس درندے کی قید سے آزاد کرا لوں گا۔" جواد نے اسے تسلی دیتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔ اسی پل داخلی دروازہ کھول کر میران

بھی آ گیا۔ زوفی نے جلدی جواد کا نمبر ڈیلیٹ کیا اور پھر دوبارہ گھٹنوں میں منہ دے کر بیٹھ گئی تھی۔ کچھ دیر کھٹ پھٹ کرنے کے بعد میران اندر آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بے شمار شاپر تھے وہ سارے شاپر فرش پہ رکھ کر زوفی کے قریب آیا۔ پھر اس نے زبردستی زوفی کو اٹھا کر واش روم میں کھڑا کیا۔

"منہ ہاتھ دھو کر باہر آؤ۔ میں کھانا لایا ہوں کچھ اندر جائے گا تو احساس ہو گا جو تم نے کیا ٹھیک نہیں تھا۔" اب کی دفعہ اس کی آواز میں ملائمت تھی۔ پھر وہ باہر نکل گیا تھا۔ زوفی غصے میں منہ دھوتی رہی تھی۔ پھر کافی دیر بعد میران کے کھینچنے پہ ہی باہر آئی۔ تب تک وہ میز پر کھانا لگا چکا تھا۔

"کھانا کھاؤ زوفی! اور غصہ جانے دو۔ میں بھی تین گھنٹے باہر اسی لیے گزار کر آیا ہوں۔ تاکہ اپنا دماغ ٹھنڈا کر سکوں۔" میران نے اسے ٹس سے مس نہ دیکھ کر چھوٹا سا نوالا توڑ کر اس کے ہاتھ میں پکڑایا۔

"اگر خود نہیں کھاؤ گی تو زبردستی کھلاؤں گا۔" اس کی دھمکی سن کر زوفی نے نوالہ توڑ لیا تھا۔ لیکن دماغ میں باتیں سر جواد کی چل رہی تھیں۔

"میران مجھے پسند نہیں کرتے۔ دادا نے زبردستی کی۔ ہر بندے کو اپنی پسند کی زندگی جینے کا حق ہے۔ پھر میں میران پہ کیوں مسلط رہوں؟ جبکہ میرے پاس ایک اور آپشن بھی موجود ہے۔" زوفی کے دماغ میں بس یہی کھچڑی پک رہی تھی ادھر میران اسے کچھ اور ہی بتا رہا تھا۔

"کل امید ہے رمضان کا چاند ہو جائے گا۔ میں سارا راشن خرید لایا ہوں۔ تم اٹھ کر چیزیں سنبھال لو۔ رات کو الارم لگانے کی ضرورت نہیں۔ تم یہیں سوؤ گی۔ میرے کمرے میں۔ سو میں تمہیں سحری کے وقت جگا لوں گا۔" وہ اسے صبح تک کا شیڈول بتا رہا تھا۔ اور وہ بے خیالی میں سن رہی تھی۔ اس کا ذہن کہیں اور رواں دواں تھا۔

"ان کے پاس تو کوئی ڈھنگ کی بات نہیں۔ کیوں کریں مجھ سے اچھی اچھی باتیں۔ اسی سے کریں گے۔ من پسند دلہن سے۔ جو اپنی مرضی کی لائیں گے۔ میری کیا اوقات۔؟" زوفی کا جل جل کر دل کباب ہو رہا تھا۔

"ایک سر جواد ہیں۔ ان کے پاس خوب صورت باتوں کا ایک ذخیرہ موجود ہے۔" اس نے بے خیالی میں سوچا تھا۔ پھر سنبھل کر جیسے خود کو ملامت کرنے لگی۔

"میں کیوں سر جواد کو بار بار سوچتی ہوں۔"

اور پھر سر جواد کو سوچنے کا ایک سلسلہ ہی چل پڑا تھا۔ بلکہ وہ دونوں بہن بھائی زوفی کی سوچوں' خوابوں اور خیالوں پر حاوی ہوتے چلے گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

ان دنوں اسے کالج سے چھٹیاں تھیں۔ اس کا زیادہ قیام گھر میں تھا۔ وہ خود بھی رمضان کو انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ کھل کر خشوع کے ساتھ عبادات کا مزا لینا چاہتی تھی۔ کیا پتا' اسی بہانے سے دل کی بے سکونی کو کنارہ مل جاتا۔ اور انہی دنوں میں نائلہ اور سر جواد کی زوفی سے ہمدردیاں' لگاؤ' التفات بہت بڑھ گیا تھا۔ یوں وہ دونوں دنوں میں ہی زوفی کی زندگی کا لازم ملزوم حصہ بن گئے تھے۔

صرف چند دنوں میں ہی نائلہ نے زوفی کو ذہنی طور پر اپنے بس میں کر لیا تھا۔ وہ زوفی کے پاس روزانہ میران کی غیر موجودگی میں آ جاتی تھی۔ پھر گھنٹوں اس کے پاس بیٹھی رہتی۔ باتوں باتوں میں میران کی برائیاں کرتی۔ اس پہ ڈھکے چھپے لفظوں میں الزام لگاتی اور ہر دفعہ اٹھتے ہوئے جواد کے دل کا حال سنانا نہ بھولتی تھی۔

"جب سے اسے تمہارے نکاح کا پتا چلا ہے۔ صدمے سے اس کی حالت غیر ہے۔ اس نے تم سے دل لگا لیا تھا۔ اور پہلی محبت کا روگ عمر بھر نہیں بھولتا۔ ہائے میرا معصوم بھائی!" نائلہ کی آنکھوں میں آنسو بھر جاتے تھے تو زوفی بھی خوا مخواہ خود کو چور سمجھنے لگتی تھی۔ جیسے اس سارے قصے میں زوفی کا ہی قصور ہو۔ نائلہ اور جواد کا ہر وقت زوفی سے موبائل پہ رابطہ تھا۔

اکثر نائلہ اس کے پاس آئی ہوتی تو پیچھے سے جواد بھی بلانے کے بہانے چکر لگاتا رہتا۔

دراصل وہ زوفی کے اردگرد اپنا حصار بنالینا چاہتے تھے۔ وہ اسے اپنی محبت' چاہت اور الفت کے شکنجوں میں جکڑ لینا چاہتے تھے۔ ان کی چکنی چکنی باتوں پہ کئی مرتبہ نادان زوفی پھسل بھی چکی تھی۔

پھر جب نائلہ اور جواد کو یقین ہوگیا کہ زوفی ان پہ اندھا اعتماد کرنے لگی ہے۔ وہ ان کی ہر بات پہ آنکھ بند کرکے ایمان لے آتی ہے۔ وہ ان دونوں کو اپنا سب سے بڑا مخلص ہمدرد سمجھتی ہے تب ہی نائلہ نے اپنا آخری داؤ بھی چلا دیا تھا۔

زوفی جو میران کی مصروفیات اور لیے دیے رویے سے تنگ تھی۔ دل ہی دل میں ناراض بھی تھی۔ اب "شک" میں بھی مبتلا ہوچکی تھی۔ اور اس کا "شک" مضبوط کرنے والے نائلہ اور جواد ہی تھے۔ ایک طرف وہ زوفی کو بتاتے کہ میران نے باہر کسی لڑکی سے عشق چلا رکھا ہے اور دوسری طرف زوفی کو اکساتے۔ وہ اپنا رویہ میران کے ساتھ سخت روکھا اور اجنبی رکھے۔ وہ اس کے آگے پیچھے مت پھرے۔ اس کے کام بھی مت کرے۔ میران کو اہمیت نہ دے۔ کیونکہ میران اس قابل نہیں تھا۔ گھر میں زوفی کو نوکرانی بنا رکھا تھا اور باہر کسی حسینہ کو بغل میں دبائے عیاشیاں کررہا تھا۔ زوفی کو جب اس بات کا یقین ہوگیا تو اس کے رات دن ایک عذاب میں کٹنے لگے۔ میران کی طرف سے ایسی قیامت خیز خبر نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

ان ہی دنوں زوفی پہ انکشاف ہوا کہ وہ میران سے کس قدر پیار کرتی ہے۔ اس حد تک کہ سر جواد کی چکنی چپڑی گوئی بھی خوب صورت بات اس کو اچھی نہیں لگتی تھی۔

جب سے اسے میران کی بے وفائی کا پتا چلا وہ دنوں میں کوئی ویران کملایا ہوا پھول بن گئی۔ اس کا نہ دن کٹتا تھا نہ رات۔ وہ سارا دن گھر میں بولائی بولائی پھرتی تھی۔ اور رات کو میران جب آجاتا تو غصے کے اظہار اور اس پہ اپنی خفگی جتانے کے لیے وہ کمرہ بند کرکے منہ سر لپیٹتی' سوجاتی یا منہ تکیے میں گھسا کر روتی رہتی۔ کتنا آسان تھا یہ سوچ لینا کہ وہ میران کی زندگی میں زبردستی گھسی ہے اسی طرح خود بخود اچانک نکل کر اسے آزاد کردے گی۔ اور یہ صرف سوچ تک محدود کام تھا۔ عملی طور پر ایسا کچھ کرنا اس کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ دریا پار کرنے سے کم نہیں تھا۔ اگر سر جواد اسے نہ بتاتے۔ میران کے کرتوتوں کا اسے نہ پتا چلتا تو آج زوفی پہ "محبت" والا یہ انکشاف بھی نہ ہوتا۔ وہ جتنا مرضی میران کی بے اعتنائی پہ جلتی تھی۔ وہ جتنا مرضی میران کے گلے کرتی' اس پہ ناراض ہوتی لیکن اس کی "بےوفائی" کا سن کر اندر سے زوفی ٹوٹ چکی تھی۔

اسے تو اب پتا چلا تھا وہ اس کے اولین دنوں کی چاہت تھا۔ میران اس کے من میں تب ہی آن بسا تھا جب دادا نے ان دونوں کا نکاح کیا۔ ہاں تب اسے میران کے انکار نے دھچکا پہنچایا تھا۔ اور میران کے الفاظ نے اسے بہت تکلیف دی تھی۔ وہ زوفی پہ رحم اور ترس کھاتا تھا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ وہ کتنا عرصہ اندر ہی اندر میران سے ناراض رہی تھی۔ پھر خود ہی مان بھی گئی۔

کیونکہ اسے لگتا تھا تب میران نے ذہنی دباؤ میں آکر یہ الفاظ کہے ہوں گے۔ لیکن اب زوفی کو پکا یقین ہوگیا تھا۔ میران نے دادا سے جو کہا ٹھیک کہا۔ اسے اپنی من پسند لڑکی مل گئی تھی۔ وہی جو اس کی محبوبہ تھی۔ اور زوفی محض ایک نوکرانی؟ ایک خادمہ۔

جو اس کے تمام کام کرتی۔ اس کا حکم بجالاتی۔ اسے سحریاں' افطاریاں بنا بنا کر کھلاتی اور بدلے میں میران اسے کیا دے رہا تھا؟

دھوکا؟ نفرت؟ زیادتی؟ ظلم؟ اس پہ سوکن مسلط کرنا چاہتا تھا؟

اور پھر سارا دن جائے نماز پہ روتی تڑپتی زوفی کو ایک اور "ہلا" دینے والی خبر مل گئی تھی۔ اس دن صبح ہی صبح افتاں خیزاں نائلہ روتی ہوئی زوفی کے پاس آگئی۔ میران آفس جاچکا تھا۔ زوفی گھر میں اکیلی تھی۔ اور اس وقت وہ سحری کے تمام برتن دھو کر گھر کی صفائی کرنے کے بعد

تسبیح پڑھ رہی تھی جب تڑپتی ہوئی نائلہ کو دیکھ کر دھک سے رہ گئی تھی۔ نائلہ کے ہاتھ میں ایک خالی لفافہ تھا۔ اور وہ زوفی کے گلے لگ کر تڑپ رہی تھی۔ اور اس کے الفاظ زوفی کے پیروں تلے سے زمین نکال رہے تھے۔

"دیکھو زوفی! میران اس کمینی لڑکی کی خاطر ہمیں کتنا ذلیل کررہا ہے۔ یہ دیکھو' ہمیں فلیٹ خالی کرنے کا نوٹس بھجوادیا۔ ساتھ اس نے جواد سے یہ بھی کہا۔ وہ دوسری شادی کرنے والا ہے۔ اور اپنی دوسری بیوی کو ہمارے والے فلیٹ میں رکھے گا۔ ظاہر ہے زوفی کو طلاق نہیں دے سکتا۔ لیکن اسے بسانے کا ارادہ بھی نہیں۔ زوفی! وہ ہمیں تو نکلوا ہی دے گا۔ لیکن اس گھر میں اپنی "محبوبہ" کو رکھے گا۔ وہ تم پر سوکن لارہا ہے۔ وہ تمہیں دھتکار رہا ہے۔ اس سے بہتر ہے' اتنا ذلیل ہونے سے بہتر ہے۔ تم خود میران سے طلاق کا مطالبہ کرلو۔" نائلہ نے تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے زوفی کے سر پہ بم گرادیا تھا۔ اور یہ آخری داؤ زوفی کے لیے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا تھا۔ اس کے بعد زوفی نے اپنی زندگی کی سب سے آخری نادانی بھی کرلی تھی۔ اس نے اپنے ٹائی ٹینک کو ڈبو ہی دیا۔

☼ ☼ ☼

رمضان کا آخری عشرہ رواں دواں تھا۔

اب بس گنتی کے روزے رہ گئے تھے۔ ایک یا دو دن میں چاند رات قریب آجاتی۔

زوفی کا ان دنوں مصلے پر زیادہ وقت گزر رہا تھا۔ میران اسے عبادات میں مشغول دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔ پھر ایک دن افطار سے پہلے میران نے زوفی سے کہا۔

"زوفی! تم اس رمضان میں پچھلی ساری عبادات کی کسر نکال رہی ہو۔ کیا پچھلے سارے "گناہ" بخشوانے کا ارادہ ہے؟۔" وہ اس کی شرارت کو سمجھے بغیر پہلے سے زیادہ سنجیدہ انداز میں بولتی ہوئی افطار کا سامان ٹیبل پر لگاتی رہی۔

"میں نے کون سا بڑے گناہ کیے ہیں؟" زوفی تڑخ کر رہ گئی تھی۔ "لوگ تو اتنے بڑے بڑے جرم کرکے بھی دندناتے پھرتے ہیں۔ ذرا بھی گناہ نہیں بخشواتے۔"

"لوگوں سے مراد کیا میں ہوں۔" میران نے معصومیت کی انتہا کرڈالی تھی۔ اس دن کے بعد اس کا رویہ زوفی کے ساتھ بہتر ہوگیا تھا۔ اور پھر اس نے دوبارہ زوفی کو اسٹائل ان کے متعلق جتایا بھی نہیں تھا۔ زوفی نے اسے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

"جتنی بھی عبادت کرلو۔ تم اپنے شوہر کے حقوق سے نظر چرا چرا کر بہت بڑا گناہ کررہی ہو زوفی! اس کی بخشش ممکن نہیں۔" میران کی شرارت ہنوز برقرار تھی۔ زوفی جوس کا جگ میز پہ رکھتی ٹھٹک گئی۔

"اور آپ اپنی بیوی کے حقوق تو بہت پورے کررہے ہیں۔" زوفی کا جواب برجستہ تھا۔ اس بار میران کو سچ مچ اچھلنا پڑا۔

"زوفی! تم تو خاصی عقل مند ہوگئی یار! ایسی سمجھداری کی بات۔؟ واہ جی' کیا کمال کردیا۔" میران کا انداز بھرپور تعریفی تھا۔ زوفی ہنوز سنجیدہ ہی رہی۔

"وقت اور حالات انسان کو سمجھ دار کردیتے ہیں۔" اس کی آنکھوں میں ریت بھرنے لگی تھی۔ نائلہ اور سر جواد کی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ میران کا اس لڑکی کے ساتھ گھومنا۔ ہوٹلنگ' شاپنگ' محبت اور اب شادی۔؟ زوفی کا دل بھر آیا تھا۔ لیکن وہ اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ کمزور پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اور ابھی تو اس دشمن جان تک اپنا آخری فیصلہ بھی پہنچانا تھا۔ آج ہی افطار کے بعد۔

"دیٹس گریٹ!" میران نے سر ہلایا۔ پھر اس کی گزشتہ بات کا جواب دینے لگا۔

"کیا میں نے تمہارے حقوق پورے نہیں کیے؟ کیا میں تمہارا خیال نہیں رکھتا؟ تمہاری ہر ضرورت مجھے بن کہے پتا ہوتی ہے۔"

"ہر ضرورت پوری کرتے ہیں مگر پیار کے دو بول آپ کے پاس نہیں۔" زوفی نے دل ہی دل میں تلخی

سے سوچا تھا پھر زیر لب بڑبڑا کر رہ گئی۔

"بیوی کے حقوق صرف ضرورت تک محدود نہیں ہوتے۔" زونی کے اگلے الفاظ نے میران کے چودہ طبق روشن کردیے تھے۔ وہ ایک مرتبہ پھر اپنی جگہ پہ اچھل گیا تھا۔ آج تو زونی اسے حیران کرنے پہ تلی ہوئی تھی۔ آج تو زونی اس کے حواس گم کرنے پہ تلی ہوئی تھی۔ اتنی گہری بات؟ اتنا حساس انداز؟ اس قدر ذو معنی جملہ' اس قدر واضح کرتا' عیاں ہوتا "حقوق و فرائض" کی طرف اشارہ۔؟ یہ زونی تھی۔ میران کے نزدیک ناسمجھ' نادان۔ احمق۔ بیوقوف۔

وہ دل ہی دل میں جیسے متاثر ہوگیا تھا۔ پھر اسے زونی پہ ٹوٹ کر پیار آگیا۔ تو گویا وہ اپنے اور میران کے رشتے کی گہرائی سمجھنے لگی تھی؟ وہ اپنے اور میران کے تعلق کی حساسیت سمجھنے لگی تھی۔ وہ اپنے اس رشتے سے بندھی "ضروریات" اور "حقوق" کی باریکیاں جاننے لگی تھی۔؟ اور کیا وہ چاہتی تھی میران دو قدم چل کر خود اس کے قریب آئے؟ میران ایک دل نشین کیفیت میں گرفتار ہوکے تھوڑا سا آگے ہوا اور زونی کے بالکل سامنے کھڑا ہوگیا۔ یوں کہ زونی دو قدم بے ساختہ پیچھے ہٹی تھی۔ میران نے بڑی ملائمت سے اس کے گال کو چھوتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری کسی ضرورت اور حقوق سے انجان نہیں زونی! اپنے سارے فرائض سمجھتا ہوں۔ لیکن میں تمہیں تمہاری دلی خوشی اور رضامندی سے پانا چاہتا ہوں۔" اس نے ایک فسوں خیز پاکیزہ لہجے کے زیر اثر بڑے خواب آگیں لہجے میں کہا تو زونی کو ایک دم چکر سا آگیا تھا۔

"اللہ' کس قدر یہ منافق اور دوغلا انسان ہے۔" زونی ہکابکا رہ گئی تھی۔

"پتا ہے' زونی! تم ایک الہامی کیفیت میں میرے دل میں اتر گئی۔ ورنہ جب دادا نے میرے اور تمہارے بارے میں فیصلہ کیا تب میں کئی مہینے تک یہی سوچ سوچ کے پریشان ہوتا تھا بھلا "محبت" کے بغیر ہماری زندگی کیسے گزرے گی۔" اس کے نرم' بھیگے' میٹھے الفاظ زونی کو اپنی سخت توہین لگے تھے۔ اچانک اسے نائلہ کی کہی باتیں یاد آنے لگیں۔ "اور میں نے تو یہ بھی سنا ہے۔ میران تمہیں پیار محبت کا جھانسا دے کر ہمارے والا فلیٹ اپنے نام لکھوالے گا۔ بلکہ اپنے بھی کہاں۔ اس کمینی محبوبہ کے نام۔ کیونکہ وہ فلیٹ تمہاری ملکیت میں ہے۔ ان دنوں وہ تم سے چکنی چپڑی باتیں کرکے اپنا مطلب ضرور نکلوائے گا۔ تم اس کی "محبت" کے جھانسے میں مت آنا۔ بس جلدی سے میران کے چنگل سے نکل آؤ۔ جواد تو اب بھی تمہارا منتظر ہے۔"

نائلہ کے الفاظ زونی کے لیے کسی کوڑے سے کم نہیں تھے۔ وہ توہین اور ذلت کے احساس سے دھواں دھواں ہوگئی تھی۔ دل چاہتا تھا خودکشی کرے۔ خود کو ختم کرے۔ کسی اندھی کھائی میں گر جائے۔ اپنا نام و نشان تک مٹا ڈالے۔ وہ ایسے دوغلے انسان کے ساتھ رہنے پر مجبور تھی۔ جو اس کی ناک تلے "کھیل محبت" کامیابی سے چلا رہا تھا اور زونی کے ساتھ اس کی اداکاری بھی کمال کی تھی۔ منجھے ہوئے کھلاڑی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جو ہر محاذ پر یکساں مقابلہ کریں۔ پھر ہاریں بھی نا۔ ہمیشہ جیتتے رہیں۔

زونی کی آنکھوں میں کانچ چبھنے لگے تھے۔

"اور میں نے پتا ہے کیا سوچ رکھا تھا؟" میران کی آواز اسے سوچوں کے تلخ بھنور سے کھینچ لائی تھی۔ زونی خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کا دل قطرہ قطرہ گرنے لگا۔ کیا اس شخص کی بے وفائی سہنے کا اس میں حوصلہ تھا؟ کیا اس شخص کو ہمیشہ کے لیے کھو دینے کا حوصلہ تھا؟ وہ کیا کرے گی؟ میران کی زندگی سے نکل کر کیا کرے گی؟ زندگی کو تنہا' اکیلے کیسے شروع کرے گی؟ اس کا رواں رواں رونے لگا۔ آہ و فغاں کرنے لگا۔

اس نے زونی کے گال پہ انگلی پھیر کر اسے ایک مرتبہ پھر اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

"میں نے سوچا تھا۔ ہم اس چاند رات کو اپنی نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔" میران کا دھیما پر اثر محبتوں

سے گندھا لہجہ اور آواز سن کر زونی کے اندر صف ماتم بچھ گئی تھی۔ ایسی اداکاری؟ ایسی فن کاری؟ اور پھر فیصلہ کن رات ان دونوں کے درمیان آگئی تھی۔ ایسی رات جس نے ان دونوں کے درمیان ایک مرتبہ پھر ان دیکھی خلیج قائم کردی تھی۔

میران جو بہت جلد اپنی زندگی کو ترتیب دینا چاہتا تھا۔ دادا کے کیے اس خوب صورت فیصلے کو ایک موڑ دینا چاہتا تھا۔ ایک خوب صورت کنارا دینا چاہتا تھا۔

ایک وقت ایسا تھا جب اس نے زونی کو اس نظر سے کبھی نہ دیکھتے ہوئے دادا کے فیصلے سے اختلاف کیا تھا۔ لیکن کچھ ہی وقت گزرنے کے بعد وہ دادا کی زیرک نگاہی اور ان کے لیے محبت کا قائل ہوگیا تھا۔ دادا ان دونوں کو ایک کرکے بہترین فیصلہ کیا تھا۔ وہ دادا کا ہمہ وقت شکر گزار رہتا۔ واقعی ہی جو ہمارے بزرگ جانتے ہیں وہ نزاکتیں ہم نہیں جانتے۔

اگر ان دونوں کے درمیان یہ خوب صورت بندھن نہ ہوتا تو زونی اور میران کا ایک گھر میں رہنا کس قدر غیر مناسب ہوتا۔

اور اسے اتنا اندازہ تو تھا ہی زونی اسے رشتے پہ خوش ہے۔ لیکن کچھ ہی عرصے میں اسے زونی الجھی الجھی لگنے لگی تھی۔ اس کا رویہ بے زار کن ہو رہا تھا۔ وہ اتنا خوش دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بلاوجہ ضدیں کرتی تھی۔ بلاوجہ ناراض ہوتی۔ خفا خفا دکھائی دیتی۔

گھر میں بھی اس کی دلچسپی کم ہو رہی تھی پھر ہر بات میں میران سے اختلاف کرنا؟ وہ چونکتا کیوں نا؟۔ پھر بہت جلد ہی میران کو زونی کی الجھنوں' بیزاریت اور غصے کی وجہ سمجھ آگئی تھی۔

گو کہ اس میں کچھ وقت لگا تھا۔ پھر بھی وہ سمجھ گیا تھا کہ زونی کو اتنی "الجھنوں" میں پھنسانے کے پیچھے کس کا آرٹسٹک دماغ ہے یا کس کا اس تمام کارروائی کے پیچھے ہاتھ ہے۔؟" اور جیسے ہی میران ان دو لوگوں کی شاطرانہ چال تک پہنچا تب تک کافی دیر ہوچکی تھی اور نوبت آج کی رات تک آگئی۔

وہ بڑی ترنگ کے عالم میں زونی کے لیے بے انتہا شاپنگ کرکے آیا تھا۔ اس کا عید کا جوڑا' جوتے' چوڑیاں اور بھی بہت سامان۔

اور یہ ساری چیزیں زونی کے لیے "سرپرائز" کے طور پر خریدی گئی تھیں۔ لیکن زونی' میران کے لیے اس سے بڑا سرپرائز سنبھال کر بیٹھی تھی۔

جیسے ہی اس نے تمام شاپر زونی کو پکڑائے' اس نے دیکھنے کی زحمت کیے بغیر آرام سے صوفے پہ لڑھکا دیے تھے۔ اور میران اپنی اس قدر لائی گئی چیزوں کی ناقدری پہ ہکابکا رہ گیا تھا۔

"اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟" زونی نے انتہائی بے زاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ میران کا دل بہت ہی برا ہوا۔ وہ زونی کے ابھی اتنے نارمل انداز پر حیران تھا جب اس نے مزید اسے لمحہ بھر میں ہی شاکڈ کردیا۔

"میرے پاس کپڑوں کی کمی نہیں۔ آپ یہ کسی اور کے لیے کرلیتے۔" میران اس کے الفاظ کو تولتا کچھ پل کے لیے سوچتا رہ گیا تھا۔ پھر اس کے چہرے پر ہلکی سی ناگواری در آئی۔

"مثلاً" کس کے لیے؟"

"یہ تو آپ کو پتا ہوگا۔" زونی نے آنکھیں جھکا کر امڈ آتی نمی کو چھپانا چاہا۔

"آئم سوری میں تو لاعلم ہوں۔ اگر تم کچھ جانتی ہو تو بتادو۔" اس کا لہجہ دو ٹوک قسم کا سنجیدہ تھا۔ زونی نے روح میں اترتی اذیت سے کرلا کر میران کی طرف دیکھا۔ اس چہرے کی طرف دیکھنا کتنا محال تھا؟ اس کے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔ بالکل اندر' دل کی گہرائیوں میں۔ قطرہ قطرہ لمحہ لمحہ۔

"لوگ سب کچھ کر کرا کر انجان بن جاتے ہیں۔ جیسے بڑے معصوم ہوں۔" زونی ایک دم چیخ گئی تھی۔ جیسے اس نے آر یا پار ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میران بھی گہرا سانس کھینچ کر سنبھل گیا۔ گویا ابلتی ہانڈی کے ابلنے کا وقت آگیا تھا۔ اور یہی بہتر بھی تھا۔ میران بھی یہی چاہتا تھا۔ وہ خود اپنا آپ عیاں کرے۔ وہ خود اپنے اندر کی بھڑاس نکالے۔ اگر کوئی مس انڈر اسٹینڈنگ تھی تو شیئر کرنے سے دور ہوسکتی تھی۔

"تم کھل کر بات کر سکتی ہو زونی! وہ سب کہہ دو۔ جس نے تمہارے من کو بوجھل کر رکھا ہے۔ تمہیں جس کشمکش میں مبتلا کر رکھا ہے۔" میران نے گہرا سانس کھینچ کر ملائمت سے کہا۔ اور پھر زونی جیسے ابل پڑی تھی۔

"میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ جو کرنا تھا آپ نے کر لیا۔ میں تو اپنی نام نہاد انا بچانے کے چکر میں ہوں۔ آپ اپنی من مانیاں کر لیں۔ اپنی من پسند لڑکی سے شادی رچالیں۔ یا جسے چاہیں اس گھر میں لے آئیں۔ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ عید سے پہلے ہی۔ کیونکہ میں جان چکی ہوں۔ یہاں خالص جذبوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہاں کوئی آپ کی الفت' چاہت یا محبت کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ اور مجھ جیسی لڑکی سے آپ کو ملے گا بھی کیا؟ مجھ پہ تو آپ نے ترس کھایا تھا۔ رحم کیا تھا۔ اب میں خود ہی آپ کی زندگی سے جا کر آپ کو آزاد کر دیتی ہوں۔ تاکہ آپ کھل کر انجوائے کر سکیں۔"

زونی کپکپاتے' تڑپتے لہجے میں کراتی میران کو گہرا سانس کھینچنے پر مجبور کر گئی تھی۔ وہ بڑے ہی سکون کے ساتھ اسے سنتا رہا۔ جب وہ چلا چلا کر خاموش ہو گئی اور نائلہ کی کہی ایک ایک بات دس دس لگا کر سنا دی تب میران نے گلا کھنکھار کر کہنا شروع کیا تھا۔

"میں جانتا تھا زونی! کچھ تو ہے' جو تمہیں کسی الجھن میں مبتلا کرتا ہے۔ کر رہا ہے۔ کوئی تو ماسٹر مائنڈ ہے جو تمہاری ذہنی رو کو جگہ جگہ بھٹکا کر الجھاتا ہے۔ کوئی تو تا جو ہمارے درمیان فاصلے بھر رہا تھا۔

پھر میں نے اس پہ اچھا خاصا ریسرچ ورک کیا تو مجھے اندازہ ہوا۔ میرے دشمن میرے اپنے قریب اتنے قریب موجود ہیں۔ اور میں آستین میں سانپ پال رہا ہوں۔ گو کہ جان تو میں گیا تھا پھر بھی میں چاہتا تھا تم خود اپنے اندر کی بھڑاس مجھ تک پہنچاؤ تب میں تمہیں اس بھیانک حقیقت کا کریہہ چہرہ دکھا سکوں۔

یہ نائلہ گو کہ بائی کریکٹر بری نہیں۔ کافی عرصہ سے ہمارے ہاں رہائش پذیر ہے۔ میں اس کو برا نہیں سمجھتا لیکن میں تمہیں ان کے۔"

میران جو اتنی لمبی تمہید باندھنا چاہ ہی رہا تھا اچانک زونی کے چلانے پہ خاموش ہو گیا۔

"اب آپ اپنے کرتوت چھپانے کے لیے سرجواد اور آنٹی پہ الزامات کی بوچھاڑ کریں گے میں جانتی ہوں۔ آپ کی ہر سازش کو جانتی ہوں۔ آپ جو کچھ کر رہے ہیں۔ وہ سب بھی جانتی ہوں۔ اس لیے برائے مہربانی آپ مجھے کچھ مت بتائیں۔ اور آخری بات' میں خود بھی بہت جلد اپنے لیے ایک فیصلہ کر رہی ہوں۔ عید سے پہلے چلی جاؤں گی۔ تب بعد میں آپ شادیانے ضرور بجالینا اور مجھے بھی اس نام نہاد بندھن سے آزاد کر دینا۔"

زونی نے زہر خند لہجے میں کہا اور دھپ دھپ کرتی اندر چلی گئی تھی۔ تب میران سر تھام کے صوفے پہ بیٹھ گیا۔

"تم بھی نا زونی! کبھی سمجھدار نہیں ہو گی۔ اچھا ہے۔ مجھے بتانا نہیں پڑا۔ تم خود عنقریب جان جاؤ گی اور یہی تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھنا اور کانوں سے سننا۔ نادان محبوبہ! اللہ محبوب دے مگر تم سا احمق بالکل نہ ہو۔"

وہ زیر لب بڑبڑاتا اٹھ کر اپنے اور زونی کے مشترکہ کمرے میں آگیا تھا۔ جہاں زونی چادر میں منہ چھپائے گم ہو چکی تھی۔ ساری دنیا سے لاتعلق اور بے نیاز ہو کر۔

☼ ☼ ☼

اور پھر زونی کی ساری بے نیازی اگلے دن ہوا ہو گئی۔

ہوا کچھ اس طرح۔۔۔

اگلے دن بھی زونی سخت بے چین اور غم زدہ پھرتی رہی تھی۔ پورا دن بے زاری میں گزرا تھا۔ رات کو منہ پھاڑ کر میران سے کہہ تو دیا تھا وہ اسے آزاد کر دے' لیکن اگلا دن اسی سوگ میں گزر گیا تھا۔ اس نے کیسے میران سے کہہ دیا؟ کس طرح اتنے بھاری الفاظ منہ سے نکال دیے؟ اور اگر میران ان الفاظ پہ عمل کر دیا تو پھر؟

زونی کا کیا بنتا؟ وہ کہاں جاتی؟ اس کا کیا ہوتا؟ میران کے علاوہ دنیا میں اور کون تھا؟ وہ پورا دن مصلے بچھا کر روتی رہی۔ اپنے لیے دعا کرتی رہی۔ میران کے دل کو اپنی طرف موڑ لینے کی گریہ کرتی رہی۔ اور میران اسے چھپ چھپ کر آنسو بہاتے دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتا۔

"بس رو لو آج کا دن۔۔۔ کل سے رونا بند' میں بھی تمہیں آج چپ نہیں کراؤں گا۔" وہ زیر لب بڑبڑاتا باہر نکل گیا تھا۔ آج اس کا ایک دوست کی طرف افطار ڈنر تھا۔ جانے سے پہلے وہ لحہ بھر کے لیے اس صوفے کے پاس رکا تھا' جس کے اوپر اس کا لایا ہوا عید کا جوڑا' جوتی اور چوڑیاں بے قدری سے نوحہ کناں تھے۔ میران کا دل برا ہو گیا۔

"کوئی تحفے کی ایسی ناقدری بھی کرتا ہے؟" وہ سوچتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ زونی بھی افطار کے بعد پہلے تو اپنی کتابیں لے کر بیٹھ گئی' پھر اچانک اسے سرجواد سے نوٹس لینے کا خیال آیا تو وہ ان کو کال کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد سرجواد نے کال ریسیو کر لی تھی۔

"زہے نصیب! آج تو میرے نصیب جاگ گئے کیسے فون کیا؟" سرجواد کا انداز سابقہ ملائم اور کچھ کچھ محبوبانہ تھا۔ اس نے بمشکل ہی لوفرانہ سمجھنے سے گریز کیا تھا۔ پھر اس نے نوٹس کے بارے میں پوچھا۔ جو سر جواد نے دینے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ سرجواد نے کہا وہ نوٹس خود بھجوا دیں گے تب زونی مطمئن سی ہو گئی تھی۔ کیوں کہ انہوں نے کہا تھا وہ پارک میں آجائے۔ نوٹس مل جائیں گے وہ جاتے ہوئے زونی کو پکڑا جائیں گے۔ پہلے انہوں نے اور بیان جاری کیا۔ پھر اور۔ زونی کو ارجنٹ ضرورت تھی۔ زونی کچھ سوچ کر پارک میں چلی آئی تھی۔ اس وقت پارک میں اکا دکا لوگ تھے جو تھے وہ بس افطار کے بعد واک کرنے آئے تھے۔ اب تک واپس بھی جا چکے تھے۔

شام کے سائے گہرے ہوئے تو زونی گھبرا گئی۔ سر ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ زونی نے کچھ سوچا اور ان کی اکیڈمی کی طرف چلنے لگی۔ اسے ٹیسٹ کی تیاری کرنا تھی۔ نوٹس بہت ضروری تھے۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی اپنی بے رنگ الجھی زندگی کو سوچتی' شدید اذیت کا شکار تھی۔ سوچیں بار بار بھٹک کر میران کی طرف سفر کرتیں۔

"بھلا میران سے دستبرداری آسان تھی؟ میران کی زندگی سے نکل جانا آسان تھا؟" اگر میران نے واقعی اسے اپنی زندگی سے بے دخل کر دیا تب؟ اگر واقعی ہی میران کی زندگی میں کوئی اور لڑکی ہوئی تو؟ اور یہاں سے آگے تک سوچنا بہت محال تھا۔ کبھی کبھی اپنی ناسمجھی میں انسان بڑے عجلت بھرے فیصلے کر لیتا ہے پھر بعد میں اس پہ پچھتاتا ہے۔ جیسے زونی پچھتا رہی تھی' لیکن گزرا وقت ہاتھ میں آنا مشکل نہیں تھا۔

وہ اکیڈمی کے قریب پہنچ گئی تو اس کی سوچوں کو بریک لگ گئے تھے۔ پھر جیسے ہی وہ سر جھٹک کر ہال کے دروازے سے ہوتی ہوئی آفس کی طرف آئی۔ بے ساختہ اس کے قدم اندر سے آتی آوازوں پہ زنجیر پا ہو گئے تھے اور پھر زونی کو لگا جیسے زماں و مکاں گھومنے لگے ہیں۔ یا آسمان اس کے سر پہ آگرا ہے یا زمین ہی پیروں تلے سے نکل گئی ہے۔ اندر سے نائلہ کی آواز آرہی تھی۔

"بس تم دیکھ لینا۔ عید سے پہلے زونی کٹے ہوئے پھل کی طرح ہماری جھولی میں آگرے گی۔ تابوت میں آخری کیل ٹھونک دیا ہے۔ اسے میران سے گوڈے گوڈے بدگمان کر چکی ہوں۔ اب تک تو اس نے میران سے طلاق کا مطالبہ بھی کر لیا ہو گا۔" نائلہ بڑے جوش بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ پھر جواد کی پرجوش آواز آئی۔

"آپا! تم کو مان گیا ہوں۔ جس کام میں ہاتھ ڈالتی ہو۔ اسے پورا کر کے ہی دم لیتی ہو۔ جیتی رہو یار! دل خوش کر دیا۔ بڑا اونچا ہاتھ مارا ہے۔ کرائے کے دھکے کھا کھا کر تنگ آچکے ہیں۔ کرائے کے مکانوں کو تو میں بچپن سے لے کر اب تک' دیکھ دیکھ کر اوب گیا ہوں۔

اوپر سے مالک مکان کا ہوا الگ۔ اب دیکھنا' زوفی آئے گی تو ساتھ اپنا فلیٹ بھی جہیز میں لائے گی۔ تم بھی کرائے کے جھنجھٹ سے بچ جاؤ گی۔ زوفی کو پڑھا لکھا کر نوکری پہ لگاؤں گا۔ کمائے اور ہمیں بھی کھلائے۔ بوجھ نہ بنے ہم پہ۔ ویسے ایک ٹکٹ میں کئی مزے ہوں گے۔ ظالم' صورت اور سیرت میں لاجواب ہے۔"

جواد کا کریہہ' مکروہ قہقہہ باہر تک لپکتا ہوا آرہا تھا۔

زوفی سے مزید سننا محال ہوگیا۔ وہ بڑے ضبط' تحمل اور انتہائی اعتماد سے جانے کس طرح خود کو جوڑتی' سنبھالتی اپنے اندر ان لوگوں کو منہ توڑ جواب دینے کی طاقت بھرتے ہوئے اندر ہینڈل گھما کر داخل ہوگئی تھی۔ اس طرح کہ وہ دونوں بہن بھائی زوفی کو غیر متوقع دیکھ کر بوکھلاتے ہوئے اپنی اپنی جگہ سے اٹھے اور گھبرا کر بول پڑے تھے۔

"زوفی! تم۔۔۔" ان دونوں کے زوفی کو دیکھ کر حواس سلب ہوگئے۔ زوفی نے لمحہ بھر کے لیے سوچا تھا۔ پھر گہرا طویل' پرسکون سانس بھرا اور کچھ دیر کے لیے ہلکا سا مسکرائی جبکہ وہ دونوں سابقہ بوکھلاہٹ میں کہہ رہے تھے۔

"زوفی! تم کب آئیں؟" ان دونوں کی جیسے جان پہ بن آئی تھی۔ دروازے پہ آئی لکشمی ہاتھ سے پھسلتی نظر آرہی تھی۔ وہ اس مسافر کی طرح گھبرائے' بوکھلائے' پریشان حال کھڑے تھے جنہوں نے اپنا سارا سامان بیچ سفر میں لٹا دیا ہو۔ وہ کسی ہارے مسافر یا جواری کی طرح خالی ہاتھ کھڑے تھے۔ اپنا وقار' عزت اور زوفی کے دل سے تم تر انسیت کو اپنے ہاتھوں سے اکھاڑ چکے تھے۔

زوفی دھیمے پر اعتماد انداز میں ہلکا سا مسکرائی تھی۔ بڑی تلخ' زہریلی اور طنزیہ قسم کی مسکراہٹ تھی۔

"جب آپ لوگ اپنی پلاننگ کو انجوائے کررہے تھے۔" زوفی کا اتنا کہنا قیامت ہوگیا تھا۔ نائلہ لپک کر زوفی کے پاس آئی تھی۔ ہاتھ مسلتا جواد بھی بھاگتا ہوا زوفی کے قریب ہوا تھا۔ زوفی آرام سے ان دونوں کو دیکھتی ہوئی ذرا فاصلے پہ کھڑی ہوئی۔ جیسے ان دونوں سے اسے "گھن" آرہی ہو۔

"زوفی! ہماری بات سنو۔ ہمارا یہ مطلب نہیں تھا۔ زوفی پلیز۔۔۔ وضاحت کا موقع دو۔۔۔" وہ دونوں منتیں کرتے ہوئے زوفی کے پیچھے لپک کر آرہے تھے۔

زوفی نے کہا بھی تو محض اتنا۔

"میں تو صرف آپ کو بتانے آئی تھی۔ عید سے پہلے ہمارا فلیٹ خالی کردیں۔۔۔ میران کے ایک فرینڈ کی فیملی ابراڈ سے آنے والی ہے۔ وہ ہمارے فلیٹ میں اسٹے کریں گے اور یہ بھی کہ کل ہر صورت ہمیں فلیٹ خالی چاہیے۔۔۔ ویسے ہم عید منانے ناردرن ایریاز کی طرف جائیں گے۔ میں اور میران۔۔۔" اس کا ایک ایک لفظ ان دونوں کو حواسوں پہ بم گرا رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے منصوبوں کو ڈوبتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ پھر زوفی بڑے نپے تلے قدم اٹھاتی واپسی کی راہوں پہ گامزن ہوگئی تھی۔ وہ بھی اس صورت میں جب آنکھوں کے فرش خشک اور صاف تھے۔ اس کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں گرا تھا۔ وہ اپنی کیفیت پہ حیران تھی یعنی اسے ذرا بھی دکھ یا افسوس نہیں ہوا تھا۔

وہ کیوں اتنے کمینے' خود غرض اور مادیت پرست لوگوں کے لیے آنسو بہاتی؟ اسے اب سمجھ آرہی تھی۔ میران اسے نائلہ اور جواد کے کس قسم کے کرتوت اور کس قسم کی "اصلیت" دکھانا چاہتا تھا۔ وہ زوفی کی آنکھوں سے کیسا پردہ ہٹانا چاہتا تھا؟

اور پھر وہ خود ہی کیوں خاموش ہوگیا تھا؟ تاکہ زوفی خود اپنی عقل سے ان لوگوں کی "کمینگی" کو کھوج سکے۔ ان لوگوں کے کریہہ چہروں کو دیکھ سکے۔

اور آج اس نے ان دونوں کے خود غرض چہروں سے نقاب ہٹتے دیکھ لیا تھا۔ وہ بہت خوش تھی کہ رمضان کے بابرکت مہینے میں اللہ نے اسے بڑے نقصان اور کسی بڑی تکلیف سے بچا لیا تھا۔

رمضان کے مہینے میں اللہ کا یہ زوفی پر خاص "انعام" تھا۔ وہ جتنا شکر ادا کرتی کم تھا۔

میران پارک کے ایک کونے میں کھڑا اسے "واپس" آتا دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔ وہ اپنے گھر کی طرف آتے رستوں پہ واپس آرہی تھی۔ ہر اچھے اور برے شخص کی پہچان کرکے۔ میران کے لیے بھی یہ مقام شکر تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے آئینے میں ناقدانہ اپنا جائزہ لیا اور مسکرا دی۔ زندگی میں اس قدر تیز رفتاری سے وہ کبھی تیار نہیں ہوئی تھی۔ صرف دس منٹ کے اندر اندر۔۔۔ اور وہ چاہتی تھی میران کے آنے تک وہ "چاند رات" کے لیے تیار ہوجائے۔ یوں پورے دس منٹ بعد وہ لاؤنج میں موجود تھی۔ اس حالت میں کہ میران اندر داخل ہوتا ہوا چیخ پڑا تھا۔

"ارے۔۔۔ یہ کیا؟ عید کا جوڑا آج ہی پہن لیا۔۔۔؟" میران اسے اتنا تیار شیار دیکھ کر بمشکل اپنے حواس سلامت رکھ پایا تھا اور پھر اس کی "تیاری" بتا رہی تھی۔ زوفی صاحبہ ہر قسم کی بدگمانی سے دور شفاف دل کے ساتھ میران کو "خوش آمدید" کہنے والی تھیں اور یہ میران کے لیے بہت بڑی کامیابی اور خوشی کی بات تھی۔ یعنی زوفی کا مطلع ابر آلود ہونے سے بچ گیا تھا۔ اور وہ ہر قسم کے بدگمانی والے الزامات سے بری ہوچکا تھا۔ زوفی اسے چیختے دیکھ کر خفگی سے تنخ کر بولی تھی۔

"میں اتنی پیاری لگ رہی ہوں۔ مجھے نہیں دیکھا۔۔۔ جوڑے کی فکر پڑ گئی۔ اور نہ لے کر دینا پڑے۔" میران اس شکوے پہ بے ساختہ ہنس کر اس کے قریب آگیا۔

"تم پہ سو جوڑے قربان۔۔۔ میران کی جان! بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔ خاص میرے لیے تیار ہوئی۔ یقین مانو' میں بے ہوش ہونے والا ہوں۔" وہ دلکشی سے مسکراتا زوفی کو اپنے دل سے بہت قریب لگا تھا۔ زوفی بے ساختہ اس کے کندھے سے آلگی اور یہ بڑا بے اختیارانہ عمل تھا۔ پھر جب بھیگی پلکوں کے ساتھ وہ اپنی غلطیوں اور نادانیوں کا اعتراف کرنے لگی تو میران نے بے ساختہ اس کے گلابی ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"اوں۔۔۔ ہوں' بالکل بھی نہیں۔۔۔ جو ہوا۔ جس نے جو بھی کیا۔ اپنے عمل کو بھگت لیا۔ سو تمہیں پریشان ہونے کی یا ایکسپلین کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔ تمہاری نیت اور دل صاف تھا۔ باقی خود غرضوں نے اپنی سزا پالی۔ یہاں سے اتنا "ذلیل ہوکر نکل رہے ہیں۔۔۔ آئندہ زندگی میں بھی پچھتاتے رہیں گے۔۔۔" وہ ملائمت سے زوفی کے شفاف گال کو چھو کر بولا تو زوفی میران کے اتنے پیارے دل پہ پوری طرح نثار ہوتی کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ میران اس کی ہنسی کے جھرنوں میں ہمیشہ کے لیے کھو گیا تھا۔

اور باہر "چاند رات" بھی مسکرا رہی تھی۔۔۔

☼ ☼

ناولٹ

فائزہ افتخار

ساحل

تیسری قسط ۳

وہ چادر کی بکل مارے دبے پاؤں حویلی کی راہ داری سے گزر رہی تھی۔ بغل میں دابی گٹھڑی ایک ہاتھ میں پکڑی کولہاپوری چپل تاکہ پیروں کی آہٹ ہی نہ آسکے اور وہ کم بخت چغل خور پازیب بھی اتار کے گٹھڑی میں باندھ رکھی تھی۔ ساری حویلی سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی بس باہر سے کتوں کے بھونکنے کی آواز گاہے بہ گاہے آجاتی تھی پھر گلیوں میں نیند سے ڈولتے قدموں کے ساتھ پھرتے چوکیدار کی صدا گونجی۔

"جاگتے رہنا بھائیو۔"

اور سہج سہج قدم اٹھاتی سلمٰی لمحہ بھر کو ہڑبڑا کر رہ گئی جیسے لالہ مقبول نے پیچھے سے آکے اس کے کان میں دھاڑا ہو۔

"پکڑی گئی لچی۔"

وہ گھبرا کے دائیں بائیں دیکھنے لگی مگر نیم تاریک راہ داری کے سب کمروں کے دروازے بند تھے اور بند دروازوں کے پیچھے گہری نیندیں۔

ایک گہرا اطمینان بھرا سانس لے کر اس نے قدم بڑھایا۔ مگر اگلے ہی پل کسی نے اسے بازو سے پکڑ کے اپنی جانب کھینچا اس کی چیخ نکل جاتی اگر ایک نرم گداز سی ہتھیلی اس کے ادھ کھلے منہ پر مضبوطی سے جم نہ جاتی۔

وہ دیوار سے چھپکلی کی طرح چپکی دہشت زدہ آنکھوں سے امہانی کو دیکھ رہی تھی۔

"بھاگ رہی ہے؟"

ام ہانی کی سرگوشی ابھری۔ سلمٰی نے ڈرتے ڈرتے ہاں میں چنبیلی کے تیل میں ڈوبی کھوپڑی ہلائی۔

"تو ابھی تک نکلی کیوں نہیں دن چڑھنے کا انتظار ہے کیا؟ بدھو۔"

ام ہانی کی سرگوشی ہلکی سی غراہٹ میں بدلی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے دوپٹے کے پلو کو کھولتی کچھ نکال رہی تھی۔

"یہ رکھ لے۔"

سلمٰی کی ہتھیلی پہ اس نے کچھ ہزار کے نوٹ رکھے۔

"ہانی بی بی۔۔ یہ۔۔"

"شش۔۔ چپ نکل جا اب دفعان بھی ہو۔"

ام ہانی نے بازو سے پکڑ کے اس کا رخ راہ داری کے اس سرے کی جانب موڑا جہاں داخلی دروازہ تھا۔ آنکھوں میں ممنونیت کے آنسو لیے سلمٰی نے جاتے جاتے اسے گلے لگانا چاہا مگر ہانی نے دوبارہ سختی سے اسے کاندھوں سے پکڑ کے اس جانب موڑ دیا۔

"بس بس۔۔ ہو گیا نا۔۔ جا اب۔۔"

اور سلمٰی یوں ہی گٹھڑی بغل میں اور روپے مٹھی میں دبائے دبے پاؤں باہر نکلی۔ سامنے بڑے سے آہنی گیٹ پر یہ موٹے موٹے تالے لٹک رہے تھے اور باہر اسٹول پہ لالہ مقبول بھی رائفل لے کر ضرور ہی بیٹھا ہوگا۔ وہ چپکے سے دائیں جانب کھنڈر کو مڑ گئی جہاں کی ٹوٹی دیوار سے نکل کے جھاڑیوں سے الجھتے اور آوارہ کتوں سے بچ کے نکلتے جانا تھا تو مشکل۔۔ مگر اس کے سوا چارہ بھی کوئی نہ تھا۔

کھنڈر میں جاتے ہی اس نے چپل پیروں میں اڑس لی اور چادر کی بکل کھول کے اسے کس کے کمر پہ باندھ دیا' گٹھڑی رکھی سر پہ اور دیوار سے کودنے لگی۔ کتے اب اور توانائی لگا کے بھونکنے لگے۔

☼ ☼ ☼

لاہور کے اس علاقے میں رات جتنی ہنگامہ خیز ہوتی ہے' آغاز سحر بھی کم نہیں ہوتا۔ وہ جو ایک سکوت کا سا عالم ہوتا ہے وہ بس چند پل کا ہوتا ہے۔ شب کے آخری چند پل طلوع سحر سے پہلے کے چند پل جس میں ایک ملگجا سا اندھیرا ویران سونے پڑے گلی کوچوں کو حیرت سے تک رہا ہوتا ہے۔

ایسے ہی کچھ پل تھے جب سرمئی پنکھوں والے کچھ کبوتر بادشاہی مسجد کے میناروں سے چپٹے اونگھ رہے تھے اور اذان کی پہلی صدا ابھرنے سے پہلے مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے ہونے والی کھڑکھڑاہٹ ہی نے انہیں سہما کے اڑان بھرنے پر مجبور کردیا۔

بالکل اسی طرح جیسے میں "اللہ اکبر" کی صدا گہری نیند میں بھی کان میں پڑتے ہی بیڈ سے اچھل پڑا۔ سرہانے رکھے الارم کلاک کو بجنے کی زحمت دینے سے پہلے ہی بند کیا اور کرسی پر رکھی اپنی جینز اور ٹی شرٹ اٹھا کے واش روم کی طرف بھاگا۔ میری اسی اچھل کود سے اور واش روم کا دروازہ زور سے کھلنے اور پھر بند ہونے پہ شعیب کی کوفت میں ڈوبی بڑبڑاہٹ ابھری۔

"کیا یار... سویرے سویرے..."

اور ٹھیک پانچ منٹ بعد میں جب دھڑا دھڑ سیڑھیاں اترتا ہاسٹل سے نکلنے کو تھا تب بند دروازے کے پیچھے سے یا تو الارم کلاک بجنے کی یا نلکوں سے بہتے پانی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

اس سے اگلے پانچ منٹ میں میں ریلوے اسٹیشن پہ موجود تھا اور پلیٹ فارم پہ کھڑی ٹرین پہ ہوتی پانی کی بوچھاڑ سے اندازہ ہوا کہ میں وقت سے خاصا پہلے پہنچ گیا ہوں۔ ابھی تو کوئی قلی بھی پلیٹ فارم پہ گٹھڑی بنے اونگھ رہے تھے۔ ہاکرز اخباروں کے بنڈل کھول رہے تھے۔ میں نے بیگ ایک بنچ پہ پھینکا اور اس سے ٹیک لگا کے سامنے والے ٹی اسٹال کو دیکھ کے سوچنے لگا کہ مجھے اس کالی بھجنگ کیتلی میں ابلتی چائے پینی چاہیے یا نہیں اور پھر ٹی اسٹال پہ رکھے ریڈیو سے ابھرتی عارف لوہار کی آواز نے میری ساری توجہ اپنی جانب مبذول کرلی۔

الف اللہ... چنبے دے بوٹی
تے میرے مرشد من وچ لائی ہو...
جگ جگ جیئے میرا مرشد
اے جس اے بوٹی لائی ہو

میرے اندر کوئی بے خود سا ہو کے دھمال ڈالنے لگا

☼ ☼ ☼

"بھابھی... ماسی رشیداں... نکل گئی نا وہ بدبخت... بھابھی۔"

مہ پارہ نے اک شور سا مچا کر سویرے ہی ساری حویلی ہلا کے رکھ دی۔ ایک ایک کرکے سب کمروں کے دروازے کھلنے لگے ام ہانی کے کانوں تک بھی یہ واویلا پہنچا۔

"بھاگ گئی ہے رات کے اندھیرے میں وہ کلموہی۔" اس نے گھبرا کے وال کلاک پہ وقت دیکھا چھ بجنے والے تھے یعنی اسے نکلے گھنٹے سے اوپر ہوگیا تھا۔

"اللہ کرے ٹرین وقت پہ چل پڑی ہو۔" اس نے دھڑ دھڑ کرتے دل کے ساتھ دعا مانگی اور چپل اڑستے ہوئے باہر نکلی جہاں مہ پارہ سب کو اکٹھا کیے چلا رہی تھی۔

"میں نے کہا تھا نا بھابھی اس کے لچھن ٹھیک نہیں ہیں۔"

"ٹھیک سے دیکھو مہ پارہ۔" نائلہ کے اپنے اوسان بھی خطا ہورہے تھے۔ معمولی بات نہیں تھی یہ۔

"یہیں کہیں ہوگی وہ۔ اتنی بڑی حویلی ہے۔"

"آخر کتنی بڑی ہے؟ کونا کونا دیکھ لیا ہے میں نے۔ اپنے سامان سمیت غائب ہے وہ... ارے کسی کو بھیجیں اسے ڈھونڈنے۔"

ماسی رشیداں نے فٹ لالہ مقبول کو دوڑایا اور وہ اکیلا تھوڑا ہی دوڑا۔ ساتھ لٹھ بردار چھ کالے بھی لے گیا۔

☼ ☼ ☼

"اے وے میریا جگنی"

عارف لوہار کی جگنی پہ سر دھنتا میں' ٹکٹ لے کر ٹرین پہ سوار ہوا۔ سارا ڈبا خالی پڑا تھا' ابھی بھی کوئی آدھا گھنٹہ تھا ٹرین کی روانگی میں۔ میں اطمینان سے ٹانگیں پسار کے اپنے سیل فون پہ کینڈی کرش سے شغل کرنے لگا۔

"ونگاں چڑھا لو کڑیو...
اج دا تا دے دربار دیاں..."

اور عارف لوہار نے جیسے مجھے جھنجوڑ کے رکھ دیا۔

"اوئے... ونگاں... (چوڑیاں) یار... جس کام سے جارہا تھا وہ تو کیا ہی نہیں۔" دل ہی دل میں خود کو جھڑکتا... گھڑی پہ وقت دیکھا۔ میں ایک بار پھر ٹرین سے باہر تھا۔

کچھ دیر پہلے میں ٹرین کے وقت سے پہلے چل پڑنے کی دعا کررہا تھا اور اب تاخیر سے روانگی کے لیے منت مان رہا تھا۔ اسٹیشن کے باہر رک کر کسی ٹیکسی ورکشے کا انتظار کرنے میں وقت ضائع کرنے کی بجائے میں اس ویگن سے ہی لٹک گیا جو پوری طرح سے بھرنے کے بعد بس نکلنے کو ہی تھی۔ ہمیشہ ویگنوں کی اندھی رفتار سے وحشت کھانے والا میں اب اس کے رینگنے پہ تلملا رہا تھا۔

مینار پاکستان کے باہر جھاڑو سے خاک اڑاتے خاکروب۔

حلوائی کی دکان پہ کڑاہی سے نکلتی پوریاں اور پیتل کے بڑے گلاسوں سے چھلکتی لسی۔

فٹ پاتھوں پہ رکھے لکڑی کے بنچوں پہ بیٹھے بڑے بڑے لقمے توڑ کے ناشتا کرتے لاہوری۔

نیلی قمیصوں' سفید شلواروں میں اسکول جاتے بچے' سبزی پہ پانی کے چھینٹے مار کے ان کا وزن بڑھاتے ٹھیلے والے۔

ایک ایک منظر جیسے سست روی سے گزر رہا تھا۔

"تاجدار حرم... ہو نگاہ کرم"

دربار کے احاطے سے اٹھتی آوازوں سے میری جان میں جان آئی ابھی ویگن ٹھیک سے رکی ہی نہیں تھی جب میں چھلانگ مار کے سڑک پر تھا۔

سر پہ رومال باندھتا' سیڑھیوں پہ جاگرزاتارتا میں اندھادھند اندر کی جانب بھاگا منت کی سیاہ چوڑیاں لیں اور پھر اسی رفتار کے ساتھ دربار کے باہر واپسی کے لیے مجھے چنگ چی رکشا سب سے پہلے دستیاب ہوا۔ اور یہ میرے لیے پہلا تجربہ تھا۔ اور غالباً" یہ بھی پہلا پہلا تجربہ تھا کہ ٹرین وقت پہ جانے کے لیے تیار تھی۔ جس وقت میں اسٹیشن پہنچا اناؤسمنٹ کی آواز کے ساتھ ساتھ ٹرین کا سائرن بھی زور و شور سے بج رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کب آئے گی ریل گاڑی؟"

اس چھوٹے سے اسٹیشن پہ چادر کی بکل میں چھپی سلمیٰ نے ہراساں نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ایک ہی تو آتی ہے سارے دن میں دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔" خداداد خود بھی سہما ہوا تھا۔

"ساری حویلی میری بو سونگھتی پھر رہی ہو گی چل خداداد لاری اڈے چلتے ہیں کسی ویگن سے نکل جاتے ہیں۔"

"ویگن کا پیچھا کرنا اور اسے بڑی سڑک پر رکوانا ان کے لیے آسان ہو گا۔ اس لیے ریل گاڑی کا سوچا کہ ایک بار نکل گئے تو بس نکل گئے۔"

"ہاں مگر نکلے تب نا... ریل کے آنے سے پہلے لوگ آ گئے تو؟"

ابھی سلمیٰ کی بات منہ میں تھی کہ لالہ مقبول اپنے لٹھ بردار جتھے کے ساتھ ان کے سر پہ تھا۔ سلمیٰ کی چیخ اس کے حلق میں گھٹ کے رہ گئی جب لالہ کی لاٹھی خداداد کے سر پہ پڑی اور وہ چکرا کے نیچے گرا۔

وہ چاروں بے جان سی سلمیٰ کو گھسیٹتے ہوئے جیپ میں ڈالنے لگے جو زمین پہ بھر بھر بہتے خداداد کے خون اور اوندھے پڑے اس کے نیم مردہ وجود کو تکتی جا رہی تھی۔ اس میں مزاحمت کرنے کی بھی سکت نہیں تھی پھر بھی نجانے کیسے اس کی سانولی کلائی میں پھنسی کرنجی رنگ کی کانچ کی چوڑیاں ٹوٹ کے خداداد کے پاس گری پڑی تھیں۔

"تم دونوں یہیں رکو۔ اس گند کو اٹھا کے کہیں پھینکو پھر آنا۔"

اور جب کچھ دیر بعد ٹرین اسی پلیٹ فارم پہ آ کے رکی اور میرے قدم زمین پہ پڑے تو وہ گند اٹھا کے دور کہیں پھینکا جا چکا تھا مگر خون کے دھبے دھوپ سے سوکھ کے دہیں بھورے ہو چکے تھے اور کرنجی چوڑیوں کی کرچیاں میرے قدموں تلے آ کے چرمرائی تھیں لیکن میرا سارا دھیان تو میری جیب میں رکھی منت کی ان چوڑیوں کی جانب تھا جن کو اسے سونپنے کی جلدی تھی مجھے جو شاذ و نادر ہی کوئی فرمائش کرتی تھی۔ جیسے اڑا اڑا میں تڑکے سے پھر رہا تھا اس اڑان کے ساتھ حویلی جانے لگا۔

☆ ☆ ☆

بڑے دادا کچا چبا جانے والی نظروں سے سلمیٰ کو گھور رہے تھے۔ یہ الگ بات کہ دلیہ، کھچڑی اور یخنی پہ زندہ بڑے دادا میں اب گندم کی روٹی کا ایک لقمہ چبانے کی سکت نہ تھی، سالم سلمیٰ کو کیا نگلتے پھر بھی وہ تھر تھر کانپے جا رہی تھی۔ پیچھے سرکے جا رہی تھی۔ اور دیوار سے لگی جا رہی تھی کہ مہ پارہ کی نظریں کون سا کم تھیں اور نگلنے اور چبانے سے کوئی پرہیز بھی نہ تھا۔

"ایسی کون سی آفت ٹوٹی پڑ رہی تھی تم پہ، کر رہے تھے نا ہم تمہارا بندوبست چند دن خود کو سنبھال نہیں سکتی تھی۔"

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ ایسا بے باک زہر اگلتی کہ نائلہ کو دادا جی کے سامنے حیا آ جاتی، اس نے نند کی توجہ دادا جی کی اکھڑی سانسوں کی جانب دلانا چاہی۔

"مہ پارہ... دادا جی کا انہیلر۔" مہ پارہ نے دراز میں سے انہیلر نکالتے دادا جی کو دیتے بھی اپنا شغل جاری رکھا۔

"تم کیا سمجھتی ہو آسانی سے بھاگ جاؤ گی یہاں سے... اس گھر کی ملازمہ کی ذمہ داری بھی یہاں ایسے ہی نبھائی جاتی ہے جیسے گھر کی بیٹیوں کی۔ رشتہ طے کیا ہے رضوان بھائی صاحب نے تمہارا، زبان دی ہے کم بخت... اس دو ٹکے کے ڈرائیور کو ہم کیا منہ دکھاتے بد بخت... ذرا دادا جی کی سانس قابو میں آنے دے پھر دیکھنا ایسی دو چار تگڑی گالیاں دیں گے تجھے کہ عمر بھر یاد رکھے گی۔ ان تگڑی گالیوں کی ہیبت ہی ایسی تھی کہ سلمیٰ تو سلمیٰ نائلہ بھی تھرا اٹھیں اور اسے چلتا کیا۔

"سلمیٰ تو جا اب تیری خبر میں بعد میں لیتی ہوں۔"

"مگر بھابھی۔" مہ پارہ تماشا اتنی جلدی تمام ہونے کے خیال سے جز بز ہو گئی۔

"مہ پارہ دادا جی کی حالت خراب ہو رہی ہے دفع ہونے دو اسے سنا نہیں سلمیٰ تو نے، جا یہاں سے۔"

سلمیٰ روتی ہوئی کمرے سے نکلی اور دادا جی کی تگڑی گالیاں اکھڑتے سانس کی وجہ سے بے بسی کے ساتھ اندر ہی گھٹ کے رہ گئیں۔ موقع ہاتھ سے نکل جانے پہ وہ اس بری طرح تلملائے کہ انہیلر کی طبی امداد کے بنا ہی ان کی قوت گویائی نے تنفس کے بپھرے دیو کو مات دے دی۔

"میرے ہوتے حویلی میں یہ بے غیرتیاں نہیں چلیں گی، کسی کو نئے رواج نہیں ڈالنے دوں گا۔ آج سلمیٰ بھاگی ہے کل یہ بھاگے گی۔" انہوں نے مہ پارہ کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ تو وہ جو ان کی کمر سہلا رہی تھی بڑبڑا کے رہ گئی۔

"لو بھلا... میں کہاں سے آ گئی بیچ میں۔" بدک کے پیچھے ہٹتی وہ بڑبڑائی، نائلہ سے مسکراہٹ چھپانا مشکل ہو رہا تھا۔

"ارے بھاگنا ہوتا تو کب کی... ہونہہ..." بڑے دادا کی قوت گویائی اب تک تنفس کے بپھرے دیو سے نبرد آزما تھی۔

"کس نے دی ہے اسے شہ؟ اور وہ کمہاروں کا لڑکا..." اور دیو غلبہ پا گیا۔

"بس کریں دادا جی۔ آپ کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔" نائلہ نے آگے بڑھ کے دوبارہ انہیلر ان کے منہ سے لگایا۔

"میں اب اس پہ کڑی نظر رکھوں گی بے فکر رہیں۔" وہ انہیں سہارا دے کر تکیے پہ لٹا رہی تھیں بڑے دادا نے پرسکون ہونے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میں اندر داخل ہوا۔

اب میں حویلی آتے ہی سب سے پہلے بڑے دادا کے کمرے میں کیوں گیا۔ ام ہانی کے پاس کیوں نہ بھاگا بھاگا گیا اس کی بھی وجہ تھی۔ جیب میں رکھی چوڑیوں کو تھپکتا میں دبے پاؤں ہانی کے کمرے کی جانب ہی جا رہا تھا کہ بڑے دادا کے کمرے سے تیزی سے نکلتی سلمیٰ کو دیکھ کے ٹھٹک کے رک گیا تھا وہ رو رہی تھی۔

"کیا ہوا سلمیٰ؟" مجھے دیکھتے ہی اس نے منہ پہ

ہاتھ رکھا اپنی سسکیاں دبائیں اور یوں ہی آنسو بہاتی بھاگ گئی۔ میرے اندر انتہائی واہیات قسم کے وہم جاگے اور میں بے اختیار بڑے دادا کے کمرے میں داخل ہوا اور پہلی نظر میں ہی کیا دیکھتا ہوں بڑے دادا بالکل بے حس و حرکت سینے پہ ایک ہاتھ رکھے' بند آنکھوں کے ساتھ لیٹے ہیں امی ان پہ جھکی ہوئی ہیں اور پھوپھو انتہائی بری شکل بنائے' عام حالات میں بنائی جانے والی بری شکل سے بھی کہیں زیادہ بری شکل میں سرہانے کھڑی ہیں میرا دل دھک سے رہ گیا۔

"بڑے دادا۔" میں بے اختیار پکارا تو امی نے پلٹ کے مجھے دیکھا۔

"سعد..."

"یہ کیا ہو گیا امی... بڑے دادا ہمیں چھوڑ کے کیسے چلے گئے۔" میں واقعی سچ مچ میں دکھی تھا اور بڑے دادا سے لپٹنے آگے بڑھ رہا تھا تو آنکھوں میں آنسو بھی تھے وہ دونوں سٹپٹا کے رہ گئیں۔

"ارے... ابھی کہاں۔" یہ حسرت میں ڈوبا فقرہ پھوپھو کا تھا۔

"نہیں نہیں سعد... یہ تو دراصل..." مگر امی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں بڑے دادا سے لپٹ گیا تھا اور دھاڑیں مار مار کے رونے لگے گا۔

"بڑے دادا..."

"سعد... پاگل مت بنو بات تو سنو۔" امی نے مجھے کاندھے سے پکڑ کے الگ کرتے ہوئے کچھ کہنا چاہا مگر اب میں نے اپنا سر زور سے بڑے دادا کے سینے پہ پٹخ دیا۔

"بڑے دادا..."

میری اس حرکت سے ان پہ کھانسی کا ایک عظیم الشان دورہ پڑ گیا۔ شاید میرے سر پٹخنے سے ان کی پسلیوں پہ سالوں سے جما بلغم ہل گیا تھا اور میں کرنٹ کھا کے پیچھے ہٹا۔ دہشت بھری نظروں سے امی کو دیکھا پھر پھوپھو کو جو مایوسی سے انکار میں سر ہلا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

فضا میں ام ہانی کی ہنسی' قوس قزح کی طرح پھوٹ پڑ رہی تھی اور میں ذرہ ذرہ رنگ سمیٹ رہا تھا۔

"بدھو... تمہیں اتنا بھی احساس نہیں ہوا کہ بڑے دادا..." وہ پھر سے کھلکھلا اٹھی۔

"ہاں اور خود تو جیسے بڑی توپ شے ہو ناں... ڈھنگ سے بھگا تک نہیں سکیں سلمٰی کو۔" ہم دونوں کھنڈر کی ایک ٹوٹی ہوئی منڈیر پہ ٹانگیں لٹکا کے بیٹھے تھے۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ سلمٰی کو بھگانے میں میرا ہاتھ ہے۔"

"کیوں کہ وہ بے چاری پکڑی گئی تھی۔ یہ تم ہو ہی جس کا ہر کام ایسا ہی ہوتا ہے... کچا۔"

"مطلب میں کچھ نہیں کر سکتی؟" وہ برا مان گئی۔

"کر سکتی ہو... مگر میرے بغیر نہیں۔ دیکھ لینا... تمہارے جس فیصلے میں' جس کام میں' میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں گا وہ کبھی پورا ہی نہیں ہو گا۔" میرے وثوق سے کہنے پہ اس کی ناراضی اور بڑھ گئی۔

"ہونہہ اپنے قابل تو ہو جاؤ پہلے بڑے آئے میرے استاد بننے۔" وہ اتر کے جانے کو تھی کہ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"یہ تو لے لو۔ تمہاری منت کی چوڑیاں۔" وہ رک گئی اور میں اسے پہنانے لگا۔ سارا دھیان تو اس کے چہرے پہ تھا خاک پہنائی جاتیں۔

"خود تو جیسے ہر کام صحیح کرتے ہو۔ دو چوڑیاں تک نہیں پہنائی جا رہیں... لاؤ... مجھے دو' خود پہنتی ہوں۔" وہ میرے ہاتھ سے لے کر خود پہننے لگی۔

"اف تنگ ہیں یہ تو بدھو۔" زور لگا کے آگے کرتے ہوئے ایک چوڑی کھٹ سے ٹوٹ گئی وہ افسوس سے نیچے گری چوڑی کو دیکھ رہی تھی اور مجھے جتانے کا موقع مل گیا۔

"دیکھا... میں نے کہا تھا ناکہ میرے بغیر جو کرو گی وہ غلط ہو گا۔"

"یہ تو ٹوٹ گئی سعد... منت کی تھی اب پتا نہیں

میری مراد پوری ہو گی یا نہیں۔"

"ایک ٹوٹی ہے دوسری تو ہے یوں سمجھو آدھی مراد پوری ہو گی یعنی کچھ ملے گا کچھ نہیں۔" میں نے کچھ زیادہ ہی بے ڈھب سی تسلی دے ڈالی جس پہ وہ کچھ دیر عجیب سی نظروں سے مجھے گھورتی رہی۔

"کھیلو گی نہیں آج' کافی دن ہو گئے۔"

اور ہمیشہ کی طرح میں اس کا دھیان' اپنی اوٹ پٹانگ بونگی سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا کچھ دیر بعد وہ کمر پہ دوپٹا کسے' چپل ایک طرف اتارے' زمین پہ کوئلے سے لکیریں کھینچے' کھیلنے کو تیار تھی۔ پتھر کو ہونٹوں سے لگا کے چومتے ہوئے اس نے ہوا میں اچھالا۔

"سعد... تم ہار جاؤ گے۔" اور پھلانگ کے ایک خانہ عبور کیا۔

"ہار تو چکا ہوں۔ بہت پہلے..." میں نے بھی اگلا خانہ پھلانگا اور جیسے ہی وہ پلٹ کے دوسرے خانے میں آنے لگی۔ میں زقند بھر کے اسی خانے میں تھا مجھ سے ٹکرا کے وہ گرنے کو تھی کہ میں نے اس کی کلائی زور سے تھام کے اسے گرنے سے روک لیا۔

"ارے۔ چھوڑو بدھو... ایک ہی چوڑی بچی ہے وہ بھی توڑو گے کیا؟"

"ویسے یہ اچانک شادی کی منت... خیریت؟" میں نے مسکراتے ہوئے ٹٹولنا چاہا' وہ میرا سوال ٹالتے ہوئے جلدی جلدی کمر سے دوپٹا کھول کے چپل پہننے لگی۔

"بس بہت ہو گئی باتیں اور کھیل' گھر چلو شام ہونے والی ہے۔ پھوپھو ڈانٹیں گی۔"

"ارے... کہیں تم نے پھوپھو کی شادی کی منت تو نہیں مانی تھی ان سے جان چھوٹ جائے اس لیے..."

"بدھو... اپنی شادی کی منت وہ خود مانیں مجھے کیا پڑی ہے۔ میں نے تو اپنی شادی کی مانی ہے۔"

وہ محبت سے کلائی میں موجود واحد کانچ کی چوڑی کو سہلا رہی تھی اور میں ساتویں آسمان پہ اڑ رہا تھا' جھک کر میں نے زمین سے کوئلہ اٹھایا اور دیوار پہ اپنا اور اس کا نام لکھنے لگا۔

"اب یہ کیا کر رہے ہو آج تو ہمارا کوئی جھگڑا ہوا نہ صلح۔"

"بس دل کر رہا ہے لکھنے کو... سوچو ہنی' یہاں کے کونے کونے پہ ہمارا نام لکھا ہے' آج سے نہیں کئی سالوں سے اور ہمیشہ لکھا رہے گا جب... جب..." میں ذرا سا رکا پھر ہمت کر کے روانی سے کہہ گیا۔

"جب ہم شادی کے بعد یہ دیکھیں گے تو ہمیں کیسا لگے گا؟" کہہ تو دیا مگر پھر ڈر سا گیا نجانے اس کا ردعمل کیا ہوا' مگر میری توقع کے برعکس وہ نہ بگڑی' نہ شرمائی' نہ حیران ہوئی' نہ ناراض الٹا کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

"شادی کے بعد؟"

"ہاں۔" اس کی ہنسی نے مجھے دلیر کر دیا۔

"بدھو... یہ مت سوچو کہ ہمیں کیسا لگے گا۔ یہ سوچو کہ میرے شوہر کو کیسا لگے گا۔"

"شوہر؟" پہلی بار اس کی کھلکھلاہٹ مجھے نیزے کی طرح چبھی تھی۔

"اور کیا... شوہر تو شوہر ہوتا ہے اپنی بیوی کا نام کسی اور کے نام کے ساتھ کیسے دیکھ سکتا ہے۔ اب اسے تھوڑا ہی پتا ہو گا کہ تم میرے بچپن کے دوست ہی نہیں میرے سائے ہو' وہ تو کچھ بھی سوچ سکتا ہے ویسے بھی یہ جگہ صرف اور صرف ہماری ہے اسے تو میں کبھی یہاں لاؤں گی ہی نہیں۔"

"کسے؟" کسی اندھے کنویں میں سے نکلی تھی میری آواز...

"کس کو؟"

"سالار کو اور کس کو... اسی سے شادی کے لیے تو یہ منت مانی ہے میں نے۔"

کاش وہ اس وقت میرا بے رنگ چہرہ' بے روح وجود اور دھندلی ہوتی آنکھیں دیکھ پاتی تو مجھے کچھ کہنے اور اسے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی لیکن اس سے پہلے کہ وہ میری آنکھوں کی پتلیوں میں جمع ہوتا نمکین پانی دیکھ پاتی' آسمان سے گرتی پانی کی بوندوں نے اس کا دھیان کھینچ لیا۔

"ارے بارش شروع۔" اس نے سراسیمہ سی

ہو کے آسمان کی جانب دیکھا اور میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچتی آگے کو چلنے لگی۔
"جلدی چلو۔۔۔ تیز ہو جائے گی۔"
میں کسی بے جان شے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ گھسٹ رہا تھا۔ بارش تیز ہو چکی تھی اور ام ہانی کے قدموں کی رفتار بھی۔ اور۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ میری آنکھوں سے بہتے آنسو بھی مگر وہ بارش کی بوندوں کے ساتھ مل گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہاں اب بھی سلمیٰ کا مقدمہ جاری تھی۔ مہ پارہ آسانی سے جان بخشی کرنے والی مخلوق تھی ہی نہیں۔
"کمہاروں کا لڑکا ایسا بھی کوئی گلفام نہیں جس کے لیے تم محل کے بھاگ گئیں۔ ویسے تو خیر تم بھی کوئی حور پری نہیں۔ پتا نہیں پھر اس احمق نے تمہارے لیے اپنی جان خطرے میں کیوں ڈالی۔"
"محبت کرتا ہے جی وہ مجھ سے" وہ اکڑوں بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔
"اوفوہ۔ محبت۔۔۔" مہ پارہ حسد سے سلگ سلگ اٹھی۔
"کتنی محبت کر بیٹھا ہے آخر' بتا دو شاباش! تاکہ اگر ضرورت سے زیادہ کر بیٹھا ہے تو اس کے کسی غلط نتیجے سے پہلے ہی تمہیں یہاں سے چلتا کر دیا جائے۔"
اس نئے کچوکے پر چادر سے ناک سڑکتی سلمیٰ تڑپ گئی۔
"نہ جی۔۔۔ ایسے نہ کہیں۔۔۔ بڑی پاک محبت ہے ہماری۔"
"ہاں' ہاں۔۔۔ بہت پاک۔ باوضو ہو کے بھاگی تھی تم۔" تب ہی مہ پارہ کی نظر بھیگی بھیگی سکڑی سمٹی سی ام ہانی پہ گئی جو اندر داخل ہوتے ہی ان کی نظر سے بچنے کی کوشش کرتی دائیں جانب مڑنے کو تھی۔
"یہ وقت ہے تمہارے گھر لوٹنے کا۔" اس کے پیر وہیں جم گئے۔
"اور یہ حالت ہے؟ تم بچی نہیں ہو ام ہانی تمہیں احساس ہونا چاہیے کہ جن لڑکیوں کے سر پہ ماں باپ کا سایہ نہ ہو ان کو عام لڑکیوں کی نسبت زیادہ محتاط ہو کر رہنا پڑتا ہے۔"
"تو کیا میں عام لڑکی نہیں ہوں؟" وہ دکھ سے چور لہجے میں بولی۔
"نہیں نہیں۔۔۔ تم تو بہت خاص ہو۔۔۔ آسمان سے اتری ہوئی۔۔۔ تمہارے لیے تو سب جائز ہے حویلی کے سب گلے سڑے اصول تو میرے لیے ہی رہ گئے تھے۔"
ابھی نجانے مہ پارہ نے کتنے اور تیر نکالنے تھے کہ نائلہ وہاں آگئیں سلمیٰ کو ہاتھ کے اشارے سے کھسکنے کا کہا اور ام ہانی کو بھی جواز فراہم کیا۔
"ابھی تک ایسے بھیگی کھڑی ہو بیمار ہو جاؤ گی ہانی' جاؤ جلدی سے کپڑے بدلو۔" سلمیٰ کے پیچھے پیچھے ام ہانی بھی کھسک گئی۔
"آپ اسے بگاڑ رہی ہیں بھابھی۔"
"میں نہیں۔۔۔ زیادہ سختی اور روک ٹوک بگاڑتی ہے۔"
"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں بہت بگڑی ہوئی ہوں پھر کیوں؟ بیالیس سال سے ساری سختیاں اور روک ٹوک سہہ رہی ہوں اماں' ابا' دادا جی' بھائی صاحب سب کی' اور ایک یہ ہے سب ہی اس کے ہمدرد اور وہ سب سے بڑا آپ کا چہیتا سعد' جو بچپن سے ہی اس کے سامنے ڈھال بن کے کھڑا ہو جاتا تھا۔"
اور وہ ڈھال۔۔۔ یعنی میں۔۔۔ سعد رضوان اس وقت اپنے کمرے میں نڈھال پڑا تھا' رہ رہ کے ہانی کے وہ الفاظ ذہن میں گونج رہے تھے۔
"سالار۔۔۔ اسی سے شادی کی منت مانگی ہے میں نے۔"
نجانے کب رات بیتی' کب صبح ہوئی میں اسی حالت میں بیڈ پہ پڑا خود کو بہلاتا رہا ام ہانی نے مذاق کیا ہوگا۔ لیکن پھر۔۔۔ پھر یہ خوش گمانی پاش پاش ہو جاتی جب اس کے الفاظ دوبارہ بازگشت بن کے گونجتے میں اس کے لہجے کے سب ڈھنگ پہچانتا تھا۔ جان جاتا

تھا۔ کب وہ مذاق کر رہی ہے۔ کب جھوٹ کہہ رہی ہے اور کب سچ اور یہ الفاظ بے رحمانہ حد تک سچے تھے۔
دروازہ کھلا تو روشنی سے بچنے کے لیے میں نے بازو موڑ کے آنکھوں پہ رکھ لیا۔
"عجیب لڑکے ہو تم۔۔۔ نہ تمہارے آنے کا پتا چلتا ہے نہ جانے کا۔"
یہ ای تھیں۔۔۔
"توبہ۔۔۔ شوز کے ساتھ سو گئے' آخر ہاسٹل سے آنے کے بعد تم سارا دن تھے کہاں اور یہ روم کا کیا حال کر دیا ہے ایک ہی رات میں' پتا نہیں ہاسٹل میں کیا کرتے ہو گے۔ کون سمیٹتا ہو گا تمہاری چیزیں۔"
میں نے بازو ذرا سا ہٹا کے آنکھوں کی جھری سے دیکھا۔ وہ یہاں وہاں بکھری چیزیں سمیٹ رہی تھیں۔ مجھے جاگتا پا کے فوراً" اصل سوال پوچھ ڈالا۔
"سنو۔ یہ تم کل شام کو ام ہانی کو کہاں سے لے کر آ رہے تھے؟"
"باہر سے؟" میں نے بازو آنکھوں سے نہ ہٹایا۔
"وہ تو مجھے بھی پتا ہے۔" وہ جھنجلا کے کہتیں اب میرے برابر بیٹھ گئیں اور میرا بازو پکڑ کے چہرے سے ہٹایا' کافی سنجیدہ لگ رہی تھیں۔
"رات کو میں نے مہ پارہ کی بک بک سے گھبرا کے بات دبا دی مگر فکر مجھے بھی ہے۔ پہلے اسکول سے سیدھی گھر آتی تھی' اب شام ڈھلے نجانے کہاں ہوتی ہے۔ ڈر تو لگتا ہے نا کہ کچھ ایسا ویسا نہ ہو۔۔۔ تم اس کے بہت قریب ہو ہر بات تم سے کہہ دیتی ہے ذرا پتا کرو اس کے دل میں کیا ہے۔"
"میں نہیں ہوں۔"
میں نے دوبارہ کہنی موڑ کے آنکھیں ڈھانپ لیں اور امی چڑ کے اٹھ گئیں۔
"توبہ۔۔۔ قسم کھا رکھی ہے ہر بات کا الٹا جواب دینے کی۔" ان کے جاتے ہی میں نے آنکھیں کھولیں چند لمحے چھت کو گھورنے کے بعد میں اٹھا اور جلدی جلدی اپنے مختصر سے سفری بیگ میں دو چار کپڑے ٹھونسے اور جانے کے لیے نکلا۔
"سعد۔۔۔" راہ داری کا موڑ مڑتے ہی مجھے اس کی آواز سنائی دی تو میں نے قدموں کی رفتار کچھ اور بڑھا لی۔
"رکو سعد۔۔۔ تمہیں کچھ بتانا ہے بلکہ دکھانا ہے۔"
وہ پکارتی ہوئی پیچھے چلی آ رہی تھی۔
"مجھے نہ کچھ سننا ہے' نہ دیکھنا ہے۔"
"بدھو۔۔۔ اندر سے تو مر رہے ہو گے۔ سالار کو دیکھنے کے لیے۔"
"اسے تو میں دیکھ لوں گا۔" میں مڑا اور دانت کچکچا کے اسے گھورتے ہوئے کہا' اس نے جھٹ سے ایک تصویر آگے کر دی اور میری آنکھوں کے آگے جیسے اندھیرا چھا گیا۔
"دیکھو۔ یہ ہے سالار۔" میں نے نظر ہٹا کے کہیں اور لگانی چاہی اور وہ اس کے اسی ہاتھ پہ ٹھہر گئی۔ جس میں اس نے تصویر تھام رکھی تھی اور اس ہاتھ کی کلائی میں موجود وہ واحد منت کی سیاہ چوڑی۔۔۔
"اچھا ہے نا۔" مگر اس کے اشتیاق سے پوچھے سوال کو نظر انداز کر کے میں نے اس کی کلائی تھامی اور چوڑی کو ناگواری سے گھورنے لگا۔
"یہ منت ماننا۔۔۔ چڑھاوے۔۔۔ دربار۔۔۔ وغیرہ سب کفر اور شرک ہے نری جہالت۔"
"ارے میں تمہیں سالار کی تصویر دکھا رہی ہوں اور تم۔۔۔ اور پھر وہ سٹ پٹا اٹھی جب میں اس کی چوڑی اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔
"یہ کیا کر رہے ہو ہٹو پرے۔" اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ کھینچا خود بھی پیچھے ہٹ گئی۔
"خود ہی تو لائے تھے تب کفر اور جہالت نہیں تھی۔"
"تب مجھے کیا پتا تھا کہ تم۔۔۔"
میں نے ایک بار پھر اس کی کلائی جھپٹنا چاہی۔ وہ بڑبڑا کے مزید پیچھے ہٹی اور تصویر اس کے ہاتھ سے نیچے جا گری۔ پیر پٹختا ہوا میں پھر سے آگے بڑھ گیا وہ جھک کے تصویر اٹھاتے اٹھاتے رکی اور دوبارہ میرے پیچھے

لگی۔

"سعد۔۔۔ اتنی جلدی واپس کیوں جارہے ہو؟ اور سنتے کیوں نہیں؟ ہوا کیا ہے؟"

تصویر وہیں گری کی گری رہ گئی۔ نجانے کب دوبارہ پھوپھو وہاں آئیں اور تصویر اٹھا کے غور سے دور جاتی ام ہانی کو دیکھا جو میرے پیچھے پیچھے منت کرتی آرہی تھی۔ آخر اس نے میرا بازو پکڑ کے مجھے روک ہی لیا اور میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔ راستہ روکتے ہوئے۔

"اتنا غصہ۔۔۔؟ اتنی دور سے مجھ سے ملنے اس لیے آئے تھے کہ یوں ناراض ہو کے اچانک چلے جاؤ گے۔" وہ ہانپتی سانسوں کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں تم کس لیے ناراض ہو کہ میں نے تمہیں سالار کے بارے میں پہلے کیوں نہیں بتایا۔ قسم سے۔۔۔ میں بتانے ہی والی تھی کہ تم آگئے اور ویسے بھی کچھ دن پہلے ہی تو میں ملی ہوں ان سے۔"

"کچھ دن پہلے ملی اور وہ اتنا خاص ہو گیا تمہارے لیے؟"

"وہ ہیں ہی ایسے۔" میرے لہجے سے جھلکتے حسد' آنکھوں سے ٹپکتے گلے کو محسوس کیے بنا وہ مسکرا رہی تھی۔

"بالکل ایسے' جیسا میں نے سوچا تھا بلکہ جیسا کوئی بھی لڑکی سوچ سکتی ہے۔ بہت لونگ کیرنگ۔۔۔ اتنے ڈیشنگ اور گریس فل۔"

میرے اندر اور شعلے بھڑک اٹھے اس بار جو میں نے رفتار پکڑی تو وہ میرا پیچھا نہ کر سکی نہ میں اس کے پکارنے پر رکا۔ میں یہ تک نہ جان سکا کہ میرے جاتے ہی مہ پارہ پھوپھو نے اسے کٹہرے میں کھڑا کر کے کیا کچھ کہا۔

☼ ☼ ☼

وہ سہمی ہوئی دیوار سے چپکی کھڑی تھی۔ مہ پارہ تصویر ہاتھ میں لیے اس کے سامنے لہرا لہرا کے دکھا رہیں اور چلا رہی تھیں۔

"اچھا۔۔۔ تو یہ گل کھلائے جارہے ہیں اس سے عشق کی پینگیں بڑھائی جارہی تھیں۔ سارا سارا دن اس لیے گھر سے غائب رہتی تھی۔"

ام ہانی نے کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ اور ہمت دونوں ساتھ چھوڑ چکے تھے' وہ فقط انکار میں سر ہلا کے رہ گئی اور مدد طلب نظروں سے نائلہ کو دیکھا جن کے چہرے پہ گہری سوچ اور تشویش کے سائے تھے' مگر نجانے کیوں وہ اب تک چپ تھیں۔

"پتا نہیں اور کیا کیا کرتی رہی ہو۔ اسکول میں پڑھانے کے بہانے۔"

"مجھے اس سے بات کرنے دو مہ پارہ۔" بالآخر نائلہ آگے بڑھیں۔

"اب بات کرنے کو رہ کیا گیا ہے بھابھی۔ اس لیے آپ سے کہتی تھی کہ کھلی چھوٹ نہ دیں اسے۔۔۔ دیکھیں۔۔۔ لگا دیا نہ بٹا کب سے ہماری عزت سے کھیل رہی ہے۔ بتاؤ سیدھی طرح۔۔۔ کیا کالک تھوپ چکی ہو اب تک۔۔۔ پھوٹو منہ سے۔۔۔ کہیں چکما دے کر فرار تو نہیں ہو گیا؟"

ام ہانی کی گردن مسلسل انکار میں ہل رہی تھی اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"شادی کرے گا تم سے؟"

پہلا سوال ہی جو نائلہ نے اس سے کیا وہ اتنا اچانک تھا کہ مہ پارہ فوری طور پر حیرت اور ناگواری تک کا اظہار نہ کر سکیں اور ایک تواتر کے ساتھ انکار میں گردن ہلاتی ام ہانی پھر سے انکار میں سر ہلانے لگی اور جب احساس ہوا تو کہہ اٹھی۔

"جی۔۔۔ کریں گے۔"

"ہونہہ۔۔۔ کرتا ہے ابھی اس سے شادی۔۔۔" مہ پارہ کے تو آگ سی لگ گئی۔

"اس جیسے لفنگے صرف جھانسہ دیتے ہیں پتا نہیں کون راہ چلتا ہے جو۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ وہ ایسے نہیں ہیں۔"

سالار کی ذات پہ ایسے رکیک جملے ام ہانی کی قوت گویائی واپس لوٹ آئی۔

"وہ بہت اچھے ہیں۔۔۔ بہت اچھی فیملی کے اور کمشنر

ہیں یہاں کے۔"

مہ پارہ کے لیے تو جیسے اب ہر جانب سناٹا ہی سناٹا تھا البتہ نائلہ کے چہرے کی تشویش کم نظر آرہی تھی۔

"ٹھیک ہے رضوان سے میں نے خاصی تعریف سنی ہے اس نئے کمشنر کی۔۔۔ میں ان سے بات کرتی ہوں تم اس سے کہو کہ طریقے سے رشتہ بھیجے شریفوں کے ہاں یہ سب نہیں چلتا۔"

"مگر بھابھی۔۔۔ خاندان۔۔۔ برادری۔۔۔" سکتے سے نکلتے ہوئے مہ پارہ نے بہت سے عذر گنوانا چاہے جس کو نائلہ نے فقط یہ کہہ کر رد کر دیا۔

"اپنا حال دیکھو مہ پارہ۔۔۔ میں اسے دوسری مہ پارہ نہیں بننے دوں گی۔"

☼ ☼ ☼

"بتاتے کیوں نہیں ہوا کیا ہے؟" وہاں ام ہانی تھی تو یہاں شعیب۔ جس کے سوال مجھے تیار تھے۔

"تم نے تو رات کو آنا تھا میں انتظار کرتا رہا' آئے کیوں نہیں؟"

"رات کو میں مر گیا تھا۔" بہت دیر بعد میں کچھ بولا تو بس یہ۔۔۔

"کیا؟"

"تم ٹھیک کہتے تھے شعیب کبھی کبھی جدائی کچھ نہیں کہتی قربت مار دیتی ہے' وہ مجھ سے دور تھی تو دل کو تسلی تھی کہ وہ میری ہے' ملا تو پتا چلا کہ وہ تو کب کی کسی اور کی ہو گئی ہے۔"

"اوہ۔۔۔"

اور پھر میں نے اسے سب بتا دیا۔ دل پھٹا پڑ رہا تھا کسی سے تو کہنا تھا۔۔۔ کہیں تو فریاد کرنا تھی۔۔۔ کسی کو تو بتانا تھا۔۔۔ جو مجھ پہ گزری۔

"اور تم میدان چھوڑ کر آگئے؟" سب جاننے کے بعد بجائے مجھ سے ہمدردی کرنے کے وہ طعنے دینے لگا۔

"بزدل۔۔۔ بھگوڑے۔"

"میدان اور ہوتا ہے شعیب۔۔۔ دل کی سرزمین اور۔۔۔ یہاں فتح کے جھنڈے وہی گاڑتا ہے جس کا نصیب ہو۔"

"تم نے اپنا نصیب پڑھا ہے کیا؟ کیا پتا اس میں کیا لکھا ہے۔ سعد تمہاری باتوں سے لگتا ہے کہ وہ اس شخص سے صرف متاثر ہے۔"

"وہ عام لڑکیوں جیسی نہیں ہے جو کسی سے متاثر ہو جائے۔"

"لیکن اس نے تم سے یہی کہا کہ سالار ویسا ہی ہے جیسا ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے تو میرے دوست وہ خواب ہے۔۔۔ اسے خواب ہی بنا ڈالو۔۔۔ ایسا خواب جو کبھی پورا نہیں ہوتا۔"

"مگر کیسے؟" میں نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

"گو بیک اینڈ فائٹ"

"فائٹ!" میں حیران رہ گیا اس عجیب و غریب مشورے پہ۔

"یہ جنگ ہے کیا؟"

"یہی سمجھ لو۔۔۔ کوشش تو کرو سعد یہ نہ ہو کہ بعد میں تمہیں پچھتانا پڑے کہ تم نے آسانی سے اسے کسی اور کا ہونے دیا اور تم نے سنا تو ہو گا کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے تو تمہارے لیے یہ محبت بھی ہے اور جنگ بھی۔"

عمر ایسی تھی کہ میں اس کی باتوں پہ غور کرنے پہ مجبور ہو گیا اس عمر میں اندازہ کہاں ہوتا ہے کہ محبت کو جنگ کے خون سے آلودہ کرنا کیسا ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼

اور اسی رات نائلہ نے رضوان کو بھی یہ خبر سنا دی۔ وہ کسی قسم کی تاخیر نہیں چاہتی تھیں اور رضوان کا بھی پہلا سوال وہی تھا جو مہ پارہ کا تھا۔

"اگر آپ اسی زمیندارانہ اور جاگیردارانہ ذہن سے سوچیں گے تو پلیز رضوان آپ پڑھے لکھے باشعور انسان ہیں۔"

"میں روشن خیال سہی مگر فیصلے کا حق ابھی بھی دادا جی کے ہاتھ میں ہے۔"

"ہاں جس حق کا وہ غلط استعمال کر رہے ہیں دیکھیں'

اسی روایت کی وجہ سے مہ پارہ بیٹھی رہ گئی۔ اب بتائیں ام ہانی کے لیے خاندان میں دور دور تک ہے کوئی اس کے جوڑ کا؟ ایسے میں یہ رشتہ نعمت ہے اسے ٹھکرا کے کفران نعمت نہ کریں کسی کو تو پہلا قطرہ بننا ہے نا۔"

ان کے سمجھانے بجھانے پہ رضوان اگلی ہی صبح ہمت کر کے دادا جی کے سامنے یہ معاملہ رکھ بیٹھے' ردعمل ان کی توقع کے عین مطابق تھا۔

"اوئے کمشنر ہوئے گا تے اپنے گھر ہوئے گا۔" وہ اس بری طرح دھاڑے کہ کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ رضوان اٹھ کے ان کا سینہ سہلانے لگے۔

"گھر پہ نہیں دادا جی یہیں لگا ہوا ہے کمشنر۔"

"کھوتے دا پتر۔ ادھر افسری کرنے آیا ہے کہ شریفوں کی حویلی تا کنے۔" وہ کھانستے کھانستے بھی خبر لے رہے تھے۔

"میں نے سنا ہے یہ سرکاری افسر بڑے عیاش ہوتے ہیں۔" مہ پارہ نے پھلجڑی چھوڑی جسے رضوان نے فوراً" جھٹلا دیا۔

"وہ ایک سلجھا ہوا میچور' شریف انسان ہے۔"

"ہوتا پھرے۔" دادا جی نے ہاتھ ہلایا۔

"بس میں نے کہہ دیا خون میں ملاوٹ نہیں کرنی۔"

"وہ تو ہو چکی ہے دادا جی۔" رضوان بھی شاید کچھ ٹھان کے بیٹھے تھے یہاں۔

"مت بھولیں کہ ام ہانی کی مرحومہ ماں کا تعلق ہمارے خاندان اور ذات سے نہیں ہے۔ سلیمان نے آپ کی مخالفت کے باوجود اس سے شادی کی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تو اس وقت بھی ان فرسودہ رسموں و رواجوں کی خلاف تھا۔ آج اگر زندہ ہوتا تو ایک بار پھر آپ کے سامنے ڈٹ جاتا اپنی بیٹی کے لیے۔"

"یہی تو ہے خون میں ملاوٹ کا اثر۔" مہ پارہ نے پھر سے تیر تیز کیے۔

"آخر نکلی نا اسی ماں کی بیٹی جس نے کورٹ میرج کی تھی۔" یہ بات رضوان کو بری طرح کھلی۔

"مہ پارہ۔ وہ میری بھی بیٹی ہے اور میں اس کے بارے میں ایسے الفاظ برداشت نہیں کروں گا۔"

"آہو۔ میں تو کچھ ہوں ہی نہیں۔"

دادا جی نے اب اموشنلی بلیک میل کرنا چاہا۔

"ہڈیوں کی مٹھ۔ میری کیا اوقات جو اب کوئی مجھے پوچھے۔"

"ایسی بات نہیں ہے دادا جی۔ آپ ہی تو ہمارے بڑے ہیں۔ آپ کی اجازت اور مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر میری طرف سے صاف انکار۔"

دادا جی کے کہنے پہ مہ پارہ اطمینان سے مسکرا دی اور رضوان نے بے بسی سے دادا جی کے حتمی فیصلے کے بارے میں نائلہ کو آگاہ کر دیا۔

"ارے ایسے کیسے صاف انکار۔ بنا ملے؟ آپ زور دیں ان پہ۔"

"کیسے زور دوں؟ کتنا زور دوں؟ اور کس برتے پہ؟ ابھی تک باقاعدہ رشتہ بھی تو نہیں آیا نائلہ۔"

"اور رشتہ آگیا اور دادا جی نے ان کے سامنے اپنا صاف انکار دہرا دیا تو؟ رشتہ آنے سے پہلے ان کی ضد ختم کرنا ہو گی۔"

"اچھا۔ بالفرض میں ایسا کر بھی دوں اور اس کے بعد ہی رشتہ نہ آیا تو؟" اس پہ نائلہ چپ کر گئیں کچھ سوچا اور ام ہانی کے پاس چلی آئیں۔

"ہانی تمہارے چچا سے میں نے اور انہوں نے دادا جی سے بات کر لی ہے جیسے میں نے رضوان کو منا لیا ہے وہ بھی دادا جی کو منا ہی لیں گے مگر اب تمہیں بھی کچھ کرنا ہو گا۔"

"مجھے؟ میں کیا کر سکتی ہوں بڑی امی۔" وہ کرنے سے پہلے ہی ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھی۔

"ایک تو سالار کو کل ہی رشتہ لانے کا کہو اور دوسرا یہ کہ دادا جی کے سامنے ڈٹ جاؤ جب وہ تم سے تمہاری مرضی پوچھیں تو شرمانے' جھجکنے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صاف بتا دینا کہ اس میں تمہاری مرضی اور

خوشی شامل ہے اور تمہیں بس یہیں شادی کرنی ہے۔"

"میں؟ میں کہوں یہ؟ دادا جی سے؟" اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"اور کون کہے گا! دیکھو ہانی۔ میں تمہاری ماں نہیں ہوں' مگر کچھ تو لگتی ہوں' ہمدرد ہوں تمہاری' تمہیں غلط مشورہ نہیں دوں گی۔ آج تم نے اپنے حق کے لیے آواز نہ اٹھائی تو اپنی پھوپھو کی طرح ہمیشہ کے لیے۔ تم سمجھ رہی ہونا۔"

وہ اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کے نرمی سے اس کا شانہ دبا کے چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

"کچھ کہنا چاہتی ہو؟" وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔ دور کسی ٹیلے پہ بکریاں لے جاتے چرواہے کو۔ مگر اپنے برابر کھڑی ام ہانی کے چہرے کو وہ بنا دیکھے پڑھ سکتا تھا۔

"جی۔"

"تو کہو۔" اب سالار گھوم کے اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"وہ۔ گھر میں۔" ہچکچاتے ہوئے اس نے کہنا چاہا بڑی امی کی خاص تاکید جو تھی اسی لیے صبح ہوتے ہی وہ ملنے چلی آئی تھی۔

"گھر میں سب کو آپ کے اور میرے بارے میں علم ہو گیا ہے۔"

"گڈ۔ اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے' یہ تو ہونا ہی تھا۔" وہ پرسکون تھا۔ ام ہانی اور بھی الجھ گئی اب بھلا اس سے زیادہ صاف الفاظ میں کیا کہے۔

"جی۔ وہ تو ہے' مگر۔ اب۔ اب آپ کچھ کریں۔"

"کیا کروں؟" نجانے وہ واقعی اتنا انجان تھا یا بن رہا تھا۔

"اپنے گھر والوں سے کہیں۔" یہ بات کہتے ہوئے اسے لگا اس کی زبان من بھر بھاری ہو گئی تھی۔

"گھر بنانا ہے ابھی۔ جب تم گھر والی ہو گی۔" سالار کو اس کی الجھن۔ اس کی جھجک شاید لطف دے رہی تھی۔

"میرا مطلب ہے آپ کی فیملی۔" اس کا چہرہ گلگوں ہو گیا تھا۔

"وہ تو تم بناؤ گی۔"

"سالار۔" اب مارے حیا کے وہ رونے والی ہو گئی۔

"میں آپ کے پیرنٹس کی بات کر رہی ہوں۔"

"وہ نہیں ہیں۔" سالار نے سگریٹ سلگایا۔

"وہ۔ تو۔ تو کوئی تو ہو گا۔" ام ہانی کو اپنی لاعلمی پہ حیرت ہو رہی تھی۔ اتنے دنوں میں وہ سالار کے بارے میں یہ تک نہ جان پائی تھی۔

"ہاں اباں ہیں۔" وہ اطمینان سے کش لگا رہا تھا اور ہانی حیران رہ گئی۔

"مگر۔ ابھی تو۔ ابھی آپ نے کہا کہ آپ کے پیرنٹس۔ تو کیا وہ اسٹیپ مدر ہیں؟"

"نہیں۔ اصلی والی ہیں۔" اب کے ام ہانی سچ میں جھنجلا اٹھی۔

"آپ گھما پھرا کے بات کیوں کرتے ہیں۔ بس آپ انہیں بھیجیں اپنے لیے۔"

"وہ کبھی اپنے لیے کچھ نہیں کر سکیں تو میرے لیے کیا کریں گی' جو کرنا ہے مجھے کرنا ہے اور وہ میں کر لوں گا ڈونٹ یو وری۔"

"تو پھر آپ کل آجائیں۔" اس کی ہمت بڑھ گئی۔ سکون سا آگیا۔

"بڑی امی کہہ رہی تھیں آپ کو کل پرسوں ہی بڑے ابا سے بات کرنا ہو گی تو کل آئیں گے نا آپ؟"

"نہیں۔" سالار نے سگریٹ نیچے پھینک کر جوتے سے مسلا۔

"مگر۔ کیوں؟" اگلے ہی پل وہ اسے پھر سے حیرت میں ڈال چکا تھا۔

"ایسے تو میں کبھی بھی کسی سے ملنے نہیں گیا۔ انہیں Proper طریقے سے مجھے انوائٹ کرنا چاہیے۔"

"فوائٹ؟ سالار۔۔۔ ایسے تھوڑا ہی ہوتا ہے کوئی کسی سے یہ نہیں کہتا کہ آیئے اور آکے ہماری بیٹی کا رشتہ طے کریں۔ آپ کو جانا ہی ہوگا سالار۔۔۔ ان سے میرا ہاتھ مانگنے۔"

"مانگنے؟ سوری۔۔۔ مگر میں نے آج تک کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا۔" سالار کے خشک لہجے پہ ہانی کو دھچکا سا لگا۔

"میں "کچھ" تو نہیں ہوں۔"

"ہاں۔۔۔ مگر "سب کچھ" بھی نہیں ہو۔" وہ مسلسل اسے بے یقینی کے سمندر میں غوطے دے رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر اسے دکھ سے دیکھتی رہی۔

"اور مجھے لگا میں۔۔۔ میں آپ کے لیے یعنی آپ نہیں آئیں گے؟"

اس کے لہجے میں مایوسی مگر آنکھوں میں ابھی ابھی امید کی ہلکی سی جوت تھی اور سالار اس سے رخ پھیرے ایک بار پھر ٹیلے کی جانب دیکھتا دوسرا سگریٹ سلگا رہا تھا۔ چرواہا بکریاں لے کر کب کا جاچکا تھا۔ ہانی کی آنکھوں کی جوت بجھ گئی۔

"ٹھیک ہے۔" اس کا لہجہ گیلا ہوتا محسوس کرکے سالار نے اس کے چہرے پہ نظر ڈالی۔

اور ان آنکھوں کے آنسو۔۔۔

وہ پگھل گیا۔

موم ہو کے بہہ گیا اور اس کا ہاتھ تھام کے نرمی سے کہنے لگا۔

"او کے۔۔۔ آجاؤں گا۔ مگر یہ امید نہ رکھنا کہ میں ان سے ریکویسٹ بھی کروں گا۔" سالار کے حامی بھرنے پہ بھی ہانی کے اندر دوبارہ امید نہ جاگی۔ اس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا۔

"ہاں۔۔۔ آپ کیوں کریں گے۔ وہ بھی میرے لیے۔۔۔ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔۔۔ نہ آئیں بے شک۔۔۔ ایسے تھوڑا ہی مانیں گے بڑے داوا۔"

اس کے آنسو جھل جھل بہہ نکلے اور وہ تب سے اپنا ہاتھ سالار کے ہاتھ سے نکالنے کی مسلسل کوشش میں بھی تھی۔ اس کے آنسوؤں کو بے خودی سے تکتے سالار نے اس کے ہاتھ کو ہلکا سا جھٹکا دے کر اپنے قریب کیا۔ وہ اس کے سینے سے آلگی اور سالار نے انگلی سے اس کی تھوڑی اٹھائی اور دوسری انگلی سے اس کے آنسوؤں کو اپنی پوروں پہ چنتے ہوئے کہا۔

"ان ہیروں کے لیے کرسکتا ہوں۔ کچھ بھی کرسکتا ہوں۔۔۔ کہہ کر دیکھو۔" وہ روتے روتے مسکرادی۔

"نہیں۔۔۔ بس۔۔۔ اتنا ہی۔۔۔"

☼ ☼ ☼

سارے راستے میں دعا مانگتا آیا کہ مجھے محبت کو جنگ بنانا نہ پڑے۔ مجھے لفظ جنگ سے ہی خوف آتا تھا لیکن گھر آتے ہی سب سے پہلے میرے کانوں میں جنگ کے بگل بجے۔

"بس رضوان۔۔۔ اب آپ نے بات سنبھالنی ہے کل کمشنر آرہا ہے ام ہانی کا ہاتھ مانگنے بس یہی شرط تھی نا آپ کی کہ وہ آئے۔۔۔ تو جائیں اب بات کریں داداجی سے۔" امی بڑے زور شور سے ابو کو قائل کررہی تھیں میرے قدم زمین میں گڑ گئے تھے۔

"فکر مت کرو۔۔۔ منالوں گا میں انہیں۔۔۔ ویسے بھی میں مل چکا ہوں سالار اعظم سے۔ اس میں چاہ کے بھی وہ کوئی خاص اعتراض نہ نکال سکیں گے۔"

جنگ شروع ہوچکی تھی اور میں خالی ہاتھ تھا' میرے پاس تو ابھی تک کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔ میں وہیں سے پلٹ گیا اور اپنے کمرے کو مورچہ سمجھ کے بند کرکے بیٹھ گیا۔ ساری شام۔۔۔ رات بھر۔

اس دوران کبھی امی آکے دروازے پر دستک دیتی رہیں کبھی ام ہانی۔۔۔

"سعد دروازہ کھولو۔۔۔ سعد پلیز۔" وہ باقاعدہ منت کرتی رہی۔

"کب تک ناراض رہو گے صبح کے آئے ہو اور مجھ سے ملے تک نہیں' پرسوں بھی ایسے ہی چلے گئے' سعد دروازہ کھولو ورنہ اس بار میں ناراض ہوجاؤں گی۔"

اتنی بڑی دھمکی پہ بھی میں ٹس سے مس نہ ہوا۔

"سعد دیکھو۔۔۔ بعد میں ہوجانا ناراض' پھر کرلینا گلے شکوے۔۔۔ ابھی مجھے ضرورت ہے تمہاری۔۔۔ سعد پلیز۔" میں نے اس کی آوازوں سے بچنے کے لیے کانوں پہ تکیہ رکھ دیا۔

"نہیں ہنی۔۔۔ ابھی اپنی ضرورت سب سے زیادہ مجھے ہے۔ پہلی بار میں نے تمہارا نہیں۔۔۔ اپنا ساتھ دینا ہے۔"

☼ ☼ ☼

ہمیشہ کی طرح ابھی بھی ان دونوں کے درمیان پراسراری خاموشی تھی' وہی صرف چمچے کے پلیٹ سے ٹکرانے کی آواز' البتہ تبدیلی صرف اتنی تھی کہ وہ جو اماں کھانے کے دوران بڑی آس سے گاہے بہ گاہے سالار پہ نظر ڈال لیا کرتی تھیں کہ شاید وہ ان کی موجودگی کا خیال کرکے ان سے کچھ پوچھ لے' دیکھ ہی لے۔۔۔ وہ بھی نہیں تھا آج۔

وہ سر جھکائے پلیٹ میں موجود کباب کو کرید رہی تھیں اور ان کی بجائے سالار ہر دو منٹ بعد ایک گہری نظر ان پہ ڈال لیتا تھا۔

"کل کیا مصروفیت ہے آپ کی؟" وہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں جیسے یقین ہی نہ آیا ہو کہ انہیں مخاطب کیا گیا ہے۔

"میری؟ کچھ بھی نہیں؟ میرے پاس کرنے کو ہے ہی کیا؟"

"چلیں۔۔۔ کل کی مصروفیت میں نے ڈھونڈلی ہے ایک جگہ جانا ہوگا آپ کو۔" وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کررہا تھا۔

"کہاں؟"

"رضوان شاہ کی حویلی۔۔۔ ام ہانی کے اور میرے رشتے کی بات کرنے۔"

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں جاؤں گی۔" وہ بے تحاشا خوش ہوگئیں' مگر اس کا لہجہ ابھی بھی روکھا تھا۔

"اور کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے مجھے ان کا جواب صرف ہاں میں چاہیے' ہوسکے تو کل ہی شادی کی تاریخ بھی طے کرلیں جو قریب ترین ہو۔" اس نے مطالبے پہ ان کی حیرت فوراً" ہی تشویش میں بدل گئی۔

"ہر بات کا قاعدہ ضابطہ ہوتا ہے سالار' کل رشتہ طلب کرنا ہے پھر ظاہر ہے انہیں سوچنے کی مہلت چاہیے ہوگی۔ شادی کی تاریخ طے کرنا تو بعد کے مرحلے ہیں۔" اماں کی تاویل پہ سالار اعظم کی پیشانی شکنوں سے بھر گئی۔

"کیا سوچنا ہے انہوں نے؟ کیسی مہلت؟ "میں" یعنی سالار اعظم شادی کرنا چاہتا ہوں اس سے۔۔۔ اور کیا چاہیے انہیں۔"

اس کے چہرے پہ کچھ ایسا تھا کہ اماں نے خائف ہوکے فوراً" ہی نظریں ہٹالیں اور زیر لب کچھ ورد کرنے لگیں۔ شاید استغفار۔۔۔

☼ ☼ ☼

رات بھر وہ میرے دروازے پہ دستک دیتی اور پکارتی رہی۔ میں پتھر بنا رہا اور اب فجر کے وقت سے پتھر بنا چھت کی منڈیر پہ کھڑا اس انتظار میں تھا کہ وہ کب دوبارہ مجھے پکارے۔۔۔

ہتھیلی پہ باجرہ لیے میں دانہ دانہ کرکے فضا میں اچھال رہا تھا۔۔۔ اور کبوتروں کو منڈیر پہ آکے چگتا دیکھ رہا تھا' اپنے عقب میں آہٹ ہوتے دیکھ کے بے اختیار میں پلٹا مگر وہ ام ہانی نہیں۔ امی تھیں' جو زمین پہ بچھی چادر پہ اچار ڈالنے کی نیت سے دھوپ میں رکھی کیری کی پھانکوں کو الٹ پلٹ کے مسالا برابر کررہی تھیں۔ میں مایوس ہوکے دوبارہ باجرہ فضا میں بکھیرنے لگا۔

"تمہیں تو ہانی نے بتایا ہی ہوگا کہ آج اس کے رشتے کی بات کرنے لوگ آرہے ہیں۔" "ہاں" میں ماں ہوکے وہ مجھے انجانے میں ہی سہی۔۔۔ ایسے چوکے کیوں لگا جاتی تھیں۔

"دعا کرو سعد۔۔۔ داداجی کوئی مسئلہ کھڑا نہ کریں۔"

"میں کیوں کروں دعا؟" میں کلس گیا۔

"بڑے بے مروت ہو۔۔۔ ویسے تو اوپر اوپر سے اتنی محبت جتاتے ہو ہانی سے' مگر اس کے لیے ایک دعا تک

نہیں کرسکتے۔"

"ہاں۔ نہیں کرسکتا۔" میری بدتمیزی عروج پہ تھی وہ ایک رومال سے ہاتھوں پر لگا اچار کا مسالا پونچھتیں میرے پاس چلی آئیں۔

"اچھا میرے لیے ہی کرلو مجھے بھی تو خواہش ہے کہ وہ بیاہ کے چلی جائے۔"

"کیوں؟" میں ناراض ہی ہوگیا۔ باقاعدہ۔

"آپ کو کیا تکلیف ہے اس سے؟ وہ کیا کہتی ہے آپ کو؟"

"ارے تکلیف کیا ہوگی۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ وہ اپنے گھر کی ہوجائے۔ مہ پارہ کی طرح حویلی میں بیٹھی نہ رہ جائے۔"

"تو بیٹھی رہے نا حویلی میں۔ آپ کا کیا جاتا ہے۔"

"اور اگر اس کی کسی اچھی جگہ شادی ہوجائے تو تمہارا کیا جاتا ہے۔" انہوں نے گھورا تو میں منمنا کے رہ گیا۔

"میرا ہی تو جاتا ہے۔"

"تم سے تو بات کرنا فضول ہے۔"

مجھ سے مایوس ہو کے وہ جانے کے لیے مڑیں۔

"میں خود دادا جی سے بات کرتی ہوں۔ تم مدد کرنے کے موڈ میں نہیں ہو۔ بے فیض۔"

"کرسکتا ہوں مدد۔" میرے کہنے پہ وہ جاتے جاتے پلٹیں۔

"واقعی؟ کیا؟"

"ایک حل ہے آپ مجھ سے کردیں اس کی شادی۔" مجھے لگا وہ حیران ہوں گی' پھر پریشان' پھر شاید ناراض یا غصہ مگر ان سب مراحل میں داخل ہونے کی بجائے انہوں نے فٹ میرے کاندھے پہ ایک زور کی دھپ لگادی۔

"ہر وقت مذاق اور سعد۔ مذاق اور بکواس میں بہت فرق ہوتا ہے۔ یہ اس کی زندگی کا معاملہ ہے جسے تم ہنسی میں اڑا رہے ہو بڑے ہوجاؤ سعد اب۔ نالائق۔"

وہ ڈانٹتی' سر جھٹکتی' نیچے چلی گئیں میں نے بے زار ہو کر مٹھی میں دبا باقی کا سارا باجرہ فضا میں اڑا دیا اور اسی بے زاری کے ساتھ کھنڈر کی منڈیر پہ آکے بیٹھ گیا۔

منڈیر بدلی تھی' انتظار نہیں۔ اس بار انتظار زیادہ طویل نہیں تھا چند ہی لمحوں میں ہانی کا ہاتھ میرے چہرے کے سامنے تھا۔ میں نے ایک نظر اس کے چہرے پہ ڈالی دوسری اس کے ہاتھ میں دبے چاک پہ۔

"بہت ہوگیا۔ یہ لو اور لکھو اپنا اور میرا نام جو ہر صلح کے بعد لکھتے ہو۔"

"ابھی تک جھگڑا ہی نہیں ہوا تو صلح کیسی؟"

"اچھا۔ تو ابھی کسر باقی ہے لڑنے کی؟ کتنے برے ہو نا تم سعد۔ ایسے وقت میں جب مجھے تمہاری ضرورت سب سے زیادہ ہے تو تم نخرے دکھا رہے ہو۔"

"میری ضرورت تمہیں کبھی تھی ہی نہیں۔" میرے اندر ہزاروں گلے مچل رہے تھے۔

"ہمیشہ تھی۔ ہے۔ اور رہے گی۔" وہ میرے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

"میں کیا صرف مشکل اور ضرورت میں یاد آتا ہوں۔"

"پھر سے جھگڑا۔ بس کرو نا مجھ میں ہمت نہیں ہے لڑنے کی۔ تم بس میری ہمت بڑھاؤ کوئی امید دلاؤ۔ پلیز۔"

"تم دلاؤ نا مجھے امید۔" میں مچلا۔ مگر وہ اپنی کہتی رہی۔

"تم نہیں جانتے سعد۔ مجھے کتنا ڈر لگ رہا ہے۔"

"مجھے بھی بہت ڈر لگ رہا ہے ہنی۔" میں ہی اپنی کہتا رہا۔

"دادا جی مان تو جائیں گے' بس اب ان پہ ہے سارا معاملہ۔"

اس کی بات نے کھٹ سے میرے دماغ کی ایک کھڑکی کھولی تھی ہاں۔ بڑے دادا۔ فیصلے کا اختیار تو ان کے پاس ہے۔ ابو' امی اور ہنی بھی' سب ان کی طرف آس بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ کیسا اچھا ہو جو بڑے دادا میری اس جنگ کا سب سے مہلک ہتھیار ثابت ہوں میں اسی وقت اٹھ کے بڑے دادا

کے کمرے کی طرف جانے لگا' وہ پھر سے پکارتی رہ گئی۔ مگر چند ہی لمحوں بعد وہیں بڑے دادا کے پلنگ کی پائنتی بیٹھا ان کی ٹانگیں دبا رہا تھا۔

"آج تجھے میرا خیال کیسے آگیا؟"

"مجھے تو ہر وقت آپ کا خیال رہتا ہے۔ آپ کو ہی میرا خیال نہیں ہے۔ کسی کو بھی نہیں ہے۔ کسی کو میں نظر ہی نہیں آتا۔" میں نے ان کی ہمدردیاں لینے کے لیے جی بھر کے مظلومیت طاری کی' مگر وہ بھی میرے بڑے دادا تھے۔

"تیرے دادے کا بھی پیو ہوں میں۔ سب سمجھتا ہوں' جب بھی تجھے مجھ سے کوئی مطلب ہو' کچھ مانگنا ہو یا کچھ منوانا ہو تب ہی آتا ہے میرے پاس' بتا کیا ہے اصل بات؟" جب وہ اصل مدعے پہ آگئے تو میں تمہید باندھ کے وقت کیوں ضائع کرتا۔

"وہ بڑے دادا۔ آپ۔ آپ یہ بتائیں پہلے کہ آپ۔ ڈانٹیں گے تو نہیں۔ منع تو نہیں کریں گے؟" تمہید بھلے نہ باندھتا' حفاظتی بند باندھنا تو لازمی تھے۔

"نہیں نہیں بول۔" انہوں نے پچکارا۔

"جو کہوں گا مان لیں گے؟"

"آہو۔ شاباش۔ بول۔"

"پہلے وعدہ کریں۔"

"وعدہ۔" انہیں بھی اب بے تابی ہو رہی تھی جاننے کی۔

"پکا والا وعدہ؟" میں نے ایک بار پھر تسلی کرنا چاہی' مگر اب ان کا صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

"کنجرا۔ بھونکتے رہیا آں۔ ہور اسٹامپ پیپر تے لکھ کے دیواں؟"

چلانے سے ان پہ کھانسی کا دورہ پڑا تو میں گھبرا کے ان کا سینہ سہلانے لگا۔ ان کی سانس گم ہو رہی تھی اور چہرہ سفید پڑ رہا تھا میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔

"نہیں بڑے دادا ابھی نہیں اس نازک موقع پہ نہیں۔ پلیز ابھی نہیں۔ ابھی رک جائیں جہاں اتنے سال نکال دیے آپ نے وہاں کچھ دن اور۔ پہلے میرا کام تو کردیں۔"

شکر خدا کا۔ ان کی حالت انہیلر لیتے ہی سنبھل گئی' مگر ہانپ رہے تھے اور فی الحال کچھ بولنے کی سکت نہیں تھی پھر بھی ہاتھ کے اشارے سے پوچھنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں اب بک بھی دے۔

"بڑے دادا۔ سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے۔" میں ایک بار پھر ہل ہل کے ان کی ٹانگیں دبانے لگا۔

"آپ چاہیں تو کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ آپ نے فیصلہ دے دیا تو سب مان جائیں گے۔"

"ہاں۔ تے بول تے سہی۔"

"وہ بڑے دادا۔ ہنی میرا مطلب ہے ام ہانی۔ آپ کو تو پتا ہے وہ میرے لیے کیا ہے بس بڑے دادا۔ آپ سمجھ جائیں نا۔ آپ نے کہیں تو اس کی شادی کرنی ہے۔ تو۔ تو۔ پھر۔"

اس سے پہلے کہ میری بات پوری ہوپاتی۔ امی اور ابو دونوں ہی اندر داخل ہوئے۔ میں کوفت سے جھنجھنا اٹھا۔ یہی حال بڑے دادا کا بھی تھا وہ بھی سخت بدمزا ہوئے۔

"چلو۔ پوری فوج آگئی بڈھے تے چڑھائی کرن۔ مرن تے دیو سکون نال۔ بے ہدایتو۔"

"میں تو یہ بتانے آیا تھا دادا جی کہ آج شام سالار۔" ابو کی بات کو بڑے دادا نے مکمل نہ ہونے دیا۔ بالکل ایسے جیسے میری بات کو ابو نے اچانک آکے ادھورا کردیا تھا۔

"آہو۔ آہو۔ پتا ہے کان پک گئے سن سن کے۔ زنانی مرد کا اپنا بس نہ چلا تو اسے بھیج دیا ہے چابی بھر کے۔" انہوں نے میرے کاندھے کو ٹہوکا دیا میں ہڑبڑا اٹھا اور بوکھلا کے انہیں دیکھنے لگا وہ میری بوکھلاہٹ بڑھانے لگے۔

"چل شاوا منڈیا۔ شروع ہوجا۔ کمشنر ہے' شریف ہے' کلم کلا ہے۔ شاباش۔ بول۔"

"میں بڑے دادا؟" میں ہونق بنا انہیں دیکھ رہا تھا جو پھر سے کھانس رہے تھے۔

"دادا جی کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بار ام

امہانی سے اس کی مرضی پوچھ لیں۔"

ایک تو یہ امی۔۔۔ میں بھنا اٹھا اکلوتی اولاد کی مرضی کیا ہے یہ جاننے کی زحمت بھی کریں۔

"اس سے کیا پوچھنا ہے۔۔۔ اسی نے تو یہ بھیجا ہے۔۔۔ یہ کھوتا۔۔۔ ام ہانی کا وکیل۔" ایک بار پھر میرے کاندھے کو استخوانی انگلیوں نے ٹھوکا دیا۔

"اب میں وعدہ کر چکا ہوں اس نامانیم سے۔۔۔ دے چکا ہوں اسے زبان۔۔۔"

مجھے یہ ٹھوکا ذرا نہ چبھا' خوشی سے بے قابو ہو کے میں نے ان کے پیر پھر سے دابنے شروع کر دیے۔

"لاڈلا ہے یہ میرا اس کی کوئی بات ٹال سکتا ہوں؟"

"سچی بڑے دادا؟" میرا بس نہ چلا کہ میں ان کے پیر ہی چوم لوں۔

"ہاں اے میرے دلوں۔۔۔ کہہ دے اس کمشنر کے بچے کو لے آئے جنبج"

اور میرے ہاتھ ان کے پیروں پہ ڈھیلے پڑ گئے۔ میں ٹکر ٹکر ان کو دیکھنے لگا۔ یہ بازی پلٹ کیسے گئی۔ میرا ہی سپہ سالار۔ میدان جنگ میں مجھ پہ ہی وار کر گیا۔

آپ نے بہت درست فیصلہ کیا ہے دادا جی۔"

ابو خوش ہو کے بڑے دادا کے گلے لگنے آگے بڑھے۔

اب تو سعد کو بھیجے گا منوانے کے لیے۔ تو میں ناں کیسے کر سکتا ہوں۔"

میں سکتے میں آگیا۔ امی میرے سر پہ ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

"جیتے رہو سعد۔ یہ تم ہی تھے جو اپنے بڑے دادا سے یہ بات منوا سکتے تھے۔"

لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ میں وہاں سے نکلا۔ عقب میں کئی آوازیں تھیں جو سماعتوں تک پہنچ کر دل ودماغ میں آگ بھڑکا رہی تھیں۔

ہانی بی بی۔ ہانی بی بی۔ مبارک ہو۔ دادا جی مان گئے۔" یہ سلمیٰ تھی۔ اور پھر امی کا فخریہ انکشاف۔

"میرے سعد کا جادو ہے۔ اس نے منایا ہے انہیں۔"

"سعد۔۔۔"

یہ شکرانے ادا کرتا لہجہ ام ہانی کا تھا۔ وہ شاید میرے پیچھے بھی آئی تھی مگر کسی نے روک لیا ہوگا۔

"ارے ہانی۔ تم کہاں چل دیں۔ دیکھو دوپہر ڈھل رہی ہے۔ شام کو سالار اور اس کے گھر والوں نے آنا ہے۔ مہ پارہ تم اسے تیار تو کر دو۔"

یہ بھی سنا تھا میں نے۔ اور اس کے بعد ایک مکمل سناٹا۔ پتا نہیں کس پاتال میں جا گرا تھا۔ جو نہ کچھ سنائی دے رہا تھا۔ نہ دکھائی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے تو آپ کی بچی پہلی نظر میں بھا گئی۔ بلکہ میں نے تو اسے دیکھے بغیر ہی دل سے بہو مان لیا تھا۔"

وہ باوقار۔ مگر سادہ دل سی اماں جان نائلہ اور رضوان دونوں کو بہت پسند آئی تھیں۔ اور اماں جان کو ام ہانی۔ البتہ مہ پارہ کی پسندیدگی بہت دور کی بات تھی۔

"لیکن ہم تو آپ کے بیٹے کو دیکھے جانے بغیر کوئی فیصلہ نہیں لے سکتے۔"

مہ پارہ کے صاف جتا دینے پر وہ کچھ شرمندہ ہوئیں۔

"دراصل وہ کچھ شرمیلا ہے۔ اسے مناسب نہیں لگ رہا تھا اس موقعے پہ خود آنا۔"

"چلیں کوئی بات نہیں۔ ہم خود جلد آئیں گے آپ کے ہاں۔ دیکھیں۔ بچی کا معاملہ ہے۔ یوں ہتھیلی پہ سرسوں تو جمائی نہیں جا سکتی۔ سب دیکھنا' پرکھنا' جانچنا اور کھنگالنا پڑتا ہے۔" رضوان کو اس کا لہجہ کچھ بدتہذیبی کے زمرے میں آتا محسوس ہوا تو فوراً ٹوک دیا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو مہ پارہ۔ سالار اعظم کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اور ان کی شرافت' خاندانی نجابت کا' کردار کا قائل بھی ہوں۔"

"لیکن آنا تو آپ سب کو ہوگا۔"

اماں نے سبھاؤ سے دعوت دے ہی ڈالی۔

"آخر رشتے داری ہونے جا رہی ہے۔ میل ملاپ

بڑھنا چاہیے۔ آپ کا پورا حق ہے اپنی تسلی کرنے کا۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ مگر آپ اپنے آبائی گھر کا پتا بھی تو دیں۔" مہ پارہ کی نئی فرمائش پہ نائلہ نے کسمسا کے رضوان کو ٹھوکا دیا۔ وہ بھی مہ پارہ کو گھور کے رہ گئے مگر وہ نظر انداز کیے لہک لہک کے کہتی رہی۔

دیکھیں ناں۔ یہاں آئے آپ کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ کوئی آپ کو جانتا تک نہیں ہے اس علاقے میں۔ ہم آپ کے آبائی شہر میں۔ اور پرانے جاننے والوں سے ہی پوچھ گچھ کر کے تسلی کریں گے۔"

"کیوں نہیں۔ ضرور۔۔۔"

اماں جان نے مروت میں کہا ضرور۔ مگر نائلہ مسلسل مہ پارہ کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرتی رہیں۔ رضوان نے بھی اپنی جانب سے کہہ کر تلافی کرنی چاہی۔

"نہیں۔ نہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔ سالار کے خاندان اور حسب نسب سے میں باخوبی واقف ہوں۔"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ منہ میٹھا کراتے ہیں۔ سلمیٰ۔" نائلہ اپنی مسرت چھپانے کی اپنی سی کوشش کرتے ہوئے سلمیٰ کو پکارنے لگیں۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ مہ پارہ منہ بناتے ہوئے وہاں سے اٹھ کے جا رہی تھی۔

"ایک اور خواہش بھی تھی میری۔"

"جی جی کہیے۔"

رضوان نے اماں جان کی جانب توجہ سے جو کچھ کہہ رہی تھیں۔

"مجھے عنقریب اپنی بیٹی کے پاس امریکہ جانا ہے۔ کچھ مہینے رکوں گی وہاں۔ میں چاہتی تھی ہم منگنی وغیرہ کے تکلف میں نہ پڑیں۔ اور شادی جلد از جلد کر دیں۔ دراصل میں اس معاملے میں تاخیر نہیں چاہتی۔"

اب بھلا نائلہ کے لیے اس سے بڑھ کے خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ ان کا بس نہ چل رہا تھا خود ہی حامی بھر کے سب طے کر دیں مگر دادا جی۔۔۔

رات کو دادا جی کے کمرے میں پھر سے مقدمہ پیش ہوا۔

"ایسا رشتہ قسمت والوں کو ملتا ہے۔ بہت نصیب والی ہے ہماری ام ہانی جو سالار جیسا شخص اس کی زندگی میں آرہا ہے۔" رضوان بڑھ چڑھ کے تعریفیں کر رہے تھے اور مہ پارہ ہر بات میں کجی تلاش کر رہی تھی۔

"دیکھا تک تو ہے نہیں ہم میں سے کسی نے اسے"۔ اور پھر دادا جی کو بھڑکانا چاہا۔ جو دل سے تو اب بھی راضی نہ تھے۔

"دیکھیں ناں دادا جی۔ کوئی بات ہے بھلا۔ پہلی بار وہ آئیں ہیں رشتہ لے کر اور بنا لڑکے کو دیکھے بھالے بھائی صاحب نے ہاں بھی کر دی۔ بھلے وقتوں میں تو لڑکی والے اگلوں کی جوتیاں گھسا دیا کرتے تھے۔"

"کیوں بھئی؟ اتنی بھاری تھی کڑی ہمیں' وہ کیا سوچیں گے کہ ان کو اتنی تھوڑ تھی رشتوں کی۔ تیار بیٹھے تھے ہاں کرنے کو۔"

دادا جی نے گھر کا تو رضوان بہن کو گھورتے ہوئے بولے۔

"دادا جی۔ بلاوجہ کے نقص کس لیے نکالتا میں؟"

"نقص نکالنے کی نوبت تو تب آتی جب اسے دیکھا جاتا۔" مہ پارہ نے پھر پھلجھڑی چھوڑی۔

"انہوں نے ہمیں انوائیٹ کیا تو ہے۔ تم بھی چلنا۔ دیکھ لینا۔ اور کر لینا اپنی تسلی۔"

رضوان نے تنگ آکے مہ پارہ سے کہا۔

"اور دادا جی۔ آپ بھی چلیں مہ پارہ کے ساتھ۔"

"ناں۔ میں کتھے جاؤں۔" دادا جی پہ اسی وقت نقاہت طاری ہو گئی۔

میں تے میری بیماریاں۔۔۔ ہک ہا۔۔۔"

آہیں بھرتے۔ ہانپتے کانپتے۔ سو سو باتیں سناتے آخر کار' دادا جی نے اپنے تمام اعتراضات سے ہاتھ اٹھا ہی لیا۔ اب رضوان تبھی کھل کے مٹھائی کھا رہے تھے۔ نائلہ کی خوشی میں اس کا ساتھ دے رہے تھے جبکہ مہ پارہ بڑے کمرے میں ان کے ساتھ موجود تو تھی۔ مگر ان کی خوشیوں میں نہیں۔ اور اس کے

چہرے پہ موجود بےزاری اور ناگواری ام ہانی کے چہرے کھلتی حیا میں ڈوبی مسکراہٹ کو پھیکا کیے دے رہی تھی۔

"حب بس بھی کریں۔ شوگر ہائی ہوجائے گی۔"

نائلہ نے رضوان کے ہاتھ سے گلاب جامن لیا اور ام ہانی کے منہ میں ٹھونس دیا۔ وہ مزید شرما گئی۔

"میں تو خوش ہوں اور حیران بھی۔ کہ دادا جی نے میری توقعات کے برعکس کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کیا۔"

رضوان نے ایک اور گلاب جامن اٹھالیا۔

"ظاہر ہے۔ بھابی نے طے جو کرر کھا ہے کہ ہاں ہی کہلوانی تھی؟" مہ پارہ کے جلے کٹے طنز پہ ام ہانی سہم کر آنچل درست کرنے لگی۔ اسے بہت خوف آتا تھا۔ کبھی مہ پارہ کی زبان سے۔ کبھی اس کے مزاج سے۔

"یہ لو۔ سعد بھی آگیا۔"

نائلہ کے کہنے پہ آنچل ماتھے تک کھینچتی ام ہانی نے چونک کر سامنے دیکھا۔

میں تھکا ہارا۔ نڈھال۔ پژمردہ۔ بڑے کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا حیرت سے۔ کبھی ٹیبل پہ رکھی چائے اور دیگر لوازمات کی باقیات دیکھ رہا تھا۔ کبھی فرش پہ دھرے مٹھائی کے ٹوکروں کو۔ تو کبھی سب کے درمیان آنچل میں 'سر جھکائے شرماتی ام ہانی کو۔ ابھی میں کچھ پوچھ بھی نہ پایا تھا کہ امی مٹھائی لے کر بڑھیں۔

"کہاں تھے تم سعد۔؟"

"کیسی بری عادت ہے صاحبزادے کی۔ ایک تو بتائے بغیر گھر سے نکلنا۔ اور پھر فون نہ اٹھانا۔"

خلاف معمول ابو نے ڈانٹنے کی بجائے صرف جتلایا۔

"حالانکہ کتنا ضروری تھا آج تمہارا گھر ہونا۔"

امی نے برفی کا ٹکڑا میری جانب بڑھایا۔

"کیوں۔۔۔ آج ایسا کیا تھا؟"

میرے اتنا پوچھتے ہی امی نے برفی کا ٹکڑا میرے منہ میں ٹھونس دیا۔

"ام ہانی کی منگنی۔"

مجھے ایسا لگا کسی نے میرے منہ میں انگارے بھر دیے ہوں۔ نہ میں اس برفی کو اگل پا رہا تھا نہ نگل پا رہا تھا۔ ٹکر ٹکر سب کو دیکھنے لگا۔

ام ہانی دوپٹے میں چہرہ چھپائے مسکرا رہی تھی۔ مہ پارہ پھوپھو مجھے چھیڑ رہی تھیں۔

"ارے۔ یہ تو کچھ شادی مرگ والی کیفیت ہے۔"

"ناراض ہوگیا ہے شاید۔ اسے بتائے بغیر منگنی کرڈالی۔" یہ ابو کا قیاس تھا۔

"تو یہ گھر میں ٹکے بھی تو۔ کسی کے پاس بیٹھ کے کچھ سنے تو۔" امی نے میرا گال محبت سے سہلانا چاہا مگر میں ان کا ہاتھ جھٹک کے وہاں سے ایسے بھاگا۔ جیسے ایک منٹ اور رکا۔ تو۔ تو یہ انگارے میرے وجود میں اتر جائیں گے۔

بھاگتے ہوئے وہاں سے نکلنے کے بعد سب سے پہلے میں نے گلاب کی کیاری میں برفی کا وہ ٹکڑا تھوکا۔ جو میرے منہ میں جھلس رہا تھا۔ تھوک پھینکنے کے بعد بھی میرے حلق سے کڑواہٹ نہ گئی۔ تب بے بسی کے احساس سے پسپا۔ میں وہیں کیاری کے پاس بیٹھ کے رونے لگا۔

☼ ☼ ☼

"اور آج سے میں آپ کی ہوگئی۔"

وہ سرشاری سے کہہ رہی تھی۔ سامنے ہو تو الفاظ گنگ سے ہوجاتے تھے۔ اندر ہی اندر مچل کے رہ جاتے۔ مگر زبان کی نوک پہ آنے کی ہمت نہ کرپاتے تھے۔ اس وقت وہ فون کے دوسری جانب تھا۔ اس لیے وہ سب الفاظ اس کے لبوں پہ سجے تھے۔

"تم اسی دن میری ہوگئی تھیں۔ جس دن میری پہلی نظر تم پہ پڑی تھی۔ میں بتاچکا ہوں کہ جو مجھے پسند آتے ہیں وہ میرے ہوجاتے ہیں۔"

"چلیں۔ یوں کہہ دیتی ہوں کہ آج سے آپ میرے ہوگئے۔"

"میں صرف اپنا ہوں۔"

سالار کے کہنے پہ وہ ٹھٹکی۔ اور جب غور کرنے پہ

بھی اس کے لہجے میں مذاق کا کوئی شائبہ نہ ہوا تو روہانسی ہوگئی۔

"کیوں تنگ کرتے رہتے ہیں آپ مجھے۔ بار بار مجھے ستانے والی باتیں کریں گے تو۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔"

"کیا کروں گی تم؟"

وہ بے حد اشتیاق سے پوچھ رہا تھا۔

"رو دو گی؟" اس کی سرگوشی ابھری۔ اور ام ہانی مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

"سعد۔ بیٹا ناشتے کے لیے نیچے کیوں نہیں آئے؟"

صبح ہوگئی ہے۔ اس کا اندازہ مجھے کبھی نہ ہوتا۔ اگر امی اندر آکے یہ نہ کہتیں۔ میں یونہی گم صم سا اوندھا پڑا انہیں دیکھتا رہا۔ وہ میرے پاس بیٹھ کے محبت سے میرے بال سہلانے لگیں۔

"رات کو بھی بنا کچھ کھائے سو گئے تھے۔"

"کھلائی تو تھی آپ نے۔۔۔ مٹھائی۔"

میں نے ناراضی جتائی اور منہ پھیرلیا۔

اتنے ناراض کیوں ہو؟ رضوان نے ڈانٹا تھا کسی بات پہ؟ میں ابھی پوچھتی ہوں ان سے۔"

انہوں نے میرا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اپنی جانب موڑا اور پھر پریشان ہوگئیں۔

"تم رو رہے تھے سعد؟ ارے۔ بتاؤ تو سہی۔ مجھے پریشان مت کرو سعد۔ بتاؤ اصل بات۔"

"امی۔۔۔ وہ۔۔۔ ہنی۔۔۔"

میں وہی بچہ بن گیا جو ان کی گود میں سر رکھ کر پھپک پھپک کر رو دیا کرتا۔ اور فرمائشیں منوالیا کرتا تھا۔ مجھے لگا میرے رونے پہ ہمیشہ کی طرح وہ پریشان ہوجائیں گی۔ مگر وہ ایک سکون کا سانس لیتے ہوئے اپنے گود میں رکھے میرے سر کو پیار سے تھپکتے ہوئے کہنے لگیں۔

"اوہ۔ شکر۔ میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ پتا نہیں کیا ہوا۔ پاگل۔ لڑکیاں بھی بھلا کیا ہمیشہ کے لیے گھر رہتی ہیں۔ اسے تو جانا ہی ہے ایک دن۔ میں جانتی ہوں تم اس کے جانے کے خیال سے دکھی ہو رہے ہو آخر بچپن کا ساتھ ہے۔ نہ تمہارا کوئی بہن بھائی۔ نہ اس کا۔ تم دونوں نے ایک دوسرے کی تنہائیاں بانٹی ہیں۔ مگر بیٹا۔ یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔" انہوں نے جھک کر میرا ماتھا چوما۔ میرے سسکیاں تھم گئی تھیں۔ اور آنسو بھی۔

"بس دعا کرو اس کے لیے۔ اس کی زندگی کا اگلا سفر خوشگوار گزرے۔"

میری آنکھیں مکمل طور پر خشک ہوگئیں۔ میں نے اپنا سر ان کی گود سے نکالا اور تکیے پہ رکھ کر دوبارہ رخ موڑ لیا۔ باہر سے ابو کے پکارنے کی آواز سنائی دی۔ وہ فوراً اٹھیں۔

"ارے۔ باتوں میں لگالیا۔ میں چلوں۔ تمہارے ابو تو شور مچادیتے ہیں گھنٹہ پہلے ہی۔ اگر کہیں جانا ہو تو۔"

میں بے بسی سے انہیں کمرے سے نکلتا دیکھتا رہا۔ جانتا تھا کہ کہاں جانے کی تیاری ہے۔ کچھ دیر چپ چاپ لیٹا رہنے کے بعد میں پھرتی سے بیڈ سے اترا اور نیچے جھانکا۔

"مہ پارہ۔ آبھی جاؤ۔ دیر ہورہی ہے۔"

امی کوفت سے پھوپھو کو بلا رہی تھیں۔

"میرا خیال ہے وہ دادا جی کو منا رہی ہے۔ ساتھ جانے کے لیے۔"

"وہ نہیں جانا چاہتے تو آپ دونوں کیوں اصرار کررہے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں رضوان۔ یہی اچھا ہے کہ وہ نہ جائیں۔ بلاوجہ کوئی مین میکھ ہی نکالیں گے۔ بلکہ مجھے تو مہ پارہ کی طرف سے بھی کھٹکا ہے آپ نے دیکھا نہیں۔ کل بھی کیسے بار بار طنز سے۔۔۔"

اور پھر پھوپھو کو کمرے سے برآمد ہوتا دیکھ کے چپ ہوگئیں۔ ان کے لحاظ میں نہیں۔ حیرت سے۔ پھوپھو فیروزی ساڑھی میں پورے بناؤ سنگھار کے ساتھ سامنے تھیں۔ فیروزہ جڑا کندن کا سیٹ بھی۔۔۔

"مہ پارہ۔ ابھی ہم صرف شادی کی تاریخ کی بات کرنے جارہے ہیں۔ شادی نہیں ہے جو تم اس قدر

تیار ہو گئی ہو۔"

"نہیں پتا چلنا چاہیے کہ ہم کوئی ایسے ویسے لوگ نہیں ہیں۔" وہ اترا رہی تھیں۔

"خاندان اور رتبے کا اندازہ زیور اور ظاہری چمک دمک سے نہیں لگایا جاتا۔ مگر بہرحال تم سے بحث کون کرے آؤ اب۔ پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔"

امی سر جھٹک کے انہیں آنے کا کہتی آگے بڑھیں۔ میں تیزی سے سیڑھیاں اترا۔

"ایک منٹ۔ میرے بغیر کیسے جا رہے ہیں آپ؟"

سب ہی حیران رہ گئے۔ پھوپھو کہے بنا رہ نہ سکیں۔

"تم بھی ساتھ چلو گے؟ مگر اس موقع پر تو صرف بڑے جایا کرتے ہیں۔"

"آنے دو۔ ماشاء اللہ اب میرا بیٹا بھی بڑا ہو گیا ہے۔ آؤ سعد۔" ابو کے مزاج کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ کبھی دھوپ کبھی چھاؤں۔

میں جانتا تھا ہنی کو جب اطلاع دی ہو گی تو وہ بہت حیران ہوئی ہو گی۔ کہ میں بھی ساتھ گیا ہوں۔ اب اسے کیا خبر۔ کہ میں کس لیے وہاں جا رہا ہوں۔

ویسے۔ خبر مجھے بھی نہیں تھی۔ کہ میں کیوں جا رہا ہوں۔ اور جب وہاں سالار اعظم کی قد آدم تصویریں جا بجا آویزاں دیکھیں تو مجھے اندازہ ہوا۔ کہ میں یہاں کیوں آیا تھا۔

میں خود کو اذیت دینے آیا تھا۔

"یہ میرا بیٹا ہے۔ سعد رضوان شاہ۔"

اور جب ابو کے تعارف کرانے پہ سالار اعظم نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ تو میں نے یہی اذیت اس کے اندر بھی محسوس کی۔ خاص طور پر تب جب امی نے اس تعارف کو مزید تفصیل سے بیان کیا۔

"ہم ہانی اور اس کی بہت دوستی ہے۔ بچپن سے ہی۔ یوں سمجھو۔ ایک جان۔ دو قالب۔"

مجھے اس کے ہاتھ میں وہی خنکی محسوس ہوئی۔ جو اس کی نظروں میں تھی پھر اس نے صرف ایک لمحے کے لیے میرا ہاتھ چھوتے ہی فوراً" چھوڑ دیا۔ مگر ایک ناگوار سی شکن اس کے ماتھے پہ اگلے کئی لمحوں تک رہی۔ مجھے لگا۔ میرے آنے کا مقصد پورا ہو گیا۔ وہاں جتنی دیر سب موجود رہے۔ میں چپ تھا۔ اور واپسی کے سارے راستے بھی میں نے گفتگو میں بالکل کوئی دخل نہ دیا۔

"غضب خدا کا۔ اتنی بڑی عمر کا داماد چنا ہے آپ نے۔ میری تو زبان ہی من بھر کی ہو جاتی ہے اسے داماد کہتے ہوئے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو مجھ سے ایک آدھ برس کا ہی فرق ہو گا۔"

"اب ایسا بھی نہیں ہے مہ پارہ۔"

امی اس حد درجہ مبالغے پہ تلملا اٹھیں۔

"زیادہ سے زیادہ پینتیس برس کا ہو گا۔ مردوں کی، اسٹیبلش ہونے میں اتنی عمر تو ہو جاتی ہے۔"

"اتنی بھی نہیں ہوتی بھابھی۔ اور وہ پینتیس کا ہو پینتالیس کا۔ آپ یہ دیکھیں کہ ہانی کی عمر کیا ہے۔ کوئی دس گیارہ برس کا فرق ہو گا۔" ان سب سے لاتعلق میں گردن موڑے باہر تکتا رہا۔

"تو اتنا فرق عام ہے مہ پارہ۔ اور یہ بھی تو دیکھو۔ کہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ جب انہیں یہ فرق نظر نہیں آ رہا تو ہم کیا اعتراض کریں۔"

ابو کے کہنے کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ پھوپھو نے جھٹ دوسرا اعتراض داغ دیا۔

"اور مجھے تو مزاج کا بھی تیکھا لگا۔"

اس بار بھی ابو نے ہی ان کی تسلی کرانا چاہی۔ امی مسلسل منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھیں۔ شاید انہیں اندازہ تھا۔ کہ اگر وہ کچھ بولیں تو بہت خطرناک ہو گا اس لیے احتیاطاً" چپ تھیں۔

"سنجیدہ مزاج اور کم گو ہے اور کیا وہ ہنسی ٹھٹول کرتا تمہارے ساتھ۔ باادب ہے۔ اور مہذب۔"

میں جانتا تھا وہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ بہت سے سوال ہوں گے اس کے پاس۔ اور میں اس سے نہیں، اس کے سوالوں سے بچنے کے لیے پھر سے کمرے میں بند ہو گیا۔ خلاف امید آج رات دروازے پہ کوئی دستک نہ ہوئی۔ میں اس سے کترا ضرور رہا تھا۔ مگر یہ تھوڑا ہی چاہتا تھا کہ وہ میرے پیچھے

نہ آئے۔ مجھے نہ پکارے۔ بے شک میں نے اس کی صدا کا جواب نہ دینا تھا۔ مگر وہ پکارتی تو۔ بھلے میں نے دروازہ نہیں کھولنا تھا۔ مگر وہ دستک تو دیتی۔

اس بات نے میرے اندر طیش کو اور بھی بلاخیز کر دیا۔ اور وہ سارا طیش میں نے کھنڈر کی اس دیوار کے خالی حصے پہ نکال دیا۔ میری انگلیوں کی پوریں کوئلے سے سیاہ ہو رہی تھیں اور بدن پسینے سے شرابور جب مجھے اس کی آواز سنائی دی۔

"سعد"۔

میں پلٹ کے دیکھے بنا اپنا کام کرتا رہا۔ وہ میری پشت پہ کھڑی تھی اس لیے اب تک دیکھ نہیں پائی تھی کہ دیوار پہ کوئلے نے اپنی سیاہی سے کیا ابھارا ہے۔ آخر اس نے میرے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کے میرا رخ اپنی جانب موڑا۔

"شکر ہے۔ تم ملے تو۔" میں مڑا تو وہ سیاہی میری پشت پہ چھپ گئی۔ اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔

"مگر مجھے تم نہیں ملی۔"

"یہ لو۔ تمہارے سامنے ہی تو ہوں۔"

"جو سامنے ہوتے ہیں، وہ ساتھ نہیں ہوتے۔ سامنے ہونے اور ساتھ ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے ہنی۔"

"ایک تو تمہاری باتیں۔ بدھو۔ سمجھتے ہو ایسی الٹی سیدھی ہانک کے بڑے کوئی فلاسفر بن جاؤ گے۔ اچھا۔ تم نے مجھے بتایا نہیں۔ تمہیں سالار کیسے لگے؟"

"بتاؤں؟"

"ہاں ناں بتاؤ۔"

وہ بڑے اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔ میں دیوار کے آگے سے ہٹا۔ اور اس سے کوئلے سے بنا عکس اسے دکھایا۔

"ایسا۔"

میں نے بڑے بڑے دانتوں، سر پہ سینگ اور خوفناک آنکھوں والی شبیہ اسے دکھائی۔

"یہ کیا مذاق ہے سعد؟"

میں نے ہنی کو اتنا برہم کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"مذاق نہیں۔ یہ تمہارا سالار ہے۔ جن۔ خون چوسنے والا۔ جو ایک خوب صورت پری کو ہمیشہ کے لیے قید کرنے والا ہے۔"

"تمہارے بے ہودہ مذاق کبھی کبھی حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ کچھ تو تمیز کیا کرو سعد۔ اب بات مت کرنا مجھ سے؟"

وہ جو اتنے دن سے مجھے منا رہی تھی۔ اب خود خفا ہو کے چل دی۔

☼ ☼ ☼

وہ الجھ سی گئی تھی۔ اس کی ناراضی اس کا عجیب و غریب رویہ۔ یہ الٹی سیدھی حرکتیں کچھ بھی تو سمجھ نہ آ رہا تھا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو مہ پارہ۔ اب وہ پرانے ڈیزائن کے بھاری زیور کون پہنتا ہے؟"

بڑے کمرے میں مہ پارہ اور نائلہ شادی کی تیاریوں کا آغاز کیے بیٹھی تھیں۔ ایک ڈھیر لگا تھا سامنے۔

"روایت ہے حویلی کی بھابھی۔"

"اب روایتیں دیکھیں۔ یا بچی کی پسند۔ میں نئے زیور ہی بنواؤں گی اور سب ہانی کی پسند کے۔"

"تو ان پرانے زیورات کا کیا ہو گا؟"

مہ پارہ نے جڑاؤ کنگن اٹھا کے حسرت سے دیکھا۔

"وہ میں سعد کی دلہن کو دے دوں گی۔"

اور سامنے سے آتی ہانی کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔

"ہانی۔ ادھر آؤ بیٹا۔ تم سے پوچھنا تھا۔ ذرا یہ دیکھ کے بتانا تو۔ ان میں سے تمہیں کچھ۔"

اور پوچھتے پوچھتے وہ ٹھٹک کے رکیں۔ ہانی کے چہرے کی الجھن بہت واضح تھیں۔

"کیا ہوا بیٹا۔"

"نہیں۔ کچھ نہیں۔ بس۔ وہ سعد۔ وہ کچھ عجیب سا۔" وہ کیا بتاتی۔ جب خود ہی کچھ نہ جان پا رہی تھی۔

"ارے۔ تم سعد کی وجہ سے پریشان ہو۔ فکر مت

کروا ابھی ذہنی طور پر تیار نہیں ہے تم سے دور ہونے کے لیے۔ بچہ ہی تو ہے اور تم سے اتنا قریب بھی۔ تمہارے جانے کے خیال سے ہی چڑچڑا ہو گیا ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا آہستہ آہستہ۔"

بظاہر کوئی اور وجہ بھی نہیں تھی۔ اس لیے ام ہانی نے بھی اس تسلی سے دل کو بہلا لیا۔ اور مسکرا کے ان کے ہاتھ سے گلوبند لے کر دیکھنے لگی۔

"مگر یہ سعد ہے کہاں؟"

مہ پارہ نے پوچھا۔

☼ ☼ ☼

میری گاڑی کی بریک ٹھیک سالار اعظم کے گھر کے سامنے لگی تھی۔ میں اس سیاہ پتھروں کی عمارت کو پتھریلی آنکھوں سے ہی کچھ دیر تکتا رہا۔ پھر اندر بڑھا۔

"دل تو میرا ہی چاہ رہا ہے نوین۔ کہ تم اس شادی پہ ہوتیں۔ آخر اکلوتا بھائی ہے مگر اس حالت میں اتنا لمبا سفر۔ اللہ اللہ کر کے تو یہ دن آیا ہے تمہاری زندگی میں۔"

میں ملازمہ کی رہنمائی میں ہال تک پہنچا جہاں سالار کی والدہ کسی سے فون پہ بات کر رہی تھیں۔

"نہیں نہیں۔ میں رک نہیں سکتی۔ پہلے تو وہ مانتا ہی نہیں تھا شادی کے لیے۔ اب مانا ہے تو میں ایک دن کی تاخیر بھی نہیں چاہتی۔ اس کے مزاج کا کیا بھروسا۔"

پہلے ملازم اور پھر مجھ پہ نظر پڑی تو وہ چونکیں۔

"نوین۔ میں تمہیں کچھ دیر میں کال کرتی ہوں۔"

"بیگم صاحبہ۔ یہ آپ سے ملنے آئے ہیں۔" ان کے فون رکھتے ہی ملازم اپنا فریضہ ادا کر کے چلا گیا۔

"السلام علیکم۔ میں۔ سعد رضوان شاہ۔ کل آیا تھا آپ کے گھر۔ ام ہانی کا کزن۔"

☼ ☼ ☼

"سعد کون ہے؟"

سالار کے اچانک سوال پہ ام ہانی حیران رہ گئی۔ اس کے اتنے اصرار پر وہ اس سے ملنے آئی تھی اور اس نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"سعد... سعد ہے۔"

وہ بھولپن سے بولی۔

"آپ سعد کو نہیں جانتے" کل آیا تھا آپ کے ہاں؟"

"واقف ہوں۔ جانتا نہیں۔ بہت فرق ہے دونوں باتوں میں۔ سنا ہے تمہارا بہت اچھا دوست ہے۔ تمہاری زندگی میں اس کا ایک خاص مقام ہے۔"

"ہاں... ہے تو..." وہ مسکرائی۔

"اگر وہ اتنا اہم ہے تو میں اب تک اس بات سے انجان کیوں ہوں؟ مجھے تمہارے بارے میں ہر چھوٹی بڑی بات کا علم ہونا چاہیے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم نے کبھی اس کا ذکر تک نہیں کیا؟"

"آپ خود ہی تو منع کرتے ہیں"

وہ معصومیت سے گلہ کر بیٹھی۔

"کہ جب میں آپ کے ساتھ ہوں تو صرف آپ کی بات کروں۔ آپ کو برا جو لگتا ہے کہ میں کسی اور کا ذکر بھی نہ کروں آپ کے سامنے۔"

"ٹھیک ہے۔ اب نہیں ٹوکوں گا۔"

کچھ دیر تک اس کے چہرے کو ٹٹولتی نظروں سے دیکھتے رہنے کے بعد سالار نے کہا۔

"بتاؤ اس کے بارے میں۔ میں خود پوچھ رہا ہوں۔"

☼ ☼ ☼

"صرف کزن ہی نہیں۔ بچپن کی دوست ہے وہ میری۔ سب سے اچھی دوست۔ مجھے بہت عزیز ہے ہنی۔ اور میں اس کے ساتھ کچھ غلط ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔"

میں کسی ریکارڈ کی طرح ان کے سامنے بج رہا تھا۔

"اتنی پیاری بچی ہے ماشاء اللہ۔ خدا اس کے نصیب اچھے کرے۔ اس کے ساتھ کبھی کچھ برا نہیں ہو گا۔ ان شاء اللہ۔"

"ہونے تو جا رہا ہے۔ بلکہ ہو رہا ہے۔"

میں نے جی بھر کے تشویش ٹپکائی اپنے چہرے اور

لہجے سے۔ حسب توقع وہ چونک اٹھیں۔

"کیا مطلب؟"

"دراصل۔ میں آپ سے جو بات کرنے والا ہوں۔ وہ بہت نازک ہے۔ آپ کو حیرت بھی ہو گی اور شاید آپ کی رائے بھی میرے بارے میں بہت بری قائم ہو گی۔ لیکن... کیا کروں۔ بتائے بغیر بھی چارہ نہیں۔ میں انجام کی پروا کیے بغیر آپ سے یہ بات کہنے جا رہا ہوں۔"

"آخر بات کیا ہے بیٹا۔ مجھے اختلاج ہو رہا ہے۔ جلدی بتاؤ۔ کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"جی جی۔ بتانے والا ہوں۔ بتانے ہی تو آیا ہوں؟"

میں صوفے پہ تھوڑا آگے کو کھسکا۔

"لیکن پہلے آپ وعدہ کریں کہ اسے طریقے سے ہینڈل کریں گی۔ اور کسی پہ ظاہر نہیں ہونے دیں گی کہ میں نے یہ بات آپ کو بتائی ہے۔"

"اب تو تم مجھے خوف زدہ کر رہے ہو"

ان کے چہرے پہ باقاعدہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"نہیں۔ پہلے آپ وعدہ کیجیے۔ میرا نام کہیں نہیں آئے گا۔ بلکہ قسم کھائیے۔"

"اچھا بیٹا۔ وعدہ۔ مگر بتاؤ تو سہی۔"

وہ سخت بے چین تھیں۔ بلکہ میں نے کر ڈالا تھا۔

"نہیں وعدہ نہیں۔ قسم۔ اپنے بیٹے سالار کی قسم۔"

☼ ☼ ☼

"مجھے بس اتنا پتا ہے کہ وہ کبھی میرا برا چاہ ہی نہیں سکتا۔ پوری دنیا میں اگر کسی کو سب سے زیادہ میری پروا ہے تو وہ سعد ہے۔ سعد رضوان شاہ"

اس کے لہجے میں سچائیاں بول رہی تھیں۔ اور سالار کی پیشانی شکنوں سے پر ہوتی جا رہی تھی۔ اپنی دھن میں کہتی ہانی کو احساس تک نہ ہوا۔

"وہ مجھے خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ مجھے خوش رکھتا ہے مجھے خوشیاں دیتا ہے۔ میری خوشی کا دوسرا نام ہے سعد۔"

☼ ☼ ☼

"جیسا کہ آپ کو پتا ہے کہ ام ہانی کے پیرنٹس۔ میرے چچا' چچی گزر چکے ہیں۔ میرے امی ابو نے ہی اسے پالا ہے۔" بالآخر میں نے بتانا شروع کیا۔

"میں جانتی ہوں اور تمہاری والدہ نے اس کی بہت اچھی تربیت کی ہے۔"

"جی جی۔ اور ابو نے بھی پرورش میں کوئی کسر نہیں رہنے دی۔ مگر کسی کو محبت اور توجہ سے پال لینا اور بات ہے اور اس کے تمام حقوق پورے کرنا ایک الگ بات۔"

"حقوق؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"مجھے کہتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا۔ مگر دیکھیں ناں۔ بے شک میرے والدین ہی... پھر بھی... سچ تو سچ ہے۔"

انہیں ٹھیک ٹھاک ہراساں اور سراسیمہ کرنے کے بعد میں نے تمہید کو سمیٹا اور مدعے پہ آیا۔

"ساتھ تو سچائی اور انصاف کا دینا چاہیے۔ جیسے

دعائے مغفرت

ہماری رائٹر سعدیہ عزیز آفریدی کی والدہ قضائے الٰہی سے دار فانی کو الوداع کہہ گئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ہم سعدیہ عزیز آفریدی کے اس غم میں برابر کے شریک ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں۔ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

ندا حسنین

میں تم اور چاند رات

میں امی اور ابو کی اکلوتی اولاد ہوں ایسے ہی ام ہانی بھی اپنے پیرنٹس کی اکلوتی تھی۔ ان کی وفات کے بعد ان کا جو بھی ہے۔ اس کی واحد وارث۔۔۔ اور آپ کو اندازہ تو ہو گا کہ وہ سب کچھ کتنا ہو گا۔"

"وہ جو بھی ہے۔ جتنا بھی ہے۔ ام ہانی کا ہے۔ ہمیں اس سے کیا غرض۔ ہمارے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے؟"

وہ شاید برا مان گئی تھیں۔ اس لیے وضاحت دینے لگیں۔

"اور سالار تو یوں بھی بہت خوددار اور غیور ہے۔ وہ کبھی جاننا تک پسند نہیں کرے گا کہ ام ہانی کتنی جائیداد کی مالک ہے۔"

"وہ تو آپ کی نیک نیتی ہے۔ لیکن ضروری تو نہیں کہ سب کی نیت ہی ٹھیک ہو۔"

"کس کی بات کر رہے ہو بیٹا؟"

ان کے سوال پہ میں ایک لمحے کو جھجکا۔

"میں اپنے۔۔۔"

پھر اگلے ہی پل خود غرض ہو کے کہہ دیا۔

"اپنے ابو کی۔ وہ نہیں چاہتے کہ ام ہانی کو اس کے حصے کی پراپرٹی ملے۔"

☼ ☼ ☼

"وہ بہت سادہ ہے سالار۔ بہت معصوم" ام ہانی ایک بار سعد کے بارے میں بات کرنا شروع کر دے تو بھلا کون روک سکتا تھا اسے۔

"اپنی عمر سے کہیں کم ہے اس کی ذہنی عمر۔ اس کی عمر کے لڑکے اتنے تیز ہوتے ہیں۔ اور وہ سدھو۔"

وہ ہنس پڑی۔ سالار کو اس کی ہنسی سے وحشت سی ہوئی۔ اس نے سگریٹ یوں سلگائی جیسے اس کے ساتھ سعد کے غائبانہ ذکر کو بھی دھوئیں میں اڑانا چاہتا ہو۔

"بہت اچھا ہے دل کا۔ معصوم۔ بھولا بھالا۔ سچا۔ دھوکا دینا۔ جھوٹ بولنا۔ فریب کاری۔ یہ سب اسے نہیں آتا۔"

☼ ☼ ☼

وہ حیرت سے گوں گوں سے جا رہی تھیں اور میں فراٹے سے جھوٹ پہ جھوٹ بول رہا تھا۔ اپنے اس فن کا اندازہ مجھے آج ہوا تھا کہ میں کتنی اچھی کہانی گھڑ سکتا ہوں۔

"بس اب یہ معاملہ آپ کے سپرد ہے۔ آپ چاہیں تو ام ہانی کو اس کا حق مل سکتا ہے۔"

"بیٹا جو تم کہہ رہے ہو۔ وہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ تم سالار کو نہیں جانتے وہ کبھی بھی یہ بات نہیں کرے گا۔ بلکہ اگر میں نے اسے یہ مشورہ بھی دیا تو وہ بگڑ جائے گا۔"

"تو آپ ان سے بات نہ کریں۔ ڈائریکٹ میرے ابو سے۔ یہ نہیں آپ کی بات زور رکھتی ہے۔"

میری بات پہ وہ مزید گھبرا گئیں۔ بے چاری سادہ خاتون۔

"نہیں نہیں۔ یہ بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔ اور سالار کو علم ہوا تو وہ۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔"

"پلیز۔ پلیز۔ کچھ تو سوچیں۔ وہ ایک یتیم لڑکی ہے۔ اسے اس کے حق سے محروم رکھنے کا سوچا جا رہا ہے صرف اس لیے کہ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ آپ ہی یہ فریضہ ادا کر دیں۔ نیکی سمجھ کے ثواب ہی کما لیں۔"

مجھے لگا اس عمر میں سب کو آخرت سنوارنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے ہی وہ رضامند ہو جائیں۔

"میرے ابو اتنے برے انسان نہیں ہیں۔ بس پتا نہیں کیسے۔۔۔ ہو سکتا ہے کسی کے غلط مشورے پہ ان کے قدم ڈگمگا گئے ہیں۔۔۔ آپ صحیح مشورہ دیں تو سنبھل بھی سکتے ہیں اور یہ بھی ہے کہ بات کھل جانے کی شرمندگی میں باز بھی آجائیں گے۔ پلیز۔ مدد کر دیں ہنی کی۔ اور دیکھیں۔ آپ نے قسم کھائی ہے اپنے بیٹے کی۔ کہ آپ اس سارے معاملے میں میرا نام نہیں آنے دیں گی۔"

آخر کار میں ان سے بات منوا کے ہی وہاں سے اٹھا۔

☼ ☼

مغرب کی اذان فضا میں بلند ہوتے ہی رمضان کا آخری روزہ اپنی تمام تر رحمتوں اور برکتوں کو سمیٹ کر سب کو الوداع کہتا ہوا رخصت ہوا۔ چاند رات کی روایتی رونق ہر سو بکھر گئی۔ گھروں سے سویوں کی میٹھی میٹھی خوشبو میں آنے کا سلسلہ شروع ہوا تو' لڑکیوں نے اپنے نازک نازک ہاتھوں کو مہندی سے نقش و نگار بنا کر سجانا شروع کر دیا۔ فضاؤں میں مہندی کی مسحور کن خوشبو رچ بس گئی' لڑکیوں کی کھلکھلاہٹیں' چوڑیوں کی کھنک کی طرح کھنکنے لگیں۔ چاند رات مبارک کا شور اٹھا اور بازاروں میں رونق مزید دوچند ہو گئی اور اتنی خوب صورت و پر رونق رات میں وہ تنہا چھت پر کھڑی یک ٹک باریک سے چاند کو بادلوں کی اوڑھ سے جھانکتا دیکھ رہی تھی۔ اس کے خوب صورت چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ آوارہ لٹیں اس کے چہرے کے اردگرد اٹکھیلیاں کر رہی تھیں' جبکہ اس کی بڑی بڑی باوای آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

"نتاشا یہ زندگی کے تمام خوب صورت پلوں میں سے سب سے حسین پل ہے جو آج تم میری ہو گئیں۔" وہ گہری سیاہ آنکھیں اس کے حسین چہرے پر ٹکائے اس کے نازک سے ہاتھ کو تھامے انگوٹھی پہناتے ہوئے کہہ رہا تھا اور شرم سے اس کی گھنیری پلکیں جھک کر اسے مزید زیر کیے دے رہی تھیں۔

"اس بار چاند رات کو تمہارے ہاتھوں میں چوڑیاں میں پہناؤں گا۔" وہ شوخی سے بولا تھا۔

"اب یہ نہ کہنا کہ تمہارے ہاتھوں میں مہندی بھی لگاؤں گا۔" وہ اترا کر اسے چھیڑنے لگی۔

"نا! مہندی لگانا تو میرا کام نہیں۔ پر تمہیں قسم ہے میری کہ تم مہندی میرے نام کی لگاؤ گی۔" وہ بڑے مان سے اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ نظریں جھکائے شرگیں مسکراہٹ لبوں پر سجائے اقرار کر گئی۔

یادیں کسی فلم کی طرح اس کی نظروں کے سامنے چل رہی تھیں اور مزید چلتی رہتیں۔ اگر مدیحہ اسے آواز دے کر' اس کا گہرا ارتکاز توڑ کر یادوں کے جہاں سے واپس حال میں نہ لے آتیں۔

"نتاشا دیکھو روحی آئی ہے تمہیں مہندی لگانے' جلدی سے نیچے آکر مہندی لگوالو۔" مدیحہ اسے اطلاع دے کر واپس چلی گئیں۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا مہندی لگوانے کا۔ مگر دل کی خواہش کی داستان وہ صرف اپنے حد تک رکھنا چاہتی تھی۔ زمانے کو شریک داستان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ نا چاہتے ہوئے بھی وہ مرے مرے قدم اٹھاتی اندر روحی کے پاس آ گئی۔

"ارے نتاشا جلدی آؤ' ابھی مجھے اپنے گھر میں بھی اتنے کام ہیں۔ پر آنٹی نے کہا تھا کہ چاند دیکھتے ہی میری بیٹی کو مہندی لگانے آجانا۔ سو میں سب سے پہلے تمہیں مہندی لگانے حاضر ہو گئی۔" روحی اسے دیکھتے ہی اپنی جلدی آنے کی وجہ بتانے لگی۔ وہ ویسے بھی تفصیلی بات کرنے کی عادی تھی۔

"بیٹا' لڑکیوں کے ہاتھ مہندی سے سجے اچھے لگتے ہیں۔ مہندی کی خوشبو جب ان کے وجود کو اپنے حصار میں لے لیتی ہیں تو بڑا ہی الوہی سا رنگ ان کی شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ایسے میں لڑکیاں بڑی پیاری پیاری' خوشبوؤں میں بسی ہوئی من موہنی سی لگتی ہیں۔" مدیحہ کو مہندی لگانا خود بھی بے حد پسند تھا اور وہ نتاشا کے ہاتھ بھی ہمیشہ نہیں تو کم از کم تہواروں میں تو سجے دیکھنا چاہتی تھیں۔

"جاؤ نتاشا روحی کو اپنے کمرے میں لے جا کر مہندی لگواؤ۔" مدیحہ کے کہنے پر وہ روحی کو اپنے ساتھ کمرے میں لے آئی۔ روحی کافی دیر سے نتاشا کی خاموشی محسوس کر رہی تھی۔ کچھ دیر تک تو انتظار کرتی رہی' پھر بھی نتاشا کچھ نہ بولی تو خود ہی بول پڑی۔

"کیا بات ہے' تم اتنی چپ چپ کیوں ہو؟" روحی نے اس کی بچپن کی عزیز ترین سہیلی تھی۔ اس کے پوچھتے ہی کب سے ضبط کیے آنسو ٹپ ٹپ نتاشا کی ہتھیلی پر گرنے لگے۔

"ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ رو کیوں رہی ہو؟ کیا ہوا ہے' آخر کچھ بتاؤ تو۔" روحی بے تابی سے اس کے آنسو صاف کرتے پوچھنے لگی۔

"شامیر۔۔۔" ڈبڈبائی آنکھیں' بھیگا لہجہ' وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی اور روحی سمجھ گئی۔

"لڑائی ہوئی ہے شامیر بھائی سے۔" اس کے پوچھنے پر نتاشا نے معصومیت سے سر ہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

وہ کتنی دیر سے کمرے میں اندھیرا کیے آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ در حقیقت یہ ماحول اس نے اس سنگ دل لڑکی کو بھلانے کے لیے بنایا تھا۔ پر ہزار ناراضی کے باوجود آنکھیں موندتے ہی وہ چھم سے اس کے سامنے حاضر ہو گئی۔

"اس انگوٹھی پر کون سا طلسم پڑھ کر پھونکا ہے۔ جب سے پہنی ہے دل تمہارے علاوہ کسی کی سنتا ہی نہیں۔" وہ آنکھیں معصومیت سے پٹپٹاتے ہوئے اس کے دل کے تار چھیڑ رہی تھی۔

"میں اس عید پر تمہارے نام کی مہندی لگاؤں گی۔ تم میرے لیے اس عید پر کیا خاص کرو گے۔"

"تمہارے نام کی عیدی لے کر آؤں گا۔" اس نے گہری نظروں سے اسے مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا۔

"بس عیدی۔۔۔" وہ مطمئن نہ ہوئی تھی' فقط عیدی سے۔

"شامیر بیٹا۔۔۔ آج چاند رات ہے اور تم منہ لپیٹے پڑے ہو۔۔۔ اور یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے اپنی۔" شگفتہ کمرے کی بتی روشن کرتی ہوئی اندر داخل ہوتے ہوئے بولیں۔

"کچھ نہیں امی۔۔۔ بس ایسے ہی تھک گیا تھا ذرا۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولا تو وہ بھی اس کے پاس آ بیٹھیں۔

"دیکھو بیٹا! اگر تم دونوں میں جھگڑا ہو بھی گیا ہے تو ختم کرو' صلح صفائی کرو۔ یہ کیا خود بھی سکون میں نہیں اور اسے بھی ستا رہے ہو۔" وہ شفقت سے اس کے بال سہلاتے ہوئے بولیں۔

"امی جن سے بے انتہا محبت ہوتی ہے ان سے کچھ امیدیں بھی وابستہ ہو جاتی ہیں اور جب وہ امیدوں پر پورا نہ اترے تو دل تو برا ہوتا ہے نا۔" وہ سر جھکائے دھیمے لہجے میں بولا۔

"بیٹا! امیدیں تو ٹوٹتی بندھتی رہتی ہیں انسانوں سے۔ امیدوں کو پورا کرنے والی واحد ذات تو صرف اللہ کی ہے۔ بھلا انسان کہاں اتنا بااختیار کہ خود سے وابستہ توقعات پوری کر سکے۔" وہ شامیر کو سمجھاتے ہوئے پل بھر کو خاموش ہو ئیں۔ ایک گہری نظر بیٹے کے چہرے پر ڈالی اور پھر سے کہنے لگیں۔

"میں نہیں جانتی تم دونوں کا کس بات پر جھگڑا ہوا ہے۔ پر محبت کرنا آسان اور نبھانا مشکل ہے۔ ایک دوسرے کے جذبات کو سمجھ کر' غلطیوں کو نظرانداز کرنا پڑتا ہے۔ تب محبت کی گاڑی آگے چلتی ہے۔ ورنہ وہیں رکی رہ جاتی ہے۔ محبت ایک دوسرے کو منوا کر اپنا آپ منواتی ہے۔ نتاشا سے جو بھی غلطی ہو گئی اس غلطی کو دور کرو' بجائے اس کے کہ خود ایک دوسرے سے دور ہو جاؤ۔"

شامیر نے اپنی پسند سے نتاشا سے منگنی کی تھی۔ وہ اس کی کلاس فیلو تھی۔ شگفتہ کو بیٹے کی اس پسند پر ذرا بھی اعتراض نہ تھا۔ وہ ان ماؤں میں سے تھیں جو اولاد کی خوشی میں خوش رہتیں۔ انہیں اپنے بچوں کی خوشیاں بے حد عزیز تھیں۔ اسی لیے بنا وجہ جانے بھی صلح کروانا چاہ رہی تھیں۔

"جی امی۔۔۔ آپ فکر نہ کریں' میں جھگڑا ختم کر دوں گا۔" وہ محبت سے ماں کا ہاتھ تھامتا ہوا بولا۔ جہاں ماں کی قدر دل ہی دل میں مزید بڑھ گئی۔ وہیں نتاشا کی بے جا ضد پر افسوس بھی ہوا۔ مگر وہ دوریاں بڑھانا نہیں' گھٹانا چاہتا تھا۔ وہ دو اہم اور مقدس رشتوں کی ڈوریوں کو سنبھالنے والا تھا۔ یہ اس کا فرض تھا کہ دونوں رشتوں کی ڈوریوں کو' بنا الجھائے اپنے گرد محبت اور اعتبار سے باندھے رکھے۔

"کیسے فکر نہ کروں۔ تم نے تو ناراضی میں عیدی لے جانے سے بھی منع کر دیا۔ مدیحہ بہن بھی کیا سوچیں گی کہ بچی کی پہلی عیدی بھی لے کر نہیں آئیں۔ آج کل کے بچے بھی عجیب ہیں۔ دماغ پھرتے دیر نہیں لگتی۔ معاملے کی نزاکت کو سمجھے بنا بس اپنی مرضی کیے جاتے ہیں۔" شگفتہ اسے احساس دلاتے ہوئے خود بھی پریشان ہو رہی تھیں۔

"آپ فکر نہ کریں امی' میں خود بات کر لوں گا نتاشا کے گھر والوں سے' کوئی بدمزگی نہیں ہو گی۔" وہ انہیں یقین دلانے والے انداز میں مطمئن کر رہا تھا۔

"تم کیا بات کرو گے صاحب زادے' میں سارے انتظامات مکمل کر آئیں ہوں۔ بس ابھی ہم نتاشا کے گھر عیدی لے کر جا رہے ہیں۔" شگفتہ نے شامیر کے سر پر ایک پیار بھری چپت رسید کرتے ہوئے کہا' تو اسے بے ساختہ ماں پر پیار آگیا۔ شگفتہ کے کمرے سے جانے کے بعد وہ موبائل چیک کرنے لگا۔ تمام دوست احباب کے' چاند رات کی مبارک کے میسج تھے۔ بس اس سنگ دل لڑکی کے ہی نہیں تھے۔

"بے وفا۔۔۔" وہ بڑبڑاتا ہوا بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے کوئی جھگڑا نہیں کیا' بس اتنا کہا تھا شامیر سے کہ اپنی عیدی کی تیاری میں خود کروں گی۔ تم مجھے خود شاپنگ کروانا اور پھر وہ تمام چیزیں آنٹی کو جا کر دے دینا۔ بس اتنی سی بات کہی تھی جس پر شامیر بھڑک گیا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم غلط مطالبہ کر رہی ہو۔ تب میں نے بھی کہہ دیا کہ ٹھیک ہے' پھر میرے گھر عیدی لے کر مت آنا۔

روحی میں نے تو غصے میں کہا تھا۔ اتنا بھی نہ سمجھا وہ۔۔۔ سچ میں عیدی لے کر نہیں آیا۔ عیدی تو چھوڑو ایک میسج تک نہیں کیا اس نے' اتنی سی بات پر کتنا بدل گیا وہ روحی۔" وہ زمانے بھر کی معصومیت چہرے پر سجا کر بول رہی تھی۔

"اتنی سی بات۔۔۔ تمہیں یہ اتنی سی بات لگ رہی ہے نتاشا۔۔۔ تمہیں اب بھی احساس نہ ہوا کہ تم نے کتنی نازیبا اور بیچ بات کہی ہے۔ ہمارے معاشرے میں اگر ایسے مطالبات لڑکے والوں کی طرف سے ہوں تو انہیں لالچی کہا جاتا ہے اور تم دھڑلے سے جو اس طرح کے مطالبات کر رہی ہو۔ اک پل کو بھی سوچا کہ شامیر تمہارے بارے میں کیا سوچے گا۔" روحی غصے سے دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس نادان لڑکی کا سر پھوڑ ڈالے۔

"روحی میں نے ایسی کوئی معیوب بات بھی نہیں کی جو تم اتنا غصہ کر رہی ہو۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ اب لڑکیاں اس طرح کی شاپنگ خود ہی کرتی ہیں۔" نتاشا اب بھی اپنی ضد کو صحیح مان رہی تھی۔

"زمانہ جتنا بھی بدل جائے' لڑکیوں کے اندر سے شرم و حیا ختم نہیں ہونی چاہیے۔" مدیحہ کی آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔ وہ کب دروازے پر آ کھڑی ہو ئیں ان دونوں کو خبر ہی نہ ہو سکی۔

"امی۔۔۔ وہ۔۔۔" ماں کو سامنے دیکھ کر نتاشا گڑبڑا گئی۔ اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی مدیحہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اوپر سے مجھے ہوا بھی نہ لگنے دی ان تمام باتوں کی۔۔۔ میں تو دل ہی دل میں شگفتہ بہن کو کتنی بار برا بھلا کہہ چکی ہوں کہ میری بیٹی کی خوشیوں کی پروا نہیں۔ مجھے کیا خبر کہ میری بیٹی خود ہی اپنی کم عقلی کے ہاتھوں اپنی خوشیاں برباد کرنے پر تلی ہوئی ہے۔

"دیکھو بیٹا! یہ عیدی شادی سے پہلے ہی لڑکیوں کے سسرال سے آتی ہے۔ یہ ایک طرح سے لڑکیوں کے لیے سسرال کی طرف سے تحفہ ہوتا ہے۔ شادی کے بعد تو ساری زندگی تم نے خود ہی شاپنگ کرنی ہے' تو اچھی بات یہ ہے کہ تم اس تحفہ کی' خلوص کی' قدر کرنا سیکھو کہ کل سسرال میں تمہاری بھی قدر ہو۔ تمہیں شامیر سے ایسی بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ تم نے تو اس کے سامنے میرا سر ہی جھکا دیا۔ مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی نتاشا۔" مدیحہ نے نتاشا کو غصے سے گھورتے ہوئے کہا تو نتاشا کو بھی کچھ کچھ اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔

"ٹھیک ہے امی میں مانتی ہوں مجھ سے غلطی ہوئی۔ مگر شامیر کو بھی تو یوں لاتعلق نہیں ہو جانا چاہیے نا۔" غلطی کے احساس کے بعد اب اسے شامیر کی ناراضی سے ڈر لگ رہا تھا۔

"واہ بیٹی! ایک تو تم حق بھی دوسروں کا چھینو اور بھی توقع کرو کہ وہ احتجاج بھی نہ کرے۔ تم نے معذرت کی اس سے۔" مدیحہ نے اسے ٹھیک ٹھاک شرمندہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں... میں نے تو بات بھی نہیں کی۔" وہ شرمندگی سے بولی تو مدیحہ بھی کچھ نرم پڑیں۔

"چلو پہلے مہندی لگوالو... پھر اپنی ساس کو کال کر کے چاند کی مبارک باد دے دینا۔" وہ اسے راستہ سمجھاتے ہوئے بولیں، تو نتاشا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

روحی اسے مہندی لگانے لگی اور اسے شامیر کی فکر ستانے لگی۔ وہ اس سے شدید ناراض تھا۔ تب ہی چاند رات کی مبارک باد تک کا پیغام تک نہ بھیجا۔ اسے شامیر کو منانا چاہیے۔ اتنے خوب صورت موقع پر روٹھنا اچھی بات نہیں۔ مہندی کب لگی اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ روحی نے اس کی ہتھیلیوں کے عین وسط میں اس کا اور شامیر کا نام بڑی خوب صورتی سے لکھا تھا۔ وہ اپنی مہندی سکھانے کی غرض سے چھت پر آ گئی۔ گہرے سرمئی آسمان پر باریک سا چاند اس وقت بادلوں کے پیچھے جا چھپا تھا۔ اس کی مدھم مدھم سی روشنی بادلوں سے چھن کر پورے عالم کو روشن کر رہی تھی۔

"چاند رات اور تمہارا ساتھ، میرے لیے اس سے بڑھ کر عید کا تحفہ اور کیا ہو گا۔" ماضی سے جھکتی ہوئی آواز، یاد بن کر اس کے چہرے پر اداسی بکھیر گئی۔

"اف یہ مہندی جلدی سے خشک ہو تو میں اس دشمن جان کو میسج کروں۔" وہ ایک نظر گیلی مہندی پر ڈال کر جھنجلائی۔

"دشمن جان خود حاضر ہے آپ کے پاس، جو پیغام دینا ہے بالواسطہ دیجیے دشمن جان کی جان۔" اس بار آواز ماضی سے نہیں بلکہ اس کے پیچھے سے آئی تھی۔ وہ جھٹکے سے مڑ کر پیچھے دیکھنے لگی۔ وہ سینے پہ ہاتھ باندھے بالکل اس کے نزدیک کھڑا ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم... تم یہاں کیسے آئے؟" وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔

"اپنے ان توانا پیروں سے، چھت تک آتی ان سیڑھیوں سے خراماں خراماں چڑھتے ہوئے یہاں تک پہنچا۔" وہ اس کے چہرے کو اپنی خواب ناک نگاہوں سے ٹٹول رہا تھا کہ اس کے یہاں آنے کی خوشی اس کے چہرے پر جھلک رہی ہے یا نہیں۔ پر برا ہوا ان ٹھنڈی ٹھنڈی اٹھکیلیاں کرتی ہواؤں کا جو اس کی آوارہ لٹوں کو اس کے دلکش چہرے کی چوکیداری پر لگا کر اب شامیر کی جھنجلاہٹ کے مزے لے رہی تھیں۔

"نہیں... تم تو مجھ سے ناراض تھے نا، چاند رات کی مبارک باد تک نہیں دی۔ اب کیوں آئے ہو؟" اب جب وہ خود ہی مان کر واپس آگیا تو تھوڑے نخرے دکھانا تو بنتا ہے نا۔

"ٹھیک ہے چلا جاتا ہوں پھر۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے واپس جانے کو مڑا تو نتاشا نے بے ساختہ اسے آواز دے ڈالی۔

"شامیر...!"

"ہوںہہ... کہو۔" وہ جیسے منتظر تھا اس کی پکار کا۔ فوراً اس کے نزدیک آکر بولا۔

"آئی ایم سوری! میں نے غلط مطالبہ کیا تھا۔ مجھے احساس ہو گیا ہے اس بات کا۔" وہ نظریں جھکائے بول رہی تھی۔ چہرے پر آوارہ لٹوں کی چھیڑ چھاڑ اسے بار بار تنگ کر رہی تھیں۔ پر ہاتھوں میں لگی مہندی کے باعث وہ انہیں ہٹا بھی نہیں پا رہی تھی۔ شامیر نے اس کی الجھن محسوس کرتے ہوئے اس کی لٹوں کو چہرے سے ہٹا کر کان کے پیچھے کیا اور کہنے لگا۔

"اچھی بات ہے کہ تمہیں احساس ہو گیا۔ پر اب کوئی فائدہ نہیں۔ عیدی تو تمہاری اب آ نہیں سکتی۔ اب اگلے سال اپنی خواہش کے مطابق تم خود ہی عیدی کی تیاری کرنا۔" وہ اسے بڑے پیار سے شرمندہ کر رہا تھا۔

"جھوٹے کہیں کے... بڑے وعدے کیے تھے چاند رات کو چوڑیاں پہناؤں گا۔" وہ اسے خفگی سے کہتی ہوئی منہ موڑے کھڑی تھی۔

"میری کیا غلطی اس میں، میں تو لایا تھا سب کچھ، تم ہی نے منع کیا تھا کہ نہیں میں خود جا کر خریدوں گی، ورنہ نہیں چاہیے۔" وہ بمشکل اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے اس کی نقل اتارتا ہوا بولا۔

"تو تا سمجھی میں کہہ دیا تھا۔ اتنا دل پر لینے کی کیا ضرورت تھی۔ بہت برے ہو تم۔" وہ پلکیں جھپک کر اپنے آنسوؤں کو اندر دھکیلتے ہوئے بولی تو شامیر کو اس پر بے ساختہ پیار آیا۔ سو مزید ستانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

"اچھا اپنی مہندی دکھاؤ مجھے۔" اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیوں دکھاؤں۔" نتاشا نے اپنے دونوں ہاتھوں کو پیچھے کرتے ہوئے تنک کر کہا۔

"آپ دونوں ہمیشہ لڑتے رہیں گے یا نیچے بھی چلیں گے۔ سب نیچے کب سے آپ لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں۔" نتاشا کی چھوٹی بہن سدرہ نے اچانک انٹری مار کر دھاڑ لگائی۔

"آ رہے ہیں... آ رہے ہیں۔" وہ دونوں آگے پیچھے اتر کر نیچے آئے۔ نیچے کا منظر الگ ہی داستان سنا رہا تھا۔ شگفتہ پھولوں کے کنگن، مٹھائی کے ٹوکرے اور خوب صورت گفٹس کے پیکٹس بڑی خوب صورتی سے میز پر سجائے منتظر تھیں۔ اسے کمرے میں آتا دیکھ کر بڑی محبت سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ ان کی محبت پر شرمساری ان کے گلے لگ گئی۔

"میں نے تو اپنی بیٹی کی عیدی کی تیاری رمضان کے شروع روزے میں ہی کر لی تھی۔ پر یہ شامیر ہی وقت نکال نہیں پا رہا تھا عیدی لے کر آنے کا۔ آج تو بس میں نے کہہ دیا تمہیں نہیں جانا ہے تو بھلے نہ جاؤ، میں تو جا رہی ہوں اپنی بیٹی کے گھر۔" شگفتہ نے پیار سے اس کے مہندی لگے ہاتھوں میں پھولوں کے کنگن پہناتے ہوئے کہا تو وہ دل ہی دل میں خود کو کوسنے لگی۔ کہ کیا ضرورت پڑی تھی عیدی میں رخنہ ڈالنے کی۔ خود خریداری کر کے وہ ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی شے خرید لیتی، مگر وہ محبت تو نہیں پا سکتی جو اس کی ساس کے دل میں اس کے لیے تھی۔ اس نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر شامیر کو دیکھا۔ وہ اس کی ہتھیلی پر سجے اپنے نام کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس نے نظریں واپس جھکا لیں۔ ایک خوب صورت سی مسکان اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

مدیحہ نے اپنے داماد کو مسکراتا دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا اور دل ہی دل میں اس کی دانش مندی کی داد دی۔ اس نے نتاشا کی بے وقوفی اپنی ماں سے چھپا کر نتاشا کو اس کی غلطی کا احساس بھی دلا دیا تھا اور ماں کا دل دکھنے سے بھی بچا لیا تھا۔

شگفتہ لاکھ محبت کرنے والی خاتون سہی پر اگر انہیں نتاشا کی ضد کے بارے میں معلوم ہوتا تو لازمی طور پر دکھ ہوتا اور سب ٹھیک ہو جانے کے بعد بھی ان کے دل میں بال ضرور آ جاتا۔ جو یقیناً آگے جا کر کہیں نہ کہیں ساس بہو کے رشتے پر اثر انداز ضرور ہوتا۔ وہ صدقے واری جاتے اپنے داماد کو دیکھ رہی تھیں۔ جو شگفتہ کی پیار بھری چھیڑ چھاڑ سے لطف اندوز ہوتا شرماتی ہوئی نتاشا کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- صدف اور جیا
میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافر ---------- موسیٰ رضا

تنزیلہ ریاض

راپنزل

"راپنزل راپنزل اپنے بال بکھراؤ۔ تاکہ میں ان کے ذریعے تم تک آؤں۔"
شہزادے نے با آواز بلند صدا لگائی تاکہ راپنزل اس کو سن کر اپنے بال قلعے کی کھڑکی سے نیچے پھینک دے۔
اس نے اپنی سات سالہ بیٹی کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے کہا تھا۔ وہ اسے راپنزل کی کہانی سنا رہا تھا۔ مہر کا انہماک دیدنی تھا۔ اسے کہانیاں سننے کا بے حد شوق تھا' اس لیے وہ اپنے پاپا سے روزانہ ایک کہانی ضرور سنتی تھی۔ یہ کہانیاں عام طور پر بہادر اور نڈر انسانوں کی زندگی پر مشتمل ہوتی تھیں۔ یہ پہلی بار تھا کہ پاپا اسے کسی ایسی لڑکی کی کہانی سنا رہے تھے جو وقت گزرنے پر "شہزادی" بن جاتی۔ مہر کو اس کہانی میں بے پناہ دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ اسکول کے فینسی ڈریس شو میں وہ اس بار شہزادی راپنزل بننے والی تھی اور اس لیے اس نے پاپا سے خاص طور پر فرمائش کی تھی کہ وہ اسے یہ کہانی سنائیں۔
"کیا راپنزل کے بال اتنے لمبے اور مضبوط تھے؟" مہر نے انہیں ٹوک کر پوچھا تھا۔ اسے اپنی عمر کے مطابق اسی طرح سوال پوچھنے کی عادت تھی۔

"ہاں۔۔۔ بہت مضبوط۔ تب ہی تو ان کی مدد سے شہزادہ اس تک پہنچا تھا۔ اس قلعے میں نہ کوئی سیڑھیاں تھی نہ دروازہ۔ راپنزل کے بال' وہ واحد ذریعہ تھا جو راپنزل کا رابطہ بیرونی دنیا سے قائم کرنے میں اس کی مدد کرتے تھے۔ وہ یقیناً" بہت مضبوط تھے۔"

"اچھا۔ پھر کیا ہوا۔۔۔؟" مہر کو مزید سننے کی بھی جلدی تھی۔

"شہزادہ ہر روز اسی طرح قلعے کے نیچے آکر کھڑا ہو جاتا۔ راپنزل اپنے بال نیچے کی جانب پھینکتی اور شہزادہ اوپر آجاتا۔ وہ اسے باہر کی دنیا کی دلچسپ باتیں بتاتا کہ باہر کی دنیا کتنی خوب صورت ہے۔ وہاں رنگ ہی رنگ ہیں۔۔۔ بھانت بھانت کے لوگ ہیں۔۔۔ مزے مزے کے کھانے ہیں۔ راپنزل سب باتیں سنتی اور اس کا اشتیاق بڑھتا جاتا۔ دھیرے دھیرے وہ اپنی محدود زندگی سے اکتانے لگی اور پھر ایک دن بوڑھی کبڑی جادوگرنی کو شہزادے کے متعلق پتا چل گیا۔" اس نے آواز کو پراسرار بناتے ہوئے کہا۔ مہر کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔

"پھر کیا ہوا پاپا۔ کیا جادوگرنی نے راپنزل کو مارا۔۔ کیا وہ راپنزل سے بہت ناراض ہوئی۔ کیا اسے بہت برا لگا۔۔۔؟"

مہر نے پوچھا تھا۔ وہ کہانی سناتا سناتا ایک دم چپ سا ہو گیا۔ اسے کچھ یاد آیا تھا۔ اس نے یہ کہانی ایک بار پہلے بھی کسی کو سنائی تھی۔ اسے' رات کے پچھلے پہر کسی بھولی بھٹکی یاد نے آستایا تھا۔ ایک پرانی سنی ہوئی غزل کی طرح جس کا کوئی مصرع ذہن میں اچانک ہی گونجنے لگے' مگر یہ یاد نہ آئے کہ یہ غزل سنی کہاں تھی' کب تھی اور اگلا مصرع کیا تھا۔

"اسے برا یہ نہیں لگا کہ شہزادہ اسی طریقے سے راپنزل تک کیوں پہنچا جس طریقے سے وہ پہنچا کرتا تھا بلکہ اسے یہ برا لگا کہ راپنزل نے اس کی مرضی کے بغیر شہزادے کو قلعے میں آنے کیوں دیا۔ وہ شہزادی سے ناراض بھی ہوئی اور سزا کے طور پر اس کے بال کاٹ دیے۔"

"پھر پاپا۔۔؟" مہر ٹوکتی ضرور تھی۔

"جب شہزادہ دوبارہ راپنزل سے ملنے قلعے تک آیا اور اسے اپنے بال نیچے ڈالنے کے لیے کہا تو جادوگرنی نے وہی کٹے ہوئے بال نیچے پھینک کر شہزادے کو اوپر بلوالیا۔"

وہ رک رک کر کہانی سناتا تھا اور ساتھ ہی مہر کے چہرے کے تاثرات بھی دیکھتا رہتا تھا' کہ آیا اسے سمجھ بھی آرہی ہے کہانی یا نہیں۔ وہ اس مقام تک پہنچا تھا کہ سائیڈ ٹیبل پر پڑے سیل کی بیپ بجی۔ اس نے مہر کو لیٹے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے فون اٹھایا تھا۔

"تمہارا ہی ذکر چل رہا تھا۔" اس نے کہا تھا۔ دوسری جانب سے حیران کن آواز سنائی دی۔

"میرا ذکر۔۔۔ اس وقت۔۔۔ تم دونوں مجھے مل کر بددعائیں دے رہے تھے۔؟"

"نہیں۔ میں مہر کو راپنزل کی کہانی سنا رہا تھا۔ تو مجھے تم یاد آگئیں" وہ بشاشت سے بولا۔

"میں۔۔۔؟ راپنزل کی کہانی میں۔۔۔؟" وہ حیران نہیں تھی اور وہ جانتا تھا کہ وہ حیران نہیں ہوگی کیونکہ وہ اس کے سامنے بھی اسے راپنزل کہہ چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

"السلام علیکم امی"

اس نے گھر کے اندر داخل ہو کر جو فریضہ سرانجام نہیں دیا تھا' وہی فریضہ لاؤنج میں داخل ہو کر با آواز بلند پورا کیا تھا۔ سارا زور لفظ "امی" تھا۔ امی وہیں دیوان پر بیٹھی کچھ ادھڑنے سینے میں مصروف تھیں۔ انہوں نے وعلیکم السلام تو کہا لیکن ساتھ ہی گھرک کر اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا تھا۔ اس نے اگر ان کی آنکھوں کا حکم

مانا سیکھا ہوتا تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ وہ اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گئی پھر اپنے پاؤں سے موزے اتارتے ہوئے پاؤں بھی اوپر کرکے گردن پیچھے کی جانب لٹکالی۔

"آج تو بہت گرمی ہے قسم سے۔۔۔ ایسا لگتا ہے ہم انسان نہیں بھنے ہوئے مرغ ہیں۔"

اس کا مخاطب ابھی بھی امی ہی تھیں جبکہ وہ مسلسل اسے اشارے کرنے میں مصروف تھیں۔

"اسے پانی وانی پلاؤ حلیمہ۔ کتنا تھک کر آئی ہے۔ واقعی بہت گرمی ہے باہر۔ لیمونیڈ بنادو۔ گرمی میں اچھی ہوتی ہے۔"

ابا نے اس کی بدتمیزی کو بالکل نظرانداز کرتے ہوئے اخبار سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے کوئی جواب دیا نہ ان کی جانب دیکھا۔

"لیموں ختم ہو گئے ہیں۔" امی تنک کر بولی تھیں گویا اس کی خدمت کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"اچھا۔ چلو میں سلیم سے پکڑ لاتا ہوں۔"

ابا فوراً" اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ امی نے سخت تاسف بھرے انداز میں اسے دیکھا۔ وہ ایسے بیٹھی تھی جیسے کسی ملک کی شہزادی ہو۔ ابا کو کسی غریب رشتہ دار کی طرح نظرانداز کیے رکھنا اس کا مشغلہ تھا۔

"کوئی ضرورت نہیں اتنی سیڑھیاں اترنے کی۔۔۔ پانی بھی اچھا ہوتا ہے گرمی میں۔۔۔ جاؤ نینا پانی پیو اٹھ کر۔ پانی نہیں پینا تو روح افزا بنالو۔۔۔ موجود ہے گھر میں۔۔۔ آپ بیٹھ جائیے۔"

امی نے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔ لہجے میں کوئی رعایت نہیں تھی۔ اس کے چہرے تاثرات' امی کے انداز پر مزید برہم ہوئے تھے۔

"میرا بھی دل چاہ رہا تھا۔۔۔ کوئی ٹھنڈی چیز پینے کو۔۔۔ ایسا کرو ہم دونوں باپ بیٹی کے لیے روح افزا بنادو" ابا کے لہجے میں محبت ٹپک رہی تھی۔

"اٹھو نینا۔ اپنے اور ابا کے لیے شربت بنالاؤ" امی اسی انداز میں بولی تھیں۔

"معاف کیجیے گا مجھے نہیں پینا کوئی لال شربت۔۔۔" وہ چڑ کر بولی تھی۔

"نہیں پینا تو نا سہی۔۔۔ بھاڑ میں جاؤ۔۔۔ بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے۔" امی اس کے انداز سے سخت جز بز ہو رہی تھیں جبکہ اسے کوئی پروا نہیں تھی' انہوں نے ترپائی مکمل کرکے دھاگا منہ سے توڑتے ہوئے سارا غصہ دھاگے پر نکالا' ورنہ دل تو چاہ رہا تھا اس کو تھپڑ جڑ ہی دیں۔

"میں نے کب کہا ہے آپ سے کہ مجھ سے بھلائی کریں۔۔۔ میں نے کچھ مانگا تو نہیں ہے آپ سے۔ جو آپ بولنا شروع ہو گئی ہیں۔۔۔ نہیں پینا مجھے پانی۔۔۔ کوئی زبردستی ہے کیا۔" وہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔

"معاف کردو بی بی' غلطی ہو گئی ہم سے۔۔۔ مت پیو پانی۔۔۔ جاؤ یہاں سے اور تمہارے لیے یہی اچھا ہے کہ تم اپنا غصہ پیتی رہو۔"

امی نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا تھا۔ ابا کے سامنے اس کے یہ انداز انہیں پریشان تو کرتے ہی تھے' غصہ بھی دلا دیتے تھے۔

"مجھے تو بس دیکھتے ہی آپ غصہ کرنے لگا کریں آپ' جیسے میں قرض مانگنے آگئی ہوں۔ ایک منٹ سکون سے نہیں بیٹھ سکتا کوئی یہاں"

وہ تنک کر اٹھی تھی اور اپنا بیگ اٹھا کر دھپ دھپ کرتی اپنے کمرے کی جانب چل دی تھی۔ موزے اور جوتے وہیں پڑے رہ گئے تھے۔

"مت ڈانٹا کرو۔" ابا نے دھیمی سی آواز میں انہیں سمجھانا چاہا تھا۔ امی نے اپنے دل کا بوجھل پن چھپا کر انہیں

دیکھا پھر سابقہ انداز میں بولیں۔
"ایسا کیا کہہ دیا میں نے۔ آپ کے سامنے ہی ہے۔ پانی پینے کو ہی تو بولا تھا۔ بس شروع ہو گئیں محترمہ۔ اتنا بھی کیا نخرا ہوا کہ خود اٹھ کر پانی بھی نہیں پی سکتیں۔ اس نے عادت ہی بنالی ہے۔ ہر وقت مزاج سوا نیزے پر۔ سمجھ جائے گی۔ بچی ہے" ابا ابھی بھی اس کی حمایت کر رہے تھے۔ اب کی بار تو امی کو بہت ہی افسوس ہوا۔
"بچی ہی تو نہیں ہے۔ بڑی ہو گئی ہے۔" وہ یہی کہہ سکی تھیں۔ ابا کچھ نہیں بولے۔

☼ ☼ ☼

"سلیم بھائی سوجی ہے؟"
خاکی یونیفارم میں ملبوس دس بارہ سال کے بچے نے کاؤنٹر کے پیچھے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ ایک ڈیڑھ کا وقت تھا۔ اس ٹائم دکان پر رش کم ہوتا تھا۔ سارے محلے کی خالائیں' باجیاں سلیم کی دکان سے روزمرہ کے مرچ مسالے۔ چاول سبزی جیسی چیزیں لے کر اور اس کے سامنے اپنے دکھڑے رو کر' اب اپنے اپنے باورچی خانوں میں دالیں بھگارنے میں مصروف تھیں۔ گرمیوں کی دوپہروں کا یہ عالم اسے بڑا پسند تھا۔ اس وقت ایک آدھ گاہک ہی آتا تھا اور وہ بھی چھوٹی موٹی چیز کا خواہش مند ہوتا تھا۔ انہیں تو وہ چٹکی بجاتے مطلوبہ سامان فراہم کر دیتا تھا۔ اس لیے ابھی بھی وہ آرام سے ہاتھ میں قلم تھامے اور کلپ بورڈ پر کاغذ سجائے کچھ لکھنے میں مصروف تھا جب اسے پکارا گیا۔ اس نے کلپ بورڈ سائیڈ پر رکھ کر وہیل چیئر کے پہیوں کو گھما کر خود کو کاؤنٹر کے قریب کیا تھا۔
"سلیم بھائی سوجی ہے؟"
بچے نے پھر پوچھا۔ وہ کافی عجلت میں تھا۔ ایسا لگتا تھا اماں نے اسکول سے آتے ہی دکان دوڑا دیا تھا۔ ایسے گاہک دیکھ کر سلیم صاحب کی رگ ظرافت پھڑک اٹھا کرتی تھی۔
"اب تو نہیں۔ ہاں بچپن میں بہت سوجی ہے" وہ قلم کنپٹی پر رکھ کر پرسوچ انداز میں بولا۔
"کیا۔۔۔؟ بچے نے ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھا۔
"ہر وہ جگہ سوجی ہے جہاں جہاں اماں کی چپل پڑ جایا کرتی تھی۔ گال' ٹانگ' بازو۔ ہر جگہ بچپن میں سوجی ہے۔ ایک بار تو ظالم اماں نے ایسی چپل لہرائی کہ سیدھی آنکھ پر لگی۔ اتنا سوجی کہ لٹک کر باہر ابل پڑی۔"
"کیا۔ سوجی۔۔۔؟" بچہ بھی اسی محلے کا رہنے والا تھا۔ سلیم بھائی کی عادت ان کے لیے نئی نہیں تھی۔
"نہیں بھئی۔ آنکھ" وہ اطمینان سے بولا تھا۔ بچے نے کھلکھلاتے ہوئے دانت باہر نکالے۔
"اوہو سلیم بھائی۔ میں اس سوجی کی بات کر رہا ہوں۔ جس کا حلوہ بناتے ہیں۔" اس نے وضاحت کی تھی۔
"اچھا اچھا تو یوں بولو نا کہ حلوہ والی سوجی درکار ہے۔"
وہ بھی مسکرایا تھا پھر کاؤنٹر کے پاس پڑی اسٹک اٹھا کر دیوار پر لگی کیل سے لٹکا ہوا اس میں پھنسا کر نیچے اتارا تھا پھر وہیل چیئر گھما کر اس بوری کے قریب لے گیا جس میں سوجی پڑی تھی۔
"مزے ہیں تم لوگوں کے۔ حلوہ بنا رہے ہو آج؟" یہ بھی سوال تھا۔ بچے نے سر ہلایا پھر کاؤنٹر سے باہر کی طرف پڑی کھلے منہ کی بوری میں سے بھنے چنوں سے اپنی مٹھی بھری تھی۔
"تمہاری باجی کا رزلٹ آیا ہے کیا۔ پاس ہو گئی میٹرک میں؟" اس نے پھر پوچھا۔
"نہیں تو" بچہ چنے پھانکنے میں مصروف تھا۔
"نانی آرہی ہیں؟"
"نہیں" بچہ اس انٹرویو سے زیادہ ان چنوں میں غرق تھا جو اس کی ہتھیلی پر دھرے تھے۔

"بات سنو۔ تم لوگوں کے گھر کوئی نیا بہن بھائی تو نہیں آگیا۔" اس سوال میں حیرت اور تجسس سے زیادہ مذاق کا عنصر تھا۔ بچے نے ناک چڑھایا۔
"نہیں سلیم بھائی۔"
تو پھر حلوہ کیوں بنا رہے ہو تم لوگ۔ آج شب برات ہے کیا۔"
وہ ابھی بھی اسی انداز میں سوال کر رہا تھا۔
"ابا کی تنخواہ بڑھادی ہے مالک نے۔ ابا خوش ہیں اس لیے ہم حلوہ بنا رہے ہیں۔"
بچے نے پوری بات بتائی تھی۔ سلیم نے خوشی سے سر ہلایا۔
"ارے واہ! مختار بھائی کی تنخواہ بڑھ گئی۔ میری طرف سے مبارک دینا۔ اور ابا سے کہنا سلیم بھائی کہہ رہے تھے۔ دعوت بنتی ہے آپ کی طرف۔" اس نے سوجی والی تھیلی تھماتے ہوئے کہا تھا پھر کچھ سوچ کر چیئر پیچھے کی اور تھوڑا خشک میوہ بھی ایک چھوٹی سے تھیلی میں ڈال لیا۔
"یہ میری طرف سے تھوڑا خشک میوہ۔ حلوے میں ڈال لینا" بچے نے سر ہلایا اور اپنی راہ ہو لیا۔ سلیم نے کاؤنٹر کی دراز میں پڑا رجسٹر اٹھایا اور اس پر اندراج کرنے کے لیے قلم ڈھونڈنے لگا جو ایک طرف رکھ دیا تھا پھر دوبارہ کوئی سوچ آئی تو رجسٹر بند کر دیا۔
"کیا یاد کریں گے آپ بھی مختار بھائی۔ سوجی بھی آپ کو مفت دی۔"
وہ واقعی خوش ہوا تھا ان کی تنخواہ میں اضافے کا سن کر۔ مختار بھائی کے گھرانے کو وہ عرصے سے جانتا تھا۔ سفید پوش بال بچے دار آدمی تھے۔ تھوڑی تنخواہ' بڑا کنبہ اور آئے دن کی بڑھتی مہنگائی کے باوجود' سلیم نے انہیں کبھی اللہ سے شکوہ کرتے نہیں دیکھا تھا۔ پانچ وقت کے نمازی تھے اور کبھی لین دین کے معاملے میں کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ اس کے رجسٹر میں ان کا کھاتا ہر مہینے کھلتا تھا جسے مہینے کی آخری تاریخ کو بنا بحث کیے چکا دیتے تھے۔ سلیم ان کی دل سے عزت کرتا تھا اور سچ بات یہ ہے کہ سلیم کی بھی پورے محلے میں بڑی عزت تھی۔
چند سال پہلے کی بات تھی وہ میٹرک کا رزلٹ پتا کر کے خوشی خوشی گھر واپس آرہا تھا جب ایک گاڑی والے نے ٹکر ماردی اور گاڑی زن سے بھگا لے گیا۔ ارد گرد والے اٹھا کر اسپتال لے گئے۔ کئی دن اسپتال میں رہا اور جب واپس آیا تو ایک ٹانگ نہ رہی تھی۔ کہتے ہیں معذوری تو موت سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ یہی سلیم کے ساتھ ہوا' وہ سولہ سالہ بچہ جو خوشی خوشی کالج میں داخلہ لینے کے خواب بن رہا تھا' اپنی معذوری سے اس قدر ذہنی بیمار ہوا کہ بستر سے لگ کر رہ گیا۔ کھانا سامنے رکھ بس سوچتا رہتا۔ نہ کسی سے بات کرتا نہ کسی بات میں دلچسپی لیتا۔ ماں باپ' بہن بھائی گود میں اٹھا کر باتھ روم تک لے جاتے تھے۔ ذہین طالب علم تھا' آگے بڑھنے کی لگن بھی تھی لیکن بیساکھی اور وہیل چیئر کو دیکھ کر ہی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں۔ سر چکرانے لگتا اور پھر سب پھینک پھانک کر اوندھا ہو کر بستر پر گر جاتا۔
اماں کچھ عرصہ دیکھتی رہیں کہ خود ہی سنبھل جائے۔ اس کا حوصلہ بڑھانے کا ہر ممکن کام کرتی رہیں۔ پانی پر دم کر کے دیتیں۔ سورۂ رحمن کی تلاوت سناتی رہتیں۔ اخبار میں کوئی آرٹیکل دیکھتیں جو اس کے حوصلے کو بڑھانے میں معاون ہو سکتا تو وہ بھی اسے پاس بیٹھ کر پورا پڑھ کر سناتیں۔ ٹی وی پر دیکھا تھا کہ ایسے مریضوں کے لیے تنہائی سم قاتل ثابت ہوتی ہے سو گھر میں اکیلا پڑا رہ کر مزید بیمار نہ ہو' یہ سوچ کر اسے سر شام گھر کی بیٹھک کا دروازہ کھول کر باہر کی طرف کرسی پر بیٹھا دیتیں کہ آتے جاتے لوگوں سے ملتا جلتا رہے۔ سرکاری اسپتال والوں نے بھی مہینے میں تین دفعہ فزیو تھراپی کے لیے لانے کو بول رکھا تھا کہ لنگڑا کر ہی سہی مگر کچھ عرصہ بعد چلنے کے قابل ہو سکے گا' وہاں بھی لے جاتی تھیں پھر وہیں ایک نفسیاتی بیماری کے ڈاکٹر سے بھی وقت لیا کہ اس کا کچھ نفسیاتی علاج ہو سکے

لیکن کوئی بہتری نہ ہوئی۔ ٹانگ نے نہیں چلنا تھا سو نا چلی۔ سلیم دن بہ دن مزید زود رنج ہوتا چلا گیا۔ بھائیوں کو گھر سے باہر اندر اپنی مرضی سے آتے جاتے دیکھتا تو مزید آنسو بہانے لگتا۔ اپنی قسمت کو کوستا رہتا۔ نماز روزے سے تو دور ہوا ہی تھا۔ مزید قدرت کو دوش دے دے کر ہلکان ہوتا رہتا۔ پھر اماں کو سمجھ میں آگئی کہ یہ ممی ڈیڈی چونچلے انہیں اور ان کے خاندان کو راس نہیں آسکتے سو انہوں نے خود ہی ایک مثبت قدم اٹھانے کی سوچی۔

اپنے دوسرے بیٹے کے ساتھ مل کر اسٹور روم صاف کر کے وہاں باہر گلی میں کھلنے والی کھڑکی بنوائی۔ اس کے آگے لکڑی کا کاؤنٹر بنوایا۔ پچھلی دیوار پر دو شیلف بنوائے اور سلیم کو بچوں کی گولیاں' ٹافیاں لالی پاپ' چپس' پاپڑ ڈبے والے جوس اور ایسا ہی الم غلم دے کر چھوڑ دیا کہ بیچو گے تو کھاؤ گے ورنہ بھوکے مر جاؤ گے' حالانکہ ابا کی تنخواہ اتنی بھی کم نہ تھی کہ بیٹے کو کم عمری میں ہی دکان پر بٹھا دیتے لیکن اماں کو اس کے لیے یہی بہتر لگا اور اس سے واقعی بڑا اچھا فرق پڑا۔ چھوٹا سا محلہ تھا جس کے آخر میں بند گلی تھی۔ ایسی کوئی دکان نزدیک تھی بھی نہیں سو محلے کے بچوں نے پرجوش انداز میں خوش آمدید کہا۔ اماں نے ہر ورائٹی کا پاپڑ اور گولیاں' ٹافیاں ڈلوادی تھیں سو بچے بھی ٹوٹ کر پڑے۔ پہلے مہینے میں ہی اسٹور میں کی گئی ساری توڑ پھوڑ کے پیسے وصول ہو گئے۔

ابتدا میں بچے ہی آتے رہے پھر کسی کے مشورے پر اماں نے ضروری مرچ مسالے اور دالیں بھی دکان میں بھر دیں۔ پہلے بچے آتے تھے پھر بڑے بھی آنے لگے۔ دکان کے مال میں بھی اضافہ ہونے لگا سلیم کے پاس بھی رونق رہنے لگی۔ لوگ آتے اس کے غم کی کہانی کم سنتے' اپنے قصے زیادہ سناتے جس سے اسے حوصلہ ملنے لگا کہ دنیا میں وہ اکیلا غمگین نہیں ہے۔ دنیا دکھوں سے بھری اٹی پڑی ہے۔ وہ اپنی ذات کے خول سے باہر نکلنے لگا۔ اس کے ارد گرد سناٹے چھٹنے لگے۔ دکان اتنی بڑھی کہ دو سال کے عرصے میں اس نے خشک چیزوں کے ساتھ' سبزیاں بھی رکھ لیں اور پھر کچھ عرصہ بعد رنگین دھاگے۔ سوئیاں اور کپڑوں پر لگانے والی لیس فیتے بھی سجا لیے۔

اماں کے ٹوکنے پر اس نے پرائیویٹ انٹر بھی کر لیا' بی اے کی کتابیں بھی لے رکھی تھیں لیکن ابھی تک مکمل کیا نہیں تھا مگر اس سے زیادہ مطمئن اور خوش انسان اس پورے محلے میں نظر نہیں آتا تھا۔ ہر ایک کے ساتھ ہنسی مذاق' چھیڑ چھاڑ اس کی عادت تھی۔ وہ بچوں اور بڑوں' سب میں یکساں مقبول تھا۔ وہ پرانی والی غمگین کیفیت جیسے ایک ڈراؤنا خواب تھی جو آنکھ کھلنے پر ختم ہو گیا تھا اور وہ اپنی مطمئن حالت کا سارا کریڈٹ اپنے اماں کے بعد' محلے والوں کو دیتا تھا جنہوں نے اس کی دکان کو چلانے میں اس کی بھرپور مدد کی تھی۔ یہ دکان اس کے لیے صرف رزق کمانے کی جگہ نہیں تھی بلکہ اس کا اعتماد تھی' اس کا حوصلہ تھی تو پھر ایسے محلے والوں کو خیال وہ کیوں نا رکھتا۔

☼ ☼ ☼

"کیا پکا ہے؟" اس نے زری سے پوچھا تھا۔

وہ منہ پر نا جانے کس چیز کا لیپ لگائے دیوان پر چت لیٹی تھی۔ آنکھوں کے علاوہ پورا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

"آلو مٹر گاجر۔" وہ بدبدا کر بولی تھی مبادا ذرا زیادہ آواز نکلی تو چہرہ بگڑ جائے گا۔ اس کا منہ سبزی کے نام پر ہی بن گیا۔

آج پھر سبزی' وہ چڑ کر بولی تھی۔

"رائتہ اور سلاد بھی ہے" زری نے بتانا ضروری سمجھا۔

"ہونہہ! رائتہ اور سلاد بھی ہے۔" اس نے بہن کی نقل اتاری پھر اس کے پاس دیوان پر پڑا ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کرتے ہوئے بولی۔

"رائتہ اور سلاد سے آلو مٹر گاجر' چکن قورمہ نہیں بن جائیں گے۔ کوجے دلہا کے ساتھ دو سو سونڈ بالے براتی بھی آجائیں تا' تب بھی کوجا دلہا کوجا ہی رہتا ہے۔"

وہ ٹی وی کے سامنے پڑے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ امی شاید نماز پڑھ رہی تھیں۔ ابا تو اس وقت ویسے بھی دکان پر چلے جایا کرتے تھے۔ اس نے ٹی وی کا والیم کم کیا اور چینل سرچنگ میں مصروف ہو گئی۔

"زری اب چائے پلا دو۔ یا ایسے ہی بھوت بنگلہ بن کر بیٹھی رہو گی" انتہائی لاڈ سے بہن سے فرمائش کی تھی۔ جب ابا گھر نہیں ہوتے تو اس کا مزاج بھی اتنا گرم نہیں ہوتا تھا اور یہ بات زری اور امی دونوں ہی جانتی تھیں۔ زری نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا پھر کچھ کہنا چاہا لیکن ارادہ ترک کر کے اٹھ بیٹھی۔ اس کا مزاج کے پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ والا حساب تھا۔ کوئی اندازہ نہیں ہوپاتا تھا کہ کب غصے والی بات کرے گی اور کب غصے سے بات کرے گی۔ زری کا مزاج بھی آج کچھ زیادہ ہی اچھا تھا سو آرام سے چائے بنانے کے ارادے سے اٹھ کر باتھ روم کی سمت چل دی تاکہ پہلے ہاتھ منہ دھو سکے۔

"چائے کے ساتھ کچھ کھانے کے لیے بھی ہونا چاہیے جس کو کھا کر میں تمہیں دعا دے سکوں کہ اللہ تمہاری اس محنت کو قبول فرمائے اور یہ جو تم اتنی لیپا پوتی کر کے اپنا بوتھا چمکاتی رہتی ہو نا۔ اس کی جھوٹی تعریفیں کرنے والا کوئی احمق جلد سے جلد تمہیں مل جائے۔ بولو آمین" نگاہوں کا مرکز ابھی بھی ٹی وی تھا اس لیے امی کو آتا دیکھ نہ سکی تھی۔

"کتنا بولتی ہو نبینا... اور کیا کیا بولتی رہتی ہو... عصر کا وقت ہے... کوئی اچھی دعا دو بہن کو" امی ہاتھ میں تسبیح لیے اس کے پاس ہی آ بیٹھی تھیں۔ اس نے ہی بے زار کن شکل بنائی جو اس کا ٹریڈ مارک بن گئی تھی۔ اسے ٹوکے جانے سے چڑ تھی۔

"امی آپ کو کبھی میری کوئی بات اچھی لگی بھی ہے۔ میں نے پہلے کبھی کوئی اچھی دعا دی ہے کسی کو جو اب دوں گی" امی نے دکھ بھری گہری سانس بھری تھی۔

"اب آپ اتنا بھی رنجیدہ نا ہوں۔ اللہ کو بھی مجھ سے بس اتنی ہی محبت ہے جتنی کہ آپ کو۔ میری دعاؤں کی عرضیاں تو فرشتے بھی ڈسٹ بن میں ڈال دیتے ہوں گے۔" وہ زہر خند انداز اپنا کر بولی تھی۔

"میں کیا کہوں تم سے اب۔ کس طرح تمہیں اپنی محبت کا یقین دلاؤں... جسے اللہ کی محبت پر یقین نا ہو... وہ ماں کی محبت کو خاک سمجھے گی... اللہ ہی سمجھائے گا تمہیں" امی تسبیح کے دانے گھما رہی تھیں۔ اس نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر انہیں دیکھا۔

"اب بھی عصر کا وقت ہی ہے اور آپ مجھے بددعائیں دینے لگی ہیں۔ امی آپ نے مجھے واقعی کسی مسجد کے احاطے میں پڑے جھولے میں سے اٹھایا تھا نا... اتنی ہی محبت کریں گی آپ مجھ سے۔"

"نبینا تو کیوں کرتی ہے ایسی باتیں... تجھے ذرا خیال نہیں آتا تاں ماں کے دل پر کیا گزرتی ہو گی۔" امی آبدیدہ ہونے لگی تھیں۔

اس نے کن انکھیوں سے انہیں دیکھا پھر دل ہی دل میں خود کو کوسا۔ ابا سے جتنی بھی نالاں اور متنفر رہتی وہ' لیکن ایک بات حتمی تھی کہ امی سے اسے بہت محبت تھی لیکن وہ ان بدقسمت لوگوں میں سے تھی جنہیں محبت کا مظاہرہ کرنا آتا ہی نہیں تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی کبھی ظاہر نہیں کر پاتی تھی کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ اس کی زبان بے حد کڑوی تھی اور امی کے آنسو' اسے اس بات کا مکمل احساس دلاتے تھے۔ اس کے نام کا پورا اثر تھا' اس کی شخصیت پر۔ وہ پھول کا ذکر بھی کرتی تھی تو اس کے پیاروں کو وہ کانٹوں کی طرح چبھتے تھے۔

"اچھا بابا۔ سوری۔ اب مجھے گناہ گار کریں گی کیا ایسی شکل بنا کر۔ مسکرائیں امی... آپ مسکراتے ہوئے اچھی لگتی ہیں۔"

وہ ان کی جانب دیکھے بنا بول رہی تھی۔ دل میں کافی شرمندگی بھی محسوس کر رہی تھی' لیکن اتنی ہمت نہیں تھی

کہ اٹھ کر ان کے گلے لگ جاتی۔

"زری دیکھو امی بھی گاجر آلو مٹر نہیں کھانا چاہتیں۔ ان کا موڈ بھی آف ہو گیا ہے آلو مٹر اور گاجر کا نام سن کر۔ خدارا اب تو ہمارے لیے کوئی زبردست قسم کی چیز بنا دو" وہ اسی انداز میں بولی تھی۔

"پکوڑے بنا رہی ہوں نھنا۔" زری نے کچن سے آواز لگائی تھی۔

"واہ جیو میری شیرنی۔۔۔ اللہ تمہیں چاند سا دلہا دے۔"

وہ اب ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی اور مقصد صرف اتنا تھا کہ امی کا جو دل دکھایا ہے اس کا مداوا کر سکے۔

"اب تو ٹھیک ہو جائیں نا میری پیاری امی آپ کی لاڈو رانی کو۔۔۔ اب تو ہنس دیں۔"

وہ ان کی جانب پشت کیے بیٹھی تھی۔ امی نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"وہی نہیں تم بھی میری لاڈو رانی ہو بلکہ تم تو زیادہ لاڈو ہو کیونکہ تم چھوٹی ہو۔۔۔ زری سے زیادہ، تم سے محبت ہے مجھے۔"

"رہنے دیں امی۔۔۔ مساجد کے احاطوں سے اٹھائے ہوئے بچوں سے کون کرتا ہے محبت۔ ہماری کیا اوقات کہ ہم زری بی بی کا مقابلہ کریں۔"

وہ ابھی بھی کڑوی باتیں میٹھے لہجے میں کر رہی تھی۔ امی اس کے انداز پر مسکرائی تھیں۔ یہ بات بچپن میں اسے ایک بار انہوں نے بتائی تھی جب اس نے پوچھا تھا کہ میں کیسے پیدا ہوئی تھی تو انہوں نے کہہ دیا تھا کہ تمہیں کوئی مسجد میں چھوڑ گیا تھا تو تمہارے ابا تمہیں وہاں سے اٹھائے لائے۔

"اب بھی تو ہنس بول رہی ہو نا۔ ابا کے سامنے بھی ایسے ہی بول لیا کرو۔ وہ بہت محسوس کرتے ہیں کہ تم انہیں اگنور کرتی ہو۔ انہیں پسند نہیں کرتی۔ آج بھی تم نے مجھے سلام کیا حالانکہ وہ بھی یہیں بیٹھے تھے لیکن انہیں سلام تک نہیں کیا تم نے۔۔۔ میری بیٹی! باپ ہیں وہ تمہارے۔۔۔ بہت چاہتے ہیں تمہیں۔" امی اسے یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کے ماتھے کی تیوریاں بڑھنے لگیں۔ چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

"مجھے کیا بتا رہی ہیں امی۔ جانتی ہوں میں کہ۔ ابا بہت محبت کرتے ہیں مجھ سے۔ آپ چھوڑیں ان باتوں کو۔ زری پکوڑے لے بھی آ۔ اللہ کی بندی۔ اب کیا منتیں کروائے گی" وہ چلا کر بولی تھی۔ دل جیسے بجھ سا گیا تھا۔ آنکھوں میں مرچیں بھرنے لگی تھیں۔ امی جب بھی اسے ابا کی محبت کا احساس دلاتی تھیں اس کے ساتھ ایسا ہی ہوتا تھا۔ امی نے ٹھنڈی لمبی گہری سانس بھری۔ وہ اپنے آپ کو اپنی اس بیٹی کے معاملے میں بے حد لاچار محسوس کرتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"سوا گیارہ" صوفیہ نے دیوار گیر سنہری کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے خود کو وقت بتایا تھا۔ سارا گھر سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ بی بی جان تو نماز عشا کے بعد ہی اپنے کمرے میں چلی جایا کرتی تھیں جبکہ ملازمین کو بھی دس بجے کے بعد، بغیر اجازت گھر کے اندر آنے کی ممانعت تھی۔ ایک آپا رحمت ہی تھیں جو اپنی مرضی سے اندر باہر آجا سکتی تھیں لیکن وہ بی بی جان کی خاص ملازمہ تھیں اور سارے گھر کی ذمہ داری بہت اچھے طریقے سے نبھاتی تھیں۔ اب تو وہ بھی سو چکی تھیں۔

صوفیہ کے دل کو عجیب سا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ وہ دو مہینے کی دلہن تھی اور گھر کی اکلوتی بہو ہونے کے باعث کچھ زیادہ ہی دلہن تھی۔ بی بی جان نے ابھی تک میٹھا نہیں بنوایا تھا، اس لیے صوفیہ ابھی تک گھر کے فعال رکن کے طور پر متعارف نہیں ہوئی تھی۔ ویسے بھی گھر میں ملازمین کی فوج ظفر موج تھی۔ بی بی جان صوفیہ کو پانی پینے کے لیے بھی خود سے ملنے نہیں دیتی تھیں۔

"تم ابھی نئی نئی بیاہتا ہو بیٹی۔ تمہارے ہاتھ کی مہندی پھیکی نہیں پڑنی چاہیے۔"

وہ اس کی جانب دیکھ کر یہی نصیحت کرتی تھیں۔ پہلے پہل صوفیہ کو اس ساری صورت حال میں بڑا مزا آرہا تھا۔ وہ صبح اٹھ کر کامدانی جوڑا زیب تن کرتی تھی، زیورات پہنتی تھی اور میک اپ کر کے بی بی جان کے ہمراہ گھر کے ہال میں بیٹھ جایا کرتی تھی، ملنے ملانے والیاں آرہی تھیں اور بی بی جان چاہتی تھیں کوئی یہ نا کہے کہ وہ اچھی بہو نہیں ڈھونڈ کر لائیں۔ صوفیہ کے اپنے گھر میں اس کی بیاہی بہنوں کے یا بھابھیوں کے ایسے ٹھاٹھ نہیں تھے۔ سارے خاندان میں ہی ایسا رواج تھا کہ نئی دلہنیں ایک ڈیڑھ ہفتے میں میٹھا بنا کر کچن میں ذمہ داریاں نبھانے آجاتی تھیں۔ کامدانی جوڑے اور زیورات دعوتوں میں پہننے جانے کے لیے سنبھال لیے جاتے تھے جبکہ یہاں بی بی جان جو ڈھیروں جوڑے بری میں لائی تھیں وہ ہی پورے نہیں ہوئے تھے۔ صوفیہ اپنی قسمت پر نہ صرف نازاں تھی بلکہ شکر ادا کرتی بھی نہیں تھکتی تھی۔ اس کے پورے خاندان میں اسے خوش قسمتی کی علامتی مثال بنا دیا گیا تھا۔ ہر خالہ پھپھی اسی کے سسرال کے گن گاتی نا تھکتی تھیں کہ "سسرال ہو تو صوفیہ کے جیسا۔۔۔ صوفیہ کی تو قسمت کھل گئی۔"

قسمت کھلنے کی باتیں تو وہ تب سے سن رہی تھی جب اس کی نسبت کاشف نثار کے ساتھ طے ہوئی تھی۔ دراصل وہ سارے گھر میں ذرا دبی ہوئی رنگت کی مالک تھی۔ باقی بہنیں رنگ روپ میں اماں پر پڑی تھیں جبکہ وہ ابا کے جیسی تھی، لیکن اماں نے سب بیٹیوں کی تربیت ایک سی کی تھی۔ کوئی کسی کو یہ احساس نہیں دلاتا تھا کہ گورا رنگ ہونا کسی اعزاز کی بات ہے۔ یہ ان کے گھر میں ایک عام سی بات مانی جاتی تھی۔ اس حساب سے دیکھا جاتا تو صوفیہ ساری بہنوں میں سب سے زیادہ ہی اچھی تھی۔ میٹرک پاس تھی۔ سلائی کڑھائی کے فن میں یکتا۔ کھانے پکانے کے ہنر سے مکمل طور آشنا۔ سیرت و اخلاق میں اعلا۔ اس زمانے میں لوگ لڑکیوں بالیوں کو انہی خصوصیات سے پرکھا، جانچا کرتے تھے۔ جہیز کے لیے خود سے بیڈ کورز کاڑھنا، قمیصوں پر گوٹے کناری کرنا، ٹی کوزیاں سینا، دو سوتی کی میزپوش بنانا لڑکیوں کے پسندیدہ مشاغل میں شامل تھا۔

خاندان کی لڑکیاں جس گھر میں اکٹھا ہوتیں، اس گھر کی لڑکیوں کے ایسے شاہکار فن پارے کھول کھول کر ضرور دیکھے جاتے تھے، سراہے جاتے تھے اور نقل کرنے کے لیے مانگے بھی جاتے تھے۔ صوفیہ کو ان باتوں کی بنیاد پر ہمیشہ سراہا جاتا تھا، لیکن کاشف نثار سے نسبت کے بعد اسے خود بھی اپنے آپ پر فخر ہوتا تھا۔ کاشف نثار نا صرف ایک کھاتے پیتے گھرانے کا اکلوتا چشم و چراغ تھا، بلکہ شہر کے پوش علاقے میں یہ بڑی سی کوٹھی، چلتے ہوئے اچھے کاروبار کا اکلوتا وارث اور پھر سب سے بڑھ کر وجاہت کا اعلا شاہکار تھا۔ جس نے بھی کاشف کو دیکھا، صوفیہ کی قسمت پر رشک کیا۔ نسبت طے ہو جانے کے بعد گھر کے باقی دامادوں کی طرح، کاشف کی انلارجڈ تصویر بھی سنہرے فریم میں سجا کر بیٹھک کی دیوار گیر شیشے کی الماری میں سجا دی گئی تھی۔ اس تصویر کی بات ہی الگ تھی۔ ہر آنے والا مہمان ان تصویروں کو دیکھتا، نظریں کاشف کی تصویر پر ٹکاتا اور یہ سوال ضرور کرتا۔

"یہ صوفیہ والا ہے نا" اس بات پر جہاں صوفیہ شرماتی وہیں دل میں "ماشاء اللہ" بھی کہتی۔ سارے خاندان میں اتنا وجیہ دلہا کسی کا نہیں تھا۔ اسے بہت فخر محسوس ہوتا۔ اپنی اماں کے گھر تو اسے یہ احساس بھی نہ ہوا تھا کہ جس بات پر وہ فخر کر رہی ہے یہی اس کے دل کا سب سے بڑا وسوسہ بن کر رہ جائے گا۔ یہ احساس اسے شادی کے اگلے روز ہوا جب سسرال والی سائیڈ کی بیشتر عورتوں نے کہا کہ دلہا تو بہت شاندار ہے، دلہن بس ٹھیک ہی ہے۔ کاشف کی منہ پھٹ بے تکلف کزنوں نے تو صاف ہی کہہ ڈالا۔

"کاشف بھائی، ہم پلہ دلہن بھی نا ملی تھی کیا۔ خود سے زیادہ خوب صورت بیوی لے آتے تو آپ کے نمبر کم ہو جاتے نا۔ اس لیے بھابھی اپنے سے کم خوب صورت ڈھونڈی ہیں۔"

صوفیہ ایک دن کی بیاہتا تھی، چپ چاپ سنتی رہی لیکن دل ٹوٹ سا گیا اگرچہ کاشف کا والہانہ محبت بھرا انداز، ہر

وہم وسوسے کو ختم کرنے کے لیے کافی تھا لیکن پھر بھی اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ کاشف سے شکل اور شخصیت میں کم ہے۔ ایک روز اس نے باتوں باتوں میں کاشف سے بھی کہہ دیا۔

"آپ کو خوب صورت لڑکیوں کی کمی تو نہیں تھی' پھر آپ نے مجھے ہی کیوں چنا؟" اس کا خیال تھا کہ کاشف اسے سراہے گا اور اسے دنیا کی خوب صورت عورت قرار دے کر اس کی محبت کے گن گائے گا لیکن وہ ہنس کر بولا۔

"مجھے زندگی میں کبھی خوب صورت عورت سے شادی کرنی ہی نہیں تھی۔ خوب صورت عورت کی الگ ہی دکانداری ہوتی ہے۔ اپنی ذات کا زعم۔ ہر بات میں نخرا۔ مجھے یہ سب نہیں چاہیے تھا۔ یہ سب چیزیں تو محبوبہ کی ذات تک برداشت ہوتی ہیں۔ میں بیوی اور محبوبہ میں فرق رکھنے کا قائل ہوں۔ مجھے تو تمہارے جیسی بیوی ہی چاہیے تھی۔"

کاشف نے اگرچہ جملے کے آخر میں اس کی دل جوئی کا سارا سامان رکھ دیا تھا لیکن صوفیہ کا دل مزید بجھ گیا۔ شادی کے دو مہینے تک چند مزید پریشان کن باتیں ہوئیں۔ کاشف خاندان کی عورتوں میں حد سے زیادہ مقبول تھا۔ خاندان کی ہر الڑ مٹیار گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے "کاشف بھائی" کے پاس حاضری لگواتی تھی۔ کاشف بھی ساتھ مل کر خوب ہنسی مذاق کرتا' ہاتھوں پر ہاتھ مار کر ٹھٹھے لگائے جاتے۔ یہی حال دوست احباب کا تھا۔ دوستوں کی بیویاں بھی کزنز کی طرح بے تکلف تھیں۔ صوفیہ کو یہ سب چیزیں ناگوار گزرتی تھیں' ان کے گھر کا ماحول کسی قدر مذہبی رہا تھا' ایسی باتیں معیوب سمجھی جاتی تھیں اس لیے اسے مزید بے چینی ہونے لگتی لیکن کاشف کے لیے یہ عام سی باتیں تھیں۔ وہ ان سب چیزوں کو عام سی باتیں سمجھتا تھا۔ صوفیہ یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا کیونکہ پہلے بھی چند ایک باتوں میں کاشف اسے باور کروا چکا تھا کہ

"میکے کو بھول جاؤ اور اپنا ایک اسٹینڈر بناؤ۔ تم ایک رئیس آدمی کی بیوی ہو۔"

صوفیہ دل مسوس کر رہ جاتی تھی۔ اب بھی یہی ہوا تھا۔ کاشف کھانے کے وقت گھر سے نکلا تھا اور یہ کہہ کر نکلا تھا کہ تم تیار رہو ہم کھانا باہر کھائیں گے۔ صوفیہ کو کیا تیاری کرنی تھی۔ وہ پہلے سے ہی نک سک سے تیار تھی لیکن چونکہ شوہر کہہ گیا تھا سو اس نے کپڑے تبدیل کر لیے تھے' میک اپ بھی کر لیا تھا لیکن کاشف نہیں آیا تھا' پھر نو بجے کے قریب اس کا فون آگیا کہ۔

"میں مجید بھائی کے گھر پر ہوں۔ پانچ منٹ میں چائے پی کر آرہا ہوں"

صوفیہ کو کاشف کے دوستوں میں مجید بھائی اور ان کی اہلیہ ہی سب سے برے لگتے تھے۔ آدمی تھا تو منہ میں پان دبائے بیٹھا رہتا جبکہ بیوی کسی فلمی ہیروئن کی طرح کاشف کے سر پر منڈلاتی رہتی۔ وہ خوب صورت بھی بہت تھی۔ اداکارہ ممتاز سے ملتی تھی۔ صوفیہ سے جب پہلی بار ملنے آئی تب بھی اور جب ان کی دعوت کی تب بھی' بھڑکتے رنگ کی میکسی میں ملبوس زلفیں پشت پر بکھرائے آس پاس خوشبوئیں بکھیرتی رہتی تھی۔ اسی لیے کاشف کے فون کے بعد سے صوفیہ کا دل جل جل کر خاک ہوا جا رہا تھا اور مرے پر سو درے کہ اسے تاخیر بھی ہو گئی تھی۔

انہی سوچوں میں الجھی بیٹھی تھی جب گاڑی کے ہارن کی آواز نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کمرے کی کھڑکی سے تو باہر نگاہ پڑتی نہیں تھی' سو کمرے سے باہر نکل آئی پھر سیڑھیوں کی گرل کے قریب آکر نیچے جھانکا۔ چند منٹ بعد کاشف کی شکل نظر آئی تھی۔ اس نے سکون کا سانس لیا پھر فوراً کمرے کے اندر چلی گئی تاکہ ناراضی کا اظہار کر سکے۔

"ارے تم اب تک جاگ رہی ہو" کاشف نے اسے دیکھتے ہی پہلا جملہ یہ ادا کیا تھا۔ اس کا دل مزید جل کر خاک ہو گیا۔

"آپ جو باہر تھے اب تک۔۔۔ کیسے سو سکتی تھی میں۔۔۔" وہ اٹھلا کر بولی۔ پوری امید تھی کہ شوہر آگے بڑھ کر اسے منانے کا سامان کرے گا لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔

"ارے بابا میرا انتظار مت کیا کرو۔ سو جایا کرو۔ میرے گھر آنے کے اوقات مقرر نہیں ہیں۔" وہ گھڑی اور ٹائی اتارتا ہوا باتھ روم میں چل دیا۔ صوفیہ کا نازک دل لرزا' پھر پلکوں سے آنسو پھسل کر گالوں پر آگئے۔ یہ نہ جتا سکی کہ پھر کھانا باہر کھانے کو کیوں بول گئے تھے۔ بے دلی سے اٹھی اور جیولری اتارنے لگی۔

کاشف آرام دہ کپڑوں میں ملبوس بستر پر آبیٹھا۔

"آپ نے ٹیلی فون پر کہا تھا۔ آپ چائے پی کر آرہے ہیں۔" اس کی جانب دیکھے بنا شکوہ کر ہی دیا۔

"ہاں ارادہ تو یہی تھا مگر حبیبہ نے اصرار کر کے کھانے کی میز پر بٹھا دیا۔ کیا مزیدار کوفتے اور ٹرائفل بنا رکھا تھا۔ مجھ سے بھی رہا نہیں گیا۔ اس لیے کھانا کھانے میں گھنٹہ مزید لگ گیا۔ بہت ذائقہ ہے حبیبہ کے ہاتھ میں۔ تم ان سے ٹرائفل بنانا تو ضرور ہی سیکھ لو۔ تم نے اب تک مجھے اپنے ہاتھ سے کچھ بنا کر نہیں کھلایا۔"

وہ سرہانہ درست کرتا اس کی طبیعت بھی درست کر رہا تھا۔ صوفیہ کچھ نہیں بولی تھی۔ اب بولنے کو کچھ رہ بھی نہیں گیا تھا۔ وہ مزید رونے کے لیے باتھ روم میں گھس گئی۔ حبیبہ کا نام اس نے دل ہی دل میں دیا سلائی رکھ دیا تھا جو اس کے دل کو جلانے کے کام آتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"وہ ایک خوب صورت عورت ہے" بی بی جان نے اسے دیکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"زندگی ایسی عورت کے لیے اس جملے سے شروع ہو کر اس جملے پر ختم ہو جاتی ہے' کیونکہ پھر خود اس کے لیے حسن ایک امام ضامن بن جاتا ہے' وہ سمجھتی ہے جہاں جائے گی چھا جائے گی۔ سب کچھ تسخیر کر لے گی۔ اسے محنت نہیں کرنی پڑے گی' سب کچھ اسے پلیٹ میں رکھ کر دے دیا جائے گا۔ عورت حسین ہو اور اسے اپنی حسن کا زعم بھی ہو تو پھر ایسی عورت مرد کے دل پر چڑھ نہیں پاتی کیونکہ مرد کے لیے عورت کا حسن تب تک اہم ہوتا ہے جب تک کہ وہ اس کی پہنچ میں نہیں ہوتا۔ جس عورت کو وہ پالیتا ہے پھر اس کے لیے وہ عورت تو رہتی ہے۔ اہم بھی رہتی ہے مگر خوب صورت نہیں رہتی۔ اس لیے جو عورتیں عام شکل و صورت کی ہوتی ہیں تا یقین کرو وہ زیادہ پیا من بھاتی ہیں۔ کیونکہ ان کی شخصیت کا اسرار مرد کے لیے ان کی کشش کو ختم نہیں ہونے دیتا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا" انہوں نے مزید محبت لہجے میں سمو کر اسے دیکھا تھا۔ وہ صبح سے بجھی بجھی سی نظر آتی تھی۔ بی بی جان کے پوچھنے پر اس نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ بتا دیا کہ وہ حبیبہ جیسی عورتوں سے خائف ہے۔

"میں نے تمہیں بہت چن کر اپنے بیٹے کے لیے پسند کیا تھا۔ تمہیں اللہ نے بہت پیاری شکل دی ہے لیکن تمہارے انداز اس سے بھی زیادہ پیارے ہیں۔ تم پہلی نظر میں مجھے بھا گئی تھیں۔ مجھے ایسی ہی بہو کی ضرورت تھی جو سلیقہ مند ہو' خوش اخلاق ہو' ملنسار ہو۔ ایسی عورت گھر توڑنے سے زیادہ بنانے پر یقین رکھتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم میرے اس گھر کو ہمیشہ جوڑ کر رکھو گی۔ تمہاری کوئی نند بھاوج نہیں ہے۔ تم ہی اس سارے گھر کی مالک ہو۔ اس گھر میں جو بھی ہے وہ سب تمہارے شوہر کا ہے اور جو تمہارے شوہر کا ہے وہ تمہارا بھی ہے بیٹی۔ بس اتنا دھیان رہے کہ تمہارا شوہر لاپروا اور شاہ خرچ واقع ہوا ہے۔ اکلوتے پن کی بہت سی خرابیاں اس کے اندر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ حبیبہ جیسی بہت سی عورتیں تمہیں اس کے اردگرد نظر آئیں گی' جو تھوڑے سے مالی مفاد کی خاطر اپنے مقام سے گرنے کو بھی تیار ہو جاتی ہیں' لیکن تم اس کی شریک حیات ہو۔ تمہارا اس پر حق ہے۔ اس لیے حق کے ساتھ اس کی زندگی میں رہو۔ یہ وہم مت کرو کہ تم خوب صورت نہیں ہو۔ تمہارا درجہ اور مقام کسی بھی باہر

والی خوب صورت عورت سے زیادہ ہے۔ اس لیے اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم نے اسے کیسے اپنا بنا کر رکھنا ہے۔ کیسے اسے سیدھی راہ پر رکھنا ہے۔ اسے کیسے اپنے حق میں بہتر بنانا ہے۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات۔"
بی بی جان نے اس کی زندگی کا مشکل ترین سبق پڑھایا تھا۔ کاشف نثار کو سمجھنے کا فارمولا سکھا رہی تھیں وہ اسے۔ یہ انگریزی کا کوئی مشکل جملہ نہیں تھا جسے وہ رٹ رٹ کر یاد کر لیتی۔ یہ تو الجبرا تھا جس کی اسے اسکول میں بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟"
اس نے ملازمہ کو دیکھتے ہی پہلا سوال یہ کیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تین سالہ ایمان بلک رہی تھی، جسے چپ کروانے کی کوشش میں وہ ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔ بچی کو بخار ہوا تھا جس کی بنا پر وہ کافی چڑچڑی ہو رہی تھی باپ کو دیکھتے ہی وہ ہمک کر اس کی جانب لپکنے لگی تھی لیکن سمیع صاحب نے اپنی بچی کی طرف دیکھا تک نہیں تھا' نا ہی اس کے متعلق پوچھا تھا بلکہ اپنی بیگم کے متعلق پوچھا تھا۔
"وہ سو رہی ہیں جی۔" وہ اتنا ہی کہہ سکی۔
سو رہی ہیں... اس وقت... ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" اس کے چہرے پر پریشانی بڑھی تھی۔
"پتا نہیں جی۔" جواب ایک بار پھر مختصر ہی آیا تھا۔
"کیا مطلب پتا نہیں... تم لوگوں کو اس گھر میں رکھا کیوں ہے۔ بیگم صاحبہ کی خدمت کے لیے... تم لوگ اگر اپنے کام ٹھیک سے نہیں کر سکتے تو اپنا اپنا حساب کرو اور چلے جاؤ یہاں سے۔" وہ غرا کر بولا تھا پھر اس کی گود میں دبکی اپنی بچی کو دیکھے بنا' وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس کی بلند آواز سن کر اماں رضیہ بھی کچن سے نکل آئیں۔ وہ ایمان کے لیے فیڈر بنانے پانچ منٹ پہلے ہی کچن میں گئی تھیں۔
"کیا ہوا... کس بات پر غصہ آگیا سمیع کو؟" انہوں نے آتے ہی پوچھا تھا۔
"میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا جی... صاحب تو ہر وقت غصے میں ہی رہتے ہیں۔" بے چاری نئی نئی کام پر آنا شروع ہوئی تھی اس لیے ڈر گئی تھی۔ اماں رضیہ نے اس کے ہاتھ سے ایمان کو پکڑا اور کاؤچ پر بیٹھ گئیں۔
"تم دل برا مت کرو... سمیع غصے کا تیز نہیں ہے... بس بیوی کی وجہ سے گھبرایا ہوا رہتا ہے... ورنہ تو دل کا بڑا اچھا بچہ ہے۔"
انہوں نے ایمان کے منہ میں فیڈر دیتے ہوئے اسے تسلی دی تھی۔ انہوں نے ہی اپنی مدد کے لیے اسے ملازم رکھا تھا۔ ایمان کی ساری ذمہ داری ان پر ہی تھی اور وہ اب اتنی توانا نہیں رہی تھیں کہ سارا گھر بھی دیکھتیں اور چھوٹی سی بچی کو بھی پالتیں۔ رانی انہیں اچھی لگی تھی۔ پھرتیلی سی لڑکی تھی۔ بھاگ بھاگ کر سارے کام نمٹاتی رہتی تھی اور ایمان کو بھی اچھے سے سنبھال لیتی تھی۔ وہ خود بھی کچھ عرصہ پہلے ہی اس کے ساتھ رہنے کے لیے آئی تھیں بلکہ سمیع نے بصد اصرار اپنے پاس بلایا تھا۔
"سمیع صاحب بی بی جی سے بہت ڈرتے ہیں کیا؟"
رانی نے اماں رضیہ کے قریب زمین پر بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا' ساتھ ہی ان کی شکل بھی دیکھی کہ اس سوال پر برا ہی نہ مان جائیں۔ صاحب کے رشتہ داروں میں سے تھیں لیکن پوچھے بنا رہا بھی نہیں جا رہا تھا۔ وہ جس دن سے آئی تھی اسی دن سے دیکھ رہی تھی کہ صاحب بچی کو تو دیکھتا بھی نہیں لیکن بیگم صاحبہ پر جان چھڑکتا ہے۔ آفس جاتے' آفس سے آتے بس اسی کے متعلق پوچھتا ہے۔ اسی کا دم بھرتا ہے۔

"ارے نہیں بھئی... ڈرتا ورتا کیا ہوگا۔ بس محبت کی شادی ہے... دونوں ساتھ پڑھتے تھے... ہوگئی محبت وحبت... نوبت شادی تک آپہنچی۔ شیریں کے باپ نے رشتہ دینے سے پہلے پہل انکار کر دیا تو سمیع صاحب مرنے مارنے تک آگئے تھے۔ یہی حال شیریں کا ہوا۔ نیند کی گولیاں کھا کر اسپتال پہنچ گئیں۔ اسی لیے ماں باپ نے بھی یہی بہتر سمجھا کہ یہ دونوں تو لاعلاج ہو چکے اور ان کا علاج ایک دوسرے کے پاس ہی ہے سو پھر شادی طے کر دی۔"
اماں گھٹنا ہلاتے ہوئے اسے تفصیل بتا رہی تھیں' انہیں باتیں کرنے کا خبط تھا اور باتیں کرتے ہوئے وہ اکثر یہ بھی بھول جایا کرتی تھیں کہ آیا کیا بات' ملازمین سے کرنی ہے اور کیا نہیں کرنی۔ دراصل سمیع کے ابا کی دور پرے کی رشتہ دار تھیں۔ شادی ہوئی نہیں تھی اسی لیے تیرے میرے در پر پڑی رہتی تھیں' سمیع کے ابا خدا ترسی میں اپنے گھر لے آئے کہ اللہ کی دی ہوئی بڑی برکت تھی' رزق کی فراوانی تھی اور پھر گھر کے کاموں میں اہلیہ کی مدد بھی ہو جایا کرے گی۔ رضیہ بی بی تب سے ان کے بچوں کی اماں رضیہ بن گئیں۔ سمیع شادی کے بعد کراچی آگیا تھا اور یہاں ہی رہ رہا تھا۔ اس نے انہیں چند مہینے پہلے ہی فیصل آباد سے بلوایا تھا۔
"اماں محبت کی شادی کا مطلب یہ تو نہیں نا کہ اپنی بچی کی پروا بھی نا ہو۔ میں نے کبھی صاحب کو ایمان کو گود میں اٹھاتے نہیں دیکھا۔ ابھی بھی جب آئے تو ایمان اتنا رو رہی تھی لیکن انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ بچی کیوں رو رہی ہے بلکہ یہی پوچھا کہ بیگم صاحبہ کہاں ہیں" رانی نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔ اماں نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ بہر حال ملازمہ تھی۔
"اچھا چلو اٹھو... اب ذرا باورچی خانے میں جھانکو... ہر وقت باتیں نا بھگارتی رہا کو۔"
انہوں نے اسے وہاں سے اٹھایا تھا لیکن اس کے سوال نے انہیں بھی بے چین کیا تھا۔ وہ بھی محسوس کرتی تھیں کہ سمیع بیوی کے لیے کچھ زیادہ ہی اتاولا ہو گیا تھا۔ ہر وقت اس کے پیچھے لگا رہتا۔ اس کے ناز ایسے اٹھاتا تھا جیسے وہ کوئی تین سال کی بچی ہے اور اپنی بچی جو تین سال کی ہونے کو آئی تھی۔ اس کی کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ انہوں نے سوچا تھا کہ وہ سمیع سے اس متعلق بات کریں گی۔

☼ ☼ ☼

"کہاں مصروف تھی۔ میں کب سے میسج کا انتظار کر رہا تھا۔" زری نے سیل فون اٹھا کر ہاتھ میں پکڑتے ہی دیکھا تھا۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھری۔
"پکوڑے بنا رہی تھی۔ کھاؤ گے۔"
اس نے بھی لکھ کر بھیج دیا۔ وہ واقعی کچن سے پکوڑے بنا کر نکلی تھی۔ پودینے کی چٹنی اور ساتھ چائے بھی تھی۔ گرمی اس قدر تھی کہ اس کی شہابی رنگت مزید دہکنے لگی تھی۔ امی اور نینا ایک طویل بحث کے بعد اب شیر و شکر ہوئی پکوڑے کھانے اور چائے پینے میں مصروف ہو گئی تھیں۔ ٹی وی پر کسی ریلیٹی شو کا ریپیٹ ٹیلی کاسٹ چل رہا تھا۔ ان دونوں کی توجہ ٹی وی کی جانب تھی۔ زری اطمینان سے چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے سیل فون میں گم ہو گئی تھی۔
"اونہہ' میں نہیں کھاتا ایسی چیزیں۔ اپنی باڈی سے عشق ہے مجھے۔ میں نہیں چاہتا کہ جب تم مجھے دیکھو تو میں موٹا ہو چکا ہوں۔" دوسری جانب سے جواب آیا۔
"ہاہاہا" زری نے صرف اتنا ہی لکھ کر بھیجا تھا۔ وہ اکثر ہی ایسی باتیں کرتا تھا۔
"ہم تو کہتے تھے میں جم جاتا ہوں۔ جم جانے والے موٹے نہیں ہوتے۔" اس نے دوسرا ٹیکسٹ کیا۔
"ہاں وہ تو جاتا ہوں اور ڈائٹ بھی کنٹرول میں رکھتا ہوں۔ مجھے کھانے پینے سے ذرا کم رغبت ہے۔" جواب آگیا تھا۔

"اچھی بات ہے۔" اس نے لکھ بھیجا۔

"اچھا میری چھوڑو۔ اپنی سناؤ۔ کیا کیا آج سارا دن۔۔۔ مجھے مس کیا۔" اس بار ٹیکسٹ کے ساتھ افسردہ شکل والا ایموشن بھی تھا۔

"نہیں کیوں کروں گی مس۔۔۔ مجھے اور کوئی کام نہیں ہے کیا۔" اس نے مسیج کے ساتھ چڑانے والا ایموشن بھیجا تھا۔ مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھری تھی۔

"نہیں۔۔۔ مجھے مس کرنا سب سے ضروری ہے تمہارے لیے۔"

دوسری جانب وہ بھی کافی فراغت سے کام نمٹا کر بیٹھا ہوا تھا کہ سیکنڈ کے دسویں حصے میں جواب آ بھی جاتا تھا۔

"کیوں۔۔۔ بھئی ضروری کیوں۔؟"

اس نے اپنی مسکراہٹ کو بدقت ہونٹوں کے کناروں سے سمیٹ کر قابو میں رکھتے ہوئے لکھ بھیجا تھا۔

"اس لیے کہ میں تمہارا سوہنو ہوں۔"

"جواب بھی فوراً" آیا۔ مسکراہٹ زری کے چہرے پر بکھر گئی۔ اسے اس جواب سے گدگدی سی ہوئی اور اسی لمحے نمنا نے اسے دیکھا تھا۔ ناگواری کی ایک لہر اس کے اندر اٹھی تھی جسے اس نے چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

"پلیٹ تمہاری گود میں نہیں ہے۔ سامنے پڑا ہے۔" نمنا نے عام سے انداز میں کہا لیکن اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا کہ زری محتاط سی ہو گئی اور اسے برا بھی لگا۔

"نمنا ویسے تم ہو بہت بدتمیز۔ ایک تو میں تمہارے کہنے پر اتنی گرمی میں پکوڑے بنا کر لائی ہوں اوپر سے تم مجھے باتیں سنا رہی ہو۔ یہ نہیں کہ شکریہ ہی بول دو۔" وہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔

"بڑی مہوانی بہن۔۔۔ یہ چار پکوڑے بنانے اور پھر طعنہ دینے کے لیے۔ لیکن تم بھی کھالو ورنہ امی سارے کھا جائیں گی۔"

وہ شرارتی انداز میں بولی۔ اس وقت وہ بالکل فریش موڈ میں تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ کچھ دیر پہلے امی کا دل دکھا کر ان سے بحث کر کے ہٹی ہے۔

"مجھے نہیں کھانے۔ میں موٹی ہو جاؤں گی۔" اس نے انکار کیا۔ نمنا نے پھر اسے گھور کر دیکھا۔

"امی آپ کو نہیں لگتا یہ زری کچھ عجیب سی ہوتی جا رہی ہے۔ موٹی ہو جاؤں گی۔ میری اسکن خراب ہو جائے گی۔۔۔ ناخن ٹوٹ جائے گا۔۔۔ ہاتھ پر نشان پڑ جائے گا۔۔۔ بال رف ہو جائیں گے۔" وہ اس کی نقل اتار رہی تھی۔

امی نے محبت پاش نظروں سے اپنی بڑی بیٹی کو دیکھا۔ اس میں اور نمنا میں دو سال کا فرق تھا۔

"اچھی بات ہے نا۔ اپنا خیال رکھتی ہے تم بھی اپنا خیال رکھا کرو۔ اس کے بال اور اسکن دیکھو اور اپنے بال اور اسکن دیکھو۔" امی نے اسے احساس دلایا تھا۔

"مجھے اور بھی ضروری کام ہیں زندگی میں۔ میں اگر اسکن اور بالوں کے چکر میں پڑ گئی نا تو پھر وہ کام کون کرے گا۔" اس نے ہمیشہ والا رٹا رٹایا جواب دیا تھا۔ امی نے مزید ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا کہ ابھی تو بٹی صاحبہ کا مزاج ٹھیک ہوا تھا۔ زری نے شکر کا سانس لیا کہ اس پر سے توجہ ہٹ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"مرد الجبرا کے سوال کی طرح ہے۔ جس طرح الجبرا کے سوال میں فارمولا سمجھ میں آ جائے تو سوال حل کرنا آسان ہو جاتا ہے اسی طرح شوہر کی رمز بھی سمجھ میں آ جائے تو زندگی آسان ہو جاتی ہے۔"

"یہ وہ سبق تھا جو اس روز صوفیہ نے سیکھا لیکن تب تک دیر ہو چکی ہوئی تھی۔ اسے کاشف نثار سے شدید محبت ہو چکی تھی اور یہ بالکل فطری بات تھی۔ وہ ایک عام سی گھر میں رہنے والی۔ اچھے رشتے کے لیے بیاہی بہنوں اور ماں کے بتائے اصولوں پر عمل کرنے والی لڑکی تھی۔ کاشف نثار اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا اور مرد بھی ایسا کہ جس کی وجاہت کا دم دنیا بھرتی تھی۔ وہ نسبت طے ہونے سے بھی پہلے اس کی تصویر کی پہلی جھلک میں ہی اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ دن بھر آتے جاتے کن انکھیوں سے شوکیس میں سجی اس کی تصویر کو دیکھتے اور رات کو اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھتے دیکھتے' وہ کب سے اس کے لیے زندگی سے بھی زیادہ ضروری ہو گیا' اسے پتا ہی نہ چلا۔

اگرچہ اسے اپنی محبت پر فخر تھا اور کاشف بھی شوہر تو اچھا تھا لیکن بس اس کی چند عادات تھیں جن سے وہ خار کھاتی تھی لیکن افسوس ناک بات یہ تھی کہ وہ ان عادات کو بدل نہیں سکتی تھی۔ کاشف کو اپنی ذات کے معاملے میں بلاوجہ کی مداخلت پسند نہیں تھی۔

انہیں دنوں اسے پتا چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ یہ خبر بہت خوش آئند ثابت ہوئی۔ بی بی جان تو خوش تھیں ہی صوفیہ کا بھی دھیان بٹ گیا۔ ان دنوں کاشف اپنے دکان کی نئی برانچ کھولنے کے تیاریاں کر رہا تھا۔ اس نے اوپن مارکیٹ میں بھی انویسٹمنٹ کی ہوئی تھی اور کسی کمپنی کے شیئرز بھی خرید رکھے تھے۔ اس کا کاروباری حلقہ کافی وسیع ہو رہا تھا۔ وہ کافی ملنسار اور مہمان نواز انسان تھا گھر میں دعوتوں کا اہتمام کرنا اور دوستوں کی دعوت پر خوشدلی سے لبیک کہنا اس کی سرشت تھی۔ وہ اکثر صوفیہ کو بھی اپنے ہمراہ لے جاتا تھا۔ حاملہ ہو جانے کے بعد وہ اس کے ساتھ جا نہیں پاتی تھی۔ بی بی جان کی نصیحت تھی کہ وہ اس حالت میں زیادہ وقت گھر میں گزارے تو اچھا ہے۔ کاشف پارٹیز سے واپسی پر اسے وہاں کی باتیں کم اور حبیبہ کی تعریفیں زیادہ سناتا۔ انہی دنوں وہ ایک پارٹی سے واپس آیا تو صوفیہ پھٹ پڑی۔

"حبیبہ حبیبہ حبیبہ۔۔۔ میں تھک گئی ہوں یہ حبیبہ کا پہاڑہ سن سن کر۔۔۔ آپ کو اس عورت کی تعریف کرنے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں ہے کیا"

"وہ ہے ہی تعریف کے قابل۔۔۔ ہفتے کے سات دن وہ نو پارٹیز اٹینڈ کرتی ہے اور ہر بار ایک نئے روپ میں سامنے آتی ہے۔ اس کی ڈریسنگ' اس کا میک اپ۔ اس کی سوشلائزنگ مجھے متاثر کرتے ہیں تو کیوں نہ کروں اس کی تعریف" کاشف نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ وہ پہلے بھی اس موضوع پر صوفیہ کی برہمی محسوس کر چکا تھا لیکن وہ اسے خاطر میں لانے کو تیار نہیں تھا۔

"اتنی اچھی لگتی تھی تو شادی کیوں نا کر لی اس سے" صوفیہ نے آنسو بہاتے ہوئے کہا تھا۔

"شاید کبھی کر لوں" کاشف کے چہرے پر ابھی بھی مسکراہٹ کم نا ہوئی تھی۔ وہ مردوں کی اس قسم سے تعلق رکھتا تھا جو عورت کو اپنی محبت میں آنسو بہاتا دیکھ کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔

"کب۔۔۔؟" صوفیہ بی بی جان کی ساری نصیحتوں کو بھول چکی تھی۔ کاشف کے اعتراف نے اسے جلا کر رکھ دیا تھا۔

"تمہیں کس بات کی جلدی ہے۔۔۔ صبح تو ہونے دو" وہ ابھی بھی مذاق کے موڈ میں تھا۔ صوفیہ کا پارہ ہائی ہونے لگا۔

"مجھے صاف صاف بتا دیں کاشف وہ آپ کی کیا لگتی ہے۔"

وہ غرا کر بولی تھی۔ آنکھیں ابھی بھی نم تھیں۔ کاشف نے اس کے انداز کو ناپسندیدگی سے دیکھا۔ عورت کا اونچا لہجہ مرد کو کبھی پسند نہیں آتا' یہ تو عورت ہوتی ہے جو مرد کے اونچے لہجے کو اس کی مردانگی سمجھ کر برداشت کر

لیتی ہے۔

"محبوبہ ہے وہ میری۔۔۔ سن لیا تم نے۔۔۔ محبت کرتا ہوں اس سے" وہ بھی غصے سے بولا۔

"تو پھر اسی سے شادی کرتے۔۔۔ میری زندگی برباد کیوں کی" وہ اب اپنے آنسو اور خفگی دونوں چھپا نہیں پائی تھی

"تم اسے زندگی برباد کرنا کہتی ہو۔ ارے زندگی بنا دی میں نے تمہاری ورنہ تم وہیں اپنے چھوٹے سے گھر میں اپنے چودہ بہن بھائیوں اور بھابھیوں کے ساتھ پڑی سڑ رہی ہوتی۔۔۔ جس طرح کا کھانا روزانہ تم میرے گھر میں کھاتی ہو نا اس طرح کے کھانے تم لوگوں کے یہاں صرف عیدوں پر بنتے ہیں۔۔۔ تمہیں جس طرح کے لباس اور دوسری اشیاء میں دلواتا ہوں نا۔۔۔ ایسی اشیاء۔ تم لوگوں کو تب نظر آتی ہیں جب تم لوگوں کے رشتہ دار دبئی سعودیہ سے آتے ہیں۔۔۔ اسے زندگی برباد کرنا کہتی ہو تم۔"

وہ کم ظرف آدمیوں کی طرح اب اپنے احسانات گنوا رہا تھا۔ صوفیہ اس کے بدلتے ہوئے انداز دیکھ رہی تھی اور رو رہی تھی۔

"محبوبہ ہے وہ میری۔۔۔ محبت کرتا ہوں اس سے" اس کے کانوں میں تو بس شوہر کا اعتراف گونج رہا تھا۔

"آپ اتنا ہی بے زار ہیں مجھ سے تو چھوڑ دیں مجھے۔۔۔ بھیج دیں مجھے میرے ماں باپ کے گھر۔۔۔ جہاں میں چودہ لوگوں کے ساتھ رہوں گی لیکن عزت کے ساتھ رہوں گی۔ جہاں مجھے یہ احساس تنگ نہیں کرے گا کہ میرا شوہر ایک آوارہ آدمی ہے" جو غیر عورتوں کے ساتھ ۔ گلچھرے اڑاتا پھرتا ہے" وہ چلا چلا کر بول رہی تھی۔

"صوفیہ آواز نیچی رکھو۔۔۔ بی بی جان سو رہی ہیں۔ میں تم سے آرام سے بات کر رہا ہوں اور تم ہو کہ بے قابو ہوتی جاتی ہو۔۔۔ اتنا شوق ہے اگر اماں کے گھر جانے کا تو میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے 'تم جا سکتی ہو' دروازہ تمہارے سامنے ہے۔"

اس نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ صوفیہ کی آنکھیں اس کے انداز پر پھیل گئی تھیں۔ یہ وہی کاشف تھا جو شادی کے شروع کے دنوں میں اس کا دم بھرتا نا تھکتا تھا۔ اس نے اپنا دوپٹا اٹھایا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

یہ زندگی کا ایک عجیب سا رخ تھا جو اسے احساس دلا رہا تھا کہ جب مائیں بیٹیوں کو دیکھ دیکھ کر ان کے اچھے نصیب کی دعائیں مانگتی ہیں تو کیوں مانگتی ہیں۔ اسے سمجھ میں آ رہا تھا کہ اچھا نصیب بڑے گھر کا نام ہے 'نا زرق برق کپڑے لتے کا۔۔۔ نہ پیٹ بھر کھانے کی لذت ہے 'نا آرام دہ بستر پر سونے کی سہولت۔۔۔ یہ نصیب اس رویے کا نام ہے جس کے تحت ماں باپ اپنے جگر کے ٹکڑے پالتے ہیں اور پھر صرف یہ دعا کرتے ہیں کہ جیسا ہم نے انہیں محبت سے پالا۔۔۔ یا اللہ انہیں آئندہ زندگی میں بھی یہی محبت عطا کرنا۔ وہ آنسو بہاتی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئی تھی۔ بی بی جان کے کمرے کی لائٹ بند تھی۔ وہ اس وقت ان کے کمرے میں بھی نہیں جا سکتی تھی اس لیے چپ چاپ وہیں صوفے پر لیٹ گئی۔ روتے رہنے سے آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں اور سر میں بھی درد ہونے لگا تھا' اسے صبح کا انتظار تھا جب بی بی جان اٹھتیں اور اس کے درد کا مداوا کرتیں۔

☆ ☆ ☆

"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی صوفیہ۔"

بی بی جان نے تاسف بھرے انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ کاشف بھی ان کے کمرے میں موجود تھے۔

"بی بی جان یہ کہتے ہیں حبیبہ سے محبت ہے انہیں۔۔۔ تو پھر بتائیں۔۔۔ میری کیا حیثیت ہے" وہ ایک دفعہ پھر بلکی۔

"لاحول ولا۔۔۔ بی بی جان دیکھ رہی ہیں یہ کیسے واہیات الزام لگا رہی ہے مجھ پر۔۔۔" کاشف تڑپ کر بولا تھا۔

"بی بی جان انہوں نے خود میرے سامنے اعتراف کیا تھا" وہ کاشف کے انداز پر حیران رہ گئی۔ اب کس قدر مودب بنا بیٹھا تھا وہ۔

"بی بی جان یہ ہر بات میں مجھ پر شک کرتی ہے۔۔۔ کیا کیوں کیسے۔۔۔ کون اور کس لیے۔۔۔ اس کی پیشانی پر تیوریاں نہیں پڑتیں بلکہ یہ سوال اور سوالیہ نشان پڑتے ہیں۔۔۔ میں کیا اتنا گھٹیا آدمی ہوں کہ اپنے دوست کی بیوی پر بری نظر رکھوں گا اور یہ تو مجھے کسی بھی عورت کے ساتھ بات کرتا دیکھتی ہے تو ایسے منہ بنا لیتی ہے جیسے میں نے اسے گود میں بٹھا لیا ہے۔۔۔ کیا میں اتنا ہی گیا گزرا ہوں کہ ہر عورت کو دیکھ کر رال ٹپکانے لگوں گا۔"

وہ تنک کر بولا تھا۔ اس کے ہر جملے کے ساتھ بی بی جان افسوس سے سر ہلاتے ہوئے صوفیہ کو دیکھتی تھیں۔ صوفیہ بالکل چپ بیٹھی تھی۔

"میری زندگی اجیرن کر دی ہے اس نے۔۔۔ آپ بتائیں کیا میں چوڑیاں پہن کر گھر بیٹھ جاؤں۔۔۔ برقع پہن کر لوگوں کی نظروں سے روپوش ہو جاؤں یا کوئی بہن جیسی کزن' بھابھی جیسی دوست کی اہلیہ مجھ سے مخاطب ہوں تو منہ سی کر بیٹھ جاؤں کہ میں بات نہیں کروں گا آپ سے۔۔۔ میری زوجہ محترمہ برا مناتی ہیں" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتا سارا الزام اس کے سر ڈالتا جا رہا تھا۔

"میں کاروباری آدمی ہوں۔۔۔ کاروبار کے سو اسرار و رموز ہوتے ہیں۔ سو جھوٹ سچ بولنے ہوتے ہیں۔ مجید میرا کلائنٹ ہے۔۔۔ لاکھوں کا بزنس دیتا ہے مجھے۔۔۔ تو اگر ضرورت کے تحت میں اس کی بیوی کو خریداری کے لیے لے گیا یا اس کے کھانے اور کپڑوں کی تعریف کر دی تو کیا فرق پڑ گیا۔۔۔ ضرورت باہمی میں نا جانے کیا کیا کرتے ہیں لوگ اور میں تو صرف تعریف ہی کرتا ہوں" کاشف اب اسی جانب دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ صوفیہ اس کی ڈھٹائی پر دل ہی دل میں جل کر خاک ہو رہی تھی۔

"تم یہاں سے جاؤ کاشف۔۔۔" بی بی جان نے اس کی بات ختم ہونے پر اسے وہاں سے چلے جانے کے لیے کہا۔

"بیٹی میں نے تمہیں اس دن کیا سمجھایا تھا۔۔۔ لگتا ہے تمہیں میری کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

بی بی جان اسے بیٹی کہتی تھیں اور اپنے بیٹے کو اس بیٹی کا خیال رکھنے کو بھی نہیں کہتی تھیں۔ صوفیہ کو اس لمحے وہ بہت دوغلی لگیں۔

"میری بچی! میں یہ نہیں کہتی کہ تم غلط کہہ رہی ہو یا کاشف کے رویے نے تمہارا دل نہیں دکھایا ہو گا لیکن بیٹی مرد نا جانے کیا کیا کرتے ہیں۔۔۔ میرا بدبخت بیٹا تو صرف زبانی کلامی تعریفیں ہی کرتا ہے۔۔۔ میری جان سمجھنے کی کوشش کرو یہ اس کے کاروباری تقاضے ہیں۔۔۔ تم کیوں جل جل کر اپنا خون کالا کرتی ہو۔ تم اپنی حالت دیکھو اور حلیہ دیکھو۔۔۔ بکھرے بال۔ سوجی ہوئی آنکھیں۔۔۔ صبح سے خالی پیٹ گھٹنوں میں منہ دے کر بیٹھی ہو۔ بیٹی! جب بچہ پیٹ میں ہو تو سمجھو ماں کی ذمہ داری تب سے شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے ہنسنے' بولنے' رونے' گنگنانے اور گڑگڑانے تک کا اثر بچے پر پڑتا ہے۔۔۔ تم بس آج کل اپنا اور بچے کی صحت کا خیال رکھو۔۔۔ باقی ہر مسئلے کو جوتے کی نوک پر رکھو چاہے وہ حبیبہ ہو یا نصیبہ۔۔۔ اب جاؤ نہاؤ' کپڑے تبدیل کرو۔۔۔ اور کاشف کو میرے پاس بھیجو۔"

انہوں نے بات ختم کر کے اسے چلے جانے کے لیے کہا تھا۔ وہ خاموشی سے بوجھل دل لیے اپنے کمرے میں آ گئی۔

☆ ☆ ☆

"مجھ سے اب تک ناراض ہو"

رات کو کاشف نے اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے نرمی سے پوچھا تھا۔ بی بی جان نے بیٹے کے بھی اچھے کان کھینچے تھے تب ہی اس نے نا صرف صوفیہ سے معافی مانگی تھی بلکہ برے رویے کے ازالے کے طور پر اسے کھانا کھلانے باہر لے گیا تھا اور واپسی پر اسے سونے کے بندے بھی دلوائے تھے۔ وہ اس سے بار بار محبت کا اظہار کرتا رہا تھا اور اس کی تعریفیں بھی کرنے میں مگن تھا۔ صوفیہ کافی مطمئن ہو گئی تھی اور رات والی باتیں اسے ایک ڈراؤنا خواب لگ رہی تھیں جواب ختم ہو چکا تھا۔ وہ بستر پر اس کے قریب ہی بیٹھی تھی جب اس نے پوچھا۔

"نہیں کاشف۔۔۔ اب نہیں ہوں۔۔۔ پہلے ناراض تھی۔" وہ سادہ سے انداز میں بولی تھی۔

"کیوں۔۔۔ اب ناراضی ختم ہو گئی؟" وہ چڑانے والے انداز پوچھ رہا تھا۔

"میں آپ سے ناراض نہیں رہ سکتی کاشف۔۔۔ میں رات بھر سو نہیں سکی۔۔۔ آپ کی رات والی باتیں میرے کانوں میں کسی بھدے بے ہنگم ساز کی طرح کانوں میں گونجتی رہی ہیں۔۔۔ آپ پلیز دوبارہ مجھ سے کبھی ایسے بات مت کرنا۔"

وہ اس کے قریب ہو کر بولی تھی۔ کاشف نثار نے اس کے انداز پر نثار ہوتے ہوئے اسے خود سے قریب کیا تھا۔

"صوفیہ ایک بات تم بھی یاد رکھو۔۔۔ مجھے شک کرنے والی بیوی نہیں چاہیے تھی۔۔۔ یہ بات مجھے سب سے زیادہ بری لگتی ہے کہ انسان کی لائف پارٹنر کو اس پر بھروسا نا ہو۔۔۔ یہ میاں بیوی کے درمیان ایک صحت مند رشتے کو پنپنے نہیں دیتا۔۔۔ دوسرا' یہ بات بھی یاد رکھو۔۔۔ کہ آج کے بعد ہمارے بیڈ روم سے باتیں باہر نہیں جائیں گی۔ تم اگر میری ماں سے میری شکایتیں کرو گی تو میں بھی تمہاری ماں سے تمہاری شکایتیں کروں گا۔۔۔ ایک کمرے سے بات نکلے گی تو گھر کے باہر بھی پہنچ جائے گی' اس سے تعلقات مضبوط نہیں ہوں گے بلکہ مزید خراب ہوں گے۔۔۔ میں تمہارے ساتھ کٹی پھٹی خراب زندگی نہیں جینا چاہتا۔۔۔ تم میری بیوی ہو۔۔۔ کچھ دن بعد تم میری اولاد کی ماں کہلاؤ گی۔۔۔ میں تمہیں ڈی گریڈ کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

وہ بہت محبت سے کہہ رہا تھا۔ صوفیہ کو بہت سکون ملا۔

"اور حبیبہ۔۔۔؟" اس نے اٹھلا کر سوال کیا تھا۔

"اسے بھول جاؤ۔ وہ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ہے۔ آتا ہے۔ اپنا احساس ـــــ دلاتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے۔" کاشف نے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں کہا تھا۔ صوفیہ اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

"میں کب سے تمہاری راہ تک رہا تھا" سلیم نے اسے دیکھتے ہی شکوہ کناں انداز میں کہا تھا۔

"کیوں۔۔۔؟" وہ اپنے مخصوص لٹھ مار کہ انداز میں بولی۔

"تمہاری یاد آرہی تھی" اس نے کاؤنٹر کے اوپر بنے چھوٹے سے دروازے کو کھول کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا تھا۔

"جتنی اوقات ہے نا اتنی ہی باتیں کیا کرو۔۔۔ اس سے زیادہ کرو گے تو طبیعت اور حالات دونوں بگڑ جائیں گے" وہ اندر آتے ہوئے بولی تھی پھر ہاتھ میں پکڑی پلیٹ اسے تھما دی۔

"یہ لو میری چہیتی بہن نے بہت مزے کے پکوڑے بنائے تھے۔ تمہارے لیے لائی ہوں" سلیم تب تک پلیٹ پر پڑا رومال ہٹا کر پکوڑا منہ میں بھی رکھ چکا تھا۔

"مہربانی ملکہ عالیہ۔۔۔ آپ نے اتنی عنایت کی کہ غریب کو پکوڑے کھلانے کے بارے میں سوچا"

وہ وہیل چیئر کو ریورس کر کے پیچھے لے گیا تھا۔ چھ بجنے والے تھے اور لائٹ جانے کے کوئی اوقات نہیں تھے۔

وہ باہر کی جانب پڑی ہوئی چیزیں لائٹ جانے سے پہلے اٹھا لیا کرتا تھا لیکن اب اسے دیکھ کر وہ پکوڑے کھانے بیٹھ گیا تھا۔ نینا کاؤنٹر پر پڑے جار اور پیکٹ چیک کرنے لگی۔

"تم جلی ملی نہیں لائے؟" اسے مطلوبہ چیز نہیں ملی تھی۔ سلیم نے نفی میں سر ہلایا۔

"کسی کام کے نہیں ہو تم اور تمہاری یہ پھٹیچر دکان تو بالکل کسی کام کی نہیں ہے" وہ چڑ کر پیچھے والے کاؤنٹر پر بیٹھ گئی تھی۔

"نینا بیگم زبان کو لگام دو۔۔۔ میں اپنی شان میں گستاخی تو برداشت کر لیتا ہوں لیکن اپنی دکان کے لیے کوئی بھی نا مناسب لفظ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

وہ اپنے پیچھے پڑے پیکٹ سے کچھ نکال کر اس کی جانب اچھال کر بولا۔ نینا نے مہارت سے کیچ کیا تھا' وہ جلی ملی کا پیکٹ تھا' اس نے بنا شکریہ ادا کیے پیکٹ کھولا اور منہ میں جیلی رکھتے ہوئے بولی۔

"مینڈکی کو زکام تو سنا تھا۔۔۔ یہاں ہیجوے کو بھی چھینکیں آنے لگیں' خدا خیر کرے زمانہ بگڑتا جا رہا ہے" وہ اسے خاطر میں نہیں لاتی تھی۔

"تم مجھے ہیجوا کہہ رہی ہو؟" وہ پوچھ رہا تھا حالانکہ جانتا تھا وہ اسے ہی کہہ رہی ہے۔

"تمہیں کوئی شک ہے۔۔۔؟ وہ جلی ملی اڑانے میں مشغول تھی۔ سلیم وہ واحد انسان تھا جس سے اس کی خوب جمتی تھی۔

"شرم تو نہیں آتی اپنے کزن کو ہیجوا کہتے ہوئے" وہ افسوس سے سر ہلا کر بولا۔

"شرم ہیجوے کو آئے۔۔۔ یا تمہیں آئے۔۔۔ مجھے کیوں آئے۔۔۔ یہ تمہارا اور اس کا معاملہ ہے۔ اپنے معاملات سے مجھے دور رکھو" اس کا پیکٹ ختم ہو چکا تھا۔

"آج تمہارے ابا گھر نہیں تھے کیا' جو تم زبان کے جوہر دکھانے کے لیے محلے میں نکل آئی ہو" سلیم نے تاک کر حملہ کیا تھا۔ ابا کے نام پر اس نے منہ بنایا۔

"سلیم بابو! توڑ دیا ہے نا بچی کا دل ابا کا نام لے کر۔۔۔ کیا تھا جو ہنس کر' دو دل کی باتیں سن لیتے۔۔۔ مگر نہیں تم بھی زمانے کے ساتھ مل گئے ہو۔۔۔ خون سفید ہو گیا تمہارا بھی" خالی ریپر کا گولہ سا بنا کر اسے پاس پڑی باسکٹ میں پھینکتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی پھر باہر نکلتے نکلتے رکی۔

"لاؤ دو۔۔۔" وہ کچھ مانگ رہی تھی۔ سلیم مسکرایا پھر وہیل چیئر آگے کر کے کاؤنٹر کی دراز سے ایک خاکی پیکٹ نکالا تھا جس پر بڑا بڑا کر کے ایک ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ نینا نے پکڑ کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔

"احمد علی" اس نے اس پر لکھا نام پڑھا تھا پھر سر ہلایا۔

"آج پھر یہی نام لکھ دیا۔۔۔ تمہیں سلیم علی لکھتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے؟" وہ چڑ کر پوچھ رہی تھی۔ سلیم نے گہری سانس بھری پھر بے بسی سے مسکرایا۔

"میں نہیں چاہتا کسی کو میرے بارے میں پتا چلے۔"

"کیوں۔۔۔ تم تھانے میں مطلوب ہو" نینا کو جرح کی عادت تھی۔

"لوگوں کے لیے ظاہری چمک دمک بڑی اہمیت کی حامل ہے اور میرے پاس کیا ہے اس ٹوٹی ٹانگ اور بیساکھی کے علاوہ۔۔۔ تعلیم بھی رو دھو کر انٹر۔۔۔ لوگ یقین نہیں کریں گے کہ ایک لولا لنگڑا انٹر پاس عام سی شکل و صورت والا کریانے کی دکان کا مالک شاعری بھی کر سکتا ہے یا اس کی کہانیاں ڈائجسٹ میں چھپتی ہیں۔۔۔"

وہ یاسیت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ نینا کو دل ہی دل میں اس کے انداز پر ترس آیا مگر عادت سے مجبور تھی اس لیے سر ہلا کر بولی۔

"ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔ کون یقین کرے گا بھلا کہ یہ پھوڑ جیسا انسان اتنی اچھی شاعری کر سکتا ہے اور اتنی اچھی کہانیاں لکھ سکتا ہے کہ اس کے نام کے ڈھیروں تعریفی خطوط آتے ہیں۔"

"اسی لیے تو اپنا نام نہیں لکھتا۔۔۔ لوگوں کی پھبتیوں سے ڈر لگتا ہے۔"

وہ سابقہ انداز میں بولا تھا۔ سارے محلے اور گھر والوں کے سامنے ہمہ وقت ہنستے رہنے والا سلیم نہنا کے سامنے کبھی کبھی افسردہ ہو جایا کرتا تھا' نہنا کے ساتھ اس کا عجیب رشتہ تھا' وہ اس کی کزن بھی تھی' سہیلی بھی اور رازداں بھی۔

"چہ چہ۔۔۔ کتنے بے چارے انسان ہو تم۔۔۔ بہت افسوس ہوا تمہاری دکھی داستان سن کر۔۔۔ تم خودکشی کر لو پہلی فرصت میں۔۔۔ یہ دنیا اب تمہارے رہنے کے قابل نہیں رہی۔۔۔ یہ دکان مرنے سے پہلے میرے نام کر جانا۔۔۔ میں تمہاری ہیلی چیئر پر بیٹھ کر ٹافیاں بیچا کروں گی۔ اور تمہاری تصویر بھی یادگار کے طور پر یہاں سامنے لٹکا دوں گی۔"

وہ سر ہلاتی جا رہی تھی اور ساتھ ساتھ چلی ملی کے پیکٹ بھی اٹھا رہی تھی۔ ہاتھ اور زبان دونوں ایک پھرتی سے چل رہے تھے۔

"مر جاؤ تم نہنا۔۔۔ ٹھیک سے جذباتی بھی نہیں ہونے دیتیں۔" وہ اس کی بات پر ہنسا تھا۔

"ایک بات یاد رکھنا۔۔۔ نہنا کو جذبات سے چڑ ہے یہ بندہ کھا جاتے ہیں۔۔۔ مت دھیان دو لوگوں کی باتوں پر۔۔۔ اپنے اندر حوصلہ پیدا کرو کہ دنیا کا سامنا اس بیساکھی کے ساتھ کر سکو۔۔۔ تمہاری شاعری' تمہارا ہنر ہے تمہارا قلم' تمہارا ہتھیار ہے اور یہ بیساکھی تمہاری سہیلی ہے۔۔۔ انہیں اپنی طاقت سمجھو۔۔۔ تم گرنے لگو گے نا تو کسی بھی انسان سے پہلے یہ لکڑی کا ڈنڈا تمہاری مدد کو آئے گا۔۔۔ فخر کرو ان چیزوں پر سلیم بابو" وہ اب باہر نکل رہی تھی۔ سلیم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ نہنا بی بی بھی کسی کی مسکراہٹ کا موجب ہو سکتی ہے۔

"ارے ظالم پورے پانچ پیکٹ چلی ملی کے اٹھا لیے۔۔۔ دو تو واپس کر دو' میں پیسوں کے خرید تا ہوں۔ مفت نہیں اٹھاتا' تمہارے ابا کی طرح رئیس نہیں ہوں"

وہ ہنستے ہوئے بولا تھا۔ نہنا منہ چڑاتے ہوئے اپنے گھر کی جانب چل دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا سوچ رہی ہو؟" سمیع نے اسے آئس کریم پکڑاتے ہوئے سوال کیا تھا۔ وہ مسکرائی مگر چہرہ پھر بھی بجھا بجھا سا تھا۔

"یہی سوچ رہی تھی کہ زندگی میں نا جانے کون سی نیکی کی تھی کہ اللہ نے اتنا اچھا جیون ساتھی عطا کیا۔" وہ مسکرائی تھی۔ سمیع بھی اس کے ساتھ بونٹ پر بیٹھ گیا۔ غروب آفتاب کا وقت ہونے والا تھا' سورج اپنا سنہری بکھرا بکھرا ساز و سامان سمیٹنے میں مشغول تھا۔ ہوا میں ہلکی سی نمی محسوس ہوتی تھی۔ اس نے آفس میں آج ایک تھکا دینے والا دن گزارا تھا اور گھر آتے ہی کچھ دیر لیٹنے کا ارادہ تھا لیکن شہرین کی فرمائش پر وہ اسے ساحل سمندر کی ہوا کھلانے لے آیا تھا۔ شہرین کو انکار کرنا اس کی عادت نہیں تھی بلکہ وہ تو خواہش کرتا تھا کہ وہ کہیں باہر چلنے کی فرمائش تو کرے لیکن وہ حد درجہ گھر گھسنی ہو چلی تھی۔ اسے گھومنے پھرنے سے رغبت نہیں رہی تھی۔

"یہ بات تو میں بھی اکثر سوچتا ہوں" وہ مسکرا کر بولا۔

"کیا۔۔۔؟" شہرین نے اڑتی ہوئی لٹوں کو ایک ہاتھ سے قابو کرنے کی کوشش کی تھی جو آئس کریم کھانے کی راہ میں سخت رکاوٹ بن رہی تھیں۔

"یہی کہ اللہ نے تمہیں کتنا اچھا جیون ساتھ عطا کیا ہے۔۔۔ نظر اتارتی رہا کرو میری۔"

"ہمہ وقت اتارتی ہوں۔۔۔ اللہ کی ذات کا شکر ادا کرتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ اللہ تمہیں ہمیشہ میرا رکھے" وہ

تشکر کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

"آمین۔۔۔ اور تمہیں بھی صرف میرا رکھے۔۔۔ ہمیشہ آمین۔"

اس نے کہنے کے ساتھ ساتھ آئس کریم کا لقمہ لیتے ہوئے شہرین کی شکل بھی دیکھی پھر اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ "آمین" کہنے میں میرا ساتھ دو لیکن وہ چپ چاپ آئس کریم کھانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

"جب کوئی دعا دیتا ہے نا شہرین جی تو آمین کہنا سننے والے پر لازم ہے" وہ اس کی خاموشی سے مصنوعی انداز میں اکتا کر بولا تھا۔

"آمین کہنے سے دعا قبول ہو جاتی ہے؟"

وہ سرسری سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔ سمیع کو اندازہ تھا کہ وہ غائب دماغی کی سی کیفیت میں ہے۔

"سیانے تو یہی کہتے ہیں کہ قبول ہو جاتی ہے۔" وہ آئس کریم میں مگن بولا۔

"اچھا تو پھر آمین۔۔۔" وہ بولی۔

"ثم آمین" سمیع نے کہا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"مت سوچا کرو اتنی باتیں۔۔۔ اللہ نے یہ جو چھوٹا سا دماغ دیا ہے نا اس میں بس میری یاد اور میری سوچ کو رکھا کرو۔۔۔ باقی کے سوال جواب زمانے والوں کو حل کرنے دو۔۔۔ ہمارا بھی بھلا ہو گا اور ان کا بھی" اس کی آئس کریم ختم ہو چلی تھی۔ وہ اپنی محبوب بیوی کی دل جوئی کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ جب جب بھی وہ اپنی امی سے بات کرتی تھی ہرٹ ہو جاتی تھی۔ ان کی شادی کے بعد سے وہ اس سے تعلقات ختم کر چکے ہوئے تھے اور عید شب رات پر بھی ملنے کے روادار نہ رہے تھے شہرین کے لیے یہ صورت حال بعض اوقات بڑی تکلیف دہ ہو جاتی تھی۔

"میں کب سوچتی ہوں سمیع" سوچیں خود با خود آتی ہیں۔۔۔ پتا بھی نہیں چلتا کب دماغ مشرق کی طرف چلتا' مغرب کی جانب گھومنا شروع ہو جاتا ہے" اس کے انداز میں لاچاری تھی۔ سمیع نے اسے دیکھا پھر آئس کریم کا آخری بائٹ لے کر دونوں ہاتھوں سے اس کی اڑتی زلفوں کو پکڑ کر کانوں کے پیچھے اڑستا ہوا بولا۔

"زندگی آئس کریم ہے۔۔۔ میٹھی مگر جلد ختم ہو جانے والی۔۔۔ اسے فضول سوچوں میں ضائع مت کرو۔۔۔ میری خاطر میں تمہیں ناخوش دیکھتا ہوں نا' تو دل چاہتا ہے خود کو گولی مار لوں۔۔۔ نا میں تم سے شادی کرتا' نا تمہارے گھر والے تم سے قطع تعلق کرتے" وہ اس کے گالوں پر ہاتھ رکھے ہوئے بولا تھا۔ اس کے ہاتھوں کے نیچے شہرین کے بال دب گئے تھے۔

"نہیں سمیع یہ بات نہیں ہے۔۔۔ میں خوش ہوں' بہت خوش۔" وہ اسے یقین دلا رہی تھی۔ سمیع کو اس کے جھوٹ بولنے پر بھی پیار آیا۔

"مان لیا بیگم صاحبہ۔۔۔ چلو اب میں تمہاری ان بدتمیز لٹوں کو سنبھالتا ہوں۔۔۔ تم یہ آئس کریم ختم کرو" اس نے اپنے ہاتھ نہیں ہٹائے تھے۔ شہرین مسکرائی تھی پھر اس نے کون کو منہ کے قریب کرنا چاہا تھا کہ سامنے نگاہ پڑی۔ وہاں جو بھی کھڑا تھا ان دونوں کو ہی دیکھ رہا تھا۔۔۔ شہرین ساکت رہ گئی تھی۔

☼ ☼

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

نبیلہ ابر راجہ

میں گمان نہیں یقین ہوں

پانچویں قسط

وہ جہاں کی تہاں اپنی جگہ کھڑی رہی۔ چھت پہ چاند کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس ہلکی روشنی میں اس نے ایک سائے کو اپنی طرف بڑھتے محسوس کیا۔ زیان قدم پیچھے کی طرف موڑتی بالکل دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ آنے والا وہاب کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ گویا اس کی چھٹی حس نے اسے بالکل درست سمت میں اشارہ دے کر خبردار کیا تھا۔

"زیان تم اس وقت یہاں... لگتا ہے میری طرح تمہیں بھی نیند نہیں آرہی ہے۔"

زیان جس طرف کھڑی تھی، وہاب نے اس طرف دیوار پہ ایک بازو پھیلا دیا اب وہ اس کے سامنے دیوار بن کر خود بھی حائل تھا۔ وہ بہت دوستانہ انداز میں بات کر رہا تھا۔ زیان کی طرف سے جواباً خاموشی طاری رہی۔

کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟" اس نے ایک قدم آگے کی بڑھایا تو زیان کو کوفت نے آن گھیرا۔

"میری کسی کے ساتھ کوئی ناراضی نہیں ہے" وہ رکھائی سے بولی۔

"پھر سارا دن تم اپنے کمرے سے کیوں نہیں نکلتی ہو میں جب بھی آتا ہوں تم غائب ہو جاتی ہو۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے" اس کی سرد مہری برقرار تھی۔ وہ چاہ رہی تھی وہاب آگے سے ہٹے تو وہ نیچے جائے۔ اگر اسے علم ہوتا کہ وہاب پہلے سے چھت پہ موجود ہے وہ اوپر کبھی نہ آتی۔

"مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی ہے میں جب بھی آتا ہوں تم جھٹ خود کو کمرے میں بند کر لیتی ہو جیسے میں کوئی آدم خور بلا ہوں۔"

"یہ میرا گھر ہے میں کمرے میں رہوں یا باہر بیٹھوں میری مرضی" وہ وہاب کو کوئی بھی رعایت دینے کے موڈ میں نہیں تھی۔ وہاب کے ساتھ اس وقت ٹکراؤ اسے ازحد کوفت میں مبتلا کر رہا تھا۔

"زیان لائف ایسے تو نہیں گزرے گی تم میری ہونے والی بیوی ہو۔ خود کو بدلو۔"

"کیا کہا تم نے... تمہاری اتنی جرأت کہ تم مجھ سے یہ بات کہو۔" وہ شاکڈ تھی۔ حالانکہ اس نے عفت خانم اور وہاب کے مابین ہونے والی باتیں خود سنی تھیں پر وہاب نے آج تک کھل کر اسے کچھ نہیں کہا تھا۔ صرف نظروں سے اسے جلاتا اور اس کی یہ معنی خیز پراسرار نگاہیں زیان کو سخت بری لگتیں۔ ابھی اس نے ایک دم اتنی بڑی بات کر دی تھی۔ رات کے اس سناٹے میں زیان کی آواز اچھی خاصی محسوس ہو رہی تھی۔ کیونکہ اس کی آواز میں غصہ اور تیزی تھی۔

"زیان مجھے غصہ مت دلاؤ ویسے ہی زرینہ خالا نے حد کر دی ہے۔" وہاب منہ اس کے قریب لا کر جیسے پھنکارا تھا۔

"آئی سے گیٹ آؤٹ، ورنہ میں حشر کر دوں گی تمہارا۔"

زیان میں اس وقت اچانک جانے کہاں سے جرأت آگئی تھی ورنہ ابو کی وفات کے بعد اسے وہاب سے عجیب سا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

"میں نے بہت برداشت کیا ہے صبر کے ساتھ" وہاب نے جھپٹ کر اس کا بازو اپنی مضبوط گرفت میں جکڑا۔

"میرا بازو چھوڑو" وہ نیچی آواز میں غصے سے غرائی۔

"نہیں چھوڑتا۔ انسان ہوں محبت کرتا ہوں تم سے۔ پیار کا اظہار کرنے کے لیے ترس رہا ہوں اور تم مجھے لفٹ ہی نہیں کرواتیں۔"

وہاب نے اس کا دوسرا بازو بھی پکڑ لیا جیسے اسے پورا یقین ہو کہ وہ کہیں نہیں جائے گی۔ زیان گھبراہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ وہاب سے اس درجہ قربت اعصاب پہ اثر انداز ہو رہی تھی۔ پر یہ اثر خوشگوار معنوں میں ہرگز نہیں تھا، منفی تھا۔

"میں جوان ہوں سینے میں دل رکھتا ہوں۔ میری عمر کے نوجوان بہت کچھ کرتے ہیں۔ مجھے بھی تمہارے ساتھ محبت کی وہ سب منزلیں طے کرنی ہیں۔" وہاب کی دست درازی بڑھ رہی تھی۔ زیان پیچھے ہوئی۔

"مجھے چھوڑو اور شرافت سے پیچھے چلے جاؤ۔ ورنہ میں شور مچا دوں گی"

مکمل ناول

"تم کیا سمجھتی ہو شور مچا کر مجھ سے بچ جاؤ گی۔" وہاب عجیب سے لہجے میں بولتا اپنا چہرا اس کے قریب لایا تو زیان نے سوچے سمجھے بغیر اس کے چہرے پہ تھوک دیا۔ صورت حال کو سمجھنے میں وہاب کو صرف چند لمحے ہی لگے اس کے بعد شیطان پوری طرح اس پہ حاوی ہو گیا۔ اس نے زیان کے منہ پہ اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا۔

"میں تو صلح و صفائی سے تمام معاملات طے کرنا چاہتا ہوں مگر اب تم نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ شادی سے پہلے ہی تمہیں دلہن بنا دوں۔" وہ خون رنگ لہجے میں اس کے کان میں بولا۔

زیان کے دونوں ہاتھوں کو اس نے اپنے ایک ہاتھ میں جکڑ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے زیان کے منہ کو دبا رکھا تھا تاکہ وہ شور مچا کر کسی کو متوجہ نہ کر سکے اس لیے وہ اپنی من مانی نہیں کر پا رہا تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پہ اس کا ہاتھ زیان کے منہ سے ہٹا تو اس نے زوردار چیخ ماری اور وہاب کے ہاتھ پہ اپنے دانت گاڑ دیے۔ وقتی طور پہ وہاب کی توجہ اس کی طرف سے ہٹی تو اس نے اونچی آواز میں پہلے بوا اور پھر زرینہ آنٹی کو پکارا۔

اس کی خوش قسمتی تھی کہ پہلی چیخ پہ ہی بوا متوجہ ہو گئیں۔ وہ تہجد کی نماز سے فارغ ہو کر تسبیح پڑھ رہی تھیں جب زیان کی جگر پاش آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ "بوا مجھے بچاؤ۔ زرینہ آنٹی پلیز بچاؤ۔"

بوا نے دل پہ ہاتھ رکھا۔ لائیٹ آ چکی تھی انہوں نے جوتے پہنے بغیر آواز کی سمت رخ کیا۔ زرینہ کا دروازہ اوپر جانے سے پہلے انہوں نے زوردار آواز میں دھڑ دھڑایا۔ وہ اس اچانک افتاد پہ ہڑبڑا کے بے دار ہوئیں۔

سب سے پہلے بوا اور ان کے پیچھے پیچھے زرینہ بیگم سیڑھیاں چڑھتی اوپر آئیں۔ زیان نے جونہی چیخیں ماریں وہاب اسے چھوڑ کر بجلی کی تیزی سے غائب ہوا۔ بوا اور زرینہ کو زیان اکیلی چھت پہ روتی ہوئی ملی۔ وہ غصے اور خوف کی زیادتی سے کانپ رہی تھی بوا نے اسے فورا" ساتھ لپٹا لیا "کیا ہوا میری بچی سب ٹھیک ہے ناں؟"

"بوا۔۔۔ بوا وہ وہاب۔۔۔!" غصے اور شرم کی وجہ سے زیان اپنی بات مکمل نہ کر سکی۔ اس کی ادھوری بات میں جو معنی پنہاں تھے اس کو سمجھنے کے لیے کسی خاص عقل یا دلیل کی ضرورت نہیں تھی۔

زرینہ بیگم کو وہاب کی طرف سے پہلے ہی کسی گڑبڑ کی توقع تھی۔ اس کے تیور جارحانہ تھے وہ بپھرے ہوئے دریا کی مانند تھا جس پہ صبر اور جبر کا مزید کوئی بند باندھنا تقریبا" ناممکن ہو گیا تھا۔ زیان جس کی ایک جھلک کی خاطر وہ چار سال سے خالا کے گھر کے چکر کاٹ رہا تھا آج اسے اکیلا پا کر وہ چھوڑنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا۔ اسے پتا تھا زیان کو اس سے سخت نفرت ہے۔ زیان کے نسوانی پندار کو روند کر وہ ہمیشہ کے لیے اسے سرنگوں کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ پھر اس سے شادی سے انکار کی جرات ہی نہ کر سکے۔ قسمت نے یہ موقعہ فراہم کیا تھا پر وہ اس موقعے سے زیان کے شور مچانے کی وجہ سے استفادہ نہ کر پایا۔ اور تیزی سے منظر سے غائب ہو گیا۔

"کیا ضرورت تھی اس وقت چھت پہ آنے کی۔ میں کہاں تک رکھوالی کروں تمہاری۔" زرینہ زیان پہ غصے ہو رہی تھیں۔

"امیر علی خود تو مر گئے اپنی مصیبت میرے سر ڈال گئے۔ اچھا خاصا رشتہ طے کیا تھا تمہارا لیکن تم نے مان کے نہیں دیا۔ اب بھگتو۔۔۔ بچاؤ اپنی عزت۔۔۔ بناؤ میرا تماشا۔ میرے پاس ایک عزت ہی تو ہے لگ رہا ہے اس کی بھی نیلامی ہونے والی ہے۔"

بوا اور زرینہ کی مدد سے زیان چھت سے نیچے آ گئی تھی اب وہ تینوں بوا کے کمرے میں تھے۔ حیرت انگیز طور پہ روبینہ باہر نہیں نکلی تھیں شاید ان تک زیان کے شور مچانے کی آواز پہنچی ہی نہیں تھی اس لیے وہ مزے سے سو رہی تھیں۔

زیان رو رہی تھی۔ زرینہ گرج برس کے خاموش ہو گئی تھیں۔ کچھ بھی سہی بات پریشانی والی تھی۔ وہاب

کی یہ گھٹیا حرکت نظرانداز کرنے والی نہیں تھی۔ اس نے ان کے گھر میں بیٹھ کر زیان کی عزت کی دھجیاں اڑانے کی ناکام کوشش کی تھی اس نے زرینہ کی تازہ تازہ بیوگی کا بھی خیال نہیں کیا تھا۔

"بوا مجھے بتاؤ کیا کروں میں؟" زرینہ سخت پریشان تھیں لے دے کے بوا ہی تھیں جن سے وہ حال دل کہہ سکتی تھیں۔

"چھوٹی دلہن میں کیا بتاؤں میرا تو اپنا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ گھر میں عجیب عجیب باتیں ہو رہی ہیں۔ چھوٹا منہ بڑی بات وہاب میاں نے کوئی اچھا کام نہیں کیا ہے۔ انہیں لگام ڈالنے کی ضرورت ہے۔" بوا نے ڈرتے ڈرتے مشورہ دیا۔

"بوا مجھ اکیلی عورت کو وہاب تو وہاب' روبینہ آپا بھی آنکھیں دکھانے لگی ہیں۔ ان کی نظر امیر علی کی جائیداد پہ ہے اور ظاہر ہے زیان بھی ان کی بیٹی ہے۔ دونوں ماں بیٹا لالچ میں آ گئے ہیں۔" زرینہ بیگم نے آج پہلی بار ان دونوں کے بارے میں ان کے تازہ عزائم کے بارے میں زبان کھولی تھی۔

"ہاں چھوٹی دلہن وہاب میاں نے مجھ سے بھی کرید کرید کر کچھ باتیں معلوم کرنے کی کوشش کی تھی میں نے آپ کے خاندان کا نمک کھایا ہے نمک حرامی نہیں کر سکتی۔"

"بوا عفت خانم کو وہاب نے ذلیل کر کے نکال دیا ہے اور میں پہلے شاید زیان کی شادی وہاب سے کر دیتی بشرطیکہ اس کا جذبہ سچا ہوتا مگر اب میں خود نہیں چاہتی کہ وہاب اپنے ارادوں میں کامیاب ہو۔ میں امیر علی کو کیا منہ دکھاؤں گی مرنے کے بعد" زرینہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

بوا حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ ساری عمر زرینہ نے زیان سے نفرت کی تھی مگر شوہر کے گزرنے کے بعد ان کی شوہر پرستی ہنوز زندہ تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ امیر علی زندگی کے آخری ایام میں وہاب سے برگشتہ ہو گئے تھے انہوں نے زرینہ سے کہا تھا کہ وہ یہاں ان کے گھر میں وہاب کو مت آنے دیں۔ شاید وہ اپنی بیٹی کی خاموشی اور بے بسی سے بہت سی ان کہی باتیں از خود جان گئے تھے۔ اس لیے زرینہ نہیں چاہتی تھیں کہ امیر علی کی روح کو کوئی تکلیف ہو۔

زیان نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ آج زندگی میں پہلی بار زرینہ آنٹی نے اس کی سائیڈ لی تھی اس کے حق میں بات کی تھی۔ روتے روتے اس کے ہونٹوں پہ تلخ مسکراہٹ آ گئی۔ بہت دیر بعد جب زرینہ کچھ سنبھلیں تو وہاں سے آنے سے پہلے انہوں نے بوا کو زیان کے بارے میں بہت سی ہدایات دیں۔

"بوا فی الحال آپ زیان کو اپنے ساتھ ہی سلائیں۔ میں وہاب کو صبح دیکھوں گی اس وقت رات ہے سب سو رہے ہیں میں خوامخواہ ہنگامہ نہیں چاہتی۔" بوا نے سر ہلایا۔ زیان بیٹھی رو رہی تھی۔ بوا نے اس کے سر کو تسلی دینے والے انداز میں تھپکا "چلو بیٹا اب سو جاؤ تھوڑا۔"

"بوا میں آپ کے پاس سوؤں گی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ ڈری ہوئی تھی۔

"ہاں زیان بیٹا میں تمہارے ساتھ ہی سوؤں گی۔ لیکن کب تک میں تمہیں بچا پاؤں گی۔ وہاب میاں کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ اب ان کی نظر تمہارے ساتھ ساتھ امیر میاں کی دولت پہ بھی ہے۔ لیکن تم انہیں پسند نہیں کرتیں۔ ناکامی کی صورت میں وہاب میاں کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ یا تو ان سے شادی کر لو یا پھر یہاں سے چلی جاؤ۔" زیان رحمت بوا کی گرد بازو لپٹائے رو رہی تھی ان کے مشورے پہ ایک دم اس کے آنسو بہنا رک گئے۔

"میں وہاب مردود سے کسی صورت بھی شادی نہیں کر سکتی۔" اس نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر تم یہاں کیسے رہو گی۔ چھوٹی دلہن خود مشکل میں ہیں انہیں نے مجھے خود اپنے منہ سے کوئی بات نہیں بتائی ہے لیکن میں سب جان گئی ہوں۔ وہاب میاں مرد ذات ہیں موقعہ پا کر پھر سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔" بوا متفکر تھیں۔

"میں کہاں جاؤں بوا میرا کون ہے اس دنیا میں" وہ اب سسک رہی تھی۔

"ایسا مت کہو میرا رب تمہارے ساتھ ہے۔ تم کوئی لاوارث یا بے سہارا نہیں ہو خود کو اتنا کمزور مت سمجھو۔" بوا کا دل اس کے دلگیر لہجے پہ کٹ سا گیا۔

"بوا اس اتنی بڑی دنیا میں کون ہے میرا۔ نہ ماں' نہ باپ' نہ کوئی بہن بھائی۔ زرینہ آنٹی میری شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں ہیں۔ رابیل' منال' آفاق سے میں نے کبھی قریب ہونے کی کوشش کی بھی تو انہیں مجھ سے زبردستی دور کیا گیا۔ انہوں نے آج تک مجھے بہن نہیں سمجھا۔" اس کے آنسو زور و شور سے بہہ رہے تھے۔ بوا ساتھ لگائے اسے تھپک رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

زیان کے شور مچانے پہ وہاب فوراً" نیچے اتر کر اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ اسے ڈر تھا ابھی پورا گھر بے دار ہو جائے گا' اسی لیے سب سے پہلے اس نے اپنے کمرے کا دروازہ لاک کیا' پھر عجلت میں شب خوابی کا لباس پہنا اور چادر تان کر لیٹ گیا۔ لیٹنے سے پہلے وہ اپنے زخمی ہاتھ پہ کس کے رومال باندھنا نہیں بھولا تھا' جہاں زیان نے اپنے دانت پوری قوت سے گاڑھے تھے۔ اس کا ہاتھ اچھا خاصا زخمی تھا ابھی تک ہلکا ہلکا خون نکل رہا تھا اور تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔

اسے نیچے آئے آدھا گھنٹہ ہو چلا تھا ابھی تک کسی نے ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ شاید خطرہ ٹل گیا تھا۔ ویسے اس نے سب کچھ پہلے سے سوچ لیا تھا اگر کسی نے زیان کے چیخنے کا سبب معلوم کیا اور اسے ذمہ دار ٹھہرانے کی کوشش کی تو وہ صاف مکر جائے گا۔ اس کے پاس اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے بہت سے دلائل تھے۔ سناٹے میں اسے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی تو وہ چوکنا ہو گیا کہ ابھی کوئی دروازے پہ دستک دے گا' پر وہ جو کوئی بھی تھا آگے نکل گیا تھا۔ یعنی اب وہ آرام کے ساتھ آئندہ کا لائحہ عمل تیار کر سکتا تھا۔ اب اسے چھت پہ ہونے والی بدمزگی اور چھوٹی سے چھوٹی بات کے ساتھ اپنی ذلت بھی یاد آ رہی تھی۔ زیان نے اس کے منہ پہ پوری نفرت کے ساتھ تھوکا تھا۔ پھر سے یاد آنے پہ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

"زیان میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تم کسی کو منہ دکھانے کے بھی قابل نہیں رہو گی۔ تم نے جرات دکھا کر اچھا نہیں کیا ہے۔" خود کلامی کرتے ہوئے اس کی مٹھیاں سختی سے بھینچی ہوئی تھیں۔ مٹھی بند کرنے سے ہاتھ میں تکلیف ہونا شروع ہو گئی تھی۔ وہاب نے زیر لب زیان کو موٹی موٹی گالیاں دیں۔

☼ ☼ ☼

زرینہ خالا اس کے ہاتھ پہ بندھی پٹی کو معاندانہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ روبینہ بھی وہاں موجود تھیں۔ زرینہ نے رات والا واقعہ من و عن دہرایا تو وہاب غصے سے بھڑک اٹھا۔ حسب توقع اس نے تردید کی۔

"زرینہ تم تو میری ماں جائی ہو۔ وہاب پہ ایسا شرمناک الزام لگاتے ہوئے تمہارا دل نہیں کانپا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی تم اتنا بدل سکتی ہو۔ آخر ہمارا قصور کیا ہے۔ اپنی سوتیلی بیٹی کی خاطر تم نے وہاب کا بھی لحاظ نہیں کیا حالانکہ یہی زیان تمہاری نظروں میں کانٹے کی طرح چبھتی ہے اب تم اس کی حمائتی بن کے آگئی ہو۔ وہاب ایسا نہیں ہے۔" روبینہ نے بہن کو بری طرح لتاڑا تو وہاب بھی شیر ہو گیا۔

"ہاں خالا آپ خود سوچیں مجھے ایسا کام کرنے کی' بے صبری دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں بھلا زیان کے ساتھ ایسا کر سکتا ہوں۔ محبت کرتا ہوں میں اس سے اور اب تو ہماری شادی بھی ہونے والی ہے۔ میں اپنی ہونے والی بیوی کی عزت کیسے خراب کر سکتا ہوں۔" اس کی اداکاری اور ڈھٹائی قابل دید تھی۔ ایک ثانیے کے لیے تو زرینہ بھی چکرا گئیں۔ مگر جب نظر اس کے ہاتھ پہ باندھی گئی پٹی پہ پڑی تو زیان کی باتیں پھر سے یاد آنے لگیں۔ وہاب نے صبح اٹھتے

ساتھ ہی سب سے پہلے ڈاکٹر کے کلینک کا رخ کیا تھا۔

"یہ تمہارے ہاتھ کو کیا ہوا ہے۔ رات تک تو بالکل ٹھیک تھا۔" انہوں نے نظریں جما کر غور سے اسے دیکھا تو وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"صبح جب میں جاگنگ کے لیے نکلا تو بھاگتے بھاگتے لڑکھڑا گیا راستے میں پتھر پڑا تھا نیچے گرا تو ہاتھ پہ چوٹ لگی آتے ہوئے ڈاکٹر سے بینڈیج کروائی ہے۔" وہ ایسے فرفر بول رہا تھا جیسے ہر سوال کا جواب پہلے سے سوچ رکھا ہو۔

"تم زیان سے پوچھو۔ وہاب کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو ایسے ہی خوامخواہ الزام لگا رہی ہے میرے بچے پہ۔ میں خود پوچھوں گی اس سے۔" روبینہ کو یہ پوچھ پچھ پسند نہیں آ رہی تھی ادھر انہوں نے زیان سے پوچھنے کا قصد کیا ادھر وہاب کے چہرے پہ بے چینی پھیل گئی۔

"ماں چھوڑیں ناں بس اب۔ زیان نہ جانے کیوں چڑتی ہے مجھ سے۔ خیر شادی کے بعد خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔" اس نے روبینہ سے زیادہ جیسے خود کو تسلی دی۔

"ہاں زرینہ میں تو کہتی ہوں کہ اب تم زیان کی شادی کر ہی ڈالو۔ میں شادی سادگی سے کرنے کے حق میں ہوں۔ میں تمہاری تنہائی کے خیال سے اتنے دن سے اپنا گھر چھوڑ کے بیٹھی ہوں۔ وہاب بھی تمہارے لیے فکر مند ہے۔ اس لیے آفس سے سیدھا ادھر چلا آتا ہے۔ لیکن ہم ماں بیٹا کب تک گھر سے دور رہ سکتے ہیں۔ تم میری مانو تو زیان کو وہاب سے بیاہنے کے بعد خود بھی میرے گھر آجاؤ۔ اتنا بڑا گھر ہے میرا یہاں تم اکیلی کیسے رہو گی" روبینہ کے لہجے میں بہن کے لیے مصنوعی فکر مندی تھی۔ زرینہ امیر علی کی موت کے بعد ان کے بدلتے رویے اور دل میں آنے والی لالچ سے باخبر نہ ہو چکی ہوتیں تو ان کی اس آفر پہ خوشی سے پھولے نہ سماتیں۔ اب یعنی روبینہ آپا اور وہاب یہ گھر ہتھیانے کے چکر میں تھے۔ یہ راہ ماں کو وہاب نے ہی دکھائی تھی۔

"میں عدت میں ہوں بعد میں اس پہ سوچوں گی"

زرینہ نے بات ٹالی۔ وہاب نے روبینہ کو آنکھ سے اشارہ کیا۔

"ہاں زرینہ پھر کب میں وہاب کی بارات لاؤں؟" وہ پھر سے اصل موضوع پہ آگئیں۔

آپا میں ابھی دکھ اور صدمے میں ہوں۔ عدت بھی پوری نہیں ہوئی ہے اور آپ کو شادی سوجھ رہی ہے۔" وہ رکھائی سے بولیں تو روبینہ قدرے شرمندہ ہو گئیں۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ عدت سکون سے گزار لو پھر شادی بھی ہوتی رہے گی۔ کون سا وہاب یا زیان بھاگے جا رہے ہیں۔" روبینہ نے جیسے سکون کی سانس لی۔

"خالا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ امی کو یہاں آپ کے پاس چھوڑ کر خود گھر چلا جاؤں۔ اتنے دن سے ہمارا گھر بند پڑا ہے اور پھر میں نہیں چاہتا کہ رات پیدا ہونے والی غلط فہمی کی وجہ سے کسی کو باتیں کرنے کا موقعہ ملے۔ میں بیچ بیچ میں چکر لگاتا رہوں گا۔" وہاب نے بہت چالاکی سے خود کو عارضی طور پہ منظر سے ہٹانے کا پروگرام بنایا تھا۔ زرینہ دل میں بہت خوش ہوئیں۔ وہاب کی موجودگی سے انہیں ہمہ وقت خوف اور عدم تحفظ کا احساس ہوتا۔ اچھا تھا وہ کچھ عرصے کے لیے یہاں سے دفعان ہو جاتا۔ اس عرصے میں وہ اطمینان سے سوچ بچار کر سکتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

روبینہ کھانے کے بعد لیٹ گئی تھیں۔ وہیں لیٹے لیٹے آنکھ لگ گئی تو زرینہ جو ان کے پاس بیٹھی تھیں انہوں نے انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا اس طرح سوتا رہنے دیا۔ خود وہ آہستگی سے باہر آگئیں کیونکہ بوا نے ان سے اکیلے میں کوئی ضروری بات کرنی تھی۔ زرینہ انہیں ڈھونڈتی باہر نکلی ہی تھیں کہ وہ اسے اپنی طرف بڑھتی دکھائی دیں۔

"چھوٹی دلہن آپ میرے کمرے میں آجائیں" بوا کا انداز چوکنا اور رازدارانہ تھا۔ زرینہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ان کے ساتھ آگئیں۔ بوا نے کمرے کا

دروازہ بند کر کے جستی ٹرنک کھولا اور اس میں رکھا بوسیدہ برسوں پرانا خط نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔ زرینہ نے سوالیہ نگاہوں سے پہلے خط اور پھر بوا کی طرف دیکھا بوا نے جوابا" انہیں خط پڑھنے کا اشارہ کیا۔ زرینہ خط پڑھ چکی تھیں۔ خط بھیجنے والے نے آخر میں اپنا نام نہیں لکھا تھا' پر پھر بھی زرینہ بیگم جان گئی تھیں کہ یہ خط بھیجنے والی ہستی کون ہے۔

"بوا آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہی ہیں" زرینہ بیگم کی نگاہیں ہاتھ میں تھامے ہوئے خط پہ تھیں۔ ان کے چہرے پہ شدید ہیجانی کیفیت تھی۔

"چھوٹی دلہن خدا گواہ ہے میں نے خود کو اس گھرانے کا فرد سمجھا ہے اور کبھی نمک حرامی نہیں کی اس لیے چاہنے کے باوجود میں نے اس خط کا جواب نہیں دیا کیونکہ یہ نمک حرامی ہوتی پھر امیر میاں بھی پسند نہ کرتے۔ لیکن اب میں سمجھتی ہوں کہ اس خط کے جواب دینے کا ٹائم آگیا ہے۔"

"بوا آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"چھوٹی دلہن اس خط کے آخر میں ایڈریس بھی لکھا ہوا ہے۔ یہ آپ کے مسئلے کا حل ہے۔ کیونکہ زیان' وہاب میاں سے کسی صورت کسی قیمت پہ بھی شادی کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔"

"میں خود بھی زیان کی شادی وہاب سے کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ اس کی نظر میرے گھر پہ ہے میرے بچوں کے حق پہ ہے۔ زیان سے شادی کی صورت میں وہاب اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ میں اور میرے بچے در در کی خاک چھانیں گے وہ زیان سے بھی سب کچھ ہتھا لے گا۔ میں امیر علی کی روح کو کوئی تکلیف پہنچتے نہیں دیکھ سکتی۔" زرینہ کی آواز بھرا گئی۔ "اور یہ ایڈریس کا کیا چکر ہے۔" انہیں یاد آگیا کہ بوا نے خط کے آخر میں لکھے کسی ایڈریس کا ذکر کیا تھا۔

"چھوٹی دلہن آپ زیان کو اس کی ماں کے پاس بھیج دیں۔" بوا نے نہایت سکون سے جواب دیا "خط کے آخر میں پتا لکھا ہوا ہے میں اسی کی بات کر رہی تھی۔"

"بوا اتنے برس گزر چکے ہیں کیا پتا اب حالات کیسے ہیں۔" وہ تذبذب میں تھیں۔

"حالات بالکل ٹھیک ہیں۔" بوا پہلی بار سکون سے مسکرائیں۔

"آپ کو کیسے پتا بوا؟"

میری رشتے کی بھانجی صغریٰ اسی ساتھ والے گاؤں میں رہتی ہے جس کا پتا خط میں لکھا ہے۔ میں نے اسے ڈھکے چھپے الفاظ میں کچھ معلومات کروانے کو کہا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو اس گاؤں میں بھیجا۔ وہ سب کچھ دیکھ بھال آیا ہے۔ بس میں اس بات پہ اس جرات پہ شرمندہ ہوں کہ میں نے آپ کو اطلاع دیے بغیر یہ سب کیا؟" بوا کی نگاہوں میں شرمندگی تھی۔

"ارے بوا ایسی بات تو نہ کریں۔ آپ نے تو بیٹھے بیٹھے میرا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ میں جس کام کو مشکل سمجھ رہی تھی وہ اتنا ہی آسان ہو گیا ہے کیونکہ زیان کی طرف سے میں ازحد پریشان ہوں۔" زرینہ کا چہرا خوشی سے چمک اٹھا۔ وہ سچ میں خوش تھیں۔

"چھوٹی دلہن میں صغریٰ کو وہاں جانے کے لیے بولتی ہوں وہ سب حالات بتا دے گی ان شاء اللہ وہاں سے اچھی خبر ہی ملے گی۔" وہ پر امید تھیں "بوا کیا وہ زیان کو اپنے پاس رکھنے کے لیے تیار ہو گی؟ مطلب وہ لوگ اسے قبول کر لیں گے؟" زرینہ کا انداز خدشات سے بھرا تھا۔

"چھوٹی دلہن صغریٰ بہت تعریف کر رہی تھی کہ نیک اور خدا ترس لوگ ہیں بہت امیر بھی ہیں۔ باقی اللہ خوب جانتا اور سمجھتا ہے۔"

"بوا ہمیں جلدی جلدی زیان کو یہاں سے بھیجنا ہو گا۔ میں وہاب کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔"

"صغریٰ وہاں سے سب معلومات لے آئے پھر میں آپ کو بتاؤں گی۔"

"بوا آپ اس کام میں دیر مت کرنا" زرینہ لجاجت سے بولیں۔

"چھوٹی دلہن آپ اللہ سے دعا کریں بس" بوا نے انہیں تسلی دی۔

☆ ☆ ☆

بوا کی بھانجی صغریٰ بوا کے کہنے پر خود اپنے بیٹے کے ساتھ "ملک محل" میں موجود تھیں۔ صغریٰ نے من و عن جو کچھ بوا رحمت نے انہیں بتایا تھا سب کچھ ملک ارسلان اور عنیزہ بیگم کے گوش گزار کر دیا تھا۔ عنیزہ نے بمشکل اپنے جذبات کو قابو میں رکھا۔ صغریٰ نے انہیں بوا کا نمبر بھی دیا۔

صغریٰ اور نواز ان کی بھرپور مہمان نوازی کا لطف اٹھانے کے بعد جا چکے تھے۔ عنیزہ جس نے مشکل سے اپنے اعصاب کو کنٹرول کر رکھا تھا ان کے جاتے ہی بکھر گئیں اور ملک ارسلان کے سینے سے لگ کر رو پڑیں۔

"ملک صاحب! میرے جگر کا ٹکڑا کن حالوں میں ہے۔ مجھے خبر ہی نہیں۔ ہائے میرے جیسی بے خبر ماں دنیا میں نہ ہو گی۔" وہ روتے روتے یہی تکرار کر رہی تھیں۔

"مجھے اپنی بچی کو وہاں سے نکالنا ہے مجھے اس سے اور دور نہیں رہنا اب۔ مجھے میری بچی لا دیں ملک صاحب۔ مجھ پہ اور ظلم نہ کریں اپنی بچی سے دور رہ کر میں نے جو سزا کاٹی ہے وہ بہت کڑی ہے۔ ملک صاحب میری سزا ختم کر دیں۔ مجھے میری بچی چاہیے" عنیزہ پہ ہذیانی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔

"وہ صرف تمہاری نہیں میری بھی بیٹی ہے میں خود اسے جا کر لاؤں گا۔ تم خود کو سنبھالو' ورنہ میں بھی پریشان رہوں گا" ارسلان نے ان آنکھوں سے بھل بھل بہتے آنسو صاف کیے۔

"سچ آپ اسے لے آئیں گے؟" وہ انہیں بے یقینی سے دیکھ رہی تھیں۔ ارسلان کا دل کٹ سا گیا۔ اس عورت اس چہرے سے انہوں نے دنیا میں موجود ہر رشتے' ہر شے سے بڑھ کر محبت کی تھی وہ اس کے دکھ اس کے کرب سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس نے ان کے ساتھ شادی شدہ زندگی کا جتنا بھی عرصہ گزارا تھا جلتے تڑپتے سسکتے گزارا تھا۔ وہ ننگے پاؤں کانٹوں پہ چلی تھی۔ اس کے راستے کے خار چنتے چنتے' ملک ارسلان کے اپنے ہاتھ زخمی ہو گئے تھے پر وہ شکوہ زباں پہ نہ لائے۔ ان کی محبت شکوے شکایتوں سے ماورا تھی۔ ساری عمر اس کی صدا پہ وہ آنکھ بند کر کے چلے تھے اور وہ اب بھی بے یقینی کا شکار تھی۔

"ہاں میں اسے۔۔۔ خود جا کر لاؤں گا اپنی بیٹی کو" وہ ان کے راستے کے خار ایک بار پھر سے چن رہے تھے۔

"کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا جہانگیر بھائی اور افشاں بھابھی کو!" ساری عمر بے یقینی کے عالم میں گزارنے کے بعد اب بھی اندیشوں کے ناگ انہیں اپنی طرف بڑھتے محسوس ہو رہے تھے۔

جہانگیر بھائی اور افشاں بھابھی کیوں اعتراض کریں گے۔ تم اتنے سال یہاں رہنے کے باوجود بھی ابھی تک ان کے مزاج کو سمجھ نہیں پائیں۔ انہوں نے نیناں کے آنے پہ بھی کچھ نہیں کہا' نہ کوئی سوال کیا ایک بار بھی ٹوہ لینے ہماری طرف نہیں آئے۔ ان کا دل بہت بڑا ہے۔ جہانگیر بھائی ہمدرد فطرت کے ہیں افشاں بھابھی بھی ان کا پرتو ہیں۔" ملک ارسلان نرم لہجے میں بولتے جیسے ان کے کانوں میں رس ٹپکا رہے تھے۔

"لیکن پھر بھی ہمیں ان کو بتانا چاہیے۔" عنیزہ نے رخ موڑتے ہوئے ان سے اپنے تاثرات چھپانے چاہے۔

"اچھا بابا آؤ ابھی بھائی جان کی طرف چلتے ہیں۔" ارسلان نے عنیزہ کو کندھے سے تھامتے ہوئے ان کا رخ اپنی موڑ کر اپنے مقابل کھڑا کیا۔

"تمہیں یاد ہے شادی کی پہلی رات میں نے تم سے ایک بات کہی تھی کہ "تم۔۔۔ تمہاری خوشی' تم سے وابستہ ہر رشتہ مجھے بہت عزیز ہے میں اس کی اتنی قدر کرتا ہوں جتنی تم کرتی ہو۔ کیونکہ میں نے محبت نہیں عشق کیا ہے تم سے۔"

"ملک صاحب مجھے سب یاد ہے۔"

"میں آج پھر وہی بات دہرا رہا ہوں کہ میں نے محبت نہیں عشق کیا ہے تم سے۔ وہ صرف تمہاری بیٹی نہیں بلکہ اب ہماری بیٹی ہے۔ میں کل بھی تمہارے

ساتھ تھا‘ آج بھی ہوں اور ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا۔ بچ ہے میں جب اللہ سے دعا مانگتا ہوں تو کہتا ہوں کہ اے اللہ تو نے عنیزہ کو جس طرح اس دنیا میں میرے ساتھ رکھا ہے۔ مرنے کے بعد اس دنیا میں بھی میری محبوب بیوی‘ میری محبت کو میرا ہم سفر بنانا۔“

ملک ارسلان ان کی نم آنکھوں کی گہرائیوں میں بغور دیکھتے ہوئے انہیں اپنی محبت کا یقین دلا رہے تھے۔ عنیزہ ان کا دائیں ہاتھ تھام کر عقیدت سے لبوں تک لے گئیں۔ یہ ان کے اظہار محبت کا خاص طریقہ تھا۔ ان کی آنکھوں میں محبت و یقین کے ہزاروں دیے جگمگا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

عنیزہ صبح یونیورسٹی کے لیے تیار ہو کر نکلی تو ہلکی بوندا باندی کا سلسلہ جاری تھا۔ سورج کا آسمان پہ کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ گھنگھور گھٹاؤں نے پورے ماحول کو گویا اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسی دن چڑھنے سے پہلے شام ڈھل آئی ہو۔

عنیزہ نے یونیورسٹی میں قدم رکھا تو رکے رکے بادل پوری قوت اور شدت کے ساتھ برس پڑے۔ اس کا یونیورسٹی میں پہلا دن تھا۔ وہ پریشانی سے ادھر ادھر اپنی ان دو کلاس فیلوز کو ڈھونڈ رہی تھی جنہوں نے یونیورسٹی میں اس کے ساتھ ہی ایم اے اکنامکس میں داخلہ لیا تھا۔ وہ کیفے ٹیریا سے ابھی کافی فاصلے پہ تھی جب بادل شدت کے ساتھ گرجے اس نے اپنی جگہ پہ کھڑے کھڑے زوردار چیخ ماری۔ وہ درختوں کے سائے میں تھی اس لیے بھیگنے سے کافی حد تک محفوظ تھی۔ لیکن بادل گرجتے ساتھ ہی اس نے درختوں کے جھنڈ سے باہر کی طرف دوڑ لگائی۔ کیونکہ اس نے سن رکھا تھا کہ درختوں پہ آسمانی بجلی گرتی ہے اور جس خوفناک آواز میں ابھی بادل گرجے تھے اسے ڈر لگ رہا تھا کہ بجلی بھی لازمی گرے گی۔ بھاگتے ہوئے اپنی دھن اور پاؤں کیچڑ میں پھسلنے کی وجہ سے وہ خود بھی گرنے والی تھی جب کسی نے پاؤں اپنی ٹانگ سمیت آگے کرتے ہوئے اسے کیچڑ لوس ہونے سے بچا لیا وہ فوراً“ اپنے قدموں پہ سنبھلی۔

”یا وحشت آپ کے پیچھے ملک الموت تھا جو اندھا دھند بھاگ رہی ہیں آپ۔“ وہ جو کوئی بھی تھا اسے ڈانٹ رہا تھا۔ عنیزہ نے خفت سے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ لمبے چوڑے سراپے پہ پرکشش چہرا اور شرارتی آنکھیں سجی تھیں۔ یہ ملک ارسلان کے ساتھ اس کا پہلا تعارف تھا۔

وہ اسی یونیورسٹی میں ایم بی اے کا اسٹوڈنٹ تھا۔ ان کے درمیان تعارف کے ابتدائی مراحل بہت جلد طے ہوئے۔ ملک ارسلان پنجاب کے زمین دار خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس سے بڑا ایک بھائی اور تھا۔ حال ہی میں اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ ملک ارسلان کا بڑا بھائی شادی شدہ اور دو چھوٹے چھوٹے بچوں کا باپ تھا۔ ملک ارسلان یہاں شہر میں پڑھائی کی غرض سے مقیم تھا اور ایک شاندار گھر میں اس کی رہائش تھی۔ وہ دو ماہ میں ایک بار گاؤں جاتا اور سب سے مل کر آجاتا۔

تھوڑے عرصے میں ہی وہ عنیزہ کے ساتھ بے تکلف ہو گیا۔

عنیزہ کی والدہ حیات نہیں تھیں صرف والد تھے جنہوں نے اسے ماں بن کر پالا تھا۔ وہ اکلوتی اولاد تھی بہت ساری محبت اور توجہ سمیٹنے کے باوجود بھی خود کو اکیلا محسوس کرتی۔ اس اکیلے پن کے احساس کو کم کرنے کے لیے اس نے بہت ساری سہیلیاں بھی بنا رکھی تھیں۔ لیکن سارا دن ان کے ساتھ گزارنے کے باوجود بھی وہ خود میں تشنگی محسوس کرتی۔

ملک ارسلان کا یونیورسٹی میں ملنا تھا تعارف بے تکلفی اس کے لیے زندگی کا دلچسپ ترین تجربہ تھا۔ ملک ارسلان اس کے ساتھ اپنے گاؤں بھائی بھابھی اپنے بھتیجوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور شرارتوں تک کو بھی شیئر کرتا۔ اسے ارسلان کا بولنا بہت اچھا لگتا تھا۔

☼ ☼ ☼

عنیزہ دھڑکتے دل کے ساتھ فون کان سے لگائے

ہوئے تھیں۔ وہ برسوں بعد بوا رحمت کی آواز سننے والی تھیں۔ بالآخر ان کا انتظار تمام ہوا۔ اب بوا سے ان کی بات ہو رہی تھی۔

”بوا آپ نے بہت دیر کر دی۔ میں تو سمجھتی تھی کہ آپ میرے دکھے دل کی پکار کو سن لیں گی۔ میں اپنی بچی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ترستی رہی۔ میں اس کے لیے کتنا روئی‘ کتنا تڑپی آپ کبھی نہیں جان پائیں گی۔ وہ صرف خط نہیں تھا ایک ماں کی حسرتوں کا نوحہ تھا‘ الفاظ کی صورت میں نے اپنا دل چیر کر رکھا تھا۔ پر آپ کو کیا اندازہ ممتا کا کیونکہ آپ کا دامن اس جذبے سے خالی جو رہا“ بوا کے دل پہ گھونسا سا لگا کچھ بھی تھا انہوں نے زیان کو ماں بن کر ہی پالا تھا۔

”ایسا مت کہیں۔ میری اپنی مجبوریاں تھیں جن کے بوجھ تلے میں سسکتی رہی ورنہ آپ کے اس خط نے میرے ضمیر پہ بہت کوڑے برسائے ہیں۔ لیکن میں بھی تو ایک ملازمہ۔ میرے اختیارات محدود تھے“ بوا کی آواز میں نمی در آئی تو عنیزہ کو اپنے الفاظ کی کڑواہٹ کا اندازہ ہوا۔ انہوں نے فوراً“ بات کا رخ بدل دیا۔

”میری بچی کیسی ہے؟ خوش ہے ناں؟“

”ہاں بہت خوش ہے۔“ بوا کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ انہوں نے عنیزہ کے ساتھ بات چیت ختم کی تو زیان کو انتظار میں پایا۔ ابھی انہیں زیان کے ضروری سامان کو پیک کرنا تھا۔ جب سے بوا اور زرینہ آنٹی نے اسے اس کی ماں کے پاس روانہ کرنے کی بات کی تھی وہ پہلے سے بھی زیادہ خاموش ہو گئی تھی۔ ابھی بھی وہ رو رہی تھی۔

”بوا میرا کوئی نہیں ہے ناں ابو کے بعد۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے ناں؟“ وہ بچوں کی طرح استفسار کر رہی تھی۔

”زیان بیٹا اب تم نہ اکیلی ہو نہ بے گھر ہو تمہاری ماں ہے اور تمہارے حصے کی محبت‘ خوشیاں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ وہ دونوں میاں بیوی اکیلے ہیں اس میں بھی قدرت کی مصلحت ہے کہ رب کو ان کی ممتا کی پیاس تم سے ہی بجھانی منظور ہے۔“

”مجھے نفرت ہے ان سے۔ اتنے برس وہ کہاں تھیں پہلے۔ میں قطرہ قطرہ مری ہوں۔“

زیان پہ ہذیانی کیفیت یکایک طاری ہوئی۔ یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلے جانے کا فیصلہ اتنا آسان نہیں تھا۔ یہاں سے جانا اسے کانٹوں پہ چلنے کے مترادف محسوس ہو رہا تھا۔ پر بوا نے زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتے ہوئے جو تلخ حقیقت بیان کی تھیں وہ بھی اپنی جگہ کم سنگین نہیں تھی۔ وہ یہاں رہتی تو اسے ہر حال میں وہاب سے شادی کرنی پڑتی جو کہ اسے منظور نہیں تھا۔ اب امیر علی بھی نہیں تھے جن کی وجہ سے طوہا“ کرہا“ وہ یہاں رہنے پہ مجبور تھی۔

زندگی گرداب میں گھری ہوئی تھی آگے کنواں پیچھے کھائی تھی۔ زرینہ بیگم نے اس کے یہاں سے جانے کے عمل کی حمایت کی تھی۔ کچھ بھی تھا انہیں وہاب کی دست درازی پسند نہیں آئی تھی کم سے کم وہ اپنی ماں کے پاس ایسی صورت حال سے محفوظ رہتی۔ مگر کوئی زیان سے پوچھتا وہ کس دل سے یہاں سے جا رہی تھی۔ بوا کے لاکھ نرمی سے سمجھانے کے باوجود اس کی نفرت اور دل کا زہر جوں کا توں تھا۔ بوا کو امید تھی کہ آنے والے وقت میں اپنی ماں کے ساتھ اس کے تعلقات معمول پہ آجائیں گے۔ ماں کے ساتھ رہنے سے اس کی ممتا کی نرمی محسوس کرنے سے جلد یا بدیر اس کی نفرت کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔

”بس اب تمہیں رونے دھونے کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ بوا نے اسے چمکارا۔

”بوا میں آپ کے بغیر کیسے رہوں گی؟“ بے بسی سی بے بسی تھی اس کے لہجہ میں۔

”میں آؤں گی تم سے ملنے“ انہوں نے آنکھوں میں در آنے والے آنسو پلکوں کی باڑھ پہ ہی روک لیے۔

”بوا سچ‘ آپ آیا کریں گی وہاں؟“ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

”ہاں زندگی نے مہلت دی تو ضرور آؤں گی۔“

"بوا آپ میرے ساتھ ہی چلیں ناں۔ یہاں کیا کریں گی؟" وہ بچوں کی طرح ٹھنکی۔

"میں نے ساری عمر یہاں گزار دی ہے۔ اب اس گھر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ اب میری میت ہی یہاں سے جائے گی۔ یہاں چھوٹی دلہن ہے۔ آفاق' رابیل' منابل ہیں۔ میں ان کو اکیلا چھوڑ کر کیسے جاؤں۔"

ان کا چہرہ محبت کی روشنی سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا' اس محبت سے جو انہوں نے اس گھر کے مکینوں سے 'بے غرض ہو کر بغیر کسی صلے کی تمنا کے کی تھی۔ زیان محبت سے بے تاب ہو کر ان کے سینے سے لگ گئی۔

تھوڑی دیر بعد بوا زیان کے کپڑے اور دیگر چیزیں سوٹ کیس میں رکھ رہی تھیں۔ وہ ان کے پاس بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھی۔ کل اسے یہاں سے چلے جانا تھا۔ وہاب کی طبیعت خراب تھی اس لیے شام کو روبینہ اپنے گھر چلی گئی تھیں۔ بوا اور زرینہ دعا کر رہی تھیں کہ زیان آرام و سکون سے چلی جائے۔ بعد میں جو ہونا دیکھا جاتا۔ فی الحال وہاب کا لاعلم رہنا ضروری تھا۔

☼ ☼ ☼

مرے دل میرے مسافر
ہوا حکم پھر سے صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یار نامہ بر کا
ہر ایک اجنبی سے پوچھیں
جو پتا تھا اپنے گھر کا
سر کوئے ناشناسیاں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی ان سے بات کرنا
تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شب غم بری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا برا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا۔

زیان جانے کے لیے تیار تھی۔ آفاق' رابیل' منابل اسے حیرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ زرینہ نے انہیں ابھی کچھ دیر پہلے ہی زیان کی یہاں سے روانگی کا بتایا تھا۔ وہ تینوں ابھی اتنے سمجھ دار نہیں تھے کہ انہیں کھل کر کچھ بتایا جاتا۔ زیان نے ان کے ساتھ اب تک کی تمام عمر گزاری تھی لیکن ان میں بہن بھائی والی مخصوص محبت یا چاہت پیدا نہیں ہوپائی تھی پر ابھی جب وہ زیان کو روانگی کی تیاری کرتے دیکھ رہے تھے اس کا دل کر رہا تھا تینوں کو گلے لگا کر روئے۔

ملک ارسلان اپنے ڈرائیور اور ایک گارڈ کے ساتھ زیان کو لینے پہنچ چکے تھے۔ بوا ان کو یہاں کے حالات اور وہاب کے بارے میں مختصرا" بتا چکی تھیں اس لیے وہ احتیاطا" کسی بھی بدمزگی سے نمٹنے کے لیے گارڈ کو ساتھ لائے تھے جو مسلح تھا۔ وہ جس شاندار گاڑی میں زیان کو لینے آئے تھے اس نے بوا سمیت زرینہ بیگم کو بھی مرعوب کیا تھا۔

زیان نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ انتہائی باوقار اور شاندار شخصیت کا مالک درمیانی عمر کا یہ مرد اس کے لیے اجنبی تھا اس نے کسی خاص جذبے کا اظہار نہیں کیا۔ ملک ارسلان نے تب خود ہی آگے بڑھ کر تعارف کروایا اور اس کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا۔ زیان نے موہوم سی گرم جوشی سے ان کے سلام کا جواب دیا تو وہ مسکرائے وہ اس کے غیرت بھرے رد عمل کے پس منظر سے آگاہ تھے اس کا یہ رد عمل عین فطرت تھا۔

اس کا مختصر سا سامان گاڑی میں منتقل ہو چکا تھا۔ وہ سب سے ملی۔ ایک نئی منزل اڑان بھرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

عنیزہ صبح سویرے جاگ گئی تھیں۔ بے چینی اور

خوشی حد سے سوا تھی۔ عنیزہ نے سب سے پہلے نینال کو بتایا کہ میری بیٹی آرہی ہے پورے گھر کی صفائی کروانی ہے اور نئے پردے بھی لگانے ہیں۔ اس نے فورا" یہ کام اپنے ذمہ لیا۔ کوئی دیکھتا تو پہچان نہ پاتا کہ لان کے عام سے سوٹ میں ملبوس خوب صورت اسٹائل میں تراشیدہ بالوں کو باندھے سر پہ دوپٹا اوڑھے نوکرانیوں کے کام کو چیک کرنے والی یہ لڑکی رِم ہے۔

وہ پہلے سی اب رہی بھی کہاں تھی۔ وہ اب عام سی مڈل کلاس لڑکی لگتی تھی۔ نہ وہ اسٹائلش ڈریسنگ نہ سب سے ممتاز کرتا رکھ رکھاؤ' نہ نزاکت اور نخرا۔ یہ تو نینال تھی۔ حالات اور زمانے کی ستائی بے آسرا بے سہارا لڑکی جس کا دنیا میں آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ ملک ارسلان اور عنیزہ ترس کھا کر جسے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ عنیزہ نے یہاں اس پہ کمال مہربانی کرتے ہوئے اس کے سپرد چھوٹے موٹے کام کیے تھے۔ مثلا" نوکرانیوں کے کام کو چیک کرنا۔ باغ کے پودوں کو دیکھنا کہ آیا ان کی درست دیکھ بھال ہو رہی ہے کہ نہیں۔ اسی نوعیت کے اور چھوٹے موٹے کام تھے۔ جو ہر لحاظ سے حویلی میں کام کرنے والوں کے نزدیک باعزت تھے۔ اس کے باوجود بھی وہ اپنی حیثیت سے واقف تھی۔ اس نے سب کے اچھے برتاؤ دیکھ کر دل میں کسی خوش فہمی کو جگہ نہیں دی تھی۔

فارغ ہو کر عنیزہ کے پاس بیٹھ جاتی۔ وہ سارا دن "ملک محل" میں آنے والی عورتوں کے دکھڑے اور مسائل سنتیں ان کا حل نکالتیں۔ نینال کو یہ کام بہت دلچسپ لگتا۔ ہر عورت کے پاس الگ ہی موضوع ہوتا۔ جو دوسری عورت کے مسئلے سے بالکل ہی جدا ہوتا۔ اس نے شہر میں ناز و نعم میں زندگی گزاری تھی۔ مسائل' مشکلات' غربت' بیماری' دکھ' تکلیف اور آفت کیا ہوتی ہے اسے ان باتوں کا ہرگز اندازہ نہ تھا۔ یہ سب اس کے لیے ایلس کی "ونڈر لینڈ" جیسا تھا۔

عنیزہ آج بے پناہ خوش تھیں۔ صبح صبح ہی انہوں نے اسے اپنی بیٹی کی آمد کی نوید دی تھی۔ اسے یہاں آئے ایک ماہ سے اوپر ہو چلا تھا اس دوران اس نے ان کی بیٹی کی ایک جھلک تک نہ دیکھی تھی نہ ذکر سنا تھا۔ وہ چاہنے کے باوجود بھی ان سے پوچھ نہ پائی۔ پوری حویلی لشکارے مار رہی تھی۔ عنیزہ نے گھوم پھر کر پورے گھر کا خود جائزہ لیا۔ حویلی کی اوپری منزل پہ انہوں نے اپنی بیٹی کے لیے بطور خاص کمرا تیار کروایا تھا۔ جس کی سجاوٹ اور فرنیچر دیکھنے کے لائق تھا۔

جا بہ جا کمرے میں تازہ پھول بہار دکھا رہے تھے اور خود عنیزہ آج بہت اہتمام سے تیار ہوئی تھیں۔ دونوں کلائیوں میں موتیے کے گجرے سجائے ارسلان کی پسند کا سوٹ زیب تن کیے خود کو خوشبو میں بسائے عنیزہ کسی نو عمر دوشیزہ کی مانند پر جوش اور تر و تازہ لگ رہی تھیں۔

نینال باغ میں تھی۔ دور دور تک ہریالی کی چادر بچھی تھی۔ وہ پھول توڑتے ہوئے عنیزہ ملک کی بیٹی کے بارے میں سوچ رہی تھی جس کے استقبال کی تیاریاں ایسے ہو رہی تھیں جیسے کسی ریاست کی شہزادی آرہی ہو۔ کچھ دیر کے لیے اسے عنیزہ ملک کی بیٹی سے حسد سا محسوس ہوا۔ اسے پاپا یاد آگئے تھے۔ ان کے یاد آتے ہی دل پہ جیسے بھاری بوجھ آن گرا۔

ویسے نینال یعنی رِم نے بہت جلد حویلی کے رنگ ڈھنگ اپنا لیے تھے۔ یہاں کا ماحول شہر سے یکسر مختلف تھا۔ لیکن اس فرق میں اسے ایڈونچر اور کشش محسوس ہوتی۔ گھٹی بند سی زندگی سے یکسر مختلف۔ وہ یہاں ایک عام سی لڑکی تھی بے سہارا۔ بے آسرا' عنیزہ ملک نے اپنے تئیں اسے ہر ممکن سہولت دینے کی پوری کوشش کی تھی۔

وہ نوکرانیوں کو ہدایت دیتی ان کی نگرانی کرتی تو اس میں بھی اسے لطف آتا کیونکہ اس کے اندر کی رِم سیال زندہ تھی جو احمد سیال کی لاڈلی نازوں پلی بیٹی تھی۔ اسے رات کی تنہائیوں میں ان کی یاد آتی تو دل میں ہوک سی اٹھتی انہوں نے اس کی ذرا سی بات تک نہ مانی تھی۔ مان لیتے تو آج یہاں نہ پڑی ہوتی شادی کر کے اپنے شوہر کے ساتھ ہوتی۔ سب کچھ ہونے کے باوجود وہ لاوارثوں کی طرح یہاں پڑی تھی۔ اور وہ خود

منوں مٹی تلے جا سوئے تھے۔ پھول توڑتے ہوئے کوئی کانٹا اس کے ہاتھ میں چبھا تھا جس نے تکلیف کے احساس سے دوچار کرنے کے ساتھ ساتھ پاپا کی یادوں کے حصار سے بھی نکالا۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا آنسو اس کی آنکھوں میں نہ آتے۔

☼ ☼ ☼

سنگ مرمر کی سفید عمارت ان کی منزل ثابت ہوئی ۔یہ عمارت دور ہی سے مکینوں کی امارت اور خوشحالی کا اعلان کر رہی تھی۔ اس میں قدم رکھتے ہی زیان کو بہت سی باتوں کا اندازہ ہو گیا۔ لینڈ کروزر جس میں بیٹھ کر وہ یہاں پہنچی تھی' رہائشی حصے سے باہر کھڑی تھی زیان کا مختصر سا سامان اس میں سے نکال کر اندر پہنچایا جا چکا تھا۔

عنیزہ اس کے استقبال کے لیے منقش دروازے کے پاس ہی کھڑی تھیں۔ سفید سنگ مرمر کی اس عمارت کی طرح ان کی شخصیت بھی بے انتہا شاندار تھی۔ ان کے ساتھ باوقار سی ایک اور خاتون بھی تھیں یہ افشاں بیگم تھیں۔ عنیزہ کو دیکھتے ہی زیان کے دل نے خاص گواہی دی کیونکہ ان کے چہرے پہ محبت ہی محبت تھی ممتا کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ انھوں نے دونوں بازو کھولتے ہوئے بڑھ کر زیان کو سینے سے لگا لیا۔ وہ اس کے چہرے' ہاتھوں' بالوں اور ماتھے پہ دیوانہ وار لوسے دے رہی تھیں۔

"میری بچی میری زیان مجھے امید نہیں تھی کہ جیتے جی میں تمہیں دیکھ پاؤں گی ۔" وہ اسے سینے سے چمٹائے بولتے ہوئے روتی جا رہی تھیں۔ افشاں بیگم اور ساتھ کھڑی نوکرانیوں کی آنکھیں اس جذباتی منظر پہ خود بہ خود ہی بھیگ گئی۔

عنیزہ نے طویل عرصے بعد اپنے جگر کے ٹکڑے کو دیکھا تھا برسوں تڑپی تھیں اور آج وہ حقیقت بن کر ان کے سامنے کھڑی تھی۔ ان کی ممتا امنڈی پڑ رہی تھی۔ لیکن زیان بالکل نارمل انداز میں ملی۔ عنیزہ کی جذباتی دل گرفتہ کیفیت نے اس کے اندر وہ خاص جذبہ پیدا نہیں کیا' جو برسوں بعد ماں سے ملنے والی بیٹی کے دل میں ہونا چاہیے تھا۔ عنیزہ کے بعد افشاں بیگم نے بھی اسے سینے سے لگایا اور اس کے ماتھے پہ بوسہ ثبت کیا۔ زیان نے اچھے طریقے سے ان سے خیر خیریت دریافت کی' افشاں بیگم کے چہرے پہ زیان کو دیکھتے ہی متاثر ہونے والی خاص کیفیت پیدا ہوئی تھی جسے مرعوبیت کا نام دیا جا سکتا تھا۔

سب نوکرانیوں نے فردا" فردا" اسے سلام کیا۔ عنیزہ ساتھ ساتھ تعارف بھی کرواتی جا رہی تھیں۔ نینال سب سے الگ آخر میں کھڑی تھی۔ اس نے بھی زیان کو خوش آمدید کہا۔ زیان نے سفید شیفون کی لانگ شرٹ اور چوڑی دار پائجامہ زیب تن کر رکھا تھا ساتھ ہم رنگ جھاگ جھاگ دوپٹا جس کے کنارے پہ میرون اور سلور لیس کے ساتھ ننھے منے گھنگھرو لگے ہوئے تھے۔ پاؤں میں سلور نگوں والی ہائی ہیل جوتی' ریشمی لمبے بال جو دونوں شانوں کے گرد بکھرے تھے۔ ستواں ناک' مغرور جاذب نظر ناک نقشہ۔ وہ پہلی نظر میں ہی اوروں کے ساتھ ساتھ نینال کو بھی متوجہ کر گئی تھی۔ قدرت نے اسے جی بھر کر دل کشی اور جاذبیت سے نوازا تھا۔ نینال نے ایک گہری نظر اسے دیکھنے کے بعد خود کو دیکھا۔ کتنے عام سے کپڑے اور عام سے حلیے میں تھی وہ۔

یونیورسٹی میں اسے فیشن آئیکون کہا جاتا تھا اس کے اسٹائل کو کاپی کیا جاتا۔ اور اب یہ لڑکی جو کروفر سے ملک محل میں تازہ تازہ وارد ہوئی تھی اسے خوامخواہ ہی پریشانی سے دوچار کر گئی تھی۔ اتنے دن کے بعد نینال عرف رنم کو اپنی پرانی زندگی یاد آئی تھی۔ کبھی وہ بھی اپنے پاپا کے ساتھ اپنے گھر میں اسی کروفر اور آن بان کے ساتھ رہتی تھی۔ بالکل کسی شہزادی کی مانند۔ جو پروٹوکول عنیزہ ملک کی بیٹی کو یہاں مل رہا تھا اپنے گھر میں اسے بھی ملتا تھا۔ مگر اب سب بدل گیا تھا۔ وہ شہر سے گاؤں پہنچ چکی تھی۔ مالکن سے نوکرانی بن گئی تھی۔

عنیزہ محبت سے زیان کو دیکھ رہی تھیں۔ یہ پیاسی ممتا کی آنکھیں تھیں۔ انہوں نے زیان کو کچھ دیر بعد نوکرانی کے ساتھ اوپر بھیج دیا تاکہ وہ فریش ہو جائے اور اپنا کمرہ بھی دیکھ لے۔

افشاں بیگم اور عنیزہ اب دونوں شاندار سٹنگ روم میں بیٹھیں باتیں کر رہی تھیں۔ موضوع گفتگو زیان ہی تھی۔

"ماشاء اللہ زیان بہت خوب صورت ہے اپنے نام کی طرح۔ چاند کا ٹکڑا ہے "افشاں بیگم نے چوتھی بار یہ جملہ کہا تو عنیزہ مسکرا دیں یہ خوشی کی مسکراہٹ تھی کیونکہ ان کی زیان کو حویلی میں قبول کر لیا گیا تھا۔

"جہانگیر بھائی کی طبیعت اب کیسی ہے ؟" انہوں نے گفتگو کے دوران پوچھا۔

"پہلے سے تو بہتر ہے لیکن آپریشن کروانے کے بعد بھی ملک صاحب کو آرام نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے بہت احتیاط بتائی ہے پر سنتے ہی نہیں کسی کی" افشاں بیگم کا لہجہ شکایتی تھا۔

"کل جب میں ان کی طبیعت کا پوچھنے گئی تو کہہ رہے تھے کہ لیٹے لیٹے تنگ آ گیا ہوں کچھ پڑھ بھی نہیں سکتا۔"

"ابھی تازہ تازہ موتیے کا آپریشن ہوا ہے اتنی جلدی کہاں کچھ پڑھ سکیں گے۔"

"بھابھی جہانگیر بھائی بھی کیا کریں مجلسی' یار باش انسان ہیں۔ ایک کمرے میں رہ رہ کر گھبرا گئے ہیں۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو یہ بڑھاپا اور بیماری انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ میں نے زیان کا بتایا تھا پر وہ ٹھیک نہیں ہیں اس لیے نہیں آئے ہیں ملک صاحب۔"

"بھابھی شرمندہ تو نہ کریں مجھے۔ زیان خود جا کر مل آئے گی ان سے بزرگ ہیں وہ ہمارے۔"

"اور یہ نینال کہاں ہے کافی دیر سے نظر نہیں آ رہی ہے۔" افشاں بیگم نے بات کا رخ بدلا۔

"صبح سے نوکرانیوں کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ میں نے اوپر والا سب حصہ صاف کروایا ہے اور نئے پردے بھی لگوائے ہیں۔ نینال بہت محنتی ہے۔ کہتی ہے بیٹھ بیٹھ کے تھک جاتی ہوں مصروف رہنا اچھا لگتا ہے۔ ادھر ادھر کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی ہے۔" عنیزہ نے افشاں بیگم کو تفصیلی جواب دیا تو انہوں نے تاسف سے سر ہلایا۔ "بے چاری۔"

"ہاں بھابھی یہ ایک انڈسٹریل ہوم کی تعمیر کب شروع کروائے گا؟" عنیزہ نے اچانک پوچھا۔

"کہہ رہا تھا جلدی کام شروع کرواؤں گا میٹریل تو منگوا لیا ہے۔ اسی سلسلے میں شہر گیا ہوا ہے۔" افشاں بیگم نے سادہ انداز میں بتایا۔

"بھابھی میں سوچ رہی ہوں جب ایک اپنا انڈسٹریل ہوم بنا لے تو میں نینال کے بارے میں اس سے بات کروں۔"

"کون سی بات؟" وہ متنفر ہوئیں۔

"یہی کہ نینال کو بھی انڈسٹریل ہوم میں کوئی کام بتائے۔ پڑھی لکھی لڑکی ہے اسی حساب سے کام کرتی اچھی لگے گی ناں۔"

"ہاں بے چاری اچھے گھر کی لگتی ہے پر قسمت بدل دیتی ہے انسان کو" افشاں بیگم نے گہرے فلسفیانہ لہجہ میں کہا۔

"ہاں بھابھی ٹھیک کہتی ہیں آپ ۔ مجھے تو بہت ترس آتا ہے نینال پہ" عنیزہ نے بھی ہمدردی کے جذبات کا اظہار کیا۔

☼ ☼ ☼

وسیع و عریض ڈائننگ ہال میں کھانے کی میز پہ صرف تین نفوس تھے۔ عنیزہ' ملک ارسلان اور خود زیان ۔ ٹیبل انواع و اقسام کی ڈشنز سے بھری ہوئی تھی۔ ملک ارسلان اور عنیزہ ایک ایک چیز خود اٹھا کر اس کی پلیٹ میں ڈال رہے تھے۔ چکھنے کے دوران ہی اس کا پیٹ بھر گیا تھا۔ یہ بات اس نے دل میں تسلیم کی تھی کہ کھانا بے حد لذیذ ہے۔ عنیزہ نے زیان کی آمد سے کئی گھنٹے پہلے ہی کھانا پکانے والی تینوں نوکرانیوں کو باورچی خانے میں مصروف کر دیا تھا۔

ملک ارسلان کا رویہ بے حد دوستانہ اور اپنائیت بھرا تھا۔ کھانے کے بعد وہ اس کی اجنبیت دور کرنے

کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔

عنیزہ محبت بھری نگاہوں سے زیان کو دیکھے جا رہی تھیں۔ زیان بہت کم بول رہی تھی یا مختصر ترین جواب دے رہی تھی۔ ان کے لہجے اور انداز میں زیان کے لیے شفقت تھی۔ اسے بہت سوچنے کے بعد بھی ایسا کوئی لمحہ یاد نہیں آیا' جب امیر علی نے پاس بیٹھ کر اس سے اتنی محبت اور توجہ سے کوئی بات کی ہو یا پوچھا ہو۔ یہ اجنبی مرد کیوں اس پہ حد درجہ مہربان ہے؟ کیوں اتنی شفقت کا برتاؤ کر رہا ہے؟ جبکہ اسے سگے باپ تک نے اسے کبھی اتنی اہمیت نہیں دی جتنی یہاں مل رہی تھی۔ اس کے دماغ میں کش مکش ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ملک محل میں اس کی آمد کی پہلی رات تھی۔ عنیزہ خود زیان کو کمرے میں چھوڑنے آئی تھیں۔ اس کا بیڈ روم اوپری منزل پہ تھا۔

"چلو تم آرام کرو تھک گئی ہو گی لمبے سفر سے" عنیزہ کو اس کے پاس بیٹھے پندرہ منٹ سے اوپر ہو گئے تھے۔ ان کی باتوں کے جواب میں زیان ہوں ہاں کر رہی تھی یا پھر سر ہلانے پہ اکتفا کر رہی تھی۔ عنیزہ اسے نیند یا تھکن کا اثر سمجھی تھیں۔

"میں چلتی ہوں بیٹا تم ریسٹ کرو" عنیزہ نے جانے سے پہلے اسے سینے سے لگا کر ایک بار پھر اس کا ماتھا چوما۔ وہ رسمی سے انداز میں مسکرائی۔ عنیزہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھتی نیچے جا رہی تھیں۔ زیان کی نظریں جیسے ان کے آگے بڑھتے قدموں کا حساب کر رہی تھی۔ وہ نگاہوں سے اوجھل ہوئی تو اس نے دروازہ بند کیا۔

اس نے دروازہ لاک کرنے کے بعد آگے پردے بھی کھینچ دیے پھر کھڑکیوں کے ساتھ بھی اس نے یہی سلوک کیا تو بعد میں اسے اپنی اس احتیاط پہ خود ہی ہنسی آگئی۔ یہ زرینہ آنٹی کا گھر نہیں تھا بلکہ وہاں سے وہ آج یہاں آگئی تھی اور دہاب جیسا عفریت بھی نہیں تھا جو وہ اس طرح سب دروازے اور کھڑکیاں بند کر رہی تھی۔ جبکہ یہاں تو ملک ارسلان تھے شاندار پرسنالٹی کے مالک۔ اس کی ماں تھی' عنیزہ۔ بالکل ملک ارسلان کی طرح باوقار۔ یہ بے پناہ سہولیات والا شاندار کمرا اس کا تھا۔ پر اس کے دل میں بے پناہ نفرت بھی تو تھی۔ دل میں اگنے والے نفرت و بیگانگی کے تناور درخت کو تازہ پانی مل گیا تھا۔ وہ کچھ مثبت سوچنے پہ آمادہ نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے کھڑکیوں پہ پڑے پردے سرکائے۔ داخلی دروازے کے ساتھ کی پوری دیوار شیشے کی تھی جس پہ پردے تھے اس نے وہ سب پردے بھی ہٹا دیے۔ شیشے کی دیوار کے آگے طویل برآمدہ تھا جس کے کونے کے ساتھ پودوں کے پینٹ کیے ہوئے گملے تھے۔ برآمدے کو سہارا دینے والے ستونوں کے گرد سرسبز بیلیں لپٹی اوپر تک جا رہی تھی۔ زیان کو شیشے کی دیوار سے پرے نظارا بڑا دلچسپ لگا۔ وہ بیڈ روم کا دروازہ کھول کر باہر برآمدے میں آگئی۔ سامنے کنارے پہ چار فٹ اونچی دیوار تھی۔ سامنے آگے کچھ فاصلے پہ بالکل اسی بناوٹ کی ایک اور عمارت تھی۔ شام کو عنیزہ نے اسے بتایا تھا کہ سامنے والا رہائشی حصہ افشاں بھابھی کا ہے۔

دونوں عمارتیں ایک جیسی تھیں۔ دوسری عمارت کی اوپری منزل پہ زیان کے کمرے کے عین سامنے بالکل اسی جیسا کمرا تھا۔ وہ دیوار پہ کہنیاں ٹکا کر کھڑی ہو گی اور سامنے موجود کمرے کو دیکھنے لگی جس کی کھڑکی اور دروازہ' دونوں کھلے ہوئے تھے۔ کمرے کی برآمدے کی سب لائٹیں بھی آن تھیں۔ وسیع ٹیرس پھولوں کے بڑے بڑے گملوں سے سجا ہوا تھا۔ کھلے دروازے سے اندر کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پردے سمٹے ہونے کی وجہ سے وہ اندر موجود ایک ایک چیز کو دیکھ سکتی تھی۔ مشرقی دیوار کے ساتھ جہازی سائز بیڈ پڑا تھا۔ سیلنگ فین کے چلنے کی وجہ سے سمٹے پردے دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔

وہ بڑی دلچسپی سے جائزہ لے رہی تھی جب اچانک ایک نوجوان تولیے سے سر رگڑتا جانے کہاں سے برآمد

ہوا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ زیان کی طرف اس کی پشت تھی۔ چوڑے کندھے اور بازوؤں کے مسلز واضح تھے۔ وہ بالوں میں برش کر رہا تھا۔ اسے پہلے کہ وہ پلٹتا زیان برآمدے سے ہٹ کر کمرے میں آگئی۔ افشاں آنٹی کے گھر سے ہی کوئی ہو گا اس نے اندازہ لگایا۔ اسے یہاں آئے ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے اس لیے یہاں کی مکینوں کے بارے میں لاعلم ہی تھی۔

شکر ہے کہ وہ اس اجنبی نوجوان کے رخ موڑنے سے قبل ہی کمرے میں آگئی تھی وہ برآمدے کی دیوار کے ساتھ کھڑی بے دھیانی میں جائزہ لینے میں مگن تھی وہ جو کوئی بھی تھا اسے اس انداز میں دیکھتا تو جانے کیا سوچتا۔ دونوں کمرے اوپری منزل پہ بالکل آمنے سامنے اور طرز تعمیر' نقشے' بناوٹ' رنگ میں ایک جیسے تھے۔ ملک محل کے دو حصے تھے۔ ایک میں ملک جہانگیر اور دوسرے میں ملک ارسلان رہائش پذیر تھے۔ دونوں حصوں کو الگ اور جدا کرنے کے لیے ڈم ڈم کی باڑ اور اس کے بعد سرسبز میدان تھا۔

زیان صوفے پہ بیٹھ گئی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ اپنی بے معنی' لایعنی سوچوں کے بھنور میں ڈوبتے ابھرتے جانے کتنی دیر گزر چکی تھی۔ اس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہونے لگی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیڈ کی طرف آئی تو نہ چاہتے ہوئے نگاہ شیشے کی دیوار سے پرے کمرے کی طرف اٹھ گئی۔ دوسری طرف بھی شیشے کی دیوار پہ سے پردے سرکا دیے گئے تھے۔ اندر زیرو پاور کی سبز لائٹ جل رہی تھی اور وہ جو کوئی بھی تھا بیڈ پہ لیٹا ایک تکیہ سیدھے بازو تلے دبائے سو رہا تھا۔ زیان کے کمرے کی لائٹس آف تھیں۔ پھر بھی احتیاطاً" اس نے شیشے کے دیوار پہ پردے برابر کر دیے۔ البتہ کھڑکی ہنوز کھلی تھی اور پردے بھی ہٹے ہوئے تھے۔ وہ صوفے سے اٹھ کر مسہری پہ آئی اور نیم دراز ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

زیان' عنیزہ اور ملک ارسلان تینوں ناشتا کر رہے تھے۔ بیچ بیچ میں باتیں بھی جاری تھی۔

"ملک صاحب مجھے مارکیٹ جانا ہے۔ زیان کو شاپنگ کروانی ہے۔" عنیزہ نے ملک ارسلان کو مطلع کیا۔ زیان نے ایک نگاہ اٹھا کر دونوں کے چہرے پہ ڈالی اور پھر سے ناشتا کرنے میں مصروف ہو گئی۔

"ہاں تو تم ڈرائیور اور گارڈ کے ساتھ چلی جاؤ۔" انہوں نے باخوشی عنیزہ کو اجازت دی۔

"آپ ساتھ نہیں جائیں گے؟" عنیزہ کو جیسے تھوڑی مایوسی ہوئی۔ "مجھے آج کورٹ جانا ہے چودھری ریاض والے کیس کے سلسلے میں۔ رات ایبک بھی واپس آگیا ہے۔ میرا جانا ضروری نہ ہوتا تو تمہارے ساتھ ضرور جاتا۔ ایبک بھی اسی وجہ سے آیا ہے۔"

"اچھا ایبک آگیا ہے۔" عنیزہ نے خوشی کا اظہار کیا۔

"ہاں رات کو آیا ہے۔ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد میں اس سے ملا ہوں" ملک ارسلان نے تفصیل بتائی۔

"اچھا میں زیان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔" عنیزہ انہیں بتانے لگیں۔

"تم ناشتا کرنے کے بعد جانے کی تیاری کرو اچھا خاصا ٹائم لگ جائے گا۔" ملک ارسلان نے مشورہ دیا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"زیان بیٹا' ناشتا کر چکی تو چینج کرو ہمیں جلدی جانا ہو گا۔" عنیزہ نے روئے سخن اس کی طرف موڑا تو اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔

خریداری کرتے ہوئے زیان نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ بس عنیزہ جو لیتی گئیں وہ بغیر کسی تاثر کے دیکھتی رہی نہ پسندیدگی کا اظہار کیا نہ ناپسندیدگی کا۔ ایسے لگ رہا تھا وہ روبوٹ ہے سوئچ آن آف کرنے کی محتاج۔

عنیزہ نے اس کے لیے بے شمار کپڑے' جوتے' جیولری کاسمیٹکس پروڈکٹس خریدیں سب اشیاء برانڈڈ اور بیش قیمت تھیں۔ پر زیان کے چہرے پہ ایک بار بھی کسی تاثر نے جگہ نہیں بنائی۔ اس کی یہ خاموشی

سرد مہری اور بیگانگی عنیزہ کے لیے تکلیف دہ تھی۔ گزرتے اٹھارہ برسوں نے زیان کو ان سے صدیوں کے فاصلے پہ لاکھڑا کیا تھا۔ وہ اجنبی کی مانند برتاؤ کر رہی تھی۔ وہ خود سے مخاطب کرتیں تو زیان بولتی ورنہ اس کے لبوں پہ چپ کا قفل تھا۔

"واپسی پہ بہت دیر ہو جائے گی ورنہ آج میں تمہیں جہانگیر بھائی سے ملواتی۔ تم ان سے مل کر بہت خوشی محسوس کرو گی کیونکہ جہانگیر بھائی بہت محبت کرنے والے انسان ہیں۔" شاپنگ ختم کرنے کے بعد وہ اب واپس جا رہی تھیں جب عنیزہ نے گفتگو کا آغاز کیا۔ جواب میں زیان نے سر ہلایا۔

"پتا ہے افشاں بھابھی تمہاری اتنی تعریف کر رہی تھیں کہتی ہیں زیان چاند کا ٹکڑا ہے بہت خوب صورت ہے۔" عنیزہ کا چہرہ یہ بتاتے ہوئے خوشی سے چمک رہا تھا۔ زیان کے چہرے پہ مسکراہٹ ابھری۔

"افشاں بھابھی کے دو بیٹے ہیں۔ چھوٹا معاذ پڑھنے کے لیے باہر گیا ہوا ہے جبکہ ایبک یہیں ہے۔ زیادہ تر شہر میں رہتا ہے۔ بہت مصروف ہوتا ہے۔ کہتا ہے گاؤں میں انڈسٹریل ہوم بنواؤں گا بلکہ اس نے کام بھی شروع کروا دیا ہے۔ اس کا ارادہ گاؤں میں بہت اچھا اسکول بنانے کا بھی ہے۔ اس کے دل میں اوروں کے لیے کام کرنے کا جذبہ ہے۔ شہر کے ساتھ ساتھ وہ گاؤں میں بھی بہت مصروف رہتا ہے۔ ہم آج شاپنگ کے لیے آ گئے ورنہ تمہاری اسے ملاقات ہو جاتی۔ ایبک بہت احترام کرتا ہے میرا۔"

عنیزہ ایبک نامی شخص کے بارے میں بہت تفصیل سے بتا رہی تھیں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی بس غائب دماغی سے سر ہلائے جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ایبک، ملک ارسلان کے ساتھ کورٹ سے واپس آ چکا تھا۔ دونوں ایک ساتھ ایک ہی گاڑی میں گئے تھے۔ واپسی پہ ملک ارسلان نے اسے کھانے کے لیے روک لیا۔ کھانا تیار تھا صرف ٹیبل پہ لگانا تھا۔ نینال نے ملک ارسلان کی واپسی کا سنتے ہی کھانا اپنی نگرانی میں لگوایا۔ وہ کھانے کی ڈشز اور ڈائننگ ہال کا جائزہ لے رہی تھی جب ملک ارسلان ایبک کے ساتھ ڈائننگ ہال میں پہنچے۔

اب یہ اتفاق کی بات تھی کہ نینال کا آج پہلی بار ملک ایبک کے ساتھ سامنا ہوا تھا۔ حالانکہ اسے "ملک محل" میں آئے کافی دن ہو چلے تھے۔ ایک اجنبی صورت ملک ارسلان کے گھر ایبک نے پہلی بار دیکھی تھی لہٰذا اس نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"یہ نینال ہے اور ہم اسے ..." وہ نینال کی موجودگی کے خیال سے بہت آہستہ آواز میں بات کر رہے تھے۔ ایبک نے کھوجتی نگاہوں سے نینال کا جائزہ لیا تو اس نے ایبک کو سلام کیا۔ پڑھا لکھا مہذب لہجہ تھا، کپڑے بھی اس نے طریقے سلیقے کے پہن رکھے تھے اس لیے اس نے نینال کو غور سے دیکھا تھا۔ وہ اس کے دیکھنے سے اپنے آپ میں بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ لیکن اس کے بعد ایبک نے دوبارہ نینال کی طرف نہیں دیکھا۔ بلکہ ارسلان کے ساتھ باتوں میں مگن ہو گیا۔ نینال وہاں سے جا چکی تھی۔ ملک ارسلان اب کھل کر نینال کے بارے میں بتا رہے تھے۔

"بس اس بے چاری کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ عنیزہ بہت نازک اور خدا ترس دل کی مالک ہے۔ جھٹ اسے اپنے ساتھ لے آئی۔ ہمیں اس کی موجودگی سے کوئی تکلیف یا پریشانی نہیں ہے۔ سارا دن حویلی میں لگی رہتی ہے۔ عنیزہ اس کے بارے میں تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔ مجھے کہہ رہی تھی کہ ایبک سے کہوں گی انڈسٹریل ہوم اور اسکول بنوانے کے بعد اسے بھی وہیں رکھ لو۔ پڑھی لکھی لڑکی ہے بہت کام آئے گی محنتی بھی ہے۔" ملک ارسلان نے نینال کے ہوٹل میں ٹکراؤ اور اس کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ گول کر دیا تھا۔

پر ایبک کو رہ رہ کر ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔

نینال کی پوری شخصیت سے کسی بھی قسم کی بے چارگی اور درماندگی کا اظہار نہیں ہو رہا تھا جس کا تذکرہ ابھی ابھی ارسلان چچا نے کیا تھا۔ اس نے چچا کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ایبک نے ان کی بات پورے غور سے سنی اور کسی بھی قسم کے تبصرے سے گریز کیا۔

"تمہاری چچی تو شاپنگ کر کے ابھی تک نہیں لوٹی ہیں۔" ارسلان کلائی میں پہنی گھڑی پہ ٹائم دیکھ رہے تھے۔

"چچا میں رات کو آؤں گا۔"

"ہاں تب میری بیٹی سے بھی مل لینا" ملک ارسلان کے لہجے کا یہ رنگ بہت انوکھا سا تھا۔ وہ یک ٹک انہیں دیکھنے لگا۔

"عنیزہ بہت خوش ہے۔ جب سے میں اسے بیاہ کر یہاں لایا ہوں تب سے اب اسے پہلی بار اتنا خوش اور مسرور دیکھا ہے۔ وہ زیان کو دیکھ دیکھ کر جی رہی ہے۔"

عنیزہ کا نام لیتے ہی ملک ارسلان کے لہجے میں محبت اتر آئی تھی۔ ابھی ابھی ایبک نے بھی یہ مظاہرہ دیکھا تھا۔ ملک ارسلان چچا اور عنیزہ چچی کی محبت کی کہانی سے وہ بہت اچھی طرح واقف تھا۔ دل سے وہ ان کی عزت کرتا تھا کیونکہ ایبک ان کی اعلا ظرفی اور وسعت قلبی کا شاہد تھا۔ عنیزہ چچی کی بیٹی کا علم اسے کچھ برس پہلے ہوا تھا جب عنیزہ چچی پہ ڈپریشن کا شدید حملہ ہوا تھا انہوں نے کمرے میں رکھی گئی ہر چیز توڑ دی تھی اور خود کو بھی زخمی کر لیا تھا تب ہسپتال میں ایبک نے ارسلان چچا کو طویل کوریڈور میں ٹہلتے اور اپنے آنسو چھپاتے دیکھا تھا۔ اس نے جرات کر کے چچا سے پوچھا تھا۔ تب انہوں نے اسے سب بتا دیا کہ عنیزہ چچی کی اس شدید بگڑتی حالت کا سبب کیا ہے۔ ایبک کے بس میں ہوتا تو ان کی بیٹی کہیں سے لا کر ان کے سامنے کھڑی کر دیتا۔ کیونکہ ارسلان چچا اور عنیزہ چچی اسے ماورائی اساطیری داستانوں کے کردار لگتے۔ جو زندہ ہو کر ملک محل میں آ گئے تھے۔

"چچا جان یہ تو اچھی بات ہے اللہ کرے چچی اب ایسے ہی خوش رہیں" ایبک نے دل کی گہرائی سے دعائیہ جملہ بولا تھا جس پہ ارسلان کا آمین کہنا بے ساختہ تھا۔

تمہاری چچی کل سے اتنی خوش ہیں کہ مجھے بھی نظر انداز کر دیا ہے۔" ملک ارسلان نے ہنستے ہوئے لطیف سا شکوہ کیا۔

"چچی ایسی نہیں ہیں کہ آپ کو نظر انداز کریں۔" اس نے پورے وثوق سے کہا۔

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو میں تو بس ایسے ہی آج ذرا اسے تنگ کرنے کا موڈ بنا رہا تھا" ارسلان چچا کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ اس بار ایبک کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

☆ ☆ ☆

زیان اور عنیزہ کافی لیٹ واپس آئیں۔ مغرب تو ہو ہی چکی تھی۔ اس تاخیر کا سبب شہر سے گاؤں کا طویل فاصلہ تھا۔ پھر جیولر کے پاس انہیں کافی ٹائم لگ گیا تھا۔ عنیزہ نے زیان کے لیے گولڈ کی اور دیگر جیولری خریدی تھی ڈائمنڈ کے ایئر رنگز اور خوب صورت سی رنگ تو انہوں نے جیولر کی شاپ پہ ہی زیان کو زبردستی پہنائی تھی۔

زیان اس آنے جانے میں آج بہت تھک گئی تھی۔ اس کی تھکن دیکھتے ہوئے عنیزہ نے نوکرانی کو کوئی اشارہ کیا تو کچھ دیر بعد وہ ایک ٹب میں نیم گرم پانی لیے چلی آئی۔ پانی میں گلاب کے پھولوں کی پتیاں تیر رہی تھیں۔ عنیزہ کے حکم پہ اس نے پانی والا ٹب صوفے پہ بیٹھی زیان کے پاؤں کے پاس رکھ کر اس کے سوچنے سمجھنے سے بیشتر ہی اس کے پاؤں نرمی سے اٹھا کر ٹب میں ڈال دیے۔ وہ احتجاج کرنا چاہتی تھی پر نہ جانے کیوں عنیزہ کا چہرہ دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ نوکرانی نمک ملے پانی سے اس کے پاؤں دھو رہی تھی پانی میں گلاب کی پتیوں اور نمک کے ساتھ اور جانے کیا کیا کچھ ڈالا گیا تھا۔ کیونکہ پانی میں سے بڑی اچھی خوشبو آ رہی

تھی۔ نوکرانی نے اس کے پاؤں دھو کر صاف کر دیے تھے۔ اب وہ تولیے سے اس کے پاؤں خشک کر رہی تھی۔ زیان کو بے پناہ سکون کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ آنکھیں موندے صوفے پہ نیم دراز تھی جب نہنال بہت سے شاپرز لیے وہاں آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ملک ارسلان بھی تھے۔ زیان آنکھیں کھولے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"آ گئے آپ لوگ واپس اور میری بیٹی کیسی ہے؟ لگتا ہے تھک گئی ہو" وہ بیک وقت عنیزہ اور زیان سے مخاطب ہوئے۔ ان کے منہ سے "میری بیٹی" کا لفظ زیان کو بہت عجیب سا لگا کیونکہ ابو نے بھی اسے میری بیٹی کہہ کر بلانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ تو اس کی پروا ہی نہیں کرتے تھے۔

"جی بس تھوڑی سی تھکن ہے" نظریں جھکا کر اس نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

"ذرا دکھایئے تو کیا کیا شاپنگ کی ہے آپ نے" اس بار بھی ان کا مخاطب سوفی صد زیان ہی تھی۔ ناچار وہ نہنال کے لائے گئے شاپر اٹھا کر ان کے پاس بیٹھ کر خریدی گئی چیزیں دکھانے لگی۔ انہوں نے ایک ایک چیز شوق اور دلچسپی سے دیکھی اور تعریف کی۔ عنیزہ ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہی تھیں۔ ملک ارسلان زیان کو حد درجہ توجہ دے رہے تھے۔

نہنال اس رخ پہ کھڑی تھی کہ زیان کا پورا چہرا اور ہاتھ پاؤں اس کے سامنے تھے۔ وہ بڑی توجہ سے ارسلان کو مختلف چیزیں دکھانے میں مصروف تھی۔ برانڈڈ کپڑوں جوتوں پرفیومز' جیولری اور دیگر اشیاء کا ایک چھوٹا سا ڈھیر نہنال کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ زیان کے گلابی آمیزش لیے سفید بے داغ پاؤں اس کے دل کو عجیب بے عنوان سی پریشانی اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہے تھے۔ "یہ سوٹ کل پہننا" ملک ارسلان نے پنک اور وائیٹ کامبنیشن والا فراک نکال کر الگ سے رکھا۔ نہنال کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں مسلا۔

احمد سیال بھی تو اسے ایسی ہی فرمائش کرتے تھے۔ دونوں مل کر شاپنگ کرتے' وہ رخم کو ہر چیز کے بارے میں اپنی رائے دیتے اور اپنی پسند سے اس کے لیے خریداری کرتے۔ اور جب ان دونوں کو مل کر کسی جگہ جانا ہوتا تو وہ خود اس کے لیے پہنے جانے والے کپڑے سلیکٹ کرتے۔ پورے دن میں پہلی مرتبہ زیان کے ہونٹوں پہ بے ریا مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو ہاں میں کل یہی کپڑے پہنوں گی۔ رخم سے یہ منظر مزید برداشت نہیں ہو رہا تھا اس لیے وہاں سے ہٹ گئی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے زیان کو دیکھ دیکھ کر وہ احساس کمتری کا شکار ہو رہی ہے۔

کھانا کھا کر زیان اوپری منزل پہ اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ لائٹ جلا کر اس نے سب سے پہلے پردے سرکائے تو نگاہ دوسرے کمرے کی طرف اٹھ گئی۔ برآمدے کی سب لائٹس آن تھیں پر سامنے کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سونے سے پہلے اس نے ٹھنڈے پانی سے شاور لیا تو طبیعت کی سب تھکن اور بوجھل پن دم توڑ گیا۔ تکیہ سر تلے رکھے وہ سونے کے لیے دراز ہوئی تو بہت جلد نیند کی وادیوں میں اتری۔

☼ ☼ ☼

ایبک سونے کے لیے اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا۔ نیچے وہ ملک جہانگیر اور افشاں بیگم کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ملک جہانگیر نے پھر سے اس کی شادی کا موضوع چھیڑ رکھا تھا۔ اس بار افشاں بیگم بھی ان کی ہمنوا تھیں۔

"بابا جان انڈسٹریل ہوم کی تعمیر شروع ہے۔ اسکول کا سنگ بنیاد بھی رکھا جا چکا ہے۔ میں کچھ ماہ بہت مصروف رہوں گا۔" اس نے جیسے اپنی مجبوری بتائی۔

"بیٹا شادی اور دیگر کام سب ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔" جہانگیر نے اس کی بات کو چنداں! اہمیت نہ دی۔ بھلا ہوا افشاں بیگم کا جو انہوں نے زیان کی آمد کا قصہ چھیڑ دیا تب کہیں جا کر ان کی توجہ ایبک کی شادی سے ہٹی۔ وہ خیر مناتا ان کے پاس سے اٹھ آیا۔

کمرے کی لائٹس آن تھیں۔ ملازم مغرب سے پہلے اس کے بیڈ روم اور اوپری حصے کی تمام بتیاں جلا دیتے تھے۔ اس نے شرٹ اتار کر بیڈ پہ رکھی اور واش روم میں آ گیا۔ نہانے کے بعد وہ نائٹ شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس باہر آیا۔ شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر گیلے بالوں میں حسب معمول برش پھیرا۔

ملک جہانگیر کی باتوں کو از سر نو سوچتے ہوئے اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔ جہاں دیوار کے ساتھ پھولوں کے گملے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے اور پاس ہی ایک کرسی پڑی تھی وہ اکثر یہاں آ کر بیٹھتا تھا۔ وہ جیسے ہی کرسی پہ دراز ہوا نگاہ اچانک ارسلان چچا کے گھر کی طرف اٹھی۔ اس کی نگاہوں کا مرکز اوپری منزل پہ واقع عین اس کے کمرے کے سامنے والا کمرا تھا۔

اندر زیرو پاور کے بلب کے ساتھ بیڈ لیمپ بھی آن تھا۔ سب پردے سمٹے ہوئے تھے اس لیے منظر واضح تھا۔ سامنے بیڈ پہ اوندھے منہ ایک نسوانی وجود محو خواب تھا کیونکہ کھلے لمبے بال اس سوئے ہوئے وجود کے اردگرد بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی معلومات کے مطابق اوپری حصہ خالی تھا۔ خالی ان معنوں میں کہ سامان تو سب کمروں میں تھا پر کوئی رہتا نہیں تھا۔

عنیزہ چچی اور ارسلان چچا نیچے رہائش پذیر تھے۔ نوکروں کے لیے الگ رہائشی حصہ مخصوص تھا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ حویلی میں عنیزہ چچی کی بیٹی بھی تو آئی ہے۔ سو فی صد وہ یہی ہو گی۔ ملک ایبک نے اندازہ لگایا۔ اسے دوسری بار دیکھنا نامناسب محسوس ہوا اس لیے بیڈ روم میں آ کر لیٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

زیان صبح خاصی دیر بعد بے دار ہوئی۔ ہلکا پھلکا ناشتا کرنے کے بعد فارغ ہوئی تو نوکرانی اطلاع کرنے آئی کہ آپ کے کپڑے استری ہو چکے ہیں' آپ تبدیل کر لیں۔ یہی وہ سوٹ تھا جو ملک ارسلان نے الگ نکال کر رکھا تھا۔ زیان تبدیل کر کے آئی تو وہی نوکرانی ہاتھوں میں موتیے کے گجرے لیے کھڑی تھی۔ زیان کی دونوں کلائیوں میں اس نے گجرے پہنائے۔ "چھوٹی بی بی آپ بہت سوہنی ہیں"۔ اس نے زیان کو بغور دیکھتے ہوئے تعریف کی تو وہ جھینپ سی گئی۔ نوکرانی نے اسی بڑی دلچسپی سے دیکھا۔

زیان ٹی وی لاؤنج میں آئی تو عنیزہ بھی وہیں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے اس کے لیے اپنے پاس جگہ بنائی تو وہ ادھر ہی بیٹھ گئی۔ ٹی وی پہ مشہور زمانہ ایک ٹاک شو آن ایئر تھا۔ زیان کی نظریں بظاہر ٹی وی سکرین پہ اور ذہن کسی اور شے کی طرف مرتکز تھا۔ عنیزہ ٹی وی دیکھنے کے ساتھ ساتھ اسے ادھر ادھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں کر رہی تھیں جن کا جواب وہ سر ہلا کر ہوں ہاں میں دے رہی تھی۔

تب ہی ملک ایبک ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوا۔ خوشبوؤں میں بسا بانکا سجیلا سا تیار۔ اسے دیکھ کر جیسے زندگی اور تازگی کا احساس فضا پہ حاوی ہو رہا تھا۔

"السلام علیکم" اس کی آواز سے گرمجوشی اور اپنائیت جھلک رہی تھی۔ زیان نے سلام کا جواب بہت مدہم آواز میں دیا۔ وہ فورا" پہچان گئی تھی۔ رات اپنے سامنے والے کمرے میں اس نے جس نوجوان کو دیکھا تھا وہ یہی تھا۔

"کب آئے ہو بیٹا تم اور سب ٹھیک ہے ناں؟" عنیزہ نے کھڑے ہو کر جس محبت سے اس کا ماتھا چوم کر حال احوال دریافت کیا تھا وہ زیان کو ایبک کی اہمیت بتانے کے لیے کافی تھا۔

"چچی جان میں کل شام کو آپ کی طرف آیا تھا سوچا مہمانوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی پر آپ لوگ نہیں ملے میں نے سوچا ابھی جا کر خیریت معلوم کر آؤں۔" اس کا اشارہ زیان کی طرف تھا۔ بات کرتے کرتے ملک ایبک نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ زیان کے چہرے کے تاثرات میں کسی بھی قسم کی گرمجوشی اور مروت نہیں تھی۔

"ایبک یہ میری بیٹی زیان ہے اور زیان یہ افشاں بھابھی اور جہانگیر بھائی کا بڑا بیٹا ایبک ہے۔ سو ہی جہانگیر

بھائی جن کے گھر جانے کا میں نے تمہیں بولا تھا۔" عنیزہ نے تعارف کروایا۔ زیان عدم دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ ایبک نے میزبانی کے اصول نبھاتے ہوئے خود سے بات کا آغاز کیا۔ زیان آپ کی کیا مصروفیات ہیں آج کل کیا کر رہی ہیں؟"

اس نے جھٹ سے جواب دیا "میں کچھ نہیں کرتی۔" عنیزہ شرمندہ سی ہو گئیں۔ زیان کا انداز لٹھ مارنے والا تھا۔ جیسے بول کر احسان کر رہی ہو۔

"ایبک' زیان نے حال ہی میں گریجویشن کیا ہے۔" عنیزہ نے اس کے رویے کی تلخی کو زائل کرنے کے لیے خود جواب دیا۔ "آپ نے کن سبجیکٹ کے ساتھ گریجوشن کیا ہے زیان؟" ایبک کی طرف سے اگلا سوال آیا۔

"میں نے ماس کیمونیکیشن میں گریجوشن کیا ہے۔"

"آگے کیا ارادے ہیں آپ کے؟" ایبک نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں۔" وہ پہلے کی طرح سرد لہجہ میں بولی تو عنیزہ کو بے انتہا شرمندگی ہوئی۔

"میں ذرا فریدہ کو دیکھ آؤں تمہیں اچھی سی چائے پلواتی ہوں۔" زیان کے رویے کی شرمندگی کی وجہ سے پیدا ہونے والی شرمندگی کے تاثر کو زائل کرنے کے لیے عنیزہ دانستہ طور پہ وہاں سی ہٹنا چاہ رہی تھیں۔

"چچی میں آج دیر سے اٹھا ہوں ابھی کچھ دیر پہلے ناشتا کیا ہے۔ فی الحال گنجائش نہیں ہے۔" ایبک نے سلیقے سے انکار کیا۔

"اچھا میں جوس کا بول کر آتی ہوں زیان نے ناشتے میں صرف انڈا اور توسٹ کھایا ہے۔ اسی بہانے یہ بھی پی لے گی" عنیزہ نے اس کی اگلی بات سنے بغیر قدم آگے بڑھا دیے۔

زیان نے عنیزہ کے جاتے ہی ریموٹ کنٹرول سے چینل تبدیل کر دیا۔ اب صرف ٹی وی کی آواز تھی ایبک اور زیان دونوں خاموش تھے۔ ایبک نے ایک نظر خاموش بیٹھی زیان کی طرف دیکھا۔ پنک فراک اور ٹراؤزر میں ملبوس دوپٹا سر پہ لیے (ایبک کے آنے سے پہلے دوپٹا اس کے شانے پہ سمٹا پڑا تھا۔ ایبک کو دیکھتے ہی اس نے پھیلا کر سر پہ اوڑھا تھا۔) ٹانگ پہ ٹانگ رکھی اپنے خفا خفا سے تاثرات سمیت وہ کافی مغرور نظر آ رہی تھی۔ ایبک کے مونچھوں تلے دبے عنابی ہونٹوں پہ عجیب بیساختہ سی مسکراہٹ در آئی تھی۔ زیان مار دھاڑ سے بھرپور ایکشن تھرلر فلم دیکھنے میں پوری طرح مگن تھی۔ جیسے اس کے سوا یہاں اور کوئی ذی نفس موجود ہی نہ ہو۔ ایبک کی موجودگی کا اس نے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔

نہناں' فریدہ کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئی۔ فریدہ اور نہناں کے ہاتھ میں دو ٹرے تھیں۔ جن میں جوس سمیت کھانے پینے کے مختلف لوازمات تھے ان کے پیچھے ہی عنیزہ تھیں۔ کھانے پینے کی سب اشیاء ٹیبل پہ سج گئی تھیں۔ "نہناں آپ کیسی ہیں؟" وہ گلاس میں جوس ڈال رہی تھی۔ زیان نے حیرت بھری نگاہوں سے اس کی سمت دیکھا وہ عام سی نوکرانی سے کتنے طریقے اور سبھاؤ سے بات کر رہا تھا۔ نہناں کے ساتھ اس نے فریدہ سے بھی حال احوال پوچھا۔ نہناں نے بہت ادب سے جوس کا گلاس ایبک کے سامنے ٹیبل پہ رکھا۔ دوسرا گلاس اس نے زیان کے سامنے رکھا۔ وہ کسی مغرور شہزادی کی طرح ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی تھی جیسے ساری دنیا اس کے قدموں تلے ہو۔ رنم کو جانے کیوں پھر اس پہ شدید غصہ آیا۔ ہر بار زیان سے آمنا سامنا ہونے پہ ایسا محسوس ہوتا جیسے اس نے رنم کی جگہ پہ قبضہ کر لیا ہو۔ ملک ارسلان' عنیزہ بیگم سے لے کر نوکرانیاں تک اس نک چڑھی زیان کو اپنی پلکوں پہ بٹھا رہے تھے جیسے۔ اسے اہمیت دے رہے تھے۔ زیان کو اس قدر اہمیت دینا اسے کھل رہا تھا۔

"ایبک' نہناں پڑھی لکھی اور قابل لڑکی ہے۔ سارا دن حویلی میں چھوٹے موٹے کاموں میں لگی رہتی ہے۔ میں چاہتی ہوں جب تم انڈسٹریل ہوم بنا لو تو اس

کو بھی وہاں رکھ لو۔ وہاں کے سب معاملات کو سنبھال لے گی" عنیزہ نے ایبک کی توجہ نہناں کے مسئلے کی طرف دلائی۔

"چچی میں اب گاؤں میں ہی ہوں۔ انڈسٹریل ہوم کی عمارت تکمیل کے مراحل میں ہے۔ مزدوروں اور مستریوں نے جلدی بنانے کے لیے دن رات ایک کر دیا ہے۔ ابھی تھوڑا ٹائم باقی ہے جب سلائی مشین اور دیگر سامان آجائے گا تو میں آپ کو بتاؤں گا اور نہناں کے لیے بھی جگہ دیکھوں گا" اس نے عنیزہ چچی کو امید دلائی۔ وہ نہناں کے مسئلے کی طرف متوجہ تھا اسے خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

"ہاں اسے جو بھی کام دو گے کر لے گی۔" عنیزہ نے اس کی تعریف کی۔

"چچی جان آپ کا حکم سر آنکھوں پہ" وہ مسکرایا۔ زیان ایک بار پھر حیران ہو رہی تھی۔ عنیزہ اور ایبک ایک عام سی نوکرانی کے لیے کتنا فکر مند تھے۔

ایبک نے اپنی طرف رکھا جوس کا گلاس اٹھایا۔ عنیزہ چچی کی مغرور بیٹی ایکشن فلم میں بری طرح ڈوبی ہوئی تھی۔ ایبک کو مزید یہاں بیٹھنا عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ واپسی کے لیے اٹھا۔ زیان نے اسے جاتے ہوئے پیچھے سے دیکھا۔ اس کے چوڑے کندھے اور پشت نمایاں تھی۔ وہ سر جھٹک کر پھر سے ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گی۔

☼ ☼ ☼

زیان' عنیزہ کے ساتھ ملک جہانگیر کی طرف پہلی بار آئی تھی۔ اس نے مہین شفون کا جالی لگے بازوؤں والا کالا فراک اور ساتھ چوڑی دار پائجامہ زیب تن کر رکھا تھا۔ لمبے بال ربڑ بینڈ میں جکڑے پیچھے کمر پہ پڑے تھے۔ مہین شفون کا دوپٹا بہت سلیقے سے سر پہ جما تھا۔ ایک کلائی میں پرل کا نازک سا بریسلیٹ تھا۔

افشاں بیگم بہت پیار سے اسے گلے لگا کر ملی تھیں۔ پھر وہ اسے ملک جہانگیر کے پاس ان کے کمرے میں لائیں۔ وہ بیڈ پہ نیم دراز تھے۔ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ڈاکٹرز نے انہیں بیڈ ریسٹ کا مشورہ دیا تھا۔ انہیں دیکھتے ہوئے زیان کو امیر علی یاد آ گئے۔ ملک جہانگیر اور امیر علی میں اسے مشابہت محسوس ہو رہی تھی زندگی کے آخری دو برسوں میں وہ بھی تو ملک جہانگیر کی طرح بیڈ کے ہو کے رہ گئے تھے۔ اس نے دل میں ہمدردی کی لہر اٹھتے محسوس کیا۔ افشاں بیگم نے زیان کا تعارف کروایا۔

ان کی نظر آپریشن کے بعد کافی کمزور اور دھندلائی ہوئی تھی مگر پھر بھی زیان انہیں دیکھنے میں بہت اچھی لگی۔ انہوں نے پاس بلا کر اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ ان کے اس عمل سے زیان کو ایک بار پھر امیر علی یاد آ گئے۔ انہوں نے زیان کو بیڈ کے پاس رکھی کرسی پہ اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شروع میں تو وہ گم صم رہی پھر آہستہ آہستہ ان کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ اس عمل سے عنیزہ خوشی محسوس کر رہی تھیں۔

وہ افشاں بیگم کے ساتھ باتوں میں مصروف تھیں۔ بیچ بیچ میں وہ دونوں زیان کو بھی مخاطب کرتی جس کی توجہ ملک جہانگیر کی طرف تھی۔ افشاں بیگم جب بھی زیان کی طرف دیکھتیں ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آجاتی۔ ایبک کو ان کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ بھی وہیں آ گیا۔ اس نے سب کو سلام کیا اور پھر بیٹھنے کے لیے جگہ تلاش کی۔ زیان کے ساتھ والی ایک اور کرسی خالی پڑی تھی۔ وہ اسی پہ بیٹھ گیا۔ وہاں بیٹھنے میں اس کی کسی خاص سوچ یا نیت کا دخل نہیں تھا۔

وہ قیمتی مردانہ پرفیوم استعمال کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی پسندیدہ مہک نے زیان کی حس شامہ کو متوجہ کر لیا۔ وہ اب اس کے پاس ہی تو بیٹھا تھا۔ بابا جان کے ساتھ بات کرتے ہوئے ملک ایبک نے ایک نگاہ زیان پہ ڈالی۔ آج اس نے کالے رنگ کی فراک زیب تن کی ہوئی تھی نازک سے پاؤں بھی کالی سینڈل میں مقید تھے۔ وہ خوامخواہ ہی توجہ اپنی طرف مبذول کروا رہی تھی۔ چہرے پہ خفگی والے تاثرات آج کچھ کم تھے۔ ایبک کو جانے کیوں ہنسی آ گئی۔ اس کی موہوم سی مسکراہٹ

افشاں بیگم کی نگاہوں سے مخفی نہ رہپائی۔ ان دونوں کو اکٹھے بیٹھے دیکھ کر ان کے دل میں خود ہی ایک خیال الہام بن کر اترا۔ دونوں ایسے بہت اچھے لگ رہے تھے۔

وہ ملک جہانگیر کی کسی بات کا جواب دیتے ہوئے دوپٹا ٹھیک کر رہی تھی اور ایک عنیزہ کے ساتھ بات کرتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ دونوں اپنی جگہ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک مکمل منظر کا حصہ لگ رہے تھے۔

"اور اگر یہ دونوں ہمیشہ ایک ساتھ رہیں تو اور بھی اچھے لگیں۔" افشاں بیگم کی سوچ نے ذرا مزید آگے کا رخ کیا تو ان کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آگئی وہ مسکراہٹ جس میں ہزار معانی پنہاں تھے۔

☼ ☼ ☼

ملک ارسلان دو دن سے یونیورسٹی نہیں آیا تھا۔ عنیزہ ان دو دنوں میں بولائی بولائی پھرتی رہی۔ پوری دنیا اسے ویران اور اداس نظر آرہی تھی۔ پہلے تو اس کے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ ارسلان دو دن کے بعد یونیورسٹی آیا تو وہ اسے لڑجھگڑ کر ناراض ہوگئی۔ حالانکہ وہ صفائی دیتا رہا پھر وہ نہ جانے کیوں ناراض ہو گئی تھی۔ ارسلان نے دو دن چھٹی کی تھی اس نے پورے ایک ہفتے کی چھٹی کی۔

عنیزہ کو پورے ہفتے شدید بخار رہا۔ جب وہ دوبارہ یونیورسٹی گئی تب بھی بخار سے ہونے والی کمزوری باقی تھی۔ ارسلان کو اس کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ بے تابی سے ڈھونڈتا ہوا لائبریری میں آیا۔ سامنے وہ کتاب رکھے پڑھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ ارسلان اس کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھا تو عنیزہ نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا اسے جھٹکا سا لگا کیونکہ ارسلان کی حالت سے لگ رہا تھا وہ بہت پریشان ہے۔

ارسلان نے اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کشاں کشاں اس کے پیچھے چلی آئی۔ پارکنگ ایریا سے ارسلان نے اپنی نئی ٹویوٹا کرولا نکالی اور اگلا دروازہ کھولا۔ عنیزہ کوئی سوال کیے بغیر بیٹھ گئی۔ اس نے نہیں پوچھا کہ تم مجھے کہاں لے جارہے ہو نہ ارسلان نے بتایا۔

چند منٹ بعد ارسلان کے ساتھ وہ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھی تھی۔ اس طرح وہ پہلی بار اس کے ساتھ گھر سے بلکہ یونیورسٹی سے باہر آئی تھی۔

"عنیزہ میں پچھلے پورے ہفتے سے بہت پریشان ہوں۔ دیکھ لو میں نے شیو تک نہیں کی۔" ثبوت کے طور پہ ارسلان نے اپنی داڑھی کی طرف اشارہ کیا۔

"تم کیوں پریشان رہے؟"

"عنیزہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔" ارسلان نے اچانک روانی سے یہ جملہ بولا تو اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے وہ جیسے گم صم سی ہوگئی جیسے کسی نے جادو سے پتھر کر دیا ہو۔

"تمہیں بری لگی ہے میری بات؟" کافی دیر وہ خاموش رہی تو ارسلان نے بے تابی سے پوچھا۔

"مجھے پتا تھا تمہیں یہ بات بری لگے گی۔ لیکن میں اپنے دل سے پورا ہفتہ لڑتا رہا ہوں، نہیں رہ پایا تو تم سے آج کہہ دیا۔" وہ اس کی مسلسل خاموشی سے دل گرفتہ ہو رہا تھا۔

"مجھے تمہاری بات بری نہیں لگی ہے۔" بالآخر عنیزہ نے خاموشی کے پردے کو چاک کیا۔

"تو پھر اچھی لگی ہے؟" وہ فرط شوق سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر جیسے اپنے سوال کا جواب ڈھونڈ رہا تھا۔ عنیزہ نے نظر چرالی۔ ملک ارسلان کو اپنے سوال کا جواب مل چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

عنیزہ، ملک ارسلان کے بازو پہ سر رکھے لیٹی اداس تھی۔ وہ انہیں مسلسل تسلیاں دے رہے تھے۔

"دیکھو تمہارے اور زیان کے درمیان چند برسوں کا فاصلہ نہیں ہے بلکہ یہ فاصلہ صدیوں کا ہے۔ ہمیں ان وجوہات کا سراغ لگانا ہے جس کی وجہ سے اس کے دل میں دوری آئی ہے۔ اس کے شکوے، شکایت اس کا نامناسب سرد رویہ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ لیکن وہ

تمہاری مجبوری کو اس وقت نہیں سمجھ سکتی کیونکہ وہ بچپن سے جو دیکھتی سنتی آئی ہے اس کا اعتبار ان باتوں پہ زیادہ ہے۔ تمہیں صبر اور محبت سے کام لینا ہوگا۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ محبت سے پتھر پگھل جاتے ہیں، جانور مطیع ہو جاتے ہیں وہ تو پھر بھی انسان ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ سے ڈسکس کر کے میرا دل و دماغ پرسکون ہوگئے ہیں۔" وہ مسکرا دیے۔

"چلو اب سب پریشانیاں ذہن سے جھٹک کر سو جاؤ۔" انہوں نے عنیزہ کا سر نرمی سے تکیے پہ رکھ کر چادر ان پہ ڈالی۔

ملک ارسلان ان کے ساتھ باتیں کرتے کرتے کب کے سو چکے تھے۔ عنیزہ کو نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ ماضی کا سفر کرتے کرتے بہت پیچھے چلی گئی تھیں۔ اس وقت وہ صرف عنیزہ قاسم تھی۔ الہڑ، کم سن اور زندگی سے بھرپور عنیزہ قاسم۔ جس پہ ملک ارسلان بری طرح دل ہار بیٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

عنیزہ کتابیں سرسبز گھاس پہ رکھے، ملک ارسلان کی باتیں غور سے سن رہی تھی۔

"تمہارے ابو سے بہت جلد اب ملنا پڑے گا۔" ارسلان نے شرارت سے اسے دیکھا۔

"کیوں؟ میرے ابو سے کیا کام ہے؟" اس نے موٹی موٹی آنکھیں پوری کھول کر اس کی طرف دیکھا تو وہ جیسے ان نگاہوں میں ڈوبنے لگا۔ پتا نہیں اسے کب، کیسے کس وقت اور کہاں عنیزہ سے محبت ہوئی تھی۔ لیکن اسے یہ خبر تھی وہ عنیزہ کے بغیر جی نہیں سکتا۔

اسے شرعی طور پہ ہمیشہ کے لیے اپنا بنانے اور اس کے جملہ حقوق کو محفوظ کرنے کے لیے وہ ملک افتخار سے بات کرنے کی سوچ رہا تھا۔ اسے پوری امید تھی معاشرتی تفاوت کے باوجود بھی ملک افتخار مان جائیں گے کیونکہ وہ بہت اچھی تھی، خاندانی تھی اس کے ابو خوددار اور عزت نفس کی دولت سے مالا مال تھے۔ اس نے ملک افتخار کو راضی کر لینا تھا ورنہ ملک جہانگیر سے سفارش کروانی تھی۔

☼ ☼ ☼

شام ڈھل رہی تھی۔ زیان سو کر اٹھنے کے بعد عجیب سی کسل مندی محسوس کر رہی تھی۔ موسم گرد آلود اور حبس سا بھرا تھا۔ وہ ٹھنڈے پانی سے جی بھر کے نہائی تو سستی قدرے کم ہوگئی۔ وہ کپڑے بدل کر نیچے آئی تو عنیزہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیں۔ نینال دوسری نوکرانیوں کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ زیان ایک ثانیے کے لیے اس کے پاس رکی۔

"مما کہاں ہیں؟" اس نے استفسار کیا۔

"وہ اپنے کمرے میں ہیں۔ شاید سو رہی ہیں۔" اس کے بجائے فریدہ نے جواب دیا تو زیان نے غائب دماغی سے سر ہلایا۔ نیناں نے ایک نظر اس کے دھلے نکھرے گلابی چہرے کو دیکھا۔ جس کے گرد کھلے گیلے بالوں کا ہالہ تھا۔ سفید موتی راج ہنس جیسے پاؤں کالے رنگ کی نازک سی جوتی میں مقید تھے آج۔ ناپسندیدگی کا تیز و تند ریلا نیناں یعنی رنم کو شرابور کر گیا۔ کیونکہ سب نوکرانیوں کی نگاہوں میں رشک و ستائش کی نمایاں جھلک اس نے محسوس کی تھی۔ "میں جہانگیر انکل کی طرف جا رہی ہوں۔ مما سو کر اٹھیں تو بتا دینا۔" زیان نے انہیں مطلع کیا۔

"چھوٹی بی بی کتنی سوہنی ہیں۔" اس کے جانے کے بعد ایک نوکرانی نے تبصرہ کیا۔

"خوب صورت تو ہیں ساتھ مغرور بھی ہیں۔" دوسری نے گرہ لگائی تو فریدہ بھی پیچھے نہیں رہی ادھر ادھر دیکھ کر آواز دبا کر بولی۔

"چھوٹی بی بی بہت اکھڑی ہیں توبہ... توبہ... مجھے تو ڈر لگتا ہے۔" اس نے باقاعدہ کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"جو بھی ہے مجھے تو چھوٹی بی بی بہت اچھی لگتی ہیں۔ نہ غصہ کرتی ہیں نہ کچھ کہتی ہیں نہ کسی کام کا بولتی ہیں۔" پہلی والی بولی۔

"ہاں ہیں تو بہت اچھی۔ کتنی چپ چپ رہتی ہیں۔" دوسری نے بھی فوراً" تائید کی۔

"مجھے تو نہیں اچھی لگتیں۔" رنم نے دلی تاثرات کے اظہار میں کسی بخل سے کام نہ لیا۔ تینوں اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ گڑبڑا گئی۔

"میرا مطلب ہے مجھے زیان بی بی کا غرور اچھا نہیں لگتا۔" اس نے عقل سے کام لیا تھا۔ اگر عنیزہ بیگم سے کوئی شکایت کر دیتا تو انہیں بہت برا لگتا تھا۔

☆ ☆ ☆

زیان اونچے ستونوں والے برآمدے کے پاس کھڑی تھی۔ جس کے گرد آتشی گلابی پھولوں والی نازک سی بیل لپٹی ہوئی تھی۔ وہ اس طرح اکیلی پہلی بار آئی تھی، اس سے پہلے ایک بار عنیزہ کے ساتھ یہاں آئی تھی اب جہانگیر انکل سے ملنے آئی تھی تو خود سے اندر کا رخ کرتے ہوئے جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ حویلی کا جائزہ لینے میں مگن تھی جب ایک نوکرانی کی نگاہ اس پہ پڑی وہ بھاگ کر اس کی طرف آئی۔

"بی بی جی آپ ادھر کیوں رک گئی ہیں آئیں اندر میرے ساتھ۔" وہ اس کے یہاں کھڑے ہونے پہ جیسے حیران ہو گئی تھی۔ زیان نے رکے بغیر قدم آگے بڑھائے۔ نوکرانی اسے ملک جہانگیر کے پاس چھوڑ گئی۔

وہ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھے۔ سفید چادر ان کے سینے تک پڑی تھی۔ اے سی فل کولنگ کے ساتھ چلنے کی وجہ سے کمرے میں اچھی خاصی خنکی تھی۔ اس نے وہ اسے بالکل امیر علی کی مانند محسوس ہوئے۔ انہی کی طرح لاچار اور بے بس۔ یہ صرف اس کی سوچ تھی ورنہ وہ لاچار اور بے بس نہیں تھے یہ تو بیماری نے انہیں کمزور کر دیا تھا۔

زیان نے اپنے دل میں جھانکا اسے بہت حیرت ہوئی کیونکہ جہانگیر انکل کے لیے اس کے دل میں کسی بھی قسم کی نفرت نہیں تھی بلکہ اس کا دل ان کی طرف کھنچتا تب ہی تو اس وقت وہ یہاں تھی۔

"انکل آپ سو رہے ہیں؟" اس نے ان کے پاس جا کر آہستہ آواز میں یہ جملہ کہا تو انہوں نے فوراً" آنکھیں کھول دیں۔

"نہیں میں سو تو نہیں رہا بس آنکھوں میں تھوڑی تکلیف تھی سو ایسے ہی بند کر کے پڑا ہوا ہوں۔" انہوں نے تفصیل بتائی۔

باتیں کرتے کرتے اچانک ان کی حالت بگڑ گئی۔ سینے سے خرخراہٹ سی ملتی جلتی آوازیں آئیں۔ انہوں نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھا اور ان کا سر تکیے پہ ڈھلک گیا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

تحریر شیلہ زاہد

جیسے کو تیسا

ایک بڑا سا گھونٹ کافی کا لیتے ہی حلق کڑواہٹ سے بھر گیا۔ برائے نام دودھ اور چینی نے کافی کے ذائقے کو کڑوا اور بدمزا کر دیا تھا۔ منہ میں بھرا گھونٹ بہ مشکل میں نے اندر اتارا تھا۔

"کیسی لگی۔" میری نند نے انتہائی جوش و خروش سے پوچھا اس کی نظریں بدستور میرے اور پھر کافی کے کپ پر مرکوز تھیں۔

"واہ... زبردست۔" میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے اسے سراہا۔ دل تو چاہا کہہ دوں کہ "بی بی! اب خدا کے لیے رحم کرو اس معدے پر۔ جس کو تم نے پچھلے دو ماہ سے تجربوں کی زد میں خراب کر رکھا تھا۔" بلا کی خوشی میری نند کے چہرے پر نظر آ رہی تھی اور میرا حلق تک کڑوا تھا۔ وہ اپنی دھن میں مگن میرے دلی تاثرات سے بے خبر اپنے ہاتھوں میں تھامی ایک لمبی چوڑی لسٹ پر نظریں گاڑے بیٹھی تھی۔ اپنے بالوں میں پھنسا بال پین نکال کر اس لمبی چوڑی لسٹ میں سے کافی کے نام پر مارک لگایا جا چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہماری نند نے ایک اور ڈش پر اپنی فتح کا جھنڈا گاڑ دیا تھا۔

"اگلی کس ڈش کی شامت آنے والی ہے۔" میرے میاں عرفان شرارت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"کل سوچ رہی ہوں کھیر بناؤں سسرال میں پہلی ڈش تو یہی بنائی ہو گی نا۔ ارے ہاں یاد آیا بھابھی! آپ کو یاد ہے آپ نے جب پہلی بار کھیر بنائی تھی چینی کی جگہ نمک..." حمیرا کی بلند ہوتی ہنسی چابک کی طرح سینے میں چبھ سی گئی۔ اس کے تضحیک بھرے انداز نے مجھے شرمندہ کر ڈالا تھا۔

وہ میرے چہرے اور چھلکتی آنکھوں سے بے خبر بولے جا رہی تھی۔ میں وہاں مزید رکے بغیر کچن میں آ گئی جہاں کی بے ترتیبی میری منتظر تھی۔ کچن کا حلیہ درست کرتے میرے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے اور دماغ ماضی کی اسکرین پر الجھا ہوا تھا۔

عرفان اور حمیرا دو ہی بہن بھائی تھے۔ عرفان کے والد کا انتقال ہارٹ اٹیک سے ہو چکا تھا وہ میڈیکل اسٹور چلاتے تھے۔ ان کے بعد یہ ذمہ داری عرفان نے اٹھالی۔ حمیرا عرفان سے پانچ برس چھوٹی اور گھر کی لاڈلی تھی۔ شادی کے ایک ماہ بعد جب میں نے پہلی بار کھیر بنائی تو کچن کی ہر چیز سے نابلد تھی۔ کھانے پکانے میں تاک نہ ہونے کے باعث کھانوں کی تراکیب سے بھی ناواقف تھی۔ پہلی بار بنائی گئی کھیر میں غلطی سے چینی کی جگہ نمک نے کھیر کو بدذائقہ بنا ڈالا تھا۔

ساس نے اس غلطی کو نظر انداز کر ڈالا تھا لیکن نند صاحبہ اپنی فطرت سے مجبور مجھے مذاق کا نشانہ بناتی رہی۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا تھا کہ جیسے میری نند مجھے نیچا دکھانے کے لیے ہر لمحہ مذاق کا نشانہ بنائے رکھتی

ہے۔ میں کچھ بھی بنالوں وہ اس میں کوئی نہ کوئی خامی تلاش کرڈالتی تھی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی گھنٹوں روتی رہتی اور میرے شوہر میری دلجوئی کرتے رہتے۔

"چھوڑو اب یہ رونا دھونا بند بھی کرو۔ اس کی باتوں کو دل پر مت لیا کرو۔ اپنی خامیوں کو درست کرنے کی کوشش کرو۔"

"عرفان! میں کتنی بھی کوشش کرلوں وہ میری پکائی ہر چیز میں کوئی نہ کوئی کمی ضرور ڈھونڈ نکالتی ہے پھر سب کے سامنے میری انسلٹ کرنا جیسے اس پر فرض ہے۔ اب دیکھو آج کتنی مزے دار بریانی بنائی تھی میں نے 'بریانی تو چیٹ پٹی ہی اچھی لگتی ہے۔ اب محترمہ زیادہ مرچ مسالا پسند نہیں کرتیں تو اس میں میرا کیا قصور مستقل سارا وقت شور مچاتی رہی کہ بریانی تو کھانے کے لائق ہی نہیں اس میں مرچیں بہت زیادہ ہیں۔" میں نے بلند آواز میں روتے ہوئے کہا۔

بریانی کا نوالہ منہ میں لیتے ہی حمیرا کے چہرے کے بگڑتے تاثرات اور اس پر تضحیک آمیز جملوں نے میرا خون کھولا ڈالا تھا۔ اس کا اس قدر شور مچانا مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں کھانا چھوڑ کر کمرے میں آبیٹھی تھی۔ شدید دکھ ہونے کے باوجود میں حمیرا سے کچھ نہ کہتی۔ میری جگہ ساس بول دیتی تھیں۔

"بیٹا رزق میں عیب نکالنا اللہ کو پسند نہیں۔ شکر الحمدللہ کرکے کھایا کرو کھانے میں برکت ہوتی ہے یہ تمہاری بہت بری عادت ہے کھانے میں عیب تلاش نہ کیا کرو بیٹا" وہ رسان لہجے میں بیٹی کو سمجھانے کی کوشش کرتیں۔

لیکن نند صاحبہ کے کانوں میں جوں نہ رینگتی۔ وہ وہی کرتی جو اس کا دل کرتا تھا بھاوج کو بے نقط سنانا جیسے اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اس کی عادت سے سب ہی واقف تھے تو سب کی طرح میں نے بھی نند کی راگنی کو برداشت کرکے سیڑھی پر قدم رکھ کر اپنی منزل تک پہنچنے کا فیصلہ کیا۔

بڑے بوڑھے کہتے ہیں وقت سب سے بڑا استاد ہے۔ وقت دھیرے دھیرے گزرتا گیا۔ بھلا ہوٹی وی کے کوکنگ شوز کا' جس کی بدولت میں اناڑی سے کھلاڑی بن گئی۔ میرے اندر کچھ کر دکھانے کی لگن نے مجھے بالآخر سرخرو کر ہی دیا۔ میں شادی کے تین سالوں میں ہر کھانے میں ماہر ہو چکی تھی کچھ وقت نے مجھے نند کی باتوں سے لاپروا بنا ڈالا تھا' کچھ میرے بیٹے دانش نے مجھے مصروف کرڈالا تھا۔

ان تین سالوں میں حمیرا کالج سے یونیورسٹی کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ حمیرا کے رویے میں کافی لچک آگئی تھی اور کیوں نہ آتی۔ رشتے والی خالہ نے حمیرا کے رشتے کی بات چلائی اور آنا" فانا" منگنی کے بندھن سے جڑنے کے بعد حمیرا میں خوشگوار تبدیلیاں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ وہ نند جسے کچن کا دروازہ دیکھتے ہی گھبراہٹ شروع ہو جاتی تھی اب یونیورسٹی سے آنے کے بعد اس کا رخ سیدھا کچن کی طرف ہی ہوا کرتا۔ شادی کی تاریخ جلد ہی رکھ دی گئی تھی اور جب سے موصوفہ نے سنا کہ ہونے والے شوہر کھانے کے شوقین ہیں وہ نئی نئی تراکیب اخبار و رسائل سے دیکھ کر آزماتی رہتی۔

"چلو دیر آید درست آید" عرفان ایک خوشگوار مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے بیڈ پر دراز ہو گئے تھے۔

میں نے مسکرا کر پلٹ کر عرفان کی جانب دیکھا اور اپنے ہونٹوں پر شہادت کی انگلی رکھ کر انہیں مزید کچھ نہ کہنے کا اشارہ کیا۔ دانش بہ مشکل میری تھپکیوں پر سویا تھا۔ میں شدید خماری آنکھوں میں لیے بے سدھ پڑے دانش کے برابر میں جھکتی چلی گئی کچھ ہی دیر میں نیند کی دیوی مجھ پر مسلط ہو چکی تھی۔ اگلے روز حمیرا کی مایوں تھی پھر ایک تھکا دینے والے مرحلے کے لیے خود کو تیار کرنا تھا۔ عرفان میری روٹین سے واقف تھے۔ وہ سارا دن مجھے تگنی کا ناچ ناچتا دیکھتے رہتے سو مجھے نڈھال سوتا دیکھ کر مسکراتے ہوئے پاس پڑی چادر مجھ پہ اور دانش کو اوڑھا دی۔

☼ ☼

"حمیرا۔۔۔ حمیرا۔۔۔"

"جی امی!" وہ ایسے چونکی جیسے کسی خواب سے بے دار ہوئی ہو۔

"بیٹا دھیان کہاں ہے تمہارا؟ کھانا ٹھیک سے کھاؤ نا۔" وہ اسے پلیٹ میں پڑے چند نوالے پر خالی چمچہ چلاتے ہوئے دیکھ کر تشویش سے بولیں۔

"جی میں کھا رہی ہوں۔" وہ اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

"رائتہ تو لیا نہیں تم نے 'بریانی میں رائتہ ساتھ نہ ہو تو تم کھانا چھوڑ دیتی تھیں اب بغیر رائتہ کے بریانی کیسے کھالی؟" عرفان کے ٹوکنے پر وہ عجیب شرمندہ سی ہو گئی چاہتے ہوئے بھی لب ہل نہ سکے زبان تلے ہونٹ دبا لیے۔

"بس ایسی ہی بھائی! کچھ عادت بدل سی گئی ہے۔" حمیرا نے ایک عجیب نظر اپنے برابر بیٹھے رضوان پر ڈالی جو کھانا کھانے میں ایسے جتا تھا جیسے اس کا مقصد واحد یہاں آکر کھانا ہی کھانا تھا۔

"ارے کولڈ ڈرنک دینا تمہیں بھول ہی گئی" میں نے بجھی بجھی سی حمیرا کے حنائی ہاتھوں میں زبردستی کولڈ ڈرنک کا گلاس پکڑا دیا۔ جسے وہ غٹاغٹ پینے لگی۔ مجھے اس کی حالت پر ترس آرہا تھا۔ شادی کے ایک ماہ بعد میکے آنے والی یہ وہ حمیرا تو نہیں ۔۔۔ خاموش خاموش ۔۔۔ بجھی بجھی سی ہر دم اکڑ کر رہنے والی حمیرا نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ اس کو ایک ہی رنگ میں وہ تین سال سے دیکھتی آرہی تھی۔ یہ اس کی شخصیت کا نیا روپ ٹیبل پر موجود گھر کے ہر فرد کے لیے شاکنگ تھا۔

"بھابھی! واہ مزا آگیا۔ بریانی تو غضب کی بنائی ہے آپ نے۔۔۔ اور یہ قورمہ قسم سے بہت لاجواب ہے ۔۔۔ ایسے ذائقہ دار کھانے اپنی نند کو بھی سکھا دیتیں۔ قسم سے کل ہی کی بات ہے ہماری اماں نے اپنی بہو سے قورمہ بنانے کی فرمائش کرڈالی۔ معلوم نہیں قورمہ بنایا تھا یا شوربے میں ڈوبا گوشت ۔۔۔ ہاہاہا ۔۔۔ اب ایسے کھانے کی کون تعریف کرے گا اور تنقید محترمہ کو برداشت نہیں ۔۔۔ دیکھیے نہ کیسے غبارے کی طرح منہ پھلائے بیٹھی ہے۔" رضوان کا انداز تمسخرانہ تھا۔

حمیرا کی آنکھ میں پانی بھرنے لگا وہ منہ پھیر کے بیٹھی رہی اور رضوان اس کے بنائے ہوئے کھانوں کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس کے گونجتے قہقہوں کو سب ہی ہونق بنے دیکھ رہے تھے۔ گھر آئے داماد کو کچھ کہنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔

میں نے دیکھا یہ وہی ٹیبل تھی۔ جس کرسی پر آج حمیرا بیٹھی تھی کل کبھی میں بیٹھا کرتی تھی۔ اسی ٹیبل پر میرے بنائے ہوئے کھانوں پر طنزیہ فقرے اور تمکنت بھرے قہقہے اچھلتے کودتے رہتے تھے۔ آج کرسیوں کی ترتیب بدل گئی تھی۔ میرے صبر نے آج مجھے اس مقام تک پہنچا دیا تھا۔ واہ میرے اللہ! تیری مصلحتوں کو ہم ناسمجھ بندے ہرگز نہیں جان سکتے تھے۔

اچانک میں نے حمیرا کی طرف دیکھا وہ میری طرف بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا اس کا پورا وجود معافی کا طلب گار تھا۔ ٹیبل پر رکھے دونوں ہاتھوں کو مٹھی بنا کر وہ مسلے جارہی تھی۔ میں نے دھیرے سے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھوں پر رکھ کر تھپتھپا دیا۔ میرے ڈھارس کے نرم لمس پا کر اس کی آنکھوں کا پانی تشکر کے جذبے سے چھلک پڑا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا وجود کسی بوجھ سے آزاد ہو گیا تھا۔

زندگی کا نام امتحان ہے۔ اس شاہراہ پر تمکنت سے چلنے والے کہیں نہ کہیں ضرور ڈگمگا جاتے ہیں۔ اللہ کو عجز پسند ہے۔ جھکی ڈالی ہی ہمیشہ پھل پاتی ہے۔ بھلا سرو جیسے درخت کو کب پھل لگا کرتا ہے حمیرا سمجھ دار تھی۔ زندگی کی شاہراہ پر تمکنت سے چلتے چلتے اچانک ملنے والی ٹھوکر پر گر گئی تھی۔ وہ جانتی تھی شوہر کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے لیکن اس مرحلے پر اسے گزرنے کے لیے صبر سے کام لینا تھا۔ میں جن "مرحلوں" سے گزر کر "معتبر" کی جس کرسی پر براجماں تھی اس کے لیے حمیرا کو محنت درکار تھی۔ میں نے دل ہی دل میں اس سفر میں اس کا ساتھ دینے کا مصمم ارادہ کیا۔ میرے دل کو واثق یقین ہے۔ وہ اپنے شوہر کے دل میں جلد ہی مقام پالے گی۔

آپ کا کیا خیال ہے۔۔۔؟

☼ ☼

فرحین اظفر

دے دل تے وفا

سوہا اور ربابا دونوں بہنیں اپنی ماں کے ساتھ گھر کی اوپری منزل میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے والد کی وفات ان کے بچپن میں ہی ہوگئی تھی۔

گھر کی نچلی منزل میں ان کے تایا اور تائی اپنی دو بیٹیوں عفت اور نائلہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ تایا اکثر بیمار رہتے ہیں۔

حدید 'انس' عفت اور نائلہ کے خالہ زاد ہیں۔ نائلہ 'انس میں دلچسپی رکھتی ہے۔ مگر انس' سوہا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار اپنی خالہ اور سوہا کی تائی کے سامنے کردیتا ہے۔ خالہ کو بے پناہ دکھ کا احساس ہوتا ہے' مگر بظاہر راضی خوشی اس کا رشتہ لے کر اپنی دیورانی کے پاس جاتی ہیں۔ سوہا کی والدہ یہ رشتہ خوشی خوشی قبول کرلیتی ہیں۔

نائلہ باقاعدگی سے اپنے والد کو اسپتال لے کر جاتی ہے۔ وہاں اسپتال کے کلرک شبیر حسین عرف شبو سے روابط بڑھ جاتے ہیں کہ اچھے برے کی تمیز کو بھول جاتی ہے۔

سوہا اور انس کی شادی کی تقریبات بہت اچھے طریقے سے انجام پاتی ہیں اور سوہا رخصت ہو کر انس کے گھر آجاتی ہے۔

حدید کسی کو ڈراپ کرنے جاتا ہے اور اس کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے۔

سوہا کے اکیلے پن کی وجہ سے عفت اس کے پاس رک جاتی ہے۔ گھر کے کاموں کے علاوہ حدید کا بھی خیال رکھتی ہے۔

حدید 'عفت کے دل میں اپنے لیے پسندیدگی کو جان لیتا ہے اور سوچ لیتا ہے کہ اس بار خالہ کو مایوس نہیں کرے گا۔

نائلہ 'شبیر حسین سے ملنا نہیں چھوڑتی اور آخر کار اپنی عزت گنوا بیٹھتی ہے' جس کا اندازہ اس کی ماں کو بھی ہوجاتا ہے اور وہ اپنی عزت بچانے کے لیے حدید کے ساتھ نائلہ کی شادی کا فیصلہ کرلیتی ہیں اور اس بات کا اظہار انس اور رباب سے بھی کردیتی ہیں۔

آٹھویں قسط

(اب آگے پڑھیے)

وہ ماما سے ملنے کے لیے گھر سے نکل چکا تھا۔ لیکن اس کا ذہن ابھی تک دبئی میں اپنے فلیٹ میں ہونے والی گفتگو میں اٹکا ہوا تھا۔ جس میں اس نے ڈزنی کو صاف الفاظ میں جتادیا تھا کہ پاکستان سے واپسی پر اسے اپنا فلیٹ خالی چاہیے۔ وہ فوراً ہی راضی ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے ایک عجیب خواہش کا اظہار کیا تھا۔

وہ اپنے اور حسیب کے بیٹے سے ملنا چاہتی تھی۔ یہ کائنات کی سب سے بڑی سچائی تھی کہ حسیب اور اس کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں تھا۔ لیکن یہ بھی ایک شرمناک 'کڑوی اور ڈراؤنی حقیقت تھی کہ ولی ان دونوں کی ہی اولاد تھا۔

ولی جو اس کا بیٹا تھا۔ اس کی شخصیت کا جھول تھا۔ اس کے کردار کا داغ تھا۔ یہ وہ جھول تھا جو زندگی میں کسی بھی رشتے کے دھاگے کو کاٹنے گرہ لگانے یا بل دینے سے جانے والا نہیں تھا۔ یہ وہ داغ تھا' جو لہو سے دھونے کے بعد بھی مٹنے والا نہیں تھا۔ لیکن وہ اس کی اپنی اولاد تھا۔ وہ اسے اون نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس کی سرپرستی سے ہاتھ بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔

"تم اس سے کیوں ملنا چاہتی ہو۔"

"میں۔۔۔ میں اسے بتانا چاہتی ہوں کہ میں اس کی بدنصیب ماں ہوں۔ جس نے اسے جنم تو دیا لیکن اپنی ممتا نہ دے سکی۔"

"ہرگز نہیں۔ میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا۔ اسے پتا چلے کہ اس کی ماں تم ہو" اس کے لہجے میں نفرت تھی۔ گھن تھی۔

"تم۔۔۔ تمہیں یقین کیوں نہیں آتا حسیب۔ میں اپنی پچھلی زندگی کو بہت پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔ اپنے شوہر سے شادی کرنے کے بعد میں نے ہر غلط اور برا کام چھوڑ دیا۔ اور یہی بات میرے شوہر کو پسند نہیں آئی۔ میں اس سے۔۔۔"

ٹیکسی نے زوردار طریقے سے بریک لگایا تھا۔ اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ وہاں سے نکلنے سے پہلے بہرالحال ڈزنی کو اس کے بیٹے کے لیے معذرت کر آیا تھا اور بھرپور تاکید بھی کہ وہ اس کے لوٹنے سے پہلے اپنا بندوبست کہیں اور کرلے۔

دو منزلہ چھوٹی اور پرانی عمارت والا گھر جو کہ اس کا سسرال تھا سامنے ہی تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم۔۔۔" نائلہ کے منہ سے چیخ سی نکل گئی۔

"ہاں تو۔۔۔! تم تو ایسے حیران ہو رہی ہو جیسے بھوت دیکھ لیا ہو۔" وہ اپنے ازلی اطمینان سے کھڑا تھا۔

"اندر تو بلاؤ گی ناں آج۔ دیکھو انکار نہیں کرسکتی تم۔ کیونکہ میں نے تمہارے اس چغد شوہر کو گھر سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔"

نائلہ کے پیروں تلے سے حقیقی معنوں میں زمین سرکنے لگی۔ شبیر حسین آج یوں دروازے سے ٹلنے والا نہیں تھا۔ وہ خوب اچھی طرح دیکھ بھال کر پکا بندوبست کرکے آیا تھا۔ اس نے خود کو سخت بے بس محسوس کرتے ہوئے اسے راستہ دیا۔

"جلدی بولو کیا کام ہے۔" وہ اندر آکر لاؤنج کے صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ جبکہ نائلہ دہلیز پر ہی ایسے کھڑی تھی۔ جیسے شبیر کے بجائے وہ خود وہاں سے نکل بھاگنے والی ہو۔

"بتادوں گا کام بھی۔ اتنی جلدی کیا ہے۔"

"جلدی ہے شبیر حسین۔ تم کیوں نہیں سمجھ رہے۔ یہ سرکاری ہسپتال یا تمہارے کسی جاننے والے کا وہ فلیٹ نہیں جہاں پر تم۔۔۔"

اس نے جان کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ مگر یہی ادھورا جملہ اسے جیسے پورا مزا دے گیا۔

"جہاں پر میں۔۔۔ کیا۔" اس نے شرارتی انداز میں اسے چھیڑا۔ نائلہ کو آگ ہی لگ گئی۔

"جہاں تم نے انسان سے حیوان کا روپ دھار کر مجھے نوچ کھایا تھا۔" وہ پھنکاری۔ شبیر حسین بے ساختہ ہنسا۔ جیسے اس کی بات نے اسے بڑا مزا دیا ہو۔

"ہاں بات تو تم نے ٹھیک کی۔ جب ہی سے تو مزا لگ گیا ہے مجھے۔ تیرا لہو منہ لگ گیا ہے میرے۔" نائلہ سر جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

"جلدی کام کی بات کرو اور نکلو یہاں سے۔"

"لے جلدی کس بات کی ہے تجھے۔۔۔ چل جاری ہے تو جلدی کرلیتے ہیں۔"

وہ اٹھ کر اس کے نزدیک آیا۔ اتنے نزدیک کہ نائلہ بے ساختہ ایک قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئی۔ اور عین اس وقت جب وہ اس سے دور ہو رہی تھی۔ اس کا بازو شبیر حسین عرف شبو کی انگلیوں کے کھانچے میں فٹ ہو گیا۔

"اندازہ تو ہوگا تجھے میں کس کام سے آیا ہوں تیرے پاس۔"

اس نے اسے بازو سے پکڑ کر خود سے قریب کیا۔ نائلہ کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"نن۔۔۔ نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں میرا ہاتھ چھوڑو۔۔۔ تم ایسا نہیں کرسکتے۔" وہ ایک دم وحشت زدہ سی ہو گئی۔ اور بری طرح اپنا بازو چھڑانے کے لیے کسمسائی۔ لیکن اس کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ بے بسی سے پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

"خبردار مجھے ہاتھ مت لگانا۔ میں شور مچادوں گی۔ تم مجھے۔۔۔"

باقی الفاظ حلق میں گھٹ گئے۔ اس نے اپنی ہتھیلی اس کے منہ پر جما کر اسے دیوار سے لگا دیا۔ وہ بے جان پتلے کی مانند دیوار سے چپک گئی۔

"زیادہ آواز نکالنے کی کوشش مت کرنا ورنہ۔۔۔"

اس کا ہاتھ قمیص کے اندر رینگ گیا اور جب باہر نکلا تو اس میں ایک تیز دھار پھل والا چاقو چمک رہا تھا۔

"یہ دیکھ رہی ہے ناں۔۔۔ زندگی بھر کے لیے خاموش ہو جائے گی۔" اس کی آنکھوں میں سفاکیت' درندگی کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ اور نائلہ کو اپنی جان' جسم کے پنجرے سے نکلتی دکھائی دے رہی تھی۔

"چل' اب شرافت سے ادھر۔۔۔ چل۔" اس نے نائلہ کے پتھرائے ہوئے بے جان جسم کو آگے دھکیلا اور سامنے ہی نظر آتے اس کے بیڈروم میں لے جا کر بیڈ پر دھکیل دیا۔

☼ ☼ ☼

چھوٹے سے گھر کے اوپری پورشن میں آج بہار اتر آئی تھی۔

امی خدا کے حضور شکرانہ ادا کرتے نہیں تھک رہی تھیں۔ کہاں تو دن رات انہیں یہ فکر کھائے جاتی تھی کہ ان کی بیٹیوں کا مستقبل کیا ہوگا اور کہاں یہ دن کہ ان کے دونوں داماد ساری پریشانیاں اور مسئلے مسائل ختم کرکے ان کے اپنے چھوٹے سے گھر میں بیٹھے ہنس بول رہے تھے۔

نیچے سے عفت اور تائی جان بھی اوپر ہی آگئی تھیں۔ اور تو اور۔۔۔ آج تو تایا جان بھی سیڑھیاں چڑھ آئے تھے۔ عفت خوب تیزی' پھرتی سے امی کے ساتھ کھانے کے انتظام میں لگی ہوئی تھی۔ بظاہر تو وہ بھی سب کے ساتھ ہنس بول رہی تھی۔ لیکن اس کا دل اور دماغ الگ الگ بھاگے دوڑے پھرتے تھے۔ وہ اپنی غائب دماغی کو قابو کرنے

میں ناکام ہوئی جارہی تھی۔

انس اور حسیب کے درمیان جو بھی اختلافات تھے۔ اتنے بہت سارے دنوں کے بعد ملنے پر انہوں نے ان کا ہلکا سا شائبہ بھی اپنے درمیان آنے نہیں دیا تھا۔ فی الحال تو دونوں ہنسی مذاق کرنے اور قہقہہ لگانے میں مصروف تھے۔

ماہا کے دل میں ایک خوشی بھرا اطمینان ہلکورے لے رہا تھا۔ اس نے حسیب کے قیمتی موبائل سے اپنی انس اور سہا کی امی اور عفت' اپنی اور حسیب کی مل کے ڈھیروں تصویریں کھینچیں۔ خوب رونق' ملے گلے میں دوپہر کا کھانا کھایا گیا۔ سہا اور ماہا کو یوں خوش باش دیکھ کر نائلہ کی یاد آتی تو ایک کمی کا سا احساس ہوتا۔ ساتھ ہی وہ ستمگر بھی یاد آجاتا۔ اس کے دل میں کوئی چنکیاں بھرنے لگتا۔ دل میں خود با خود شکوہ سا ابھرنے لگتا۔

"کیا ہوجاتا اگر نائلہ کی جگہ میں اور حدید۔" وہ بار بار استغفار پڑھنے لگتی۔

"نائلہ ہی حدید کے ساتھ گزری تمام باتیں بھلا کر زندگی کی نئے سرے سے شروعات کرلیتی تو۔"

اس کی اپنی سوچیں ہی تھیں۔ اس کے اپنے تلاطم تھے۔ جن میں وہ بار بار ڈوب کر ابھرتی۔ پھر حاضرین محفل کو دیکھ کر ایک زبردستی کی بجھتی ہوئی مسکراہٹ لبوں پر سجانے کی کوشش میں انہیں بس دائیں بائیں پھیلا لیتی۔ جو چند لمحوں بعد بنا کسی شعوری کوشش کے واپس سکڑ جاتے۔

سہ پہر کے قریب چائے پی کر انس نے سہا کو چلنے کا اشارہ کیا۔ ان کا ارادہ بھانپتے ہی حسیب بھی اٹھ گیا۔

"آنٹی میں خاص طور پر ماہا سے ملنے بہت ایمرجنسی میں آیا ہوں۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں اس کو آپی کے یہاں لے جاؤں۔ پرسوں میری واپسی ہے پھر کل ہم لوگ ذرا گھوم پھر لیں گے۔"

امی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

"اب تم آہی گئے ہو تو ماہا کو بھی ساتھ ہی لے جاؤ ناں۔"

تائی جان نے اچانک ہی امی کے دل کی بات کردی۔ کمرے کی رونق بھری چہلوں میں لحہ بھر کو وقفہ آگیا۔

"جی۔۔ جی ہاں۔۔ ضرور۔" حسیب کچھ گڑبڑا سا گیا۔ پھر تھوڑا سا کھنکار کر بولا۔

"اگر ماہا چاہے گی تو پرسوں میرے ساتھ ہی۔۔"

"سہا تم کوئی سامان بھول کر تو نہیں جارہیں؟"

ماہا نے جان بوجھ کر اس کی بات کاٹ دی اور سوائے خود تائی جان اور تایا کے سب ہی نے اس بات کو محسوس کیا۔ امی نے تو باقاعدہ ماہا کو گھوری تک دے ڈالی۔

اسی گھر میں' اسی گھر کی دو بیٹیاں جہاں اپنے گھروں کو واپس لوٹ رہی تھیں۔ وہیں ایک بیٹی ایسی بھی تھی۔ جو اکیلے گھر میں تنہا اپنی بدنصیبی سے نبرد آزما۔ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

آفس میں اس کی غیر حاضر دماغی کو باس سے لے کر چپڑاسی تک' سب ہی نے محسوس کیا تھا۔ اس کا خود پر سے اختیار ختم ہو گیا تھا۔ دماغی رو بھٹک کر' ٹھہر کر' رک کر' پلٹ کر ایک ہی سمت کو بھاگتی تھی۔ اور دو چہروں پر جمتی تھی۔

ایک نائلہ اور دوسری عفت۔

وہ عفت کو چاہتا تھا لیکن اسے پا نہیں سکا۔ اس نے نائلہ کو پایا۔ اپنایا اور اپنا بنانے کی بہت کوشش کی لیکن نائلہ۔۔

اس نے اس کی ہر کوشش پر اپنی بے رخی' بیگانگی اور اجنبیت سے پانی پھیر دیا۔ اس نے جتنا اس کے قریب ہونے کی کوشش کی' وہ اس سے اتنا ہی دور بھاگی۔ کیوں۔۔؟ اس کا جواب شاید وہ ایک حد تک جانتا تھا کہ' وہ انس کو چاہتی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ نائلہ کے بجائے اس کی بہن کو اپنانا چاہتا تھا۔ نائلہ بھی اس کے بجائے اس کے بھائی کی زندگی میں آنا چاہتی تھی۔

ایسا تو ہو نہیں سکا۔۔ تو چلو۔۔ جو بھی ہوا۔ جیسا ہوا۔ اسے قسمت کا لکھا اور رب کی رضا سمجھ کر جب اس نے سمجھوتا کرلیا۔ تو وہ کیوں نہیں کررہی۔ کیوں نہیں کرسکی اور کیوں کرنا نہیں چاہتی۔ یوں اپنے اور اس کے بیچ دوری کی نام نہاد دیوار کھڑی کرکے وہ آخر کس بات کا انتظار کررہی تھی۔ اور یہ سلسلہ کب تک چلنا تھا۔ ظاہر ہے ساری زندگی تو نہیں چل سکتا تھا۔

"مجھے نائلہ سے صاف صاف بات کرنی ہی ہوگی۔"

آفس کا ٹائم ختم ہونے والا تھا۔ اس نے بے حد تھکے ہوئے انداز میں اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو مسلا اور سامنے رکھے کمپیوٹر پر نگاہیں جمادیں۔

☼ ☼ ☼

رات اپنا کافی سفر طے کرچکی تھی۔ لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ بے حد محبت بھری نگاہوں سے اس کا چہرہ پڑھ رہی تھی۔ جو اس پر اپنی بے حد و حساب چاہتیں لٹا کر نیند کی وادیوں میں اتر گیا تھا۔

کتنے دن کے بعد' کتنے صدیوں جیسے پل' کتنے سالوں جیسے گھنٹے بتا کر ان بانہوں کا گھیرا اور ان سانسوں کی ہر حدت اور خوشبو کو اس قدر قریب سے محسوس کیا تھا اس نے۔۔۔ وہ جانے کب تک یونہی محبت پاش نگاہوں سے وہ مہربان چہرہ دیکھتی رہتی۔ معاً" اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے یوں خود کو اتنی محویت سے تکتا ہوا دیکھ کر وہ دھیمے سے مسکرایا۔

"کیا ہوا۔۔۔ نیند نہیں آرہی کیا۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس یونہی خاموشی سے مسکرا کر اسے دیکھتی رہی۔ اس نے واپس نیند میں جانے سے پہلے بند ہوتی آنکھوں کو کھولا۔ پھر اس کی پیشانی پر بوسہ لیا۔

"سوجاؤ جان۔ پھر صبح پتا نہیں دیر تک سونے کو ملے یا نہیں۔"

اس نے ایک گہری پرسکون سانس بھر کر آنکھیں بند کرلیں۔ لیکن صرف چند لمحوں کے فرق سے اس کی جڑی ہوئی پلکیں الگ ہوگئیں۔

حسیب کے سیل پر کوئی میسج آیا تھا۔ اس نے سائیڈ ٹیبل سے اس کا موبائل اٹھایا۔ کسی انجانے نمبر سے آیا ہوا میسج۔۔۔ شاید دبئی سے۔۔۔

"حسیب ہنی! آئی مس یو ڈارلنگ۔ اگر تم جاگ رہے ہو تو پلیز بتادو کہ کافی کہاں رکھی ہے۔ میں نے سارے کیبنٹس دیکھ لیے کہیں نہیں مل رہی۔"

نہ کوئی بجلی گری تھی' نہ آندھی آئی' نہ طوفان۔ بس چند لمحوں پہلے کا محبت بھرا فسوں اچانک غائب ہو گیا۔ اس کے مسکراتے ہوئے لب سکڑ گئے۔ ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔ اس نے ایک بے یقین نظر اطمینان سے سوتے ہوئے حسیب پر ڈالی اور اسی بے یقین کیفیت میں ٹیکسٹ ٹائپ کرنے لگی۔

"شاید کافی ختم ہوگئی تھی۔ تم جاکر اسٹور سے لے آؤ۔"

"اس ٹائم؟ تم اگر پہلے بتا کر جاتے تو میں لاکر رکھ لیتی۔"

اتنی بے تکلفی۔ یہ انداز تخاطب۔ وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے آنے والا میسج پڑھ رہی تھی۔ کوئی بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ حسیب کے فلیٹ پر کوئی عورت رہ رہی تھی۔ اور حسیب اسے وہاں چھوڑ کر ماہا سے ملنے آیا تھا۔

ہزاروں سوال کیوں۔ ؟کیوں۔ ؟کیوں۔ لیکن کیوں۔ ؟اور جواب ندارد۔

سورج کی شعاعیں سیدھے چہرے پر پڑ کر اسے بیدار کر گئی تھیں۔

"اوں ہونہہ۔ یہ کھڑکی کیوں کھول دی ماہا یار اسے تو بند کردو۔ کتنی تیز دھوپ آرہی ہے۔" اس نے تکیے میں منہ گھسیڑا۔ پھر بے چینی سے اسے دیکھا۔ جو بالکل سامنے اس کی جانب پشت کیے ڈریسنگ کے آگے بیٹھی تھی۔

"ماہی میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں۔" کوئی جواب نہ پا کر اس نے پھر دیکھا۔

"کیوں کھولی ہے۔ ونڈو بند کردو یار۔"

"آپ کو جگانے کے لیے کھولی ہے۔ تاکہ آپ کے ہوش و حواس ٹھیک طرح سے بیدار ہوجائیں۔" اس کی آواز بھاری نم اور بھرائی ہوئی تھی۔ حسیب ایک دم چونکا۔

"تم رو رہی ہو۔ کیوں۔ ماہا کیا ہوا ہے؟"

وہ چند لمحے یونہی بیٹھی رہی۔ پھر پلٹی اور ہاتھ میں پکڑا اس کا سیل فون پٹخنے کے سے انداز میں اسے کھینچ مارا۔

☼ ☼ ☼

شام گہری ہو کر رات کے آنچل میں چھپ رہی تھی جب وہ لوگ گھر پہنچے۔ پوری گلی میں صرف ایک ان ہی کا گھر تھا جو مکمل اندھیرے اور خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ گیٹ پر کھڑے ہو کر اتنی بار بیل بجانی پڑی کہ گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ اس دن یہ اتفاق ہی تھا کہ انس گھر کی ڈپلی کیٹ چابی اپنے ساتھ لے جانا بھول گیا تھا اور گھبراہٹ جب تشویش میں بدلنے لگی تب صحن میں لگا انرجی سیور جل اٹھا۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھول کر نائلہ انتہائی عجلت میں پلٹ گئی۔

انس اور سوہا دونوں نے ہی بطور خاص اس کا یہ انداز نوٹ کیا۔ سوہا نے اس ایک لمحے میں جب وہ پلٹ رہی تھی اس کا سرخ اور سوجا ہوا منہ بھی دیکھ لیا تھا۔ جبھی چند قدم کے صحن پار کرکے برآمدے میں قدم رکھتے ہی اس کے منہ سے نکلا۔

"السلام علیکم! نائلہ کیا بات ہے۔ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔"

تیر کی طرح تیزی سے واپس اپنے کمرے میں گھستی نائلہ دہلیز پر رک گئی۔

"نہیں۔" اس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے بہت دیر روتی رہی ہو۔

"کیا ہوا طبیعت کو۔" اس نے آگے بڑھ کر نائلہ کو اپنی طرف گھمایا۔ اور وہ گھنٹوں سے جیسے کسی ہمدرد کندھے کی تلاش میں تھی۔ یکدم ہی سوہا کے کندھے سے آن لگی۔ اور اس بری طرح بکھر کر روئی کہ سوہا تو سوہا خود انس بھی گھبرا گیا۔

وہ جلدی سے اس کے لیے پانی لے کر آیا۔ سوہا نے اسے صوفے پر بٹھایا اور اس کا سر تھپکنے لگی۔ نائلہ کا اس طرح بے قراری سے تڑپ کر رونا دونوں کی سمجھ سے باہر تھا۔ نہ تو وہ اتنی نازک تھی اور نہ اس کے اعصاب....

پانی پی کر جب ذرا طبیعت ٹھہری تو اس نے سوالیہ نگاہوں سے دونوں کو اپنی طرف تکتا پایا۔

"وہ... میں۔" اب سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا جواز پیش کرے۔

"اتنے دن سے گھر میں اکیلی تھی اور آج صبح حدید بھی ناراضی کے عالم میں جو نکلے تو اب تک واپس نہیں آئے۔ مغرب کا وقت تھا میں ڈر گئی تھی۔"

"لیکن... تمہارا تو پورا منہ سوج رہا ہے۔ آنکھیں کتنی سرخ ہورہی ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے تم پتا نہیں کب سے اور کتنا رو چکی ہو۔"

سوہا کی آواز میں حقیقی تفکر اور خلوص چھلک رہا تھا۔ انس البتہ اب تک خاموش تھا۔ نائلہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے پاس کوئی جواب تھا بھی نہیں۔

"چلو نیند کی گولی کھا کر آرام کرو۔ میں آگئی ہوں میں حدید بھائی کو سمجھا دوں گی۔ وہ ناراضی ختم بھی کردیں گے اور تمہیں ڈسٹرب بھی نہیں کریں گے۔"

سوہا اسے تسلی دینے والے انداز میں مسکرائی۔ نائلہ کے دل میں ایک بار پھر حسد اور رشک کے ملے جلے جذبات ابھرے۔

وہ اٹھنے لگی تھی تب اس کی نظر انس پر پڑی۔

وہ صوفے کے پاس پڑا ہوا کوئی مڑا تڑا کاغذ اٹھا رہا تھا۔ نائلہ کی سانس اٹکنے لگی۔ یہ موٹا کاغذ اور اس کے اندر لپٹی چمکیلی پنی' اس پان کی تھی جو شبیر حسین نے یہاں آنے کے بعد کھایا تھا اور لاپروائی سے پھینک دیا تھا۔ کاغذ اور سنہری پنی پر لگے کتھے کے نشانات واضح تھے۔

انس نے چند لمحے کاغذ کو غور سے دیکھا پھر بنا کچھ کہے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ نائلہ کی اٹکی ہوئی سانسیں بحال ہوئی۔ وہ تیزی سے کمرے میں گھس گئی۔

☼ ☼ ☼

حسیب ماہا کو گھر چھوڑ کر ایئرپورٹ کے لیے نکل گیا تھا۔

پورے وجود پر اداسی' افسوس اور پژمردگی طاری تھی۔ وہ کچھ نہ کرکے بھی ایک بار پھر مجرم' بلکہ ملزم سے مجرم بن چکا تھا۔ اسے اپنے اور ماہا کے تعلقات پرانی نہج پر لانے کے لیے جتنی محنت کرنی پڑی تھی سب بے کار گئی تھی۔

اسے گھر واپس چھوڑتے وقت اس کے وہی انجان انداز تھے۔ نم آنکھیں' روٹھا چہرہ اور کم آواز۔ نہ اس نے کوئی صفائی مانگی۔ نہ اس نے خود کو کسی وضاحت کے قابل سمجھا۔ اب کی بار بدگمانی کی دھول نہیں۔ آندھی چلی تھی اور ماہا کا دل' دماغ' عقل سب کچھ اس آندھی کی سرخ مٹی میں منوں وزن تلے دب چکا تھا۔

ایئرپورٹ نزدیک ہی تھا۔ جب اچانک اس کے خیالات کو ایک جھٹکا لگا۔ کیب رک چکی تھی۔ وہ نا سمجھی سے سامنے آجانے والے ان موٹر سائیکل سواروں کو دیکھنے لگا۔ جو افراتفری کے عالم میں اس سے کچھ کہہ رہے تھے۔

جتنی دیر میں حسیب ان کی بات سمجھا ان میں سے ایک نے حسیب کے ہاتھ میں دبا موبائل جھپٹا۔ حملہ بے حد غیر متوقع تھا۔ حسیب نے بے اختیار مزاحمت کی۔

ڈرائیور دوسرے لڑکے کے گن پوائنٹ پر تھا۔

حسیب نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ بس لمحہ بھر کی بات تھی۔ لڑکے نے ٹریگر دبا دیا۔ فضا میں یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔

انہوں نے ٹیکسی میں لدا ہوا دوسرا سامان گھسیٹا اور خون میں لت پت جسم کو وہیں چھوڑ کر فرار ہوگئے۔ پوری گاڑی ڈرائیور اور حسیب کے گاڑھے سرخ خون سے بھرتی جارہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ کتنے دن کے بعد اس کمرے میں انس کے ساتھ داخل ہوئی تھی۔ اندر قدم رکھتے ہی رنگ برنگی سوچوں نے اس کا ہاتھ تھام کر آنکھوں میں آنکھیں ڈالنی چاہیں۔ لیکن اس کے دھیان کے پردے پر کوئی اور ہی منظر ان یادوں

کو پڑے ہٹا کر آن کھڑا ہوتا۔
وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس منظر میں ڈوب ڈوب جاتی۔
سب سے پہلے جا کر جب اس نے ڈریسنگ میں اپنا سراپا دیکھا اور پشت پر ابھرتے انس کے عکس کو دیکھ کر دھیمے سے مسکرائی تب۔ انس جواباً" مسکرا کر واش روم چلا گیا۔ تب۔
اس نے چوڑیاں اتاریں' میک اپ جو کہ بہت ہلکا ہی تھا۔ بے دھیانی میں ٹشو سے رگڑتے ہوئے۔ اور اس کے بعد ہی دوپٹا اتار کر اس کو تہ کرکے بار بار واپس کھولتے ہوئے' انس کے نکل کے آنے کے بعد بھی وہ اسی سوچ میں گم تھی کہ آج آخر نائلہ کو ہوا کیا تھا۔
"کیا بات ہے۔ کن خیالوں میں گم ہیں بیگم صاحبہ!"
انس اسے مخاطب کرتے ہوئے بہت فریش تھا۔ سوہا نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر ایک دم تازہ دم ہو کر مسکرائی۔
"کچھ نہیں بس ایسے ہی۔"
وہ بیڈ کے پاس کھڑی تھی۔ ہاتھ میں دوپٹا تھا۔ قریب ہی انس اس کے برابر سے ہو کر بیڈ پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کا دل انس کے نکھرے وجود کو دیکھ کر لمحے بھر کے لیے کھل سا گیا۔ اس نے ایک بے خودی کے سے عالم میں آگے بڑھ کر اپنے بازو اس کے کندھوں پہ ٹکا کر اسے حصار میں لے لیا۔ انس اس خوب صورت سپردگی کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ بے اختیار اس کے محبت بھرے اس انداز پر مسکرا اٹھا۔ آج وہ بنا جھجکے' شرمائے اور جھوٹی موٹی بنے بغیر' سیدھا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہی تھی۔
"کیا دیکھ رہی ہو۔" انس کے لیے اس کے انداز نرالے بھی تھے اور بے حد خوب صورت بھی۔
"سب کچھ۔" اس کے گداز لبوں پر الفاظ چمکے۔
"سب کچھ۔ سب کچھ کیا۔" وہ حیران ہوا۔
"آنکھیں' ناک' ہونٹ' بال سب کچھ۔" اب کے سوہا کا انداز شرارتی سا تھا۔
"کیوں۔" اس نے اپنے ہاتھ اٹھا کر سوہا کی کلائیوں پر رکھے اور انہیں دھیرے سے اپنی گرفت میں لیا۔
"اتنے دن بعد جو دیکھا ہے۔ کیا فرصت سے دیکھ بھی نہیں سکتی۔" اس نے لاڈ سے شکوہ کیا۔
"نہیں۔ دیکھ سکتی ہو بلکہ صرف دیکھتی کیوں ہو۔ اس سے بڑھ کے بھی کچھ کر سکتی ہو۔" بات کی تہہ میں اترتے ہی اس نے لمحے بھر میں اپنے ہاتھ کھینچے۔ مگر اب اس کی کلائیاں انس کی گرفت میں تھیں۔
"کیا ہوا۔ اب کیا ہوا۔" سوہا کی ہنسی نکل گئی۔
"کچھ نہیں بس دیکھ چکی۔" وہ مسلسل اپنی ہنسی دبا رہی تھی۔
"تم دیکھ چکی نا! میری باری تو اب آئی ہے۔" اس نے اس کی کلائیوں کو جھٹکا دیا۔
"تو آپ بھی دیکھ لیں۔" وہ مسلسل اپنے ہاتھ موڑ موڑ کر چھڑوانے کے چکر میں تھی۔ لیکن انس کی گرفت میں ناکام ہو رہی تھی۔
"دیکھوں گا میں بھی۔ دیکھوں گا ہی لیکن ایسے تھوڑی۔ میں اپنے انداز سے۔"
اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ابھری۔ اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کی کلائیوں کو آزاد کیا۔ سوہا بجلی کی سی تیزی سے دور ہو گئی۔
"سوہا۔ انس! کھانا کھا لو تیار ہے۔"
باہر سے نائلہ کی آواز ابھری۔ آواز بھاری تھی۔ لیکن ہموار بھی تھی۔ انس نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ کھولا۔

وہ اپنی بات دہرا کر وہیں سے واپس پلٹ گئی۔ انس نے مڑ کر سوہا کو دیکھا۔ پھر اس کے نزدیک آیا۔
"یہ نائلہ کو کیا ہوا ہے۔" اس نے سرگوشی کی۔
"پتا نہیں۔" جواب بھی سرگوشی میں آیا۔
انس معصوم سا منہ بنا کر سوہا کی طرف جھکا۔ سوہا نے اسے پیچھے دھکیلا پھر دروازہ کی طرف موڑا پھر پشت پر ہاتھ رکھ کر دھکیل دیا۔ انس ڈھیلے پن سے آگے بڑھتا چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

اس نے جھکی جھکی نگاہوں سے ان کے جھریوں بھرے سانولے ہاتھ دیکھے۔ دس میں سے چار انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں تھیں۔ جو ان کے سانولے ہاتھوں سے ذرا بھی میل نہیں کھا رہی تھیں۔ چھوٹی سی ٹرے میں چائے کے دو کپ اور بسکٹ کی پلیٹ رکھے۔ وہ جھکی۔ ٹرے اماں اور ان کے درمیان ہی مسہری پر ٹکا دی۔ اس کے سیدھے ہونے سے پہلے ہی وہ ہاتھ اس کے سر پر آن ٹھہرا۔
"جیتی رہو۔ خوش رہو۔ اللہ نصیب کھولے۔ جلدی سے اچھا سا بر ملائے اپنے گھر کا کرے۔" خاتون کے منہ سے دعاؤں کے پھول جھڑے۔ اور کمرے کا ماحول مہک گیا۔
"یہی ہے میری بیٹی عفت۔ ماشاء اللہ سے۔ بہت فرمانبردار اور سگھڑ ہے۔ آپا اب تم سے کیا چھپانا۔ بس۔"
وہ سر پر سے ہاتھ ہٹتے ہی پلٹ کر کمرے سے نکل آئی۔
گھر کی تینوں لڑکیاں بیاہی گئی تھیں۔ بس اب صرف ایک ہی باقی تھی۔ اس کی فکر نے ہی اماں کی نیندیں اڑا رکھی تھی۔ وہ خود تو سارا دن گھر میں ہی رہتی تھی۔ نہ کہیں آنا نہ جانا۔ نہ ملنا ملانا۔ خاندان کی تقریبات میں بھی ابا کی وجہ سے کبھی جانا ہو جاتا تھا۔ اور کبھی نہیں۔
اماں کے بقول "اس گھر کی دہلیز تو کوئی رشتہ پھلانگتا ہی نہیں۔ پرانے وقتوں میں بیری پکتی نہیں تھی کہ پتھر گرنے شروع ہو جاتے تھے اور اب۔"
کبھی کبھی وہ عفت کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر کبھی چچی تو کبھی ابا کے سامنے شروع ہو جاتیں۔
عفت بس ایک پتھرائی ہوئی سی کیفیت کے ساتھ اماں کے تبصرے اور تجزیے سنتی رہتی۔ کل ماہا اور سوہا کے اپنے گھروں کو چلے جانے کے بعد رات میں اماں نے ہمت پکڑی اور محلے کے ہی کسی گھر سے کہہ سن کر وچولن کو بلوا بھیجا۔ یہ وچولن جسے پورا محلہ نسیم خالہ کے نام سے جانتا تھا۔
محلے کے کئی گھروں میں رشتے کروا چکی تھی۔ سنا تھا۔ کافی کھاتے پیتے علاقوں میں بھی اس کا آنا جانا تھا۔ بہت سے ایسے گھرانے جہاں اسے بہت امید اور آس کے ساتھ بلایا جاتا تھا۔ رشتہ طے ہو جانے سے لے کر شادی کی کامیابی تک کے مرحلوں میں اسے خوب نوازتے تھے۔ رشتہ پکا ہو جانے کی صورت میں اس کی اپنی فیس بھی تھی۔ جس کی وصولی میں وہ ذرہ برابر بھی مروت نہیں دکھاتی تھی۔ لیکن بے چاری مزاج اور طبیعت کی بہت اچھی تھی۔ با اخلاق اور ملنسار اور کچھ اس کے پروفیشن کا تقاضا بھی تھا۔ لیکن اس کا اپنا کہنا یہ تھا کہ جس طرح اس نے اپنی تین بیٹیوں کے رشتوں کے لیے بیوگی میں بھاگ دوڑ کی۔ شادی کروانے میں جس طرح دھول پھانکی' اس سے یہ سبق سیکھا کہ اگر میری ذرا سی محنت سے کسی کی بیٹی اپنے گھر کی ہو جائے تو آخرت کے لیے سودا مہنگا نہیں۔
یہی وجہ تھی کہ اماں کے ایک بلاوے پر وہ بلا حیل و حجت چلی آئی تھی جبکہ جانتی تھی کہ یہاں سے مال ملنے کی کوئی امید نہیں۔
عفت نے باورچی خانے میں آ کر ایک گہری سانس لی۔ چولہے پر چڑھی مسور کی دال میں سے اڑتی بھاپ کو

دیکھا۔ اس کی زندگی میں خوشیاں بھی ایسے ہی دھوئیں کی مانند مرغولے بن کر فضاؤں میں کہیں اڑ گئی تھیں۔

اس نے بے دلی سے چند ایک صاف ستھری پلیٹوں کو اسٹینڈ پر آگے پیچھے کیا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ اس بے معنی سے کام کے دوران اس کی آنکھیں دھندلا سی گئی ہیں۔ اس نے تیزی سے آنکھوں کو رگڑا چند لمحوں کے لیے منظر صاف ہوا۔ پھر فوراً ہی دوبارہ دھندلاہٹ بھر گئی۔

وہ گرم دیگچی میں سے اٹھتی بھاپ کے سامنے منہ دے کر کھڑی ہو گئی۔ اور پھر کتنے ہی آنسوؤں کو بنا رو کے بہہ جانے دیا۔

کبھی کبھی آنسوؤں کا بہہ جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔ مستقل دل میں جمع رکھنے سے ایسی دلدل بن جاتی ہے۔ جس میں ہر خوشی لاکھ ہاتھ پیر مارے ڈوبتی ہی چلی جاتی ہے۔ آنسوؤں کی یہ دلدل اس قدر وحشیانہ بھوک رکھتی ہے کہ خوشیاں نگلتے نگلتے پورا بندہ نگل جاتی ہے۔ آنسوؤں کو آدم خور دیمک بننے میں دیر نہیں لگتی۔

☼ ☼ ☼

اس نے کچن کے دروازے میں سے عفت کی قمیص کی جھلک دیکھ لی تھی۔ پھر بھی بنا سلام دعا کیے آگے بڑھ کر سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔ اوپر امی شاید باتھ روم میں تھیں۔ کمرے خالی تھے اور باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اندر جا کر دھم سے بیڈ پر بیٹھی۔ چند لمحے ضبط سے گہرے گہرے سانس لیتی رہی اور بس.... چند لمحے گزرے تھے کہ اس کا حوصلہ ٹوٹ گیا۔ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ یہاں اسے کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ کوئی اسے کندھا پیش کرنے والا نہیں۔ کوئی اس کے آنسو پونچھنے والا نہیں تھا۔ کوئی اس سے آنسوؤں کا سبب جاننے والا نہیں تھا۔

کافی دیر رو چکنے کے بعد جب تھوڑا دل ہلکا ہوا اور اسے محسوس ہوا کہ امی اب نہا کر نکلنے والی ہوں گی تو اس نے چہرہ صاف کیا اور کچن کے سنک سے جا کر چہرے پر پانی کے چھپاکے مارے گو کہ یہ ذرا سا پانی 'اس ڈھیر سارے پانی کے اثرات مٹانے میں ناکام تھا۔ جو اس نے کمرے میں آنسوؤں کی شکل میں بہایا تھا۔ پھر بھی چند گھونٹ چلو میں بھر کر حلق میں اتار لینے سے اس نے خود کو امی کے سامنے کرنے کے لیے تیار کر لیا۔

امی ابھی نہا کر نکلیں گی تو اسے سامنے دیکھ کر حیران تو ضرور ہوں گی۔ سوالات کریں گی۔ پھر تشویش کا اظہار کریں گی۔ ان سارے مرحلوں سے بخیر و خوبی نمٹتے ہوئے اسے امی کو کس طرح مطمئن کرنا ہے کہ انہیں محسوس نہ ہو کہ اس کے اور حسیب کے درمیان پھر سے کوئی ناچاقی ہو گئی ہے۔ اس نے خود کو ذہنی اور جسمانی طور پر تیار کرنے کے لیے ہونٹوں کو دائیں بائیں پھیلا کر مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن یہ کوشش بہت بھونڈی ثابت ہوئی۔ کیونکہ اتنی تیزی سے اس کی آنکھوں میں نمی ابھری کہ اس نے خود کو احمق محسوس کیا۔

آنکھیں صاف کر کے گہری سانس لی۔ چہرہ تھپتھپایا۔ اور پلٹ کر پھر گلاس میں پانی لینے لگی۔

امی نہا کر نکلیں تو اس نے سلام میں پہل بھی کی اور جلدی بھی۔ وہ اس کا سلام سن کر رکیں۔ ٹھٹک گئیں۔

"وعلیکم السلام! تم کب آئیں۔"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے۔" اس نے چہرہ چھپانے کے لیے گلاس منہ سے لگایا اور کچن سے نکل کر درمیانی فاصلہ عبور کر کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس نے جتنا سرسری انداز میں جواب دیا تھا۔ امی اتنی ہی تشویش بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

ماؤں کی آنکھوں میں اللہ تعالیٰ نے جو ایکسرے مشین فٹ کر دی ہے۔ اس کا تعلق سیدھا دل سے جڑا ہوتا ہے۔ اولاد جسمانی چوٹ اور تکلیف "شاید" ماں سے چھپا سکے۔ لیکن دل میں کیا چل رہا ہے۔ یہ چھپانا تقریباً" ناممکن ہی ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جبکہ ماں کی آنکھوں سے نکلتی ایکس ریز اولاد کی آنکھوں کی اسکرین پر لکھی ہر زبان پڑھ سکتی ہوں۔ دل میں پھوٹتے لڈو اور امیدوں کے بجھتے چراغوں کی ایکس ریز ریڈنگ 'ایک آنکھ کے اضطراب سے دوسری آنکھ پر انکشاف تک بنا کسی سگنل کی موجودگی کے 'بلا کم و کاست پہنچتی ہیں۔

اس نے نگاہیں جھکا کر اپنا ہینڈ بیگ کھنگالنا شروع کر دیا۔ دل کو ایک پاگل سی خوش فہمی تھی۔ یا بے وقوفوں والا بہانہ کہ شاید اس بیگ میں سے کوئی ایسی چیز نکلے گی۔ جسے دیکھ کر امی یا تو اپنی بات بھول جائیں گی یا بہل جائیں گی۔ حسب توقع وہ فوراً" ہی اس کے پیچھے کمرے میں چلی آئی تھیں۔ اور اب بے حد غور سے اس کی مصروفیت دیکھ رہی تھیں۔

"اور حسیب کہاں ہے۔"

"وہ چلے گئے واپس۔" اس نے بیگ سے اپنا موبائل نکالا۔

"اپنی... بہن کے پاس۔" انہوں نے ذرا سی دیر کے لیے بھی اپنی نظریں اس پر سے ہٹائی نہیں تھی۔ وہ خود بیڈ پر بیٹھی تھی۔ وہ دروازے پر کھڑی تھیں۔ ماہا کے فرار کے سبھی راستے مسدود تھے۔

"نہیں 'دبئی... ابھی مجھے چھوڑ کر ایئرپورٹ ہی گئے ہیں۔" اس نے بے حد آرام سے کہا۔

"لو۔ تمہیں لے کر نہیں گیا وہ۔ کل تو کہہ رہا تھا کہ اگر تم جانا چاہو..." ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ ماہا بے حد انہماک سے فون پر کوئی نمبر ملا رہی تھی۔

"میں تم سے بات کر رہی ہوں۔" انہیں ایک دم جلال چڑھا۔

انہوں نے گیلے الجھے بالوں کا ہی جوڑا بنا لیا تھا۔ اور ایک ماتھے پر جھولتی لٹ کو جارحانہ انداز میں کان کے پیچھے اڑس کر وہ اس کے مقابل آئیں۔

"ان ہی کو فون کر رہی ہوں۔ تاکہ آپ خود بات کر کے مطمئن ہو جائیں۔" فون آف تھا۔ اس نے پھر ملایا۔ لیکن بے سود۔

"بچ۔ ابھی فون آف جا رہا ہے۔" اس نے ناامیدی سے کال کاٹ دی۔

"سچ بتا مجھے ماہا! پھر کوئی بات ہوئی ہے تم دونوں کے درمیان۔"

"ارے... نہیں امی... بس وہ مجھے نہیں لے جا سکتے تھے... ان کے فلیٹ میں ایکچوئلی..." اس نے تھوک نگل کر خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"کسی دوست کی فیملی آ کر رکی ہوئی ہے۔ اس لیے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" کتنا مشکل تھا انہیں مطمئن کرنا اور اس سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ خود کو مطمئن رکھنا اور سنبھالنا۔

"وہ... لوگ یہ سمجھے کہ... حسیب یہاں آئے ہیں زیادہ دن کے لیے۔ اس لیے وہ ان کے فلیٹ پر آ گئے۔ اب انہیں کیا پتا تھا کہ وہ اتنی جلدی واپس جائیں گے۔"

"تو حسیب کیوں چلا گیا۔ وہ بھی رک جاتا۔"

"وہ کیسے رکتے۔ وہاں ان کا کام کا حرج ہو رہا تھا۔" اس نے بیگ سے ایک لپ گلوز اٹھا کر مٹھی میں بھینچا۔

"تو اب وہاں کہاں رہے گا وہ۔"

یا اللہ اس نے گود میں رکھا بیگ پٹخنے کے سے انداز میں نیچے رکھا۔

"اوہو امی۔" وہ اٹھ کر ڈریسنگ تک گئی۔ اور ہاتھ میں پکڑا گلوز خوامخواہ ہونٹوں پر پھیرنے لگی۔ انداز میں اس قدر محویت تھی جیسے اس سے زیادہ ضروری کوئی کام دنیا میں نہیں رہا۔

"آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ حسیب اور ان کے فرینڈز جن کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ ان کے لیے یہ روٹین کی بات ہے۔"

"لیکن حسیب تو نہیں ہے نا! اب کنوارا۔" اس نے آئینہ دیکھتے ہوئے ایک کرب محسوس کیا۔ اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

"وہ کبھی بھی کنوارے نہیں تھے امی۔ کیا بتاؤں میں آپ کو۔" دل کی بات دل میں ہی رہی۔

"اچھا ناشتا کیا ہے تم نے یا لے کر آؤں۔"

"وہ سمجھیں شاید ان کے تابڑ توڑ سوالوں سے ماہا عاجز آرہی ہے۔

"نہیں بس جائیے۔ میں خود بنالوں گی۔" وہ تیزی سے بول کر کمرے سے نکل کر کچن میں چلی گئی۔

"میں ذرا اوپر کے لیے نیچے جارہی ہوں۔"

امی بولتی ہوئی کچن کے سامنے سے گزر کر سیڑھیوں کی طرف گئیں۔ ان کے قدموں کی چاپ ہلکی ہوتے ہوتے معدوم ہوگئی۔

ماہا نے اپنے لبوں کو ہاتھ سے دبا کر بے ساختہ ابھرتی سسکی کو روکا۔ لیکن آنسوؤں کو نہ روک سکی۔ اسی طرح منہ پر ہاتھ رکھے دو قدم پیچھے ہو کر دیوار سے ٹکی اور پھر نیچے بیٹھتی چلی گئی۔

انسان کبھی کبھی کتنا بے اختیار اور بے بس ہوجاتا ہے۔ پوری جان لگا کر بھی لبوں پر مسکراہٹ نہیں لاپاتا اور پورا زور لگا کر بھی اس نمکین پانی کو نہیں پی پاتا جسے اشک کہتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

انہوں نے زندگی میں پہلی بار کوئی اتنا خوفناک حادثہ حقیقی آنکھ سے اور اس قدر نزدیک سے دیکھا تھا۔

بس چند قدموں کا فاصلہ ہی تو تھا۔ یا چند سو قدموں کا۔ ان کے قدم بے اختیار بریک پر جا پڑے تھے۔ فائرنگ کی آواز اتنی ہی بلند' واضح اور دہشت ناک تھی اور پھر۔۔۔

لہو۔۔۔ بے حد' بے حساب اور بے انتہا بہتا ہوا لہو تھا یا لہولہان' ہوش و حواس سے بیگانہ وہ دو انسانی وجود جو زندگی اور موت کے کھیل میں اپنی جان کی بازی بس ہارنے ہی والے تھے۔ سے کا جواری چال چل چکا تھا۔ اور مہرے بس پٹنے ہی والے تھے۔

ان دونوں کے قریب سب سے پہلے پہنچنے والے بھی وہ خود ہی تھے اور ہوش و حواس قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ان کی آخری سانسیں بچانے کی کوشش کرنے والی بھی پہلے شخص وہ خود ہی تھے۔

اس سے پہلے کبھی ان کا دل اس رفتار سے نہیں بھاگا تھا۔ یوں لگتا تھا وہاں کھڑے کھڑے وہ یا تو دل کے مریض بن جائیں گے۔ یا اعصابی شکست خوردگی کے۔ آس پاس رش بڑھ رہا تھا۔ لوگ جمع ہو رہے تھے۔ لیکن وہ صرف تماش بین تھے۔ جو تماشا ختم ہونے کے انتظار میں تھے۔ اس تماشے کو جاری و ساری رکھنے کی ساری جدوجہد وہ خود ہی تن تنہا کرنے والے تھے۔

ٹیکسی کے کھلے دروازے سے انسانی دھڑ' کسی بے جان بوری کی طرح آدھے باہر لٹک رہے تھے۔ خاک' خون اور کانچ کی کرچیوں پر کھڑے ہو کر' انہیں سیدھا کرتے' کئی اور ہاتھ مدد کے لیے آگے بڑھے۔ ایک عجیب سی وحشت کے عالم میں ساتھ چھوڑتے حوصلے کو ذرا کی ذرا سہارا ملا۔ گاڑھا اور سرخ خون اب ٹیکسی سے نکل کر اطراف میں پھیلتا جارہا تھا۔

ایمبولینس کال کرتے' انہیں اچھی طرح محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے مضبوط ہاتھوں میں واضح لرزش' اتر آئی

تھی۔ ان کے ہاتھ کپڑے اور چہرہ بھی لہو میں لتھڑ چکا تھا۔

ٹیڑھے میڑھے گوشت پوست سے بنے بھاری بھر کم نیم مردہ تنوں کو کھینچ کر زمین پر لٹاتے سمے' کچھ جی داروں نے تو ان میں سے ایک کی موت کی تصدیق تک کردی تھی۔ لیکن وہ خود کسی بات پر یقین کرنے سے پہلے' ایک آخری کوشش کرلینا چاہتے تھے۔

جب ہی گہری گہری سانسیں لیتے کلام الٰہی کے جو کچھ حصے انہیں یاد تھے۔ اس وقت تک دم کر کر کے ان پر پھونکتے رہے۔ جب تک ایمبولینس کے سائرن کی گونج نے پوری فضا میں شور برپا نہ کردیا۔

☼ ☼ ☼

کچھ دیر کے بعد انس کو حیدر آباد کے لیے نکلنا تھا۔

سویا اس کے ہینڈ کیری میں انتہائی ضروری سامان رکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی رفتار معمول سے کہیں سست تھی اور لگتا تھا دل بھی معمول سے ہلکی رفتار میں دھڑک رہا ہے۔

"کیا ہوا کن سوچوں میں گم ہو۔"

انس مسلسل دوستوں سے فون پر رابطے میں لگا تھا۔ پھر بھی اس نے اس کی خاموشی اور اداسی کو محسوس کرلیا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا اپنا دل میں اتنے دن بعد سویا سے ملنے پر جدائی کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کا موڈ کچھ اس سے دور جانے کی وجہ سے اور کچھ نوکری کی ٹینشن سے۔ بجھا بجھا سا تھا۔

"کچھ نہیں بس۔ آپ کے جانے کا سوچ کر مجھے الجھن سی ہو رہی ہے۔"

"الجھن یا اداسی۔"

"اداسی بھی ہے اور الجھن بھی۔" اس نے ہینڈ کیری کی زپ بند کی اور وہیں بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"کہنے کو میرے سسرال میں ساس سسر اور نندوں کے نام پر کوئی جھگڑا نہیں۔ لیکن بس پھر بھی پتا نہیں کیوں ۔۔۔ مجھے یہاں آپ کے بغیر رہنے کے خیال سے ہی گھٹن سی ہو رہی ہے۔"

"بچ۔۔۔ اتنا ذہن پر سوار مت کرو نا!" انس نے ہاتھ سے اسے نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر اس کے برابر ہی آکر بیٹھی تو اس نے اسے بازو کے گھیرے میں لے لیا۔

"جیسے ہی انتظام ہوگا۔ میں تمہیں بلوالوں گا۔"

سویا نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ اس نے اس کے کندھے پر سر ٹکا کر اپنے بائیں ہاتھ میں اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں پھنسالیں۔

"وہ تو جب آپ بلائیں گے تب نا! ابھی تو یہاں بس میں ہوں گی یا یہ۔۔۔ نائلہ۔"

"انس توانس۔ اسے خود محسوس ہوا کہ نائلہ کے نام پر اس کے حلق میں ایک کڑواہٹ سی گھل گئی۔

"اس نے کیا کہا ہے تمہیں۔"

"کیا کہنا ہے اس نے۔ کچھ بھی نہیں بس۔۔۔" اس نے ایک گہری سانس لے کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

کچھ باتیں ادھوری رہ کر بھی پورے معنی سمجھا دیتی ہیں۔ پھر ان کا کہنا نا کہنا برابر ہوجاتا ہے۔ اگر وہ کوئی تلخ بات ہو تو اس کی تلخی بھی پوری طرح محسوس ہوتی ہے۔ اور اگر وہ کوئی مہکتے لفظ ہوں تو ان کی خوشبو سے پورا من' پورا وجود مہک جاتا ہے۔

"فکر مت کرو تم۔ میں روز فون کروں گا اور زیادہ عرصہ تمہیں رہنا نہیں پڑے گا یہاں اور اگر کوئی بات ہو بھی۔ کوئی مسئلہ ہو تو حدید سے کہنا۔" وہ بات کرتے کرتے رکا جیسے اسے کچھ یاد آیا۔

"کمال ہے۔ کل سے میں نے حدید کو نہیں دیکھا۔" اس کے لہجے میں تعجب تھا۔
"جی! رات بھی وہ بہت دیر سے گھر آئے تھے۔"
"چلو' ٹائم کم ہے۔ میں اسے فون کرلوں۔ تم ایک نظر اور دیکھ لو کچھ رہ تو نہیں گیا۔" اس نے بولتے ہوئے سوہا کو اپنے بازو کے گھیرے سے آزاد کیا اور فون پر حدید کا نمبر ملایا۔ بیل جاتی رہی مگر فون' ریسیو نہیں ہوا۔ کئی بار کی کوششوں کے بعد وہ یک دم چونک گیا۔ فون آف کردیا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کام میں کسی صورت اس کا دھیان نہیں لگ رہا تھا۔ آج دو دن بعد بھی اس کے غصے کی آگ یونہی بھڑک رہی تھی۔
نائلہ کی شکل سامنے آتے ہی اس کے جسم وجاں کو جھلسانے لگتی۔ اسے لگتا کہ یا تو وہ خود مرجائے گا یا پھر اسے مار ڈالے گا۔ لیکن اس سے اپنی عزت' نفس پر پیر رکھ کر یہ نہیں پوچھ سکے گا کہ' آخر اس میں کمی کیا ہے۔ کیوں وہ اس کے نزدیک آنا پسند نہیں کرتی۔
کوئی مرد اتنا مضبوط نہیں ہوتا۔ کسی میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ عورت ذات کے گنجلک کھولنے کے لیے اپنی عزت نفس کی بھینٹ چڑھا سکے۔ عورت بھی وہ جو کبھی اسے دل کو نہیں بھائی۔ اس کی نظروں میں نہیں سمائی اور بیوی کے منصب پر کبھی فائز ہونے کے لیے کوئی خوب صورت کوشش تک نہیں کرپائی۔
وہ جب جب سوچتا۔ اس کی رگوں میں شرارے سے ناچ اٹھتے۔ دو دنوں میں اس نے صرف رات کے چند گھنٹے گھر میں بتائے تھے۔ وہ بھی اس طرح جیسے بستر پر اس کے برابر میں کوئی عورت یا اس کی بیوی نہیں۔ انسانی روپ میں کوئی اچھادھاری ناگن لیٹی ہے۔ ذرا جو اس نے گردن گھمائی یا کروٹ بدلنے کی کوشش کی تو ناگن اس کے وجود سے لپٹ کر اسے خاکستر کرڈالے گی۔
یہ دو دن اس نے جس طرح خاموشی سے گزارے تھے۔ صرف اس لیے کہ وہ شاید نائلہ کا خون اپنی گردن پر نہیں لینا چاہتا تھا۔ ورنہ غصے کی شدت تو اتنی تھی کہ جی چاہتا کہ پہلی فرصت میں اس کا گلا دبا کر قصہ ختم کرے۔
دو دن کے ضبط اور برداشت کا سبب بھی شاید صرف اتنا ہی تھا کہ جلدی تھوڑا نیچے اتر آئے۔ یہ اس کی شرافت اور انسانیت تھی کہ اتنے شدید غصے کے باوجود وہ نائلہ سے ٹھنڈے دل ودماغ کے ساتھ بات کرنا چاہتا تھا۔
وہ نائلہ کے دل کی بات جاننا چاہتا تھا۔ وہ اس رشتے کو بنانے کے لیے یقینا" خود حدید کی طرح ہی دل سے رضا مند نہیں تھی۔ لیکن اب وہ اس رشتے کو نبھانے کے لیے بھی رضا مند تھی یا نہیں۔ اس کے دل میں کیا تھا۔ اس کے دماغ میں کیا چل رہا تھا۔ اس کے ارادے جاننے کے لیے خود پر قابو پانا ضروری تھا اور وہ کس جدوجہد سے خود پر قابو پانے جیسی آزمائش سے گزر رہا تھا یہ وہ خود ہی جانتا تھا۔
آفس سے چھٹی لینا بھی بے کار تھا۔ اس کے اور انس کے دوست مشترکہ تھے اور معاملہ ایسا تھا کہ کسی سے بانٹا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ بے حد کوششوں کے بعد اس نے حاضر دماغی سے آفس میں اپنا دھیان لگانا شروع کیا تھا۔ یوں بھی یہ جگہ ایسی تھی جہاں بجن نہ ہونے کے برابر اور دشمن جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے۔ گھاگ اتنے کہ اڑتی چڑیا کے پر گن لیں اور بناوٹی اتنے کہ ان سے بڑھ کر کوئی ہمدرد نہیں۔
حدید نے اپنا کردار ہمیشہ بہت صاف ستھرا اور غیر جانبدار ہی رکھا تھا۔ اب اس ناپسندیدہ عورت کے لیے وہ خود پر کوئی داغ دھبا برداشت کرنے کا اہل نہیں ہوسکتا تھا۔
ایک گہرا سانس لے کر اس نے کمپیوٹر اسکرین پر سے نظریں ہٹائیں اور ذرا سختی سے بند کرکے کھولیں۔

مسلسل روشنی پھینکتے اسکرین پر نظریں گاڑنے سے آنکھوں میں ترمرے سے ناچنے لگے تھے۔
ذہنی رو بھٹکتی ہوئی آکر واپس اپنی جگہ ٹھہری تو دیر سے وائبریشن پر لگے سیل فون کی تھرتھراہٹ نے توجہ کھینچ لی۔
وہ چونکا ضرور۔ لیکن فون ریسیو نہیں کرسکا۔ ایسا بھی پہلی بار ہی ہوا تھا کہ ایک شہر اور ایک گھر میں ہوتے ہوئے اس کا اور انس کا مسلسل دو دن سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی وہ خود کو بھی اس قابل نہیں پا رہا تھا کہ بشاش لہجے اور آواز میں انس سے بات کرسکتا۔ انس یقینا" کھٹک جاتا۔ اس کی نوکری جاچکی تھی۔ وہ پہلے ہی پریشان تھا۔ اور آج ہی حیدر آباد کے لیے نکل رہا تھا۔ اسے فیصلہ کرنے میں چند لمحے ہی لگے ہوں گے۔
"بعد میں خود فون کرکے تسلی سے تفصیل سے بات کرلوں گا۔"
دل ہی دل میں بول کر اس نے پہلے لائن کاٹی پھر' فون ہی آف کردیا۔ یہ سوچے بغیر کہ انس کو تشویش میں ڈالنے کے لیے یہ حرکت بھی کافی تھی۔

☼ ☼ ☼

"پرائیویٹ نوکری کرتا ہے لڑکا۔"
اماں فون پر نائلہ سے بات کررہی تھیں۔ قریب ہی عفت سپاٹ چہرہ لے کر بیٹھی۔ ابا کے سر میں تیل کی مالش کررہی تھی۔ ابا بہت عرصے بعد اس طرح فرمائش کرکے عفت سے مالش کروانے بیٹھے تھے۔ تبھی اماں ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر وہیں بیٹھ کر نائلہ کو فون کر بیٹھیں۔ خود نائلہ کو تو اماں کو فون کرنے یا گھر آنے کا خیال ہی نہیں تھا۔
اماں ہی بے چاری اس کی فکر کرتی تھیں۔ یا کبھی کبھار ابا یاد کرلیتے تھے۔
"تعلیم بھی اچھی ہے۔ چودہ جماعتیں..... ہاں ہاں وہی گریجویٹ (گریجویٹ) ہے۔"
اماں بے حد شوق سے نائلہ سے ذکر کررہی تھیں۔ پتا نہیں نائلہ کے تاثرات کیسے تھے۔ کیا وہ خوش ہوگی۔ یا افسردہ.... لیکن افسردہ کیوں ہوگی۔ ہاں ہو بھی سکتی ہے۔ عفت کی ذہنی رو' اس کی انگلیوں کی طرح ہی کچھ کچھ ادھر سے ادھر پھدک رہی تھی۔
ایک سچائی جس سے وہ دونوں بہنیں یا شاید وہ تینوں وہ' نائلہ اور حدید بھی واقف تھے۔ کسی پیپ زدہ پھوڑے کی مانند ان کے درمیان اگ آئی تھی۔ جس سے کراہیت بھی آتی تھی۔ لیکن علاج کے لیے اس کی طرف دیکھنا بھی ضروری تھا۔ حدید اور اس کے ایک دوسرے کی طرف جھکاؤ سے ان دونوں کے علاوہ نائلہ بھی واقف ہی تھی۔
اب اس کی شادی کی بات اس کے لیے باعث خوشی ہی ہوگی۔ اگر اس نے دل سے حدید کو اپنا لیا تھا اور ایک وفا شعار بیوی کی طرح حدید کے دل میں گھر کرنے کی کوشش کررہی تھی تو عفت کی شادی پر خوشی محسوس کرنا بھی اسی کا ایک حصہ ہوسکتا تھا۔ کیونکہ اسے عفت سے نامحسوس سا خوف تو بہرالحال محسوس ہوتا ہی ہوگا۔ یہ بھی اس کی وفا شعاری ہوتی کہ شوہر سے ماضی میں دلچسپی رکھنے والی لڑکی اور وہ بھی سگی بہن کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کرنا اور کامیاب ہونے پر خوش ہوتا۔
"ہیں..... کیا کہہ رہی ہو۔"
اماں جملہ تفصیلات بمعہ اس کی پہلی شادی اور ایک بچے کے نائلہ کے گوش گزار کرچکی تھیں۔
"اے لو۔ یہ کیا۔"
انہوں نے فون کانوں سے ہٹا کر اچنبھے سے فون کو اور پھر ابا کو دیکھا۔
"آدھی پونی بات سن کر کچھ بھی کہے بغیر فون بند کردیا۔"

"چلو کسی کام میں مصروف ہو گی۔"

"ارے ایسی بھی کیا مصروفیت۔ اس سے بات نہیں کروں گی تو اور کس سے کروں گی۔ خیر۔۔۔" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر مسہری سے پیر نیچے لٹکائے۔

"یہ بھی اچھا ہی ہوا ورنہ میں تو سمجھ رہی تھی کہ دوہا جو کان سن کر جانے کتنا غصہ کرے گی۔" اماں بات مکمل کر کے باہر چل دیں۔ جبکہ اماں کی بات سن کر ابا کے سر میں تیزی سے چلتی اس کی انگلیوں کی رفتار دھیمی پڑ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ بے حسی سے موبائل فون کی ٹیون سن رہی تھی۔

امی کچھ دیر کے لیے نیچے گئی تھیں تائی امی کے پاس۔ عفت کے رشتے کے لیے کچھ لوگ آنے والے تھے سنا تھا۔ اچھا گھرانہ اور معقول رشتہ تھا لیکن لڑکے کی ایک شادی پہلے بھی ہو چکی تھی۔

"بے چاری عفت۔۔۔ پتا نہیں کیسے۔۔۔"

"ماہا!" امی کی آواز سے اس کی سوچیں ادھوری رہ گئیں۔

"کب سے فون بج رہا ہے۔ میں سیڑھیوں سے آواز سنتی ہوئی آئی ہوں۔"

"جی۔" وہ بے طرح چونکی اور اپنی غیر حاضر دماغی کی گہرائی پر خود بھی دم بخود رہ گئی۔

"امی وہ کوئی رانگ نمبر ہے بار بار تنگ کر رہا ہے۔" اس نے فون ہاتھ میں لے کر اپنی بات کی سچائی ثابت کرنے کے لیے زور سے بٹن دبا کر لائن کاٹ دی۔

"آپ بتائیں ہو گئی بات تائی امی سے۔ کیا کہا انہوں نے۔"

"کیا کہیں گی وہ بے چاری۔"

ماہا کی بات پر ان کا دھیان فی الفور فون سے ہٹ عفت کے لیے آنے والے رشتے کی طرف چلا گیا۔ وہ تھکی ہوئی نہیں تھیں۔ لیکن ان کے لہجے اور انداز میں بے نام سی تھکن اتر آئی۔

"بظاہر تو کوئی خرابی نہیں لگ رہی اب یہ تو گھر والوں سے مل کر پتا چلے گا کہ فیملی کیسی ہے۔"

"پیسے والے ہیں۔" وہ بغور امی کا مایوس لہجہ سن رہی تھی۔

"بتا تو رہی تھی رشتے والی۔"

"بس تو اگر پیسے والے ہیں تو سمجھ لیں کہ آدمی برائیاں تو یوں ہی چھپ جائیں گی۔"

"ہاں بھیا آج کل کا چلن بھی خوب ہے۔ چوڑے چمار بھی خاندانی بنے بیٹھے ہیں۔ دولت کے بل بوتے پر۔ اور جو خاندانی اور شریف لوگ ہیں۔ ان بے چاروں کو غربت کی وجہ سے کوئی پوچھتا نہیں۔"

امی نے پیر اوپر کیے اور دیوار سے نکا کر رکھے تکیے کو سیدھا کر کے لیٹ گئیں۔ ماہا چند لمحے کسی سوچ میں ڈوبی رہی۔ پھر چونک کر انہیں دیکھا۔

"عفت سے بات کی آپ نے کیا کہتی ہے وہ۔"

"وہ کیا کہے گی۔ جو ماں باپ کی مرضی ہو گی۔ اس پر سر جھکا دے گی۔"

"اللہ کرے لڑکا بہت ہی اچھا ہو۔" ماہا کے دل سے بے ساختہ ایک دعا نکلی اور لبوں تک آ پہنچی۔

"آمین۔ اللہ کرے ہر لحاظ سے ہی اچھا ہو مگر۔ خالی لڑکے سے کیا ہوتا ہے۔ جب لڑکی بھرے پرے گھر میں جاتی ہے تو سب سے ہی سابقہ پڑتا ہے۔ اللہ بچی کے نصیب اچھے کرے۔" ماہا امی کے چہرہ دیکھتی ان کی بات سن کر کھو گئی۔

جانے کتنی دیر خاموشی چھائی رہی۔ ماہا کی نگاہیں۔ امی کے چہرے سے ہٹ کر یہاں وہاں بھٹکنے لگیں۔ انداز سے صاف ظاہر تھا کہ ذہن اور نظروں میں کوئی مطابقت نہیں۔ آنکھیں دیکھ کچھ اور رہی تھیں۔ اور ذہن سوچ کچھ اور رہا تھا۔ (میں تو بھرے پرے خاندان میں نہیں گئی تھی۔ لیکن۔) ادھر ادھر سے ہوتی ہوئی اس کی نگاہیں پھر امی کے چہرے پر آن ٹکیں۔

"کتنی کمزور ہو گئیں ہیں امی! بے چاری۔ سارا دن اکیلی ہی گھر کے کاموں میں لگی رہتی ہیں۔ اوپر سے میں یہاں ہوں تو۔۔۔" اس کی سوچوں کو بریک لگا۔ فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجنے لگی تھی۔ اس نے جلدی سے امی کی نیند ٹوٹنے کے خوف سے ریسیو کر لیا۔ دوسری طرف آپی تھیں۔ اس نے سلام کیا۔

"کیا حال ہیں سب خیریت ہے۔" وہ جواب دے کر پوچھنے لگیں۔

ماہا کو ان کا لہجہ کچھ غیر معمولی سا لگا۔ پہلا خیال یہی آیا کہ شاید حسیب نے اس کی شکایت لگائی ہے۔ دل میں ایک دم ہی بے زاری ابھرنے لگی۔

"جی سب خیریت ہے۔ اللہ کا شکر۔"

"اچھا۔ وہ میں حسیب کا فون ملا رہی ہوں۔ کافی دیر سے مگر آف جا رہا ہے۔"

"اچھا۔" اسے ایک دم ہی یاد آیا کہ اس نے گھر آتے ہی حسیب کا فون ملایا تھا تو وہ تب بھی آف تھا۔

"ہاں تم سے کانٹیکٹ ہو تو بتا کرنا۔"

"اوکے۔"

وہ شاید جلدی میں تھیں۔ زیادہ لمبی بات نہیں کی۔ ماہا نے فون بند کر کے امی کو دیکھا۔ ان کا تنفس ہموار تھا۔ اور وہ نیند میں جا چکی تھیں۔

"خیریت تو ہے۔ آج امی اس وقت سو گئیں۔"

اجالے کو اپنی آغوش میں سمیٹتے اندھیرے اور اذانوں کی آوازوں پہ اس نے کھڑکی سے باہر نگاہ دوڑا کر جو آخری بات سوچی وہ یہی تھی۔

☼ ☼ ☼

آپریشن تھیٹر کی سرخ بتی گھنٹوں سے جل رہی تھی۔ اندر موجود شخص جو کوئی بھی تھا۔ اس وقت تو انہیں انتہائی عزیز ہو چلا تھا۔ کیونکہ ہاسپٹل پہنچتے ہی ڈاکٹر نے فی الفور آپریٹ کرنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ کیس پولیس کا تھا۔ اور جتنی دیر میں پولیس پہنچی۔ وہ بے چارے مسلسل دبی آواز اور مضطرب لہجے میں ڈاکٹرز کی منتیں ہی کرتے رہے۔ مریض کی حالت بے شک نازک تھی۔ اور پولیس کے آتے آتے اور نازک ترین ہو چلی تھی۔ لیکن نہ پولیس کو اس کی حالت سے سروکار تھا۔ نہ ڈاکٹرز کو کوئی جلدی تھی۔ ہاں اگر کوئی احساس کرنے والا تھا تو وہ خود ہی تھے۔

خدا خدا کر کے پولیس آئی۔ رپورٹ درج کی گئی۔ خود ان کے گرد سوالات اور تفتیش کا دائرہ سب سے تنگ تھا۔ مگر وہ صبر سے برداشت کرتے رہے۔ تمام کارروائیوں سے نمٹنے کے بعد جب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا ہی چاہتا تھا۔ تب لب مرگ اس شخص کو آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔ جبکہ اب ڈاکٹرز اس کی زندگی کے بارے میں زیادہ پرامید نہیں تھے۔ خون بہت زیادہ بہہ جانے کے سبب اس کی زندگی کے چانسز کم اور موت کے زیادہ تھے۔

ٹیکسی ڈرائیور جس کی موت کی تصدیق اسپتال لانے سے ہی پہلے لوگوں کے ذریعے کر دی گئی تھی۔ اس کے لواحقین روتے پیٹتے آ کر اس کی میت کو لے جا چکے تھے۔ اب وہاں رہ گئے تو وہ خود یا ان کا پی اے۔ جو کئی بار کالز کر کے ان سے بات کرنے میں ناکام ہو کر ان کی گاڑی میں لگے ٹریکر کے ذریعے ان تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا۔

تب سے اب کئی گھنٹے گزر جانے کے باوجود وہ ان کے ساتھ ہی تھا۔ اور دل میں ہزار خواہش رکھنے کے باوجود ان سے گھر جانے کے لیے نہیں کہہ سکا تھا۔ خدا خدا کر کے آپریشن تمام ہوا۔ ڈاکٹرز نے باہر آکر لواحقین کو تلاش کیا۔ وہ بے تابی سے لپک کر گئے۔

"کیا ہوا ڈاکٹر صاحب۔ وہ بے چارہ بچ تو گیا ناں۔ اب ٹھیک ہے۔ آپریشن کامیاب ہو گیا۔" ان کے لبوں سے سوالات کے پنچھی بے تابی سے پھڑپھڑاتے ہوئے نکلے۔ ڈاکٹر نے ایک گہری سانس بھری۔ ان کے پاس کوئی امید افزا خبر نہیں تھی۔ مغیث حسن نے بمشکل دیوار تھام کر خود کو لڑکھڑانے سے روکا تھا۔

☼ ☼ ☼

انس کیا گیا تھا۔ در و دیوار سے لے کر موسم، چار دیواری اور اس کا اپنا جیتا جاگتا وجود سب ہی کچھ ایک بے نام سی اداسی کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ اس نے شاید زندگی میں اس سے پہلے کبھی اتنی اداسی محسوس نہیں کی تھی۔ یا شاید یہ انس کی اس محبت بھری رفاقت کا اثر تھا۔ جو پچھلے چوبیس گھنٹوں میں اسے میسر رہی۔ دونوں دنیا جہان کی فکریں بھلا کر ایک دوسرے میں ہی گم رہے۔ یہاں تک کہ اس گھر میں موجود باقی دو نفوس کو بھی۔

اب جبکہ وہ چلا گیا تھا۔ اور سوہا کو علم تھا کہ شام تک انتظار کرنے کے بعد بھی یہ کمرہ اس کے وجود کی رونق سے آباد نہیں ہو گا۔ اسے یہ تنہائی اور خاموشی کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھی۔ کچھ خیال آنے پر اس نے ماہا کو کال کی۔ لیکن کافی دیر بلکہ بار بار بیل جانے پر بھی اس نے فون ریسیو نہیں کیا۔

وہ اس بات سے یکسر انجان تھی کہ ماہا آج صبح ہی صبح امی کے گھر واپس آچکی ہے۔ وہ یہ تصور کر رہی تھی کہ ماہا حسیب کے ساتھ ہے۔ اور اس قدر مگن ہے کہ خیال تک نہیں کہ اپنا سیل فون اٹھا کر دیکھ لے کہیں کسی کی کال تو نہیں آرہی۔ یقیناً "سائلنٹ" پر رکھا ہو گا۔ جب ہی ریسیو نہیں کیا۔

اس نے از خود ہی ساری باتیں فرض کر لیں۔ جو کہ ظاہر ہے خوش خیالی ہی تھیں۔ پھر بے زاری سے فون پٹخ دیا۔ انس سے بات ہو چکی تھی۔ اب بار بار فون کر کے اسے ڈسٹرب کرنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"نائلہ کو دیکھتی ہوں کیا کرتی رہی ہے سارا دن اکیلے۔ کچھ کام میں ہاتھ ہی بٹا دوں۔"

خود سے کہتے ہوئے اس نے کمرے سے باہر قدم نکالا اور سیڑھیاں اترنے لگی۔

عام حالات میں وہ اس طرح خود سے نائلہ کے پاس جانے کا تصور تک نہیں کر سکتی تھی۔ بلکہ شادی کے بعد سے وہ نائلہ کے مزاج سے ٹھیک ٹھاک خوف کھانے لگی تھی۔ نائلہ کا موڈ اگر خراب ہوتا تو وہ اس سے بدتمیزی کرنے میں اور اسے جھڑکنے میں دیر نہیں کرتی تھی۔ لیکن اب کی بات اور تھی۔

کل جس طرح وہ اس کے گلے لگ کر روئی تھی۔ اور جس طرح اس نے اپنی تنہائی کا شکوہ کیا تھا۔ اس سے سوہا کے دل میں نہ صرف خود بخود گنجائش پیدا ہو گئی تھی بلکہ دل میں اس کے خلاف موجود بہت سارے گلے شکوے اپنی موت آپ مر گئے تھے۔

آخری سیڑھی سے نیچے والے فلور پر قدم رکھتے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے گھر میں خود اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ نیچے پورا گھر اس قدر خالی اور خاموش پڑا تھا جیسے یہاں کسی زندگی کے آثار ہی نہیں۔ لمحے بھر کو اسے خوف سا محسوس ہوا۔ پھر اپنے پاگل پن پہ خود کو اس نے جھڑک دیا۔

"واش روم میں یا اپنے بیڈ روم میں ہو گی نائلہ جائے گی کہاں۔"

کچن بالکل خالی اور صاف ستھرا تھا۔ یقیناً" وہاں بھی کافی دیر سے قدم نہیں رکھا گیا تھا۔ سامنے ہی لاؤنج تھا۔ خالی لیکن صاف ستھرا۔ سجا بنا۔ دائیں طرف حدید کے بیڈ روم کے دروازہ نیم وا تھا۔ اس نے دھیرے سے آواز دی

لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے قریب جا کر دروازے کو ہلکے سے دھکیلا۔

نائلہ سامنے ہی کھڑی تھی۔ لیکن دروازے کی طرف پشت کر کے۔ سوہا نے بے اختیار ایک گہری اطمینان بھری سانس لی۔ دل میں جو ایک عجیب سی بے چینی لاحق تھی اس کا خاتمہ ہوا تھا۔

"نائلہ! اب کی بار اس نے ذرا زور سے پکارا۔ نائلہ بری طرح چونک کر بلکہ کسی حد تک خوف زدہ ہو کر پلٹی۔

اس کے اس طرح ڈر جانے پر سوہا یقیناً" حیران ہوتی لیکن اسے حیران ہونے کی مہلت نہیں ملی۔ وجہ تھی نائلہ کی دگرگوں حالت۔ اس کے ہاتھ میں موبائل تھا۔ اور آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ بال اجڑے بکھرے اور کپڑے بے حد گندے مسلے ہوئے تھے۔

نائلہ کیا ہوا۔ کس سے بات کر رہی تھیں۔ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔" سوہا خود بھی گھبرا گئی۔

نائلہ جواب دینے کے بجائے عجیب خالی خالی سپاٹ نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ سوہا کو وہ اس لمحے بالکل کوئی مجہول۔ سودائن لگی۔ خبط الحواس۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو مجھے۔ نائلہ۔" وہ آگے بڑھ کر نائلہ کے کندھے پر ہاتھ رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے رد عمل نے باز ہی رکھا۔

"ہیں؟۔" وہ جیسے گہری نیند سے جاگی۔ "نہیں بس۔ کچھ نہیں۔"

اس نے جلدی جلدی آنکھیں رگڑیں۔ اور پلٹ کر موبائل کو ہاتھ اونچا کر کے الماری کے اوپر رکھ دیا۔ سوہا نے بطور خاص اس کا یہ عمل نوٹ کیا۔ موبائل کو بھلا خود سے اتنا دور رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جیسے بچوں کی پہنچ سے دور رکھ رہی ہو۔

"تم رو رہی تھیں۔ لیکن کیوں۔"

اسے اندازہ ہو گیا تھا نائلہ اس کی طرف دیکھنے سے گریزاں تھی۔ وہ خود ابھی تک دروازے سے ایک قدم اندر کھڑی تھی۔ نائلہ نے اسے بیٹھنے تک کے لیے نہیں کہا تھا۔ نہ اس کی بات کا جواب دیا تھا۔ دوسری طرف نائلہ کو اس کے اس قدر اچانک آجانے کی رتی برابر امید نہیں تھی۔ جب ہی وہ فوراً" خود کو سنبھال بھی نہیں سکی اور گڑبڑا گئی۔ مزید کسر سوہا کے سوالات نے پوری کر دی۔

"کیا حدید بھائی سے کوئی ناراضی ہے۔"

اس نے خود ہی اندازہ لگایا کہ شاید نائلہ اپنی اور حدید کے ذاتی مسئلے کو ڈسکس نہیں کرنا چاہتی۔ اور اس کے اندازے نے نائلہ کی مشکل آسان کر دی۔ اس نے خود کو سنبھالا اور بڑے ڈرامائی انداز میں اس کی طرف مڑی۔

"ظاہر ہے اور کیا بات ہو سکتی ہے۔"

"اچھا۔ لیکن کیوں کس بات پر۔ وہ تو بہت کول مائنڈڈ ہیں۔"

"یہی تو میری بھی سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیوں۔ بس رات کو دیر سے گھر آنا اور تلخ باتیں کرنا۔ طنز کرنا۔ مجھے نظر انداز کرنا۔ کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں تمہیں۔"

وہ بے بسی سے انگلیاں مروڑنے لگی۔ آنکھیں پھر بھر آئیں۔ سوہا بے اختیار اس کے قریب آئی۔

"اچھا تم رو تو مت۔ اگر تم کہو تو۔ میں بات کروں ان سے۔"

"نہیں نہیں بالکل نہیں۔" سوہا کو اسی جواب کی امید تھی۔

"ایسا نہ ہو وہ تم پر بھی بھڑک جائیں۔ اور مجھ سے اور زیادہ ناراض ہو جائیں۔"

"او کے۔" سوہا اس کے گھبرانے پر اسے تسلی دینے والے انداز میں ساتھ لگا کر بیڈ تک لے گئی۔ پھر اسے بٹھا کر اس کے برابر بیٹھ گئی۔

"میں نہیں کروں گی ان سے بات۔ لیکن ایسے کیسے پتا چلے گا پھر کہ مسئلہ کیا ہے۔"
"شاید آفس کی کوئی پرابلم۔" نائلہ نے آنکھیں پونچھتے ہوئے اندازہ لگایا۔
"ہاں یہی بات ہوگی۔ یاد نہیں۔ جب انس کے آفس میں پرابلم ہوگئی تھی۔ تو وہ کسی طرح چڑچڑے ہوگئے تھے۔"

سوہا نے بے ساختہ ہی انس کا حوالہ دیا تھا۔ اور نائلہ کے دل میں کسی نے چٹکی کاٹ لی۔
"خیر جو بھی مسئلہ ہو، میں خود ہی سولو کرلوں گی۔ تم پریشان مت ہونا۔"
اس کا لہجہ اتنا اچانک بدلہ اور اتنا روکھا ہوگیا کہ سوہا دنگ رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اگلی بات کیا کرے۔

"اور اگر اب تم نیچے آہی گئی ہو تو پلیز رات کا کھانا دیکھ لو۔ میں نے دن بھر بہت کام کیا ہے۔ میں ذرا آرام کروں گی۔"

سوہا کے دل میں اس کے لیے ہمدردی بھرے چند جذبات جو کچھ منٹ پہلے کی پیداوار تھے۔ یکایک ہی فضا میں اڑنچھو ہوگئے۔

اس کے دونوں بازو ڈھیلے ہو کر لٹک سے گئے۔ کھانا بنانا اور وہ بھی صرف تین لوگوں کا کوئی اتنا بڑا کام نہیں تھا۔ لیکن نائلہ نے ہمیشہ کی طرح اسے پل میں پرایا کردیا تھا یا شاید اس کی اوقات یاد دلادی تھی۔
وہ مڑکر تیزی سے باہر نکل گئی۔ مزید وہاں رکنا یا کچھ اور کہنا اپنی بے عزتی کے مترادف ہی ہوتا۔ اسے جاتا دیکھ کر نائلہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اور الماری پر رکھا ہوا موبائل اٹھایا۔ اس کی آنکھیں ایک بار پھر بھرنے لگی تھیں۔
وہ تیزی سے کال لاگ میں سے ہسٹری ڈیلیٹ کررہی تھی۔ اس کے بعد میسجز ان باکس کی باری تھی۔ جتنی تیزی سے اس کی انگلیاں چل رہی تھیں۔ اس سے زیادہ تیزی سے اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپاٹپ گر رہے تھے۔ اس کے پاس بھیگتے چہرے کو صاف کرنے کی فرصت تھی نہ خواہش۔
"طبیعت نہیں۔ میری قسمت خراب ہے۔" وہ دل ہی دل میں خود سے مخاطب تھی۔

☆ ☆ ☆

رات کے ڈھائی بجے کا وقت تھا۔ گہری رات کا مخصوص سناٹا اپنی کالی چادر کھول کر زمین آسمان کو سمیٹ چکا تھا۔ آسمان پر تاروں کی مہک بے حد مدھم تھی۔ دور کہیں سے کبھی کبھی چوکیدار کے سیٹی بجانے کی تیز آواز پردہ سماعت پر گرتی تو بند کمرے میں سانس لیتے بظاہر سوتے لیکن درحقیقت جاگتے وجود اپنے آپ میں چونک جاتے۔
وہ جانتی تھی وہ جاگ رہا ہے، لیکن ظاہر نہیں کررہا۔ لیکن وہ خود ظاہر کررہی تھی۔ اپنے جاگتے حواس بھی۔ اور اپنا اضطراب بھی۔

باربار کروٹ بدلتے ہوئے وہ ذرا فاصلے پر لیٹے وجود کو باور کرانا چاہتی تھی کہ وہ اس کی اداکاری سے واقف ہے۔ لیکن اس کوشش کا اس پتھر وجود کے اوپر کوئی اثر ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جب بے چینی حد سے سوا ہوگئی تو اس نے ایک بار پھر فیصلہ کن انداز میں اس کی طرف کروٹ بدلی۔ اور بے حد دھیرے سے اپنا ہاتھ رخ پھیر کر لیٹے ہوئے حدید کے بازو پر رکھا۔
ایک فقط ایک لمحہ یا اس سے بھی کم وقت لگا تھا۔ اور حدید نے اپنا بازو یوں جھٹکا جیسے اس پر کوئی زہریلا پتنگا آن بیٹھا ہو۔
نائلہ اپنی جگہ پر سن سی ہوگئی۔

حدید نے صرف ہاتھ نہیں جھٹکا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھا تھا۔ اور اب انتہائی شعلہ بار نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ اس قدر نفرت، اتنا غصہ اور ایسی چنگاریاں ان آنکھوں سے پھوٹ رہی تھیں کہ نائلہ کو لگا اس کا وجود وہیں پڑے پڑے چند لمحوں میں خاکستر ہوجائے گا۔ اس میں حرکت کرنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ نہ اتنی ہمت تھی کہ اپنی نظریں اٹھا کر وہ چہرہ ہی دیکھ لے۔
اس نے نظریں جھکائے اپنے ڈوبتے دل کو سہارا دے کر ایک بار پھر دایاں ہاتھ اٹھا کر حدید کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی۔ اب کی بار اس نے پہلے سے زیادہ زور سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔
"تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھے ہاتھ لگانے کی۔"
وہ دبی آواز میں غرایا۔
نائلہ کو اپنی ہتھیلیوں سے پسینہ پھوٹتا محسوس ہوا۔
اس کے پاس حدید کے سوال کا جواب نہیں تھا۔ اور اگر ہوتا بھی تو شاید جواب دینے کی ہمت نہ ہوتی۔
"بولو۔ کس کی۔ کس کی اجازت سے مجھے چھوا تم نے۔"
وہ اس کے نزدیک جھک کر اس کے چہرے پر اپنا گرم تنفس پھینکتے ہوئے پھنکارا۔ نائلہ بے ساختہ پیچھے ہٹی۔
"مجھے۔" اس کے حلق سے بیٹھی ہوئی سی آواز نکلی۔ اس نے محسوس کیا گلے میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ آن واحد میں پانی کی طلب جاگ اٹھی تھی۔
"مجھے اجازت کی۔" بات مکمل ہونے تک صرف الفاظ باقی رہ گئے۔ "کیا ضرورت۔" آخری الفاظ صرف لبوں کی جنبش سے ظاہر ہوئے۔
وہ زور سے پیروں پر ڈالی ہوئی چادر اتار کر پٹختے ہوئے اٹھا۔ اور کمرے سے باہر جانے لگا۔ نائلہ کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس کی کوئی بات تک سننے کا روادار نہیں ہوگا۔ وہ خود سے فرض کیے بیٹھی تھی کہ ہمیشہ کی طرح جب وہ اس کو اپنی ذرا سی توجہ سے نوازے گی تو وہ سب کچھ بھول بھال کر پھر سے پہلے جیسا ہوجائے گا۔ لیکن اس بار ایسا نہیں ہوا۔
اسے یوں کمرے سے جاتا دیکھ کر اس کے نیم مردہ تن میں جانے کہاں سے کون سی زندگی جاگی کہ وہ خود بھی ایک دم سے بیڈ سے اتر کر اس کے پیچھے لپکی۔ اور بند دروازے سے دو قدم پہلے اس کا بازو تھام کر اسے روک لیا۔
"چاہے آپ مجھ سے جتنے بھی خفا ہوجائیں۔ لیکن کمرے سے باہر مت جائیں۔ خدا کے لیے ایک بار صرف ایک بار میری بات سن لیں۔"
حدید نے ایک بار پھر اپنا بازو جھٹک دیا۔
"ہمارے درمیان کہنے سننے جیسا کوئی رشتہ نہیں۔ بہتر ہوگا تم یہ خیال ہی دل سے نکال دو کہ اب میں تمہاری کوئی بات سنوں گا۔"
اس کی آواز دھیمی لیکن بے حد ہموار تھی۔ اور شاید اتنی بے رحم بھی۔
"نہیں حدید! آپ ایسا نہیں کرسکتے۔ پلیز پلیز۔ خدا کے لیے صرف ایک بار میری بات سن لیں۔ مجھے اپنے رویے کی بدصورتی کا احساس ہوگیا ہے۔ میں۔"
وہ یکایک ہی دروازے اور اس کے درمیان حائل ہوئی تھی۔ حدید کو اس سے اتنی ہمت کی امید نہیں تھی۔ یا شاید اتنی جلدی جھک جانے کی امید نہیں تھی۔ مگر بہرحال اس کے اندر اٹھتے اشتعال کے بگولے یوں ذرا سی اشکوں کی بوندا باندی سے بیٹھنے والے نہیں تھے۔ یہ آندھی شاید ہر چیز کو خود میں سمو کر ہوا برد کرنے والی تھی۔ امید، آرزوئیں، خواب اور شاید۔۔۔ یہ رشتہ بھی۔

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ حدید نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر شدت سے برابر میں جھٹک دیا۔ وہ اس بری طرح لڑکھڑائی کہ برابر میں رکھے صوفے کے کونے سے اس کا سر لگتے لگتے بچا۔ وہ لمحے سے بھی کم وقت میں انتہائی جارحانہ انداز میں دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔ لیکن لاؤنج میں پڑے صوفے پر چادر تان کر سوتی سوہا کو دیکھ کر ذرا کی ذرا ٹھہرا۔ گہری سانس بھری پھر سیدھا کچن کا رخ کیا۔

نائلہ نے باہر آکر سوتی ہوئی سوہا کو دیکھا۔ پھر ایک نظر غٹا غٹ پانی کا گلاس چڑھاتے حدید کو' سوہا کی موجودگی میں وہ بھلا کیا کر سکتی تھی۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ کہنا اس کے آگے اپنا تماشا بنوانے کے مترادف ہوگا۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کی نیند کس قدر کچی ہوتی اس کا اندازہ اس کے کسماتے وجود سے لگایا جا سکتا تھا۔

اس نے انتہائی بے بسی کی سی کیفیت میں حدید کو سیڑھیاں پھلانگ کر چھت پر جاتے دیکھا۔ اور بھرپور جسم میں سرائیت کرتی ایک بے نام سی تھکن کو محسوس کیا۔ واپس کمرے میں قدم رکھتے سمے' اسے یکایک ہی اپنا وجود اور اپنی زندگی سب بالکل بے کار معلوم دے رہا تھا۔

دھڑ سے بیڈ پر بیٹھ کر اس نے دونوں ہاتھوں میں سر گرا لیا۔

☼ ☼ ☼
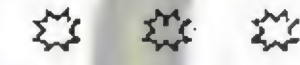
بہت عرصے کے بعد گھر میں ایک بار پھر رونق سی جاگ گئی تھی۔ بلکہ نچلے حصے میں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ چہل پہل اور خصوصی صفائیاں تو بس شادی اور ولیمہ کے دنوں میں ہی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد تو جیسے خوشیوں اور رونق نے نچلے پورشن سے منہ موڑ کر سیدھا سیڑھیوں کا رخ کرنا شروع کر دیا تھا۔

نائلہ کی شادی کے وقت بھی اس قدر خاموشی اور سادگی تھی کہ ذرا مزا نہیں آیا تھا۔ اوپر سے خود نائلہ کی عجیب و غریب کیفیت اور اس سے بھی زیادہ اس کا کاٹ کھانے والا مزاج ماہا اور سوہا کو اس سے دور ہی رکھتا تھا۔ لیکن آج معاملہ ذرا الگ تھا۔ ماہا نے خود عفت کے ساتھ مل کر پورے دل سے لگ کے پورے گھر کی نہ صرف صفائی کی۔ بلکہ صفائی سے فارغ ہونے کے بعد مہمانوں کی آنے میں جب ذرا وقت تھا تو عفت کو بھی رگڑ ڈالا۔ اس کے نہ نہ کرتے کرتے بھی آدھا پونا فیشل تو ہو ہی گیا تھا۔ رہی سہی کسر بلیچ کریم نے پوری کر دی۔

حسیب سے ناراضی اور پھر اس کے فون نہ کرنے کی خفگی اپنی جگہ لیکن عفت۔ اس نے ہمیشہ ہر موقع پر ان دونوں بہنوں کا بڑھ کر ساتھ دیا تھا۔ جو اپنائیت عفت کے وجود سے پھوٹتی تھی۔ وہ نائلہ کے آس پاس بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

"ارے واہ لو! یہ کیا بات ہوئی۔ لڑکی کی بہن ہو تم۔ کیا پتا وہ لوگ ملنا چاہیں اور نہ بھی ملنا چاہیں۔ تو آج ویسے بھی تمہیں ہونا ہی چاہیے۔ پہلی بار تو آ رہے ہیں۔ وہ لوگ۔"

وہ ایک بجھی بجھی مسکراہٹ سے آئینے میں اپنی پشت پر کھڑی ماہا کا عکس دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ جب اماں کی آواز کانوں میں پڑی۔ ماہا کا ردعمل اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔

"کیا۔ نائلہ آ نہیں رہی۔" اس نے حیرت سے عفت سے سوال کیا تھا۔ عفت کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بجھ کر بالکل ہی معدوم ہو گئی۔

"پتا نہیں۔" اس کے لہجے میں ایک بے نام سی اداسی تھی۔

ماہا پیچھے سے گھوم کر ڈریسنگ پر اس کے سامنے آ گئی۔

ایک بات پوچھوں عفت! تم سے۔"

عفت جو بے دلی سے اپنی نظریں جھکا کر کھڑی تھی۔ چونک کر سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ جو سوال ابھی لبوں

تک نہیں پہنچا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں سے پڑھ لیا اس نے۔ تب ہی سر جھکا کر بولی۔

"یہ مت پوچھنا کہ میں خوش ہوں یا نہیں۔"

ماہا کو اس کی ان کہی بات میں حقیقت بولتی محسوس ہو رہی تھی۔

"اگر تم خوش نہیں ہو تو پھر یہ سب کھڑاگ کیوں۔"

اس کی آواز سرگوشی سے ذرا ہی بلند تھی۔ عفت نے جواب نہیں دیا۔ وہ بڑے انہماک سے اپنے ناخنوں پر لہسن کا جوا رگڑ رہی تھی۔ نیل پالش لگانے کی عیاشی کی عادت ہی نہیں تھی۔ ماہا کو جواب کا انتظار تھا بھی نہیں۔ وہ خاموشی سے عفت کے سر جھکائے ہوئے وجود کو سراپا پیر دیکھتی رہی۔

وہ ایک مکمل لڑکی تھی۔ لیکن بھرپور نہیں۔ اس کی تازگی اور جاذبیت یوں لگتا تھا کسی نے چھین لی ہے۔ جیسے زندگی میں رنگ نکال کر صرف سرخ و سیاہ امتزاج پھیرا گیا ہو۔ بھلا۔ بھلا ایسی ایسی بھی کونسی کمی تھی۔ جو ایک اچھی خاصی صورت اور نیک سیرت لڑکی کو یوں بیت جھڑ اوڑھا کر چلی گئی تھی۔ اس کے دل میں خیال کا ایک کوندا سا لپکا۔ وہ بری طرح چونک پڑی۔

"تو گولی کھا کر آرام کر لے۔ حدید بیٹا چلا گیا آفس....." تائی اماں کی آواز ابھی بھی آ رہی تھی۔

ماہا نے کسی نام پر عفت کے ہاتھوں کو رکتے اور پھر لرزتے دیکھا۔

"تو ایک بار کہہ کر تو دیکھ۔ نہیں کرے گا انکار بہت نیک بچہ ہے۔"

وہ جہاں کی تہاں تھم سی گئی۔ اس کے باہم جڑے ہوئے لب وا ہوئے۔ عفت کی پلکوں کی لرزش اور کپکپاتے ہونٹوں نے کسی ادراک کا دروازہ کھولا۔ اور اس کے دل سے نکلی اپنے قیاس کے غلط ہونے کی دعا اس کھلے دروازے کے دوسری جانب سے جھانکتی آگہی کی تاریکی میں گم ہو گئی۔

آگہی۔ ہاں آگہی۔

آگہی جو اجالا بھی ہے اور امید بھی۔ یہی آگہی تیر بھی ہے اور تیرگی بھی۔ عذاب بھی ہے اور آشوب بھی۔ رنجیدگی بھی ہے۔ رہائی اور رحمت بھی۔

اسی آگہی کی تاریکی میں اس نے کمرے کی ہر ایک شے کو دھواں بن کر ہوا میں اڑتے دیکھا۔ صرف ایک عفت کا چہرہ تھا جو اس کی ہستیوں میں نقش تھا۔ اور صرف ایک آواز تھی جو باہر سے آ رہی تھی۔ ایک نام پکار رہی تھی۔ وہ دونوں اس نام کو جانتی تھیں۔ لیکن ماہا کو لگا جیسے اس نے زندگی میں اس سے پہلے نہ یہ چہرہ کبھی ٹھیک سے دیکھا تھا۔ نہ یہ نام ہی سنا تھا۔

"حدید نے کیوں منع کر دیا خیر تو ہے۔"

عفت نے ہاتھ میں پکڑی چیز ڈریسنگ ٹیبل پر ڈالی اور آہستگی سے کھڑی ہو کر مڑی۔ وہ شاید ماہا کی ٹٹولتی کھوجتی نگاہوں میں اترتی الہامی کیفیت کو بھانپ گئی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ ماہا کوئی سوال کرتی وہ خود کو اور اس کو بہلا لینا چاہتی تھی۔ لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔

ماہا نے بے اختیار اٹھ کر اس کا کندھا تھاما۔ وہ پیچھے سے اس کے سامنے آئی۔ اور عفت بے اختیار سے مڑ کر دوبارہ ڈریسنگ کے سامنے جا بیٹھی۔ خود کو چھپانے کی بہت بے ساختہ اور معصوم سی کوشش تھی۔ لیکن ناکام بھی۔

ماہا اس کی اس حرکت پر چند لمحے وہیں کھڑی رہی۔ پھر پشت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ بے حد دھیمے سے۔ بہت ہولے سے اس کے لبوں میں جنبش ہوئی۔

"عفت! کیا تم کسی اور کو....."

آئینے میں دکھائی دیتے عکس نے اپنی نگاہیں جھکا رکھی تھیں۔ اور جب وہ نگاہیں اٹھیں۔ تو ان میں ایک سمندر

بھر اتھا۔ ماہا کا دل ڈوب ڈوب گیا۔ وہ دونوں آئینے میں ہی ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ پھر عفت کے لب ہلے۔

"اب بھلا پوچھنے سے کیا فائدہ۔ اور اب۔ اس نے پلکیں جھکائیں۔ اور سمندر بہہ نکلا۔

"اب بھلا کہنے سے بھی کیا فائدہ۔"

"کون ہے وہ۔ کیا۔ کیا حدید بھائی۔" اس کی سرگوشی نقارے کی چوٹ جیسی لگی۔ عفت تڑپ کر اس کی طرف پلٹی۔

"تمہیں قسم ہے ماہا۔ آج کے بعد میرے سامنے کبھی ان کا نام نہیں لینا۔" ایک گولا سا حلق میں پھنس رہا تھا۔ بات کرنی محال تھی۔ لیکن اسے کہنا تھا۔ ہر حال میں کہنا ہی تھا۔ ماہا نے اپنی گیلی آنکھیں پونچھنے کے بجائے اس کا چہرہ صاف کیا۔ اس کا دل کیوں اتنی تیزی سے بھر آیا تھا۔ اسے خود بھی پتا نہیں چلا۔

عفت بے اختیار ہو کر دونوں بازو اس کی کمر پر باندھے اس سے لپٹ گئی۔ شاید خود اپنی ذات کے زنداں میں جیتے جیتے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اسے روزن کی تلاش تھی۔

☼ ☼ ☼

آنے والی خواتین تصور سے بہت بہتر تھیں۔ سادہ سے کپڑے تھے۔ نہ گہرے میک اپ کی تہیں تھیں، نہ چیختی لپ اسٹکیں، نہ زیور کی بھرمار، نہ نمائش، نہ چبھتے سوالات۔

امی اور تائی امی نے ان سے مل کر بے اختیار ہی سکون کا سانس بھرا تھا۔

"اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمارے گھر میں۔ بس۔ ہاں۔ کمی ہے تو بس اک گھر والی کی۔" انہوں نے ایک گہری ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر سلسلہ کلام جوڑا۔

"ماشاء اللہ سے میری مرحوم بہو بہت شاندار جہیز لے کر آئی تھی۔ گھر بھر دیا تھا۔ حالانکہ ہم نے تو اس کے گھر والوں کو بھی منع کیا تھا۔ لیکن۔"

"خیر اب ان سب باتوں کا کیا فائدہ۔ امی تو بس جذباتی ہو گئیں۔ آپ بلائیں نا! اپنی بیٹی کو۔ کیا نام ہے بھلا۔" یہ لڑکے کی بڑی بہن تھیں۔ بروقت اپنی ماں کو ٹوک کر سنبھالا دیا۔

جی عفت نام ہے میری تایا زاد بہن ہے۔" ماہا نے جلدی سے مسکرا کر بات بڑھائی۔

"ہاں بہن جانے والے چلے جاتے ہیں۔ رہ جانے والے تو بس یاد ہی کرتے رہ جاتے ہیں۔" لڑکے کی ماں ابھی بھی اپنے جذباتی فیز سے باہر نہیں نکلی تھیں۔

"ماشاء اللہ سے ایسے طریقے سے پورے گھر کو سنبھالا تھا اس نے۔ دیکھنے والے مثالیں دیتے تھے اپنی بہو بیٹیوں کو اس کی۔ مجھے تو بس پلنگ پر ہی بٹھا دیا تھا۔"

ان کا بیان مزید جاری رہتا تھا۔ امی اور تائی امی کو اب ایک بے نام سی الجھن سی محسوس ہونے لگی تھی۔

"آنٹی میں عفت کو بلا لاتی ہوں۔" ماہا نے ہی انہیں درمیان میں ٹوک کر احساس دلایا کہ وہ یہاں اپنی بہو کا قصیدہ پڑھنے نہیں بلکہ نئی بہو پسند کرنے آئی ہیں۔

"اور آنٹی ان شاء اللہ آپ عفت کو دیکھ کر کبھی مایوس نہیں ہوں گی۔"

کمرے سے نکلتے نکلتے اس نے اپنے حصے کی کارکردگی دکھانا ضروری سمجھا۔ اس کے نکلنے کے بعد اس کا انٹرویو بذریعہ امی شروع ہوا۔

"یہ کون لڑکی ہے۔ اچھا اچھا۔"

"شادی شدہ ہے۔" یہ للچایا ہوا سوال بہن کی جانب سے آیا تھا۔

ماہا کا ظاہری حلیہ اپنے شوہر کے اچھے مالی حالات کی چغلی کھاتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے ایک قیمتی سوٹ کے ساتھ کانوں میں سونے کے ٹاپس اور ہاتھوں میں نقلی لیکن بے حد نفیس کڑے کا سیٹ پہن رکھا تھا۔ ہلکے میک اپ اور سلیقے سے بنے بالوں میں اس کے انگ انگ سے نو بیاہتاؤں والا دلہناپا جھلک رہا تھا۔ بچے نہ ہونے کی وجہ سے اس کے متناسب سراپے میں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ خواتین کی باتوں اور تفتیش سے صاف ظاہر تھا کہ اگر ماہا غیر شادی شدہ ہوتی تو یقیناً "یہ رشتہ اس کی طرف پلٹ چکا ہوتا۔

عفت نے کمرے میں آکر دھیرے سے سلام کیا۔ ماہا اس کے ساتھ اندر نہیں آئی۔ وہ چائے لینے کے لیے دانستہ باہر رک گئی تھی۔

آنے والی دونوں خواتین نے اسے بہت شوق اور اصرار سے اپنے درمیان میں بٹھایا تھا۔ ان کے، عفت کو دیکھ کر کھل اٹھنے والے چہروں سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ انہیں عفت پسند آئی تھی۔

چند ایک رسمی سوالات اور چائے پی کر جب وہ رخصت ہوئیں تو نہ صرف انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دے گئی تھیں۔ بلکہ خود بھی جلد ہی دوبارہ آنے کا عندیہ بھی ظاہر کر گئی تھیں۔

تائی امی نے ان کے جاتے ہی دو رکعت نماز نفل کی نیت باندھ لی۔ عفت نے برتن سمیٹ کر دھونے کے لیے باورچی خانے کی راہ لی۔ اور امی نے اوپر کی۔ البتہ جانے سے پہلے تایا ابو کو تفصیلات سے آگاہ کرتی گئیں۔ تایا ابو کا چہرہ بھی جوش اور خوشی سے تمتما اٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کومے میں چلا گیا وہ۔"

یاور انہیں تھام کر نزدیکی بینچ تک لایا۔ اور وہ اس پر ڈھے سے گئے۔ خود یاور بھی لمحہ بھر کے لیے چپ سا رہ گیا۔

"اوہ میرے خدایا!" مغیث حسن کا انداز بے حد مجرمانہ سا تھا۔

"سر پلیز آپ خود سنبھالیں۔ آپ کی طبیعت نہ بگڑ جائے کہیں۔"

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔"

چند لمحے گزرے۔ یاور تشویش سے انہیں دیکھتا رہا۔ اس کے ٹیچر اور باس مغیث حسن کی پریشانی اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ وہ کسی بھی شخص کے جانی یا مالی نقصان پر اسی طرح پریشان اور افسردہ ہو جاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو بے حد سخی اور فیاض دل سے نوازا تھا۔ اور جس قدر خلوص دل سے وہ خلق خدا کے کام آتے تھے۔ اسی قدر فیاضی سے انہیں رب تعالیٰ، موقع بھی فراہم کر رہا تھا اور سہولت بھی۔

ان کے تقریباً" ہر اسکولز میں ایسے غریب لیکن ذہین طلبا زیر تعلیم تھے۔ جن کے والدین محدود آمدنی اور وسائل کی وجہ سے انہیں تعلیم دلانے سے قاصر تھے۔

بظاہر ان کی زندگی مکمل تھی۔ عزت، دولت اور شہرت۔ ہر وہ چیز بن مانگے ان کو مل گئی تھی۔ جس کی کوئی بھی شخص تمنا کر سکتا ہے۔ گھر تھا۔ محبت کرنے والی شریک حیات تھیں۔ نہیں تھی تو بس ایک اولاد نہیں تھی۔

سالہا سال انتظار اور ڈھیروں کوششوں کے بعد اب انہوں نے خود کو جو اللہ کی مرضی کہہ کر سمجھا بجھا لیا تھا۔ لیکن ایک دعا تھی۔ جس کا دامن آج بھی وہ اور ان کی بیگم تھامے بیٹھے تھے۔

"سر! آپ ٹھیک ہیں سر۔"

"ہاں ہاں میں ٹھیک ہوں۔"

"تو پھر اب کیا کریں سر میرے خیال میں تو آپ گھر چلے جائیں۔ مزید یہاں رکنا۔۔۔"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس سے دو لفظ "فضول ہے۔" ادا نہ ہو سکے۔

"یہ حادثہ ایئرپورٹ کے نزدیک ہوا تھا۔ اور اس کے ساتھ لگیج بھی تھا۔ تم ایئرپورٹ انکوائری سے پتا کرو۔ کیا پتا اس کے گھر والوں کا کچھ اتا پتا مل سکے۔"

انہوں نے والٹ سے کئی ایک ہرے نیلے نوٹ نکالے۔

اس ٹیکسی ڈرائیور کے ورثاء کو بھجواؤ اور ہاں' جب تک یہ بندہ یہاں زیر علاج ہے۔ اور اس کے گھر والوں کا پتا نہیں چل جاتا۔ اس کے علاج کا خرچہ ہم ہی اٹھائیں گے۔"

☼ ☼ ☼

حقیقت میں وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ عفت کا رشتہ طے ہو جانے پر کیا محسوس کر رہی تھی۔ بلکہ اس کے لیے تو یہ کہنا کیا سوچنا ہی مشکل تھا کہ اس کا ذہن اپنے مسئلے مسائل کے علاوہ بھی کچھ اور بھی محسوس کرنے کے قابل ہے۔

اس کا دماغ تو بس شبیر حسین اور حدید کے درمیان کٹی پتنگ کی طرح ڈولتا رہتا تھا۔ ایک وہ تھا جس کی طرف وہ لپکتی تھی اور وہ اسے جھٹک دیتا تھا۔ اور ایک وہ تھا۔ جھٹکنا چاہتی تو جتنا جھٹکا دیتی وہ اتنا ہی اس سے چپکتا جا رہا تھا۔ اور سچ تو یہ تھا کہ یہ شبیر حسین ہی تھا۔ جس کے وقت بے وقت کے میسجز اور فون کالز نے اس کا دھیان اور دماغ ناکارہ کر ڈالا تھا۔

وہ سارا وقت یا تو گم صم بیٹھی رہتی اور کوئی راستہ نہ ملتا تو خود بخود اس کی آنکھیں بہہ نکلتیں۔ مصیبت یہ تھی کہ وہ نہ کھل کر رو سکتی تھی۔ نہ کسی سے اپنا حال بیان کر سکتی تھی۔ اور حدید کی بے اعتنائی بھی برداشت کرتی تھی۔ اس کے اعصاب شل ہونے لگے تھے۔ ایسے میں عفت کے رشتے منگنی یا نکاح پر اس کا ردعمل ویسا نہیں ہو سکتا تھا۔ جیسا ہونا چاہیے تھا۔ وہ چاہ کر بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اور اب تو اس نے چاہا ہی نہ تھا۔ حدید کا رویہ اس قابل ہی نہ تھا کہ اس سے کوئی بھی بات کی جاتی۔ بلکہ شاید وہ خود ہی اس قابل نہ تھی کہ کوئی اس سے بات کرنے کے قابل سمجھتا۔

زندگی میں شاید پہلی بار اس نے خود کو اس قدر تنہا محسوس کیا تھا۔

سوہا نے بھی اس دن کے بعد سے اس سے بات نہ کرنے کی قسم کھالی تھی۔ اوپر سے سیدھی کچن میں آتی۔ کھانا پکا کر پلیٹ میں رکھتی اور اوپر ہی لے جاتی۔ شروع کے ایک دو دن اسے اوپر اکیلے سونے میں ڈر لگا۔ لیکن گزرتے وقت کے ساتھ وہ بھی جاتا رہا۔

جب فارغ رہ رہ کر روہانسی ہو جاتی تو کبھی ماما کو فون کر لیتی۔ نمازیں' تلاوت قرآن کے علاوہ جو وقت بچتا۔ اس میں کبھی ہینڈز فری کانوں میں لگائے گانے سنتی رہتی۔ یا انس کو یاد کرتی۔ یا انس سے ہی باتیں اور میسج چلتے رہتے۔ نائلہ کو خود بھی اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ اس نے سوہا کو ناراض کر دیا ہے۔ لیکن اس نے پہلے کبھی پروا نہیں کی تھی۔ اب اگر کرتی بھی تو وہ سوہا کے لیے حیرانگی کا باعث ہی ہوتی۔

سوہا کی لاتعلقی ایک طرح سے اس کے لیے اچھی ہی تھی۔ اگر وہ اس کے اور حدید کے درمیان تعلق کا تناؤ محسوس کر لیتی تو شاید پھر بات ان دونوں کے درمیان محدود نہ رہتی۔

دن بھر ہر لمحہ ہر منٹ اسے اپنے موبائل فون کا خیال آتا رہتا۔ وہ اسے مستقلاً "بند کر کے بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔ کیونکہ کبھی کبھی اس کی بات اماں یا عفت سے ہو جاتی تھی۔ ایک چھوٹے اور سستے سے موبائل کی سہولت

اس کے گھر تک بھی پہنچ ہی گئی تھی۔

اس وقت بھی یہی ہوا۔

وہ باتھ روم میں بند تھی۔ حدید آفس جا چکا تھا۔ اور سوہا شاید ابھی سو ہی رہی تھی۔ جب باتھ روم میں جاتے ہی سیل فون بجنے لگا۔ اس نے چند منٹ پہلے ہی اماں سے عفت کے سسرال والوں کے بارے میں بات کرنے کے لیے آن کیا تھا کیونکہ اس بار پیغام اماں کے نہیں بلکہ سوہا کی طرف سے موصول ہوا تھا کہ اماں' نائلہ سے ناراض ہیں۔ کیونکہ اکلوتی بہن کی شادی کا معاملہ ہے اور نائلہ خاطر خواہ تو کیا۔ بالکل بھی توجہ نہیں دے رہی۔ نہ اس بات میں ذرا سی بھی دلچسپی لے رہی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ دل و دماغ کو تمام تر اعصاب شکن سوچوں سے آزاد کرنے کے بعد اس نے اس خیال سے فون آن کر کے ڈریسنگ پر رکھا تھا کہ باتھ روم سے نکل کر فون کرے گی۔ اس کے واش روم میں جاتے ہی فون بج اٹھا۔ اس نے لاپروائی سے بجنے دیا۔ اسے معلوم تھا۔ اگر شبو کی طرف سے بھی آیا تو فی الحال اسے ریسیو کرنے والا گھر میں کوئی نہ تھا۔ اور وہ خود اس کی آواز سننا بھی نہیں چاہتی تھی۔

باہر خالی گھر میں فون کی آواز زور و شور سے گونج رہی تھی۔ اور اندر وہ واش بیسن کے سامنے دونوں ہاتھ جمائے فل اسپیڈ سے بہتے پانی پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ کافی دیر بجنے کے بعد فون خاموش ہو گیا۔

اس کے سختی سے بیسن پر جمے ہاتھ اور تنے ہوئے اعصاب لمحے بھر کے لیے ڈھیلے پڑ گئے اس نے یک گونہ سکون سا محسوس کیا۔

کچھ آوازیں کس قدر تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ وہ صرف سماعتوں کو تکلیف نہیں دیتیں۔ وہ کسی زہریلی دوا کی طرح پورے وجود کو مفلوج کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اور ضروری نہیں کہ وہ آوازیں کسی جاندار مخلوق کی ہی ہوں۔ کبھی کبھی ان خطرناک آوازوں کا محرک کوئی بے جان شے بھی ہو سکتی ہے۔ لمحہ بھر کو سکون ملا تھا۔ عارضی تھا۔ لمحہ بھر میں ہی غارت ہوا۔

سوہا واش روم کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔

اس کا رواں رواں کمان میں کسی ڈوری کی طرح تن گیا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

دعائے مغفرت

ہمارے ادارے کے دیرینہ کارکن' ہمارے ساتھی عابد صاحب کے بڑے بھائی محمد صدیق اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ادارہ کرن عابد صاحب کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعاگو ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی خطاؤں کو درگزر کر کے ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے۔ اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

قارئین سے بھی دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

زرنین آرزو

ہار دی ہیں آس تیری

"پھوپھو پلیز مان جائیں اور ہمیں نازو کی طرف جانے کی اجازت دے دیں۔ معلوم ہے نا کہ نازو ہم سب کی مشترکہ اور چہیتی سہیلی ہے۔ اگر آج ہم اس کی بارات میں نہ گئیں تو وہ سخت خفا ہو جائے گی اور ہم میں سے کسی کی شکل تک نہیں دیکھے گی۔" شارمین کب سے چھوٹی پھوپھو کی منتیں کرتے کرتے قدرے روہانسی ہو گئی تھی۔ وہ سب کی سب کوئی گھنٹہ بھر سے تیار تھیں، لیکن چھوٹی پھوپھو سے اجازت مل کر نہیں دے

مکمل ناول

رہی تھی۔ چھوٹی پھوپھو کا موقف بھی درست تھا۔ رات گہری ہو رہی تھی اور اتنی رات کو تنہا لڑکیوں کا اکیلے گھر سے باہر قدم نکالنا قطعی نامناسب تھا۔

"میں اتنی رات کو تنہا لڑکیوں کو گھر سے باہر بھیجنے کے حق میں نہیں۔"

"مگر ہمارا جانا ازحد ضروری ہے۔" چھوٹی پھوپھو کے نفی میں گردن ہلانے پر مانیا کے باقاعدہ آنسو ابل پڑے۔

"ٹھیک ہے اگر تم سب نے ضد باندھی ہے تو پھر زیمان کو میرے پاس بھیجو۔ وہ تمہارے ساتھ جائے گا۔" مانیا کے آنسو چھوٹی پھوپھو کے دل پر گراں گزرے۔ اس لیے انہوں نے ہتھیار پھینکتے قدرے نرم لہجے میں کہا تو شارمین باقاعدہ ان کے گلے لگ گئی اور ایک نعرہ بھی با آواز بلند لگا دیا۔

"سویٹ چھوٹی پھوپھو۔"

"زندہ باد۔" مانیا اور جودت نے مشترکہ آواز نکالی تو چھوٹی پھوپھو مسکرا دیں۔ مانیا، زیمان کو بلانے دوڑ گئی، مگر چند لمحوں بعد ہی گھٹنوں تک منہ لٹکائے واپس چلی آئی۔

"کیا ہوا؟" سب ہی نے بیک وقت پوچھا۔

"وہ گھر پر نہیں ہے۔" مانیا کے حلق سے نکلنے والی آواز پھنسی پھنسی سی تھی۔

"اب کیا ہو گا؟" انوشے بھی تیار ہو کر آ گئی تھی۔ وہ لوگ آج اگر نازو کی بارات میں نہ پہنچیں تو ان کی دوستی خطرے میں پڑ جائے گی اور کم از کم وہ نازو کی دوستی چھوٹنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ نازو نے بے حد اصرار سے ان سب کو کم از کم ہفتہ بھر گھر میں ٹھہرنے کو کہا تھا۔ مگر بزرگوں سے اجازت نہ ملی۔ البتہ انہوں نے یہ وعدہ ضرور کر لیا تھا کہ وہ ہر فنکشن میں وقت سے پہلے پہنچیں گی، مگر آج بارات میں پہنچنے میں ہی انہیں ایک گھنٹہ دیر ہو گئی اور یہ سب ان لڑکوں کے طفیل تھا جو سب کے سب بے کار تھے۔ جن کے اپنے مشاغل اور اپنی مصروفیات تھیں۔ انوشے کو اس بات سے سخت چڑ تھی۔ جب ان مردوں کے پاس ان کے لیے وقت نہیں تو پھر انہیں بھی کیا ضرورت ہے ان پر انحصار کرنے کی۔

"اماں پلیز۔ ہم خود ہی چلے جائیں گے۔ ہم اتنی ڈھیروں لڑکیاں ہیں۔ ہمیں کوئی اٹھا تو نہیں لے جائے گا۔ میں گاڑی ڈرائیو کر لوں گی۔ آخر کب تک ان

X-HWER

مردوں کی محتاج رہیں گی۔ یہ کمپیوٹر کا دور ہے۔ جس میں لڑکیاں' لڑکوں سے آگے نکل چکی ہیں۔'' انوشے کے لہجے میں ازحد بے زاری تھی۔ اس بات پر چھوٹی پھوپھو نے آنکھیں سیکڑ کر اس کی جانب دیکھا اور قدرے مدھم لہجے میں گویا ہوئیں۔

''بیٹا تم ابھی دنیا کی اونچ نیچ سے واقف نہیں۔ جب ہی ایسی کم عقلی کی باتیں کر رہی ہو۔ تمہیں اندازہ بھی نہیں کہ اس معاشرہ میں قدم قدم پر کسی مضبوط سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ عورت لاکھ مضبوط بننے کی کوشش کرے' مگر زندگی کے ناسازگار حالات میں اسے ایک مرد کا سائبان درکار ہوتا ہے۔ اب تم میری ہی مثال لے لو انوشے۔ تمہارے ابا کے گزر جانے کے بعد میں نے تمہیں جس تکلیف اور صبر سے پالا ہے' تم اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں۔'' وہ افسردہ سی ہو گئی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں اپنے شریک سفر سے جدا ہونے کی تکلیف' نمی کی صورت ہویدا ہو گئی تھی۔ ان کا مضمحل چہرہ دیکھ کر انوشے نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

''میں سب جانتی ہوں اماں کہ آپ نے کتنا صبر آزما وقت گزارا ہے۔ مگر پلیز مجھے ان خواتین سے چڑ ہے' جو ہر قدم پر مردوں کے ساتھ کو ضروری سمجھتی ہیں۔۔۔ اب دیکھیے ہمارا نازو کی طرف جانا ضروری ہے اور صرف ان ہی مردوں کی وجہ سے ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ نازو کی اب تک تو رخصتی بھی ہو گئی ہو گی۔'' انوشے نے اس خوف ناک حقیقت کا احساس دلایا۔

''چھوٹی پھوپھو۔'' شارمین ان کے قریب آ گئی۔ ''آپ یوں کریں' آپ ہمارے ساتھ چلیں یا پھر بڑی پھوپھو کو ہمارے ساتھ جانے پر راضی کر دیں۔''

''نہیں۔۔۔ امی نہیں مانیں گی۔'' مانیا نے اس کی تجویز رد کر دی۔

''تو جاؤ' پھر جا کر جرار بھائی کی منتیں کرو۔'' جووت اس ساری بحث سے اکتا گئی تھی۔ سارا وقت فضول کے بحث و مباحثے میں ضائع ہو رہا تھا اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات تھا۔

''کوئی ضرورت نہیں جرار کی منتیں کرنے کی۔''

جرار کے نام پر انوشے کا چہرہ یکلخت گرم ہو گیا تھا۔ اس شخص کے سامنے کسی قسم کی بے بسی اور لاچاری کا مظاہرہ اسے سخت گراں گزرتا تھا۔ اس خاندان کے تمام بزرگوں نے اس شخص کو کچھ زیادہ ہی سر پر چڑھا رکھا تھا۔ جیسے اس گھر کا کوئی کام اس کے مشورے کے بغیر پورا نہیں ہوتا تھا۔ جیسے ہر معاملے میں اس کی موجودگی لازمی تھی۔۔۔ اور۔۔۔

''بری بات ہے انوش۔۔۔ جرار کے معاملے میں کم از کم تمہیں تہذیب کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔'' چھوٹی پھوپھو نے سرزنش کرتے پہلے انوشے کو گھورا اور پھر جووت کی طرف گردن گھماتے بولیں۔

''جاؤ۔۔۔ جووت۔۔۔ تم جیری کو بلا لاؤ۔''

''جی بہتر۔۔۔'' جووت سر ہلاتے باہر نکل گئی۔

''اگر جیری بھائی بھی ہمیں لے جانے کو رضامند نہ ہوئے تو۔۔۔؟'' مانیا نے خدشہ ظاہر کیا۔

''تو کون سا قیامت آ جائے گی۔'' جرار کا ذکر ہو اور انوشے کی زبان میں کھجلی نہ ہو۔ ایسا تو کسی طور ممکن نہیں۔ البتہ اس کا جملہ اندر آتے جرار نے باخوبی سن لیا۔

''قیامت تو نہیں' البتہ طوفان ضرور آ جائے گا۔''

جرار کے اچانک سامنے چلے آنے پر وہ لحہ بھر کو سناٹے میں رہ گئی۔ بلکہ واضح طور پر گڑبڑا بھی گئی۔ خجالت سے چہرہ سرخ ہو گیا۔

''میں جانتا ہوں۔ میری عدم موجودگی میں میرا ذکر خیر آپ اسی مناسب انداز میں کرتی ہیں۔'' وہ اس کے بالکل سامنے کھڑا اس کے معطل ہوتے حواسوں کا مزا لے رہا تھا۔ پھر یکلخت ہی وہ چھوٹی پھوپھو کی جانب گھوما اور مئودب لہجے میں بولا۔

''آداب چھوٹی پھوپھو۔۔۔''

''جیتے رہو بیٹا' آؤ بیٹھو۔'' انہوں نے محبت سے مسکراتے ہوئے اس کے لیے اپنے قریب جگہ بنائی۔

''شکریہ۔۔۔'' وہ ان کے قریب ٹک گیا۔

''بیٹے۔۔۔ مجھے تم سے ضروری کام تھا' اگر تکلیف

نہ ہو تو۔۔۔''

''تکلیف کیسی پھوپھو' آپ حکم دیجیے۔''

''دراصل ان بچیوں کو اپنی دوست کی بارات میں جانا ہے۔ انہیں پہلے ہی دیر ہو چکی ہے' اگر تم انہیں وہاں چھوڑ دو تو۔۔۔''

''بصد شوق پھوپھو۔۔۔ لیکن میں انہیں لینے نہیں جاؤں گا' کیونکہ انہیں چھوڑ کر مجھے ضروری کام سے نہیں جانا ہے۔'' وہ بات مکمل کر کے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ لڑکیاں حیران و پریشان تھیں۔ حضرت آج خلاف توقع اتنی آسانی سے کیسے مان گئے۔ ورنہ وہ کسی کے قابو کے نہیں تھے۔

''واپسی کی تم فکر نہ کرو۔ تب تک نریمان لوٹ آئے گا اور وہ یہ ڈیوٹی باخوبی انجام دے لے گا۔'' وہ مسکرائیں۔ جرار پورچ کی جانب بڑھا تو لڑکیوں نے مستعدی سے اس کی پیروی کی۔ انوشے البتہ ست روی سے تعاقب میں تھی۔ وہ مسلسل جھنجلاہٹ کا شکار تھی۔

''کیا تھا۔۔۔ اگر اماں۔۔۔ جرار سے خدمات مستعار نہ لیتیں تو۔۔۔؟ خوامخواہ میں وہ شخص اپنی برتری پر طمانیت محسوس کرے گا۔'' وہ چپ چاپ پچھلے دروازے سے اندر بیٹھنے لگی تو جرار کی سخت آواز کانوں میں گھس کر رگوں میں چنگاریاں سی بھر گئی۔

''محترمہ۔۔۔ ست روی ترک کر کے پھرتی کا مظاہرہ کیجیے اور جلدی سے گاڑی میں سوار ہو جائیے۔۔۔ میں کوئی آپ کی طرح سے فارغ نہیں ہوں۔ انتہائی ضروری کام کے سلسلے میں مجھے جانا ہے اور مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ یہ جانے کا کون سا وقت ہے۔ رات کے دس بج رہے ہیں۔ اب تک تو سب اختتام پذیر ہو گیا ہو گا۔''

''کیا کریں جیری بھائی۔۔۔ کوئی لے جانے والا نہیں تھا۔'' جووت بولی تو انوشے لب بھینچ کر رہ گئی۔ جووت جیسی ڈرپوک اور دبو قسم کی لڑکیوں نے ان مردوں پر یہ ثابت کر رکھا ہے کہ ان مردوں کے بغیر یہ معاشرہ ایک قدم نہیں چل سکتا اور نہ ہی ان کے بغیر عورتوں کی زندگیوں میں تحفظ ہے۔

''جیری بھائی۔۔۔ پلیز لینے بھی آ جائیے گا۔'' جووت ان کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر گھس کر بیٹھ گئی تھی۔

''ناممکن۔۔۔ ہاں البتہ اگر میں جلد فارغ ہو گیا تو دوسری بات ہے۔'' جرار نے گاڑی کو مخصوص سمت کے تعاقب میں دوڑاتے کہا تو انوشے سے ضبط نہ ہو سکا۔ پتا نہیں یہ شخص آخر خود کو سمجھتا کیا ہے؟ جیسے یہ دنیا ایک اسی کے سر پر تو قائم ہے۔ جیسے وہ اگر اس دنیا میں نہ ہو تو سب کے کام ٹھپ ہو جائیں گے۔

''رہنے دو جووت۔۔۔ اصرار کیوں کرتی ہو۔۔۔ موصوف سمجھتے ہیں جیسے یہ اگر ہمیں لینے نہیں آئیں گے تو ہم گھر واپس پہنچ ہی نہیں سکیں گے۔ وہ تو اماں نے زبردستی ان کے ساتھ ہمیں روانہ کر دیا۔ ورنہ ان کا احسان لینے سے بہتر تھا کہ ہم گھر پر ہی رہتیں یا پھر میں خود ڈرائیو کر کے تم سب کو لے جاتی۔'' انوشے کے ایک تسلسل سے ادا ہونے والے جملوں نے جیسے جرار کو تپا دیا۔

''محترمہ اگر میرا احسان لینا پسند نہیں تھا تو آپ بصد شوق گھر پر رہ جاتیں۔ اگر دل میں اب بھی کوئی ملال ہے تو میں گاڑی روکے دیتا ہوں۔ ابھی اور اسی وقت گھر کو واپس روانہ ہو جائیے۔ مجھے کوئی اعتراض

اعتذار

فاخرہ گل کا ناولٹ ''خالہ سالا اور اوپر والا'' کی آخری قسط موصول نہ ہونے کی بنا پر اس ماہ شامل اشاعت نہ ہو سکی۔ اس لیے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

نہیں۔" جرار نے طنزیہ مسکراہٹ لبوں پہ سجائے اسے باقاعدہ گردن گھما کر دیکھا تھا۔ وہ ایک پل کو ہونق بن گئی۔ پھر لمحوں بعد ہی اس شخص کی بدتمیزی پر گرم ہو گئی۔

"اگر اعتراض نہیں تو ابھی گاڑی روک دیجیے۔"

"پاگل ہوگئی ہو کیا انوش۔۔۔" ماتیا نے اس کا ہاتھ دبایا۔

"پاگل تو یہ ہمیشہ سے ہیں۔ جب ہی تو ان سے کسی قسم کی عقل اور تحمل کی توقع نہیں ہے۔" جرار نے اسے جلانے کو خوامخواہ قہقہہ لگایا تو انوشے کے تن بدن میں جیسے آگ سی لگ گئی۔

"ساری عقل اور سارا تحمل تو جیسے ان محترم پر ختم ہے۔ پلیز جرار صاحب گاڑی روکیے۔ میں یہیں سے واپس جاؤں گی۔ مجھے آپ کے ساتھ کہیں نہیں جانا۔" اس نے جیسے تہیہ کرلیا تھا۔ اگر اس نے گاڑی نہ روکی تو وہ چلتی گاڑی سے کود پڑے گی۔ اسے اپنی عزت نفس اور خودداری ساری دنیا سے بڑھ کر عزیز تھی اور اس شخص کے سامنے تو وہ کسی قیمت پر ہتھیار نہیں پھینکے گی۔ اس شخص کو نہ خواتین سے بات کرنے کی تمیز ہے اور نہ اسے اخلاق چھو کر گزرا ہے۔

"محترمہ رات کا وقت ہے۔ آپ اکیلی گھر نہیں جا سکیں گی۔ اگر ذرا صبر سے کام لیں تو میں پہلے ان لڑکیوں کو وہاں اتار دوں۔۔۔ پھر آپ کو گھر چھوڑنے کا فریضہ انجام دے دوں گا۔" وہ پھر سے گردن موڑے کہہ رہا تھا۔ اس شخص کا اطمینان دیدنی تھا۔ دوسرے وہ شگفتگی سے مسکرا بھی رہا تھا۔ انوشے نے دیکھا یوں مسکرانے سے اس کی بھوری آنکھوں کی روشنیاں جگمگانے لگتی تھیں۔

"جی شکریہ۔۔۔ اتنی زحمت مت کریں۔" وہ تلملا کر بولی۔

"شکریہ تو مجھے۔۔۔ آپ کا ادا کرنا چاہیے۔ اتنی آسانی سے پیچھا جو چھوڑ رہی ہیں۔" دھواں دھار گولہ باری ہو رہی تھی۔

"پلیز جیری بھائی۔۔۔ آپ سامنے دیکھ کر ڈرائیو کیجیے اور پلیز سیز فائر۔۔۔ کم از کم آپ ہی اس وقت اس لڑائی سے دستبردار ہو جائیے۔" وہ بندہ جسے اس کا جیون ساتھی بننا تھا۔ وہ اس سے یکسر ناآشنا تھی۔ بچپن سے ایک چھت تلے رہنے کے باوجود اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس مزاج کا ہے؟ کہ اسے کیا پسند ہے اور کیا ناپسند۔۔۔ بس وہ اتنا جانتی تھی' اسے دوسروں پر رعب جمانے کی بری عادت ہے۔

"آپ نے سنا نہیں۔۔۔ گاڑی روکیے۔۔۔" وہ ہنوز انگاروں کی طرح دہک رہی تھی۔

"بھئی جووت اور شارمین۔۔۔ تم سب کی سب بے حد سلجھی لڑکیاں ہو۔۔۔ تم سب اسے سمجھاتی نہیں کہ ہر وقت کا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔ مسلسل غصہ ناک پر دھرے رہنے سے ناک ٹیڑھی ہو جاتی ہے اور انسان بدشکل ہو جاتا ہے اور اگر یہ بدشکل ہو گئی تو اس سے کون شادی کرے گا۔ خیر میری بات تو جانے ہی دو۔" وہ مسلسل توہین کیے جا رہا تھا۔ کیا سننا چاہتا ہے وہ۔۔۔ یہ بے انتہا مغرور بندہ۔۔۔ کہ اس جیسے گلفام نے اگر اس کا ہاتھ نہ پکڑا تو وہ ساری زندگی کنواری بیٹھی رہ جائے گی۔ یہ مرد ذات کتنی خوش فہم اور کمینی ہوتی ہے۔ عورت کو دبا کر اپنے پاؤں کی جوتی بنا کر رکھنے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ مگر وہ اس کے جذبات سے غالباً لاعلم ہے۔ اگر بڑے ماموں آغا ہمدانی نے بہت پہلے ان دونوں کو نکاح کے بندھن میں نہ باندھ دیا ہوتا تو وہ کب کا اس اکھڑ باز شخص کا مزاج درست کر چکی ہوتی۔

اس کی قسمت کا مالک بن کر یہ شخص کچھ زیادہ ہی سر پر چڑھ گیا ہے۔ جیسے اسے اس کی تذلیل اور اہانت کا لائسنس مل چکا ہے۔ وہ جب چاہے اس پر رعب جما سکتا ہے۔ وہ جب چاہے اس پر اپنی مرضی اور پسند و ناپسند ٹھونس سکتا ہے۔ اگر بڑے ماموں نے یہ نکاح اس کے ہوش و حواس میں کیا ہوتا تو وہ صاف صاف انکار کر دیتی۔ جرار ہمدانی تب پندرہ برس اور وہ دس برس کی تھی۔ افسوس اماں نے بھی اس نکاح کو نہیں روکا۔ انہوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ ہوش سنبھالنے کے بعد ان کی بیٹی کے خیالات اور احساسات کیا ہوں

گے؟

انہوں نے عمر بھر کا طوق اس سے بنا پوچھے اس کے گلے میں ڈال دیا تھا اور اس بات کا جیسے انوشے کو بہت قلق تھا۔ جس شخص سے اس کی ایک لمحہ کو بھی نہیں بنتی۔ اس کے نام اس کی زندگی لکھ دی گئی تھی۔

ابا کے گزر جانے کے بعد اماں نے تو جیسے بالکل ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے تھے۔ وہ بالکل چھوئی موئی بن گئی تھیں۔ ذرا ذرا سی بات پر رونے لگتی تھیں۔ ان کی اسی پریشانی کو معدوم کرنے کے لیے بڑے ماموں نے یہ اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا۔

شعور کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد جب انوشے کو اپنے اور جرار کے تعلق کا علم ہوا وہ چڑنے لگی تھی۔ پتا نہیں کیوں جرار کی صورت دیکھتے ہی وہ اندر تک تپ جاتی تھی۔ ہر بات میں مردوں کے ماتحت ہونا اسے سخت ناپسند تھا۔ وہ جتنا اس بات سے چڑتی تھی۔ جرار اتنا ہی اس پر رعب جماتا تھا۔ ہر وقت ان کی کسی نہ کسی بات پر آپس میں ٹھنی رہتی۔ یہ بے انتہا خود پسند بندہ' اسے اپنی ذات کے سامنے کچھ اور نظر ہی نہیں آتا۔ کتنی شدت سے وہ اسے بے نقط سنانے کو مچلتی تھی۔ مگر ہر بار اماں آڑے آجاتیں۔ گاہے بگاہے ان کی سرزنش برقرار رہتی۔

"انوش۔۔۔ تمہیں جرار کی عزت کرنی چاہیے۔ یہ ہر وقت کی محاذ آرائی اچھی بات نہیں۔۔۔ تم جانتی ہو نا کہ تمہارا اور اس کا کیا تعلق ہے اور اس تعلق کی بنیاد پر تمہیں اس سے تہذیب کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اس کا دل جیتنے کی کوشش کرنی چاہیے اور۔۔۔"

"No Way اماں۔۔۔ آپ ان فضول باتوں کی مجھ سے قطعی توقع مت رکھیں۔" وہ جھنجلا کر کہتی۔

"آخر کیوں؟ کیا حرج ہے اگر تم اس سے ٹھنڈے مزاج سے بات کر لو گی تو۔۔۔"

"ٹھنڈا مزاج۔۔۔" وہ چڑ جاتی۔

"مجھے تو اس کی صورت دیکھتے ہی غصہ آجاتا ہے۔ پتا نہیں آپ نے کیا دیکھ کر میرا نکاح اس سے پڑھوا

دیا۔ میں آپ پر اتنی ہی بوجھ تھی تا کہ فوراً" سر سے اتار پھینکا۔ کم از کم آپ اتنا تو انتظار کر لیتیں کہ میں اپنے ہوش و حواس میں ہوتی۔ آپ جانتی ہیں کہ مجھے مردوں کا غلام بن کر رہنا بالکل بھی پسند نہیں۔"

"جرار بہت بہترین اور پیارا لڑکا ہے انوش۔۔۔ اس خاندان کا سب سے شان دار سپوت۔ جس سے اپنی بیٹی کی شادی کی تمنا ہر ماں کے دل میں ہے۔ تم تو خوش نصیب ہو کہ وہ تمہارا مقدر ہے اور۔۔۔" گاڑی کو زور دار جھٹکا لگا تھا۔ سلگتے خیالات میں خود کو جلاتی انوشے اس اچانک بریک سے سامنے سیٹ سے جا ٹکرائی۔ اس کا دماغ بھنا گیا۔ "دیکھ کر گاڑی نہیں چلائی جاتی۔ پتا نہیں آپ کو ڈرائیونگ لائسنس کس نالائق نے دے دیا ہے۔"

"پتا نہیں تمہارا دھیان کہاں تھا۔ جیری بھائی نے تو سامنے سے اچانک آجانے والے ٹرک سے بڑی مہارت سے خود کو بچایا ہے۔" جووت نے جرار کی سائیڈ لی تو انوشے لب بھینچ کر رہ گئی۔ جب وہ نازو کے بتائے ہوئے شادی ہال کے سامنے پہنچے تو بارات کب کی آچکی تھی۔ نکاح بھی ہو چکا تھا اور اب کھانا تناول کیا جا رہا تھا۔

"جیری بھائی۔۔۔ آپ دس منٹ انتظار کریں۔ مجھے لگتا ہے اب ہمارا یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ رخصتی قریب ہوگی اور ویسے بھی شادی ہال مقررہ وقت پر بند ہو جاتے ہیں۔ بس ذرا ہم نازو سے معذرت کر آئیں۔" مانیا نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

"آل رائٹ۔۔۔ دس منٹ سے اگر ایک لمحہ بھی اوپر ہوا تو میں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

"تھینکس۔۔۔" وہ سب کی سب اندر کی جانب بڑھیں۔

"اور سنو۔" جرار نے سست روی سے قدم اٹھاتی انوشے کو پکارا تھا۔

"جلنے کی بدبو یہاں تک صاف آرہی ہے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تم اندر نہ ہی جاؤ تو بہتر ہے۔ لوگوں پر کیا امپریشن پڑے گا۔"

جواباً" انوشے نے پلٹ کر اسے غصیلی نظروں سے دیکھا اور تیز تیز قدم اٹھاتی اندر چلی گئی۔ وہ مسکراتا رہ گیا۔ اس لڑکی کے لیے اس کے دل میں بہت گنجائش تھی۔ وہ اس کی زندگی کا اہم جزو تھی۔ وہ اس کے مستقبل کی روشنی تھی۔ ایسی روشنی جس کی چکا چوند میں اسے اپنی منزل صاف دکھائی دیتی تھی۔ اس لڑکی کی ذات کی سچائیاں اسے اپنے فاتح ہونے کا احساس دلاتی تھیں۔ یہ لڑکی اگر اپنی ساری خفگی بھلا دے تو زیست بہاروں سے تعبیر ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ ہنوز اس سے لاپروا تھی۔ اس کے معاملے میں جلی بھنی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ اسے جلی کٹی سنانے سے بھی باز نہیں آتی تھی۔ مگر جو بھی تھا وہ اسے ہر حال میں بہت اپنی، بہت پیاری لگتی تھی اور خصوصاً" جب وہ اس کی کسی بات پر خفا ہو کر اسے دیکھتی تھی تو اسے بہت مزا آتا تھا۔ اسے چھیڑ کر وہ مکمل حظ اٹھاتا تھا۔ کسی دن اگر اس بے چین دل نے زیادہ تنگ کیا تو وہ یکلخت اس کا ہاتھ تھامتے "اس کی آنکھوں میں دیکھتے بڑی بہادری سے کہہ دے گا۔

"اے پیاری لڑکی! میں تمہارے متعلق سوچ سوچ کر ہلکان ہوا جا رہا ہوں۔ اگر تم نے جواباً" مجھ سے محبت کا اقرار نہ کیا تو خدا کی قسم ساری دنیا کو چیخ چیخ کر اکٹھا کر لوں گا اور تمہاری سنگ دلی کی داستان کہہ ڈالوں گا۔" بھلے جو بھی تھا۔ مگر دل کو یہ طمانیت ضرور تھی۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے نام لکھ دی گئی ہے اور زندگی گزارنے کو یہ تسلی بہت کافی تھی۔

☼ ☼ ☼

موسم بہت دلفریب تھا۔ آکاش کی وسعتیں آوارہ سفید بادلوں سے اٹی تھیں۔ گلاب کے پھولوں کے کنج گزرتی ہوائیں، پھولوں کی ہوشربا خوشبو میں اطراف میں بکھیرتی پھر رہی تھیں۔ گلاب کی بے شمار پتیاں ہری ہری گھاس پر بکھری پڑی تھیں۔ وہ جب سے چپ چاپ لان میں اترنے والی سیڑھیوں کے آخری اسٹیپ پر بیٹھی خوب صورت تتلیوں کو پھولوں کی گرد منڈلاتا دیکھ رہی تھی۔ جب ہی نریمان اس کے بالکل

قریب آن بیٹھا۔ مانیا بھی اس کے دوسری طرف جم گئی۔

"تم یہاں مزے سے بیٹھی ہو اور اندر تمہاری قسمت کا فیصلہ کیا جا رہا ہے۔" نریمان کی بات پر وہ لمحہ بھر کو سن رہ گئی۔ اس کی قسمت کا فیصلہ اور اس سے پوچھے بنا وہ کوئی گائے بکری نہیں کہ اسے کسی بھی کھونٹے سے باندھ دیا جائے۔ مگر اسے کھونٹے سے تو مدتوں پہلے ہی باندھا جا چکا ہے، تو پھر وہ خود کو گائے سمجھ لے یا بکری۔۔۔ مگر۔۔۔ اس وقت وہ ذی شعور نہیں تھی۔ احتجاج نہیں کر سکتی تھی۔ اب کے ایسا نہیں ہو گا۔ وہ اب ہر اس فیصلے سے اختلاف کرے گی جو اس کی مرضی کے خلاف کیا جائے گا اور۔۔۔

"میں تمہیں بتاتی ہوں انوش۔۔۔ جرار بھائی اعلا تعلیم کے لیے بیرون ملک جانا چاہتے ہیں اور بڑے ماموں انہیں تنہا بھیجنے کے حق میں بالکل نہیں۔ لہٰذا وہ چاہتے ہیں کہ تمہیں بھی جرار بھائی کے ہمراہ کر دیا جائے۔ مطلب اندر تمہاری رخصتی کا فیصلہ ہو رہا ہے۔" مانیا کی بات پر جیسے انوشے کے پیروں میں کوئی گولا سا پھٹا تھا۔

"واٹ۔۔۔"

"بھئی اتنا حیران کیوں ہو رہی ہو۔ جب نکاح ہوا ہے تو رخصتی بھی ہو گی۔" مانیا مسکرائی۔

"اور۔۔۔ اور کیا جرار مان گئے۔" اس کا لہجہ ہکلایا ہوا تھا۔

"نہ ماننے کی وجہ۔۔۔" مانیا نے الٹا سوال کیا۔ تو نریمان نے اس کی بات اچک لی۔ "جرار ہرگز ہرگز اس رخصتی کے لیے تیار نہیں۔ وہ تو سرے سے اس نکاح کے ہی خلاف ہے۔ حضرت کا کہنا ہے کہ انوشے جیسی بددماغ اور بدتہذیب لڑکی کے سنگ زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ انسان ساری زندگی تنہا گزارے۔ وہ تو شادی کو فارغ لوگوں کا مشغلہ تصور کرتا ہے۔" نریمان کے سفید جھوٹ پر مانیا کو غصہ آگیا۔ وہ آنکھیں سکیڑ کہنے لگی۔

"غلط بات مت کرو نریمان۔۔۔ جرار بھائی کے خیالات بالکل ایسے نہیں ہیں جیسے تم بتا رہے ہو۔ تم خوامخواہ انوش کا دل میلا کر رہے ہو، جانتے ہو، میاں بیوی کے درمیان فساد پھیلانا اور ان کے رشتے کو کمزور کرنا اس دنیا کا سب سے بڑا گناہ ہے۔"

"تم میری دادی بننے کی کوشش نہ کرو۔" نریمان نے بھی جواباً" اپنی آنکھیں سکیڑیں۔ انوشے کو ان دونوں کی بحث سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن مانیا کے لبوں سے اپنے اور جرار کے تعلق کی حیثیت جیسے اسے سانپ بن کر ڈس گئی۔ جرار اور اس کا شوہر۔۔۔ اس حقیقت کو ہضم کرنا اس کے لیے قطعی دشوار تھا۔

"یہ تم نے میاں بیوی کس کو کہا؟" انوشے کا چہرہ تپ کر لال انگارہ ہو گیا تھا۔

"تمہیں اور جیری بھائی کو۔۔۔" اس کے غصے کی پروا کیے بغیر مانیا نے آہستگی سے کہا تو انوشے مزید سیخ پا ہو گئی۔

"دیکھو مانیا۔۔۔ قبل از وقت اس تعلق۔۔۔ اس رشتے کا ڈھنڈورا مجھے پسند نہیں۔ ہو سکتا ہے وقت اور حالات کو یہ تعلق گوارا نہ ہو۔ تو گویا تم کچھ الٹا سیدھا سوچ رہی ہو؟"

"دیکھو انوش۔۔۔ تم چاہے لاکھ نفی کرو، مگر تم دونوں کے درمیان ایک اٹوٹ تعلق ہے اور اس تعلق کو تسلیم کرنے میں ہی عقل مندی ہے۔ ایمان سے تمہاری جگہ اگر کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو وہ جیری بھائی جیسے شان دار مرد کو اپنے شریک سفر کے طور پر دل و جان سے قبول کرتی۔ اپنی خوش بختی پر ناز کرتی۔۔۔ مگر جانے تم کس مٹی کی بنی ہو کہ اپنی روشن قسمت کو خود ہی ٹھوکریں مارنے پر تلی ہو۔ یاد رکھو انوشے۔۔۔ تمہارے برے رویے سے بددل ہو کر اگر جیری بھائی نے تم سے منہ موڑ لیا تو تاحیات سر پکڑ کر روؤ گی۔"

"ہونہہ! مجھے بالکل پروا نہیں۔" مانیا کی لمبی چوڑی تقریر پر وہ مزید چڑ گئی۔

"تم سے سر کھپانا فضول ہے انوشے۔" مانیا نے ہاتھ کھڑے کر دیے اور دھپ دھپ کرتی اندر چلی گئی۔

"تم اس ماںیا کی بات پر بالکل بھی توجہ نہ دو انوشے۔ یہ تمہاری زندگی ہے اور اسے اپنی مرضی سے گزارنے کا تمہیں پورا پورا اختیار ہے۔ تمہیں کسی کی دھونس میں نہیں آنا چاہیے اور پھر بھلا ایسے شخص کے ساتھ زندگی کیا گزارنا' جو تمہیں بددماغ سمجھتا ہو۔ تم سے شادی سے بہتر خودکشی کرنا' پسند کرتا ہو۔" زیمان اس لڑکی کے چڑنے والی عادت سے بہت محظوظ ہوتا تھا۔ خصوصاً" جرار کے معاملے میں وہ بالکل ہی ہتھے سے اکھڑ جاتی تھی اور برملا اس کے خلاف اپنے اندر کا عناد اگل دیتی۔

"اگر جرار مجھے بددماغ سمجھتے ہیں تو موصوف خود کیا ہیں؟ میں کون سا ان جیسے اکھڑ مزاج اور اکڑو قسم کے شخص سے شادی کی تمنا میں مری جارہی ہوں۔ اچھا ہے وہ اس شادی سے انکار کردیں۔ اگر انکار نہیں کریں گے تو میں ابھی خود جا کر بڑے ماموں کے سامنے انکار کیے دیتی ہوں۔ مجھے کسی بھی مرد کا غلام بن کر رہنا پسند نہیں ہے اور شادی تو "تاحیات کی غلامی" کا نام ہے۔" وہ غصے سے پاؤں پٹختے بڑے ماموں کے کمرے کے باہر آگئی' مگر اندر جانے کی ہمت نہ ہوسکی۔ اندر سے آتی آوازیں واضح طور پر اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ بڑے ماموں کہہ رہے تھے۔

"دیکھو بیٹے۔ مجھے تمہارے بیرون ملک جانے پر کوئی اعتراض نہیں۔ تم مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہو۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ مگر تمہارے چلے جانے سے یہاں میرے کاروبار کا نقصان ہوگا۔ تم جانتے ہو اتنا وسیع کاروبار سنبھالنا میرے بس میں نہیں رہا۔"

"آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔ سلطان چچا آپ کے ساتھ ہیں نا۔"

"مگر یہ ماننے کی بات ہے کہ تمہاری وجہ سے اس ایک سال کے دوران ہمارے کاروبار نے دن دگنی ترقی کی ہے اور پھر میں تمہارے وجود کا بھی عادی ہوگیا ہوں۔ پھر بھی اگر تم باہر جانے پر بضد ہو تو انوشے کو ہمراہ لے جاؤ۔ تمہاری پھوپھو کی بھی تسلی ہوجائے گی۔ اکلوتی اولاد کی پریشانی میں وہ روز بہ روز گھلتی جارہی ہے۔"

"اب انہیں کیا پریشانی ہے بابا جان۔ اب جبکہ انوشے میری ذمہ داری ہے' اس کی زندگی مجھ سے منسوب ہے تو انہیں مطمئن ہوجانا چاہیے۔ میں اتنا نااہل تو نہیں ہوں کہ ان کی بیٹی کو خوش نہ رکھ سکوں۔"

"گویا تم ابھی رخصتی نہیں چاہتے۔ تمہاری اس گول مول بات سے یہ ہی نتیجہ نکلتا ہے۔" بڑے ماموں بولے۔

"جی۔ کچھ ایسا ہی سمجھ لیجیے۔" جرار کی آواز مدھم تھی۔

"شکر ہے بلا ٹلی۔" انوشے کو لگا جیسے یکلخت اس کے سر سے کوئی بھاری بوجھ سرک گیا ہو۔ اگر جرار رخصت کی حامی بھر لیتے تو اس کی جان پر بن جاتی اور تب نامعلوم وہ کیا کچھ کر ڈالتی اور جرار جب کمرے سے باہر آیا تو انوشے کو کھڑا دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ وہ بھی خجالت کے طفیل سرخ چہرہ لیے کھڑی تھی اس میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ سر اٹھا کر مقابل جمے شخص کو ایک نظر دیکھ ہی لیتی۔

"تم یہاں کیا کررہی ہو؟" وہ ہولے سے غرایا تھا۔

"ک۔ کچھ نہیں۔" الفاظ اس کے حلق میں اٹک سے گئے۔ "مجھے معلوم ہے تم ہماری باتیں سن رہی تھیں۔ تم یہ جاننا چاہ رہی تھیں کہ کیا فیصلہ ہوا ہے۔ تم نے زیمان کے ہاتھوں جو پیغام بھجوایا تھا' میں نے اسے نظر انداز کردیا ہے۔" وہ سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"پیغام۔ کون سا پیغام؟" وہ ہکلانے کے ساتھ ساتھ سٹپٹا بھی گئی۔

"تم ہی نے زیمان کے ہاتھوں پیغام بھجوایا ہے ناکہ بابا جان اگر مجھ سے رخصتی کا پوچھیں تو میں انکار نہ کروں۔" جرار کی بات پر انوشے کو لگا جیسے مقابل کھڑے شخص نے اسے طمانچہ کھینچ مارا ہو۔ کیا وہ صورت سے اتنی ہی گھٹیا نظر آتی ہے کہ اپنی رخصتی کے لیے دوسروں کے ہاتھ پیغام بھجواتی پھرے اور وہ بھی اس شخص کے لیے جس سے اسے ازل سے چڑ تھی۔

یہ زیمان۔ وہ ایک بار اس کے سامنے آجائے تو اس کی اچھی طرح خبر نہ لی تو انوشے نام نہیں۔ خدا جانے کیسی بیچر بائی ہے اس زیمان نے۔ یہاں جرار سے کچھ بکواس کردی اور وہاں اس کے پاس آکر کچھ اور کہہ دیا۔ سخت لی جمالو قسم کی ہستی ہے یہ شخص۔ اس کے تو فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ اندر بڑے ماموں کے کمرے میں کیسی کھچڑی پک رہی ہے۔ وہی اندر کی خبر لایا تھا اور اس سے پہلے جرار کو اس کے متعلق آگ لگادی۔ انوشے کا دل چاہا وہ جا کر زیمان کا گریبان پکڑ لے اور۔

"توبہ توبہ۔ کسی لڑکی کو اپنی شادی کے لیے اتنا بے چین میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ لڑکی تم میں شرم و حیا نام کو نہیں۔ اپنی رخصتی جلد کروانے کے لیے تم نے دوسروں کو پیامبر بنا ڈالا۔ مجھے لڑکیوں میں اتنی بے باکی قطعی پسند نہیں۔ خواتین کو اتنا بے حجاب ہونا زیب نہیں دیتا۔" وہ پتا نہیں کیا کیا بولے جارہا تھا۔ اتنی تذلیل۔ اتنی اہانت۔ بھلا اس شخص کو کس نے حق دیا اس پر انگلی اٹھانے کا۔ اسے اس طرح بے عزت کرنے کا۔ کہیں کا گلفام ہے نا' جو وہ اس سے شادی کے لیے مری جارہی ہے۔ کیا وہ اسے اتنی ہی گری ہوئی' اتنی ارزاں لگتی ہے۔ غصہ آنکھوں میں پانیوں کی دبیز تہ کی صورت اتر آیا۔

"مجھے اپنی شادی کی کوئی جلدی نہیں ان فیکٹ میں تو آپ سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔ مجھے اپنی زندگی پر کسی کی اجارہ داری قطعی پسند نہیں۔ لہٰذا آپ ہر قسم کی خوش فہمی کو دل سے نکال پھینکیے کہ میں آپ سے شادی کے لیے مری جارہی ہوں۔ مجھے اپنی آزادی اور خوشی ہر حال میں عزیز ہے۔" یہ ہی بہتر ہے۔ وہ اس شخص کی ساری غلط فہمی دور کردے۔ اس کے چودہ طبق روشن کردے۔

"اگر شادی کے لیے مری نہیں جارہی تھیں تو کمرے سے باہر چھپکلی بنی کیوں چپکی تھیں۔"

"آپ سے مطلب۔" اس شخص کو اپنی ذات سے متعلق صفائیاں دینے کا اسے ایک فیصد بھی شوق نہیں۔ یہ ہی بہتر ہے' یہاں کھڑے ہوکر دل جلانے کی بجائے وہ منظر سے ہٹ جائے۔ وہ ایڑیوں پر گھومی۔ جب ہی وہ اس کے راستے میں آگیا۔

"مجھے تمہاری ہر بات سے مطلب نہیں ہوگا تو اور کسے ہوگا؟ تم اگر کچھ بھی الٹا سیدھا کروگی یا کہوگی تو لوگ تو مجھ پر ہی انگلیاں اٹھائیں گے کہ دیکھو جرار ہمدانی کی شریک سفر بے حجاب اور نک چڑھی ہے اور تب میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔"

"اچھا ہے۔ میری جان چھوٹ جائے گی۔" ایک پھڑکتا ہوا طبیعت صاف کرنے والا جملہ مقابل کی سمت اچھال کر جیسے اس نے اندر کی بھڑاس نکالی۔

"اتنی آسانی سے جان نہیں چھوٹے گی۔ اسی بندے کے سنگ ساری زندگی گزارنا ہوگی۔"

"ہرگز نہیں۔" وہ پیر پٹختی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی اور اسے مایوسیوں کے اندھیروں میں چھوڑ گئی۔ جرار کو اس کا انداز بہت اذیت دیتا لگ رہا تھا۔ تو کیا وہ واقعی اس کے سنگ زندگی گزارنا نہیں چاہتی؟ اپنے تعلق پر ناخوش ہے۔ اس لڑکی نے اسے ہمیشہ اپنی باتوں اور اپنے انداز سے یہ یقین دلایا ہے کہ وہ اس سے ساتھ بندھنے والے اس بندھن کو بوجھ سمجھتی ہے۔ کیا اسے اس کا انتظار کرنا چاہیے؟

☆ ☆ ☆

کتنی دیر وہ اپنے کمرے میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے نڈھال سا پڑا رہا۔

"وہ اس کے جذبوں کو محسوس کیوں نہیں کرلیتی؟ ضروری تو نہیں۔ وہ لبوں سے کچھ ادا کرتا تو تب ہی وہ سمجھتی۔ لیکن۔" لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔ وہ لڑکی سرے سے اسے پسند ہی نہیں کرتی۔

خدایا! یہ بابا جان نے اسے کس امتحان میں ڈال دیا؟ ایک لڑکی جو اس کے ساتھ زندگی گزارنا ہی نہیں چاہتی۔ اس کے سنگ زبردستی کب تک یہ تعلق نبھایا

جاسکے گا؟ اور پھر محبت قربتوں کا نام ہے۔ فاصلوں اور تنفر کا نہیں۔ وہ دکھ اور کرب کے ملے جلے جذبات لیے جیسے بہت مضمحل ہو رہا تھا۔ کیسی پاگل کردینے والی سوچیں تھیں۔

"جیری بھائی..." جودت نے اندر جھانکا۔

"ہوں..." "آپ یہاں چھپے بیٹھے ہیں اور وہاں اشعر بھائی نے اپنی سالگرہ کی سرپرائز پارٹی کا اہتمام کیا ہے۔ ڈرائنگ روم میں سارا انتظام ہے۔ سب ہی تیار ہو رہے ہیں۔ سالگرہ کے بعد وہ سب کو پکچر دکھانے لے چلیں گے۔"

"اوہو... اتنا لمبا چوڑا پروگرام..." خود کو سنبھال کر جرار نے اپنے لہجے میں بشاشت پیدا کرلی۔ اس کے چہرے کے اضمحلال سے کسی کو بھی یہاں' اندرونی کیفیت اور توڑ پھوڑ کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔ اس کا دکھ اپنا ہے۔ اس کا دکھ بانٹ لینے سے کم تھوڑی ہوگا۔ یہ روگ تو ساری زندگی کا ہے اور...

"آپ بھی بس جلدی سے تیار ہوجائیے۔"

"جنگلی بلی... تم چلو... میں پانچ منٹ میں تیار ہو کر آتا ہوں۔"

اور جب وہ ڈرائنگ روم میں پہنچا تو وہاں واقعی زبردست پارٹی کا انتظام تھا۔ سینٹر ٹیبل پر بڑا سا کیک بمعہ موم بتیوں کے موجود تھا۔ غباروں اور پھولوں سے ماحول رنگین ہو رہا تھا۔ سب ہی سروں پر برتھ ڈے caps رکھے کیک کے گرد موجود تھے۔ عمیر دھڑا دھڑ تصویریں کھینچ رہا تھا۔ جودت اپنی تصویر بنوا رہی تھی۔ جرار کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر دوڑ کر اس کے قریب گئی اور اس کے بازو سے لگ کر عمیر سے بولی۔

"پلیز عمیر... میری اور جیری بھائی کی ایک شان دار سی تصویر بنا ڈالو۔ اور جیری بھائی آپ کو مسکراتے ہوئے تصویر کھنچوانی ہے' اوکے..." جودت چہکتی آواز میں بولی تو جرار نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دیا۔

"یہ چھوٹی سی لڑکی اسے خوشیاں سمیٹنے کا گر آتا تھا۔ وہ بڑی بڑی خوشیوں کے انتظار میں نہیں رہتی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہی خوش ہوجاتی تھی۔ کاش وہ بھی یہ گر سیکھ پاتا۔" جرار نے ایک گہرا سانس بھر کے اندر کی اداسی کو باہر نکال دینا چاہا۔ اسی دم انوشے اندر داخل ہوئی۔ جودت اور جرار کو اتنے قریب کھڑا دیکھ کر جیسے اسے کرنٹ سا لگا۔ دونوں مسکرا کر تصویر کھنچوا رہے تھے۔ جودت' جرار کے بازو سے لگی تھی۔ لمحہ بھر کو ایک سایہ سا انوشے کے چہرے پر لہرا گیا۔

یہ شخص جو اس کی زندگی سے منسوب ہے۔ اسے کبھی اس سے سیدھے منہ بات کرنے کی توفیق نہیں ہوئی اور وہ اپنی خوش اخلاقی اور محبتیں کسی اور پر لٹا رہا ہے۔ اس میں قصور اس شخص کا بھی نہیں۔ اس جودت نے اسے حد سے زیادہ اہمیت دے کر سر پر چڑھا رکھا تھا۔ اتنا کہ وہ چاہنے لگا تھا کہ سب ہی اس کے گن گائیں۔ سب ہی اس کی خوشامدیں کرتے پھریں اور اس کی شان دار پرسنالٹی کے اسیر ہوجائیں۔ دفعتاً انوشے کا دل چاہا۔ وہ آگے بڑھ کر جودت کو جرار کے بازو سے ایک جھٹکے سے علیحدہ کرے اور اسے بے نقط سنا دے۔ اپنا سارا غبار اس پر نکال دے۔

"تف ہے تم جیسی لڑکیوں پر' جو اپنی عزت نفس اور اپنی ناموس کو مردوں کے قدموں میں ڈھیر کردیتی ہیں اور اس پر ذرا بھی ملال محسوس نہیں کرتیں۔" وہ جب سے دروازے میں اٹکی تلملا رہی تھی۔ بھلے وہ جرار کو گھاس نہیں ڈالتی۔ مگر اسے یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ جو چیز اس کی ملکیت ہے وہ کسی اور کے تصرف میں چلی جائے۔ دل کے کسی گوشے میں یہ چبھن کیوں؟ دماغ کے کسی کونے میں یہ احساس کیوں؟

"جیری بھائی... ایک تصویر اور... پلیز ذرا شان دار سا پوز بنائیے۔" جودت اصرار کر رہی تھی۔ انوشے سے مزید برداشت نہ ہوسکا۔ وہ سرعت سے آگے بڑھی اور ان دونوں کے عین سامنے پہنچ گئی۔

"جودت تمہیں تصویریں کھنچوانے کے علاوہ اور بھی کوئی کام ہے۔ ہر وقت گلا پھاڑ پھاڑ کر ہنستی رہتی ہو۔ نہ تمہیں اٹھنے بیٹھنے کی تہذیب ہے اور نہ ہی کوئی تمیز..." وہ انگاروں کی طرح دہک رہی تھی۔

"یا میرے مولا... بچانا۔" اسے تنگ کرنے کو جرار

ہمد ہلی کی رگ شرارت پھڑکی تو نہ چاہتے ہوئے بھی جودت کی ہنسی نکل گئی۔ حالانکہ انوشے کی اس اچانک گولہ باری پر وہ روہانسی ہو چلی تھی۔ لیکن جرار کے لبوں سے ادا ہونے والے الفاظ نے جیسے اسے سب بھلا دیا۔ اپنی انسلٹ بھی اور انوشے کی بدتمیزی بھی۔ اس کے اس طرح ہنسنے پر انوشے مزید تپ گئی۔

"شٹ اپ جودت... لگتا ہے تمہیں تہذیب سکھانی ہی پڑے گی اور وہ بھی بڑے ماموں سے کہہ کر..." انوشے کی وارننگ پر جودت کی ہنسی کو جیسے یکلخت بریک لگ گئی۔

"جودی... تم کیوں سیریس ہوگئیں۔ جو لوگ خود ہنس بول نہیں سکتے' انہیں دوسروں کے ہنسنے بولنے پر جلن محسوس ہوتی ہے۔ اب ان ہی محترمہ کی مثال لے لو... ہر وقت جلی بھنی ہری مرچ بنی رہتی ہیں۔ میں تو سوچ سوچ کر پریشان ہوجاتا ہوں کہ یہ بابا جان نے مجھے کس مشکل میں ڈال دیا۔ انہوں نے میرے گلے میں ایسا ڈھول باندھ دیا ہے جسے نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے بجانا ہی پڑے گا۔" جرار بڑی سنجیدہ سی صورت بنائے کہہ رہا تھا۔ جودت اپنی ہنسی چھپانے کو دوسری طرف مڑ گئی۔ جبکہ انوشے کا گندمی رنگت والا چہرہ ضبط کی شدت میں سرخ ہو رہا تھا اور سیاہ آنکھیں لال انگارہ...

"یہ تو آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔"

"تمہاری بات ٹھیک ہے۔ مگر جس وقت یہ بندھن بندھا تھا۔ اس وقت میں سوچنے سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ بزرگوں کے اس فیصلے میں میری ذاتی پسند اور رضا کا کوئی عمل دخل نہیں۔" وہ اسے بار بار چڑاتا تھا اور وہ بار بار چڑتی تھی۔

"تو اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ آپ بصد شوق اس تعلق کی دھجیاں بکھیر سکتے ہیں۔ آپ کو روک کس نے رکھا ہے۔ اچھا ہے میری بھی خلاصی ہوگی۔" وہ تنفر سے بولی۔

"سوچ لو... میں تمہاری آنکھوں کی زبان سمجھتا ہوں۔ یہ آنکھیں صاف کہتی ہیں کہ تمہاری زیست کی واحد خوشی صرف میری ذات ہے اور مجھ سے جدا ہو کر تم ایک پل بھی آسودگی سے نہ رہ پاؤ گی۔" جانے کس خیال کے تحت جرار نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہونہہ... خوش فہمی ہے آپ کی۔ میں آپ کی صورت تک دیکھنا نہیں چاہتی۔" اس نے اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے چھڑا لیا تو جرار کی آنکھیں سلگ اٹھیں۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

"اتنی نفرت؟"

"جو چاہیں سمجھ لیں۔" وہ کھٹ کھٹ کرتی باہر نکل گئی اور وہ دھواں دھواں ہوتا چہرہ لیے کھڑا رہا۔ وہ اس لڑکی کا اذیت ناک رویہ کب تک برداشت کرے۔ یوں سب کے سامنے ہاتھ چھڑا کر اس کی تذلیل کا مطلب؟ وہ سنجیدگی سے اس نکتے پر سوچنا چاہتا تھا' جب ہی اشعر سامنے آگیا۔

"یار دیر ہو رہی ہے۔ چلو کیک کاٹتے ہیں۔ اس سرپھری لڑکی کے رویے پر جتنا غور کروگے اتنا ہی الجھو گے۔ وہ اگر معاملہ تم اور یا موت ہوتی تو آج تم دونوں کے درمیان بہترین دوستی ہوتی اور تم دونوں کے رشتے کی ڈور اس طرح الجھی الجھی نہ ہوتی۔"

"یو آر رائٹ۔" اس کی آنکھوں اور اس کے چہرے سے برستے سکون نے اس بات کو ظاہر کردیا کہ وہ سنبھل جانے کی ہمت رکھتا ہے اور یہ کہ وہ ہرگز کسی صدمہ سے دوچار نہیں۔ تالیوں کی گونج میں کیک کاٹنے کے بعد اشعر نے حسب وعدہ سب کو پکچر کے لیے چلنے کو کہہ دیا تو لڑکیاں خوش ہوگئیں۔

"میں انوشے کو بلاتی ہوں۔" شارمین' انوشے کے کمرے کی طرف آئی تو وہ بے سکونی سے کرسی پر بیٹھی اپنی ٹانگ جھلا رہی تھی۔

"یہاں کمرے میں کیوں پڑی ہو۔ وہاں اشعر بھائی نے کیک بھی کاٹ ڈالا اور اب پکچر پر چلنے کی تیاری ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"تم نہیں چل رہیں کیا؟"

"دل تو بہت چاہ رہا ہے۔ مگر وہاں وہ موصوف بھی ہوں گے جرار ہمدانی صاحب' جن کا سامنا مجھے قطعی گوارا نہیں۔" اس نے زبردستی ہونٹ پھیلائے۔

"دیکھو انوش۔۔۔ تمہارا رویہ ان سے روز بروز بدتر ہوتا جارہا ہے جو قطعی نامناسب ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تمہارا ان سے کیا رشتہ ہے۔"

"تم سب ہی مجھے سمجھانے پر تلے ہو' کبھی ان حضرت کو بھی یاد دلا دیا کرو کہ میرا ان سے کیا تعلق ہے اور اس تعلق کی بنیاد پر مجھے عزت دینا اس کا فرض ہے۔ مگر وہ تو عورت کو پیروں کی جوتی سمجھتا ہے اور مجھے مردوں کی اسی سوچ سے چڑ ہے' نفرت ہے۔" وہ واقعی چڑ گئی۔ وہ اس سے ہمدردی کی توقع رکھے ہوئے تھی اور وہ اس مغرور شخص کی سائیڈ لے رہی تھی اور اسے موردالزام ٹھہرا رہی تھی۔

"اچھا یہ بحث پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھو اور چلنے کی تیاری کرو۔ دیر ہو رہی ہے۔"

"او کے۔" وہ خلاف توقع جلد مان گئی۔ وہ بھلا اس شخص کی خاطر کیوں اپنا موڈ غارت کرے۔ کیوں اپنا پروگرام خراب کرے۔

"گڈ۔" وہ شارمین کے ہمراہ پورچ میں آئی تو سب ہی موجود تھے۔ ماسوائے جرار ہمدانی کے۔ حالانکہ سب کو وقت کی پابندی کی تاکید بھی ان ہی کی جانب سے تھی۔ مگر وہ اب خود منظر سے روپوش تھے۔

"یہ جیری بھائی کہاں گئے۔" جودت نے ادھر ادھر دیکھا۔

"اور ان کی گاڑی بھی دکھائی نہیں دے رہی۔" مانیا نے پورچ کے اس مخصوص حصے کی جانب دیکھا جہاں جرار ہمدانی کی گاڑی کھڑی رہتی تھی۔

"میں نے ذرا دیر پہلے جرار کو گاڑی باہر نکالتے دیکھا تھا۔ موڈ خاصا بگڑا ہوا تھا۔ اگر میں بروقت سامنے سے نہ ہٹ جاتا تو لامحالہ مجھے بھی نیچے دے دیا ہوتا۔" زیمان نے اطلاع فراہم کی تو سب ہی کے منہ لٹک گئے۔

"یہ ان کے موڈ کو یکلخت کیا ہوا۔ کیک کٹتے وقت تو اچھے خاصے خوش باش تھے۔" مانیا نے پوچھا۔

"کیک کٹنے سے پہلے جو تماشا ہوا' سب ہی نے دیکھا ہے۔ مجھے غصہ آرہا تھا تو کیا جرار نے انسلٹ محسوس نہیں کی ہوگی۔ مجھے تو اس کے گاڑی چلانے کے انداز سے وحشت ہو رہی ہے۔ کہیں کوئی حادثہ نہ کر بیٹھے۔ بڑا خطرناک موڈ لے کر نکلا ہے؟" زیمان کی تفصیل پر ماحول پر یکلخت ٹینشن چھا گئی۔

"خدا خیر کرے۔" شارمین نے دہل کر دل پر ہاتھ رکھا۔

"خدا جانے لوگوں کو غرور کس بات کا ہے؟" زیمان نے کنکھیوں سے انوشے کی طرف دیکھا۔

"زیمان کے بچے۔ اگر تم نے میرا نام لیا تو میں تم سے بری طرح پیش آؤں گی۔ ذرا سا معاملہ گڑبڑ ہو تم سب کا نزلہ مجھ پر گرتا ہے۔" وہ بری طرح جز بز ہو رہی تھی۔ سخت گرم تھی۔

"میں نے بھلا تمہارا نام کب لیا؟" اس کے ہتھے سے اکھڑنے پر زیمان گڑبڑا گیا۔

"اوفوہ بھئی۔۔۔ یہ تم دونوں نے کیا لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔ جب بھی کہیں جانے کا پروگرام ہو۔۔۔ بدمزگی ضرور پیدا ہوتی ہے۔" اشعر بیچ بچاؤ کرانے آگے بڑھا۔

"لڑائی تو جیسے میں نے شروع کی تھی نا۔۔۔ سب ہی کو مجھ سے پرخاش ہے تو میں نہیں جاتی ایک میرا وجود سب ہی کو کھٹکتا ہے۔" انوشے آنکھوں میں امڈتی نمی کو چھپانے کو اندر بھاگ گئی۔

"لو جی۔۔۔ سارا پروگرام ٹائیں ٹائیں فش۔۔۔ اب کیا خاک مزا آئے گا۔ ادھر جیری بھائی خفا ہو کر نکل گئے۔ ادھر انوش بی بی نے ہری جھنڈی دکھا دی۔ رہ گئے ہم بے چارے جو محض ان دونوں اہم شخصیات کے مزاج کے تابع ہیں۔" جودت بھی منہ پھلا کر چلی گئی تو زیمان بولا۔

"چلو چھٹی ہوئی۔"

"تو کیا آج کا ہمارا پکچر کا پروگرام ختم۔" مانیا افسردہ لہجے میں بولی۔

"تمہیں اگر چلنا ہے تو میرے ساتھ چلو۔" زیمان کی آنکھوں میں بہت کچھ تھا۔ مانیا کے دل کی دھڑکنیں خوامخواہ منتشر ہو گئیں۔ پچھلے کئی دنوں سے زیمان اسے اچھا لگنے لگا تھا اور خود اس نے بھی محسوس کیا تھا۔ زیمان کی آنکھوں میں اسے دیکھتے ہی رنگ مچلنے لگتے ہیں اور لبوں پہ الفاظ آکر رک جاتے ہیں۔ پتا نہیں وہ کیا کہنا چاہتا تھا؟ وہ شاید کوئی پیام سننے کو بے چین تھی۔

"پھر چل رہی ہو نا۔" زیمان نے کچھ دیر کے لیے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ پھر کبھی۔۔۔" وہ سٹپٹائی۔

"ابھی کیوں نہیں۔" وہ بضد تھا۔

"میرے خیال میں مجھے پھوپھو بلا رہی ہیں۔" وہ وہاں سے کھسک لی۔ اشعر اور شارمین خوامخواہ کھانسنے لگے۔

"تو یہاں بڑے بڑے چھپے رستم موجود ہیں۔ ویسے کب سے یہ سلسلہ شروع ہے؟" شارمین کے سوال پر زیمان کھل کر مسکرا دیا۔

"شاید ازل سے۔۔۔

گڈ لک۔۔۔" اشعر بھی مسکرا دیا۔

✲ ✲ ✲

اس خاندان کے بزرگ بڑے ماموں آغا ہمدانی تھے۔ جنہوں نے اس پورے خاندان کو یکجا کر رکھا تھا۔ ان کا وسیع کاروبار ان کے اکلوتے سپوت جرار ہمدانی نے انجینئرنگ کے بعد سنبھال رکھا تھا۔ وہ اپنی لیاقت' قابلیت' مروت اور انسانیت کے سبب سب ہی کا منظور نظر تھا' ہر دلعزیز تھا' بچپن میں اس کی والدہ کے گزر جانے کے بعد چھوٹی پھوپھو نے اس کی پرورش میں کوئی کمی نہ اٹھا رکھی تھی۔ چھوٹی پھوپھو اپنے شوہر کی وفات کے بعد اپنی اکلوتی بیٹی انوشے کے ساتھ تب سے یہیں مقیم تھیں۔ بھائی نے ان کی بہت پذیرائی کی تھی۔ اور جرار نے بھی انہیں اپنی والدہ کا درجہ دے رکھا تھا۔

آغا ہمدانی سے چھوٹے عقیل ہمدانی کی تین اولادیں تھیں۔ زیمان' شارمین اور جودت۔ زیمان تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا۔ شارمین نے انوشے کے ساتھ ہی بیچلرز کیا تھا جبکہ جودت ایف اے میں تھی۔ اس کے بعد بڑی پھوپھو کا نمبر تھا۔ بڑی پھوپھو کے شوہر کا کینیڈا میں کاروبار تھا وہ زیادہ تر وہیں رہتے تھے اس لیے وہ اپنے بچوں اشعر' عمیر' مانیا اور عمر کے ساتھ پاکستان میں ہی رہنے لگی تھیں۔ مگر بڑے ماموں نے انہیں کہیں اور رہنے نہیں دیا۔ اپنے بڑے سے بنگلے میں بھی گنجائش تھی اور ان کے اپنے دل میں بھی۔ اسی سبب انہوں نے ان سب خونی رشتوں کو ایک چھت تلے جمع کر رکھا تھا۔

اس دن موسم قدرے سرد تھا۔ بارش تھم چکی تھی۔ گہری گہری کالی گھٹاؤں نے ابھی بھی آکاش کی وسعتوں میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ فضا میں مدھم سا اندھیرا رچا بسا تھا۔ برآمدے کے چکنے ستونوں سے لپٹی عشق پیچاں کی بیلوں سے خوب صورت کاسنی پھول ٹوٹ ٹوٹ کر برآمدے کے پھسلتے فرش پر آن گرے تھے اور اب نم آلود ہوائیں انہیں یہاں وہاں لڑھکا رہی تھیں' ایسے میں بڑھتی ٹھنڈ سے بے نیاز انوشے سویٹر سے بے نیاز سیڑھیوں پر بیٹھی بہت خاموش خاموش اور خالی الذہن سی تھی۔

زندگی کے اس ڈھب کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

جس شخص سے اس کی زندگی منسوب تھی۔ اس شخص سے اس کی ایک لمحے کو بھی نہیں بنتی تھی۔ وہ پہلے ہی مرد ذات سے متنفر تھی۔ اور یہ مرد جس کے ہاتھ میں اس کی زندگی کی ڈور سونپ دی گئی تھی' ہرگز قابل اعتماد اور قابل بھروسہ نہیں تھا۔ اپنی بھنورا صفت فطرت کے زیر اثر اسے نئی نئی دوستیاں گانٹھنے کا شوق تھا۔ اس کا کھلم کھلا مظاہرہ وہ جودت کے ساتھ دیکھ چکی تھی۔

اور اب بالکل نئی اطلاع زیمان نے اسے فراہم کی تھی۔

"جانتی ہو انوش۔ جرار کا زیادہ وقت آج کل کہاں گزرتا ہے۔ وہ آج کل دیر سے گھر کیوں آنے لگا ہے۔"

زیمان نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا تھا۔

"یہ ان کا سراسر ذاتی معاملہ ہے۔"

اس کے انداز میں لاپروائی کے ساتھ ساتھ گہری سنجیدگی بھی تھی۔

اس کی سوچ سے وہ کہاں آتا جاتا ہے۔ وہ اپنا وقت کہاں گزارتا تھا۔ وہ کتنی دیر گھر سے باہر رہتا ہے۔ اسے کوئی پروا نہیں۔ پروا وہاں کی جاتی ہے جہاں کوئی دلی وابستگی ہو۔

"یہ تمہارا بھی ذاتی معاملہ ہے انوشے"

"کیوں بھلا؟"

انوشے نے تیوریاں چڑھالیں۔

"اس لیے کہ تم جرار کی ذات سے منسوب ہو۔ وہ تمہارا شوہر ہے اور تمہیں اس کی ہر حرکت پر کڑی نظر رکھنی چاہیے۔ وہ کس کس سے ملتا ہے؟ وہ کن لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔ اس کی کتنی لڑکیوں سے دوستی ہے۔"

"پلیز زیمان۔۔۔ میرا دماغ خراب مت کرو۔" اس کے سر میں درد ہونے لگا۔

"زندگی خراب ہونے سے بہتر دماغ کا خراب ہونا ہے۔ جانتی بھی ہو۔ جیری کی آج کل ایک لڑکی شیما سے بڑی دوستی ہے۔ دونوں رات گئے تک موبائل پر لگے رہتے ہیں۔ وہ اس کے لیے بے حد سنجیدہ ہو رہا ہے اور کوئی پتا نہیں، وہ مستقبل میں اس کے ساتھ کوئی سنجیدہ تعلق قائم کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے۔"

اس کی بات پر جیسے انوشے کے دل پر گھونسا سا پڑا۔

"تمہیں کیسے پتا؟"

اسے اپنی ہی آواز دور کسی پہاڑ کی چوٹی سے آتی محسوس ہوئی۔

"مجھے بھلا کیسے پتا نہ ہوگا۔ محترمہ میں اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتا ہوں۔ اور پھر جرار نے میری موجودگی میں اس لڑکی کے لیے ایک عدد ڈائمنڈ کی بیش قیمت رنگ بھی خریدی ہے۔"

زیمان نے لحہ بھر کو رک کر اس کے چہرے کے بدلتے رنگ کو دیکھا تھا۔

"لڑکی ابھی بھی وقت ہے۔ تم اس شخص کو پلو سے باندھ کر رکھو ورنہ تاحیات سر پکڑ کر روؤ گی۔ شاید تمہیں اندازہ نہیں۔ جرار کی شاندار شخصیت پر لڑکیاں مکھیوں کی طرح بھنبھناتی ہیں اور دوسرے موصوف بھی کچھ دل پھینک واقع ہوئے ہیں۔"

اس کی ساری باتیں انوشے کے اندر تیرین کر کھب گئیں۔

اچھا تو ایک جودت پر اکتفا نہیں۔ وہ گھر سے باہر بھی لڑکیوں سے دوستیاں گانٹھتا پھرتا ہے۔

زیمان کے انکشاف نے جیسے اس کے ہاتھ پاؤں مفلوج کر دیے تھے۔

اگر اس کا بس چلے تو وہ ساری زندگی اس شخص کی صورت نہ دیکھے۔ اس پر ایک دم ہی جیسے بے تحاشا تھکن طاری ہو گئی۔ کتنی دیر تک وہ یونہی تصویر کی مانند ساکت جمی رہی۔ اپنے اندر کی آوازوں سے پریشان جو مسلسل اس کی نفی کر رہی تھیں۔

"تم جھوٹ کا سہارا لیے ہوئے ہو انوشے۔ تم اگر چاہو بھی تو اس شخص سے منہ نہیں موڑ سکتیں۔ جس تعلق نے تم دونوں کو ایک ڈور میں باندھ رکھا ہے، وہ تعلق تمہیں بہت عزیز ہے۔ یہ تم خود پر خول چڑھائے کیوں پھرتی ہو۔ تم مان کیوں نہیں لیتیں تم چپکے چپکے اسے سوچتی ہو۔ تنہائیوں میں اس سے باتیں کرتی ہو۔ تم نے اس کی ذات کے حوالے سے بہت سے خواب دیکھے ہیں۔ مگر تم ماننے کو تیار نہیں۔

آخر تم خود کو کب تک دھوکے میں رکھو گی۔"

اس کے اندر کوئی ہیولا مدھم آواز میں چلا رہا تھا۔

"سب بکواس ہے۔ بھلا میں خود کو دھوکے میں کیوں رکھنے لگی۔" اس نے پھر سے اس ہیولے کی آواز کو دبانے کی کوشش کی۔ مگر وہ آواز جیسے تیز تر ہو گئی۔

"اگر یہ دھوکا نہیں تو پھر تمہاری آنکھوں میں ویرانیوں نے کیوں ڈیرے ڈال لیے ہیں۔ تم اس شخص کو جودت کے ساتھ ہنستے بولتے کیوں برداشت نہیں کر سکتیں اور یہ جو نئی لڑکی کا قصہ زیمان سنا کر گیا ہے۔ وہ تمہیں کیوں ہضم نہیں ہو رہا۔ کیوں بھلا"

وہ اپنے اندر کی آوازوں سے جیسے نڈھال سی ہو گئی۔ دفعتا" اس کا دل کیا وہ یہیں ستون سے لگ کر رونے لگے۔ اپنا سارا غبار، سارا اضمحلال باہر نکال پھینکے۔ اپنی ساری بے چینیاں آنسوؤں کے سیلاب میں بہا دے اور۔۔۔

دفعتا" وہ تیز روشنیوں کی بوچھاڑ میں نہا سی گئی۔ جرار کی گاڑی اس کے عین سامنے پورچ میں آن رکی تھی۔ وہ گاڑی لاک کر کے اس کی طرف آ رہا تھا۔

انوشے نے ذرا گردن ترچھی کر کے دوبارہ اسی زاویے پر کر لی تھی۔ سفید پل اوور اور بلو جینز میں وہ بہت شاندار لگ رہا تھا۔ سیاہ بال بکھرے بکھرے سے تھے اور بڑی بڑی بھوری آنکھوں کی جگمگاہٹوں میں تھکن کے آثار تھے۔

وہ تن سی اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔ وہ اس وقت اس کا سامنا کرنے کے موڈ میں قطعی نہیں تھی یکلخت اس کا دل چاہا۔ وہ وہاں سے بھاگ لے۔ مگر جرار نے اس کے سر پر پہنچ کر اس کے بھاگ نکلنے کا ارادہ ملیامیٹ کر دیا۔

وہ عین اس کے سر پر کھڑا اسے گھورتی نظروں سے دیکھتا اس کا سکون تباہ کیے دے رہا تھا۔ انوشے نے سر تک اوپر اٹھایا نہیں گیا۔

بھلا اس شخص کی زندگی میں دوسری لڑکیوں کے ہوتے ہوئے اس کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔

اس خیال نے جیسے اس کا حلق تک کڑوا کر دیا۔ وہ غصہ ہونے کی بجائے ڈیپریس ہو گئی۔

"تم اتنی سردی میں یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟" وہ سخت لہجے میں بازپرس کر رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"سوئیٹر کیوں نہیں پہنا؟ کیا مرنے کا ارادہ ہے۔"

اس کے لہجے کے ساتھ ساتھ چہرے پر بھی سختی ہویدا ہو گئی۔

"چاہے میرا جو بھی ارادہ ہو۔ آپ کو اس سے مطلب؟ براہ کرم آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ مجھے آپ میں رتی برابر بھی دلچسپی نہیں۔"

"دیکھو۔ میں نے تمہاری دلچسپیوں کے بارے میں استفسار نہیں کیا۔ تم فورا" اٹھو اور اندر چل کر ہیٹر کے پاس بیٹھو۔ کمال ہے کسی نے بھی نوٹس نہیں لیا کہ تم اتنی سردی میں باہر ہو۔ بغیر سوئیٹر کے تم نے نمونیہ کروانا ہے کیا؟"

وہ سارے سلگتے خیالات پس پشت ڈالے صاف آواز میں کہہ رہا تھا۔

"اچھا ہے جان چھوٹے گی"

"کس کی؟" اس کے چور لہجے پر وہ ٹھٹک سا گیا۔

"آپ کی مجھ سے اور میری آپ سے۔"

وہ کیا باور کروا رہی تھی۔ یہی کہ وہ اس سے سخت تنگ آ چکی۔ اس سے بے زار ہو چکی۔ وہ مسلسل اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش میں تھا۔

"دیکھو مجھے فضول کی بک بک پسند نہیں۔ اگر تم فورا" نہ اٹھیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

"آپ سے برا کوئی ہے بھی نہیں۔"

یہ جملے انوشے کی زبان کے اردگرد بڑی شدت سے بل کھائے تھے مگر خود پر ضبط کرتے وہ چپ رہ گئی۔ وہ چاہتی تو اس کے منہ پر اس کی سچائیاں اچھال دیتی۔

"آپ کون ہوتے ہیں مجھ پر فضول کا رعب جمانے والے۔۔۔ اپنا یہ رعب ان لڑکیوں کے لیے بچا رکھیں جنہیں آپ بے وقوف بناتے پھرتے ہیں۔ کم از کم میں آپ کے ہاتھوں بے وقوف بننے کو تیار نہیں۔"

وہ ایک بھی لفظ منہ سے نکالے بغیر اٹھی اور کھٹ کھٹ کرتی اپنے کمرے میں چلی آئی ذہن مسلسل کھول ابل رہا تھا۔

وہ بھلا اس شخص کا رعب کاہے کو جھیلے۔ وہ بغیر سوئیٹر کے پھرے یا بغیر شال کے۔ جبھی جرار ہمدانی نے اندر جھانکا اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا۔ وہ اسے

چیک کرنے کو اس کے تعاقب میں چلا آئے گا۔
"تم نے ابھی تک سویٹر نہیں پہنا؟" وہ سانس روکے بیٹھی رہ گئی۔
وہ ہزار کوششوں کے باوجود اس شخص کے سامنے اپنا اعتماد کھو بیٹھتی تھی۔ وہ اس کی نگاہوں کی حدت یہاں سے بھی محسوس کر سکتی تھی۔ اسے لگا اگر اس نے مزید حجت کی تو سامنے کھڑا شخص اسے کچا چبا جانے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔
"کان خراب ہیں تمہارے سنائی نہیں دے رہا کیا؟" اس کی غراہٹ رونگٹے کھڑے کر دینے والی تھی۔
"وہ سویٹر نہیں مل رہا۔" اس نے گھگیائے انداز میں کہا۔ جان بچانے کو یہی بہانہ سمجھ میں آیا۔
"کیسے نہیں مل رہا۔" وہ غصے سے اس کی وارڈ روب کی طرف بڑھا۔ دونوں پٹ کھول کر اندر جھانکا۔ یہ بالکل سامنے دو تین سویٹر ہینگر پہ لٹک رہے تھے۔
"یہ کیا ہے؟" ایک سویٹر ہینگر سے کھینچ کر اس کی طرف اچھال دیا۔
"جھوٹ بھی بولتی ہو۔"
"جھوٹ نہیں بول رہی۔ نظر ہی نہیں آیا۔" وہ چڑ گئی۔ ہر وقت ہٹلر بنا رہتا ہے یہ شخص۔
"آئندہ مجھ سے غلط بیانی سے کام لیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" وہ باہر نکل گیا اور وہ سوچتی رہ گئی۔
"انتہائی ان کلچرڈ اور ال مینرڈ ہے یہ شخص۔ دماغ کی چولیں تک ڈھیلی کر ڈالیں۔ اس شخص کی موجودگی میں چند ساعتیں بھی گزارنا دو بھر ہو جاتا ہے۔ جانے پوری زندگی کیسے گزرے گی؟" وہ بے دم سی بیڈ پر گر گئی۔

☼ ☼ ☼

اور پھر اشعر اور شارمین کو شادی کا شور بلند ہوا۔
اشعر تعلیم سے فارغ ہو کر کینڈا جانا چاہ رہا تھا۔ پھوپھا جان نے انہیں وہاں اپنے بزنس کو سنبھالنے کے لیے بلایا تھا۔ بڑی پھوپھو راضی تھیں لیکن وہ اشعر کو وہاں تنہا بھیجنے کے حق میں نہیں تھیں۔ اشعر لاکھ فرمانبردار سہی۔ مگر مغربی ماحول پھر بھی اثر انداز ہو جاتا ہے۔ اس خیال کے تحت انہوں نے آغا ہمدانی سے بات کی تو انہوں نے اشعر اور شارمین کی شادی اسی مہینے کے آخر تک رکھ دی۔ نوجوان پارٹی نے سنا تو دانتوں میں انگلی دبالی۔
"اتنی جلدی شادی۔" مانیا حیرت سے بولی۔
"دعا کرو۔ ہماری شادی بھی یونہی اچانک قرار پا جائے۔" زیمان نے شوخ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ بری طرح جھینپ گئی۔ اور پھر اس کی بات نظر انداز کرتے بولی۔
"اف میں تو سوچ سوچ کر پاگل ہو رہی ہوں کہ شارمین میری بھابھی بنے گی۔ خدایا کتنا مزا آئے گا۔ خوب ہنگامہ خوب ہلا گلا رہے گا۔"
"اور سنو شارمین۔ تم اپنی شادی کی ساری شاپنگ میرے ساتھ کرو گی۔" انوشے نے فوراً پلان بنا لیا۔
"اونہوں اب شارمین کو کہیں بھی آنے جانے کے لیے میری اجازت درکار ہو گی۔" اشعر شرارت سے مسکرایا۔
"کیوں...؟" انوشے نے ماتھے پہ بل ڈال لیے۔
"ابھی شادی نہیں ہوئی اور مردذات والی اکڑ بازی شروع ہو گئی۔ شارمین تمہاری باندی تو نہیں جو اسے کہیں آنے جانے کے لیے تم سے پوچھنا پڑے۔ اس طرح تو تم اس کی زندگی جہنم بنا دو گے۔"
"سیز فائر یار... یہ تم ہر وقت بمباری کے موڈ میں کیوں رہتی ہو۔" اشعر نے بوکھلا کر کانوں کو ہاتھ لگائے۔
"تم جیسے مردوں کی طبیعت صاف کرنے کو اس قسم کی بمباری کی ضرورت ہے۔" انوشے سلگتے لہجے میں بولی... اور پھر شارمین کی طرف گھومی۔
"سنو شارمین تم شادی کے بعد اس اشعر کے رعب میں بالکل مت آنا۔ یہ کوئی پرانا دور نہیں ہے۔ کمپیوٹر کا دور ہے جہاں مرد اور عورت برابر ہیں جہاں دونوں کو اپنے اپنے حقوق کا پتا ہے۔"
"شارمین کو تو مشورہ دے رہی ہو اور اپنے بارے

میں کیا خیال ہے۔ جیری تو خالصتاً" فرمانبردار بیوی چاہتا ہے۔ جس کے منہ میں زبان نہ ہو اور جو شوہر کے ہر حکم پر سر جھکانا اپنا ایمان سمجھتی ہو۔" اشعر کی بات پر اسے پتنگے لگ گئے۔
"تو پھر اپنے جیری صاحب سے کہو کہ وہ کسی گائے سے شادی کر لیں۔" اس کی بات پر زیمان قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ جبکہ اندر آتے جیری کو انوشے کی بات سخت ناگوار گزری۔
"اور اگر میں تمہیں ہی گائے بنا لوں تو۔"
"تو منہ کی کھانی پڑے گی۔" انوشے ترکی بہ ترکی بولی۔
"مولا بچانا یہ خواتین تو پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتی ہیں۔"
زیمان نے ماحول کی تلخی کو معدوم کرنے کے لیے مزاحیہ انداز میں کہا۔ مگر تبھی آغا ہمدانی کو دروازے پر دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ ان کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں اور چہرے پر غصہ واضح انداز میں ثبت تھا۔ یقیناً" انہوں نے انوشے کی بدتمیزی دیکھ لی تھی۔ وہ بھی اپنے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے جرار ہمدانی کے ساتھ انہیں جیسے اس لڑکی کی سوچ اور انداز پر بہت صدمہ ہوا تھا۔ وہ ایسی باغیانہ سوچ کی مالک ہو گی۔ اس کا انہیں قطعی اندازہ نہیں تھا۔ اگر انہوں نے جلد از جلد کوئی فیصلہ نہ کیا تو وہ لڑکی بالکل ہی ہاتھوں سے نکل جائے گی۔ اشعر اور شارمین کی شادی کے بعد روزے ہیں اور پھر عید۔ وہ عید کے فوراً" بعد جرار اور اس لڑکی کی شادی کر دیں گے۔
انہوں نے آن واحد میں فیصلہ کر لیا اور خاندان کے بزرگوں کو اپنے کمرے میں بلوا بھیجا۔
"کوئی اہم فیصلہ ہونے والا ہے۔" جودت بولی تو عمیر نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔
"لگتا ہے بڑے ماموں کو کوئی بات سخت ناگوار گزری ہے اور جہاں تک میرا اندازہ ہے انہوں نے انوشے کی بکواس کا برا منایا ہے۔"
"تم تو گئیں کام سے انوش۔"
زیمان نے پہلے سے ڈری سہمی انوشے کی طرف دیکھا جس کا رنگ سرسوں کے پھول کی مانند زرد ہو رہا تھا۔ وہ سخت رونکھی ہو رہی تھی۔ اس نے صاف دیکھا تھا۔ اس کی اشعر کے ساتھ بحث اور بعد ازاں جرار کے ساتھ بدتمیزی پر بڑے ماموں کا مزاج بگڑا تھا۔ پتا نہیں وہ کب سے اس کی بک بک سن رہے تھے۔ وہ بھی تو غصے میں جو جی چاہے منہ سے نکال دیتی تھی۔ ذرا بھی لحاظ نہیں کرتی تھی۔ اور اب اس بدلحاظی کا خمیازہ تو اسے بھگتنا ہی پڑے گا۔
بہت سے آنسو اس کی آنکھوں میں جھلملائے... لیکن وہ خود کو مضبوط ظاہر کرنے کی کوشش میں خواہ مخواہ دوپٹا انگلیوں پر لپیٹتی کھولتی رہی۔ اس طرح مصروف ہاتھ خود کو سنبھال لینے میں بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔
مانیا آئی تھی۔ وہ بڑے ماموں کے کمرے کی کھڑکی سے اندر کی ساری روداد سن آئی تھی۔
"مبارک ہو۔" اس کا انداز بڑا سنسنی خیز تھا۔
"کس بات کی" سب کی مشترکہ آواز ابھری۔
"جیری بھائی اور انوشے کی شادی عید کے بعد ہونا قرار پائی ہے۔ یعنی پورے ڈھائی مہینے ہیں۔" مانیا کی بات پر انوشے کا دل گھبرا گیا۔
"شادی۔"
اس کا چہرہ یکلخت سفید پڑ گیا۔ جیسے قربانی کے بکرے کو ذبح کرنے کے لیے قربان گاہ کی طرف لایا گیا ہو۔ وہ اپنی قسمت سے سخت نالاں تھی۔ اس قسمت نے کبھی اس کا ساتھ نہیں دیا۔ اس قسمت نے ہمیشہ اس کی مرضی کے خلاف فیصلہ کیا ہے۔ پہلے اس سخت گیر شخص سے نکاح اور اب اس کے سنگ رخصتی۔ وہ مایوسیوں کے اندھیروں میں گھری تھی۔ وہ خود یہ ظلم ہرگز ہرگز نہیں ہونے دے گی؟ وہ صدائے احتجاج بلند کرے گی۔ اور
"میں یہ شادی بالکل نہیں کروں گی۔" اس نے اپنی سوچ کو الفاظ کا جامہ پہنایا۔ چہرے پر چھائی زردی کو چھپانے کے لیے وہ باقاعدہ مسکرائی تھی۔

"بڑے ماموں کے سامنے تمہیں انکار کی جرات ہے بھلا۔" مانیا بولی۔

"کیوں بڑے ماموں کیا سولی پہ چڑھا دیں گے۔"

وہ بڑے ماموں سے بات کرنے ان کے کمرے میں آئی تو باقی سب اندر کی کاروائی جاننے کے لیے اس کے تعاقب میں پیچھے چلے۔

"Best of luck" زیمان نے اس کی ہمت بندھائی۔

وہ بہت مرجھائی ہوئی تھی اور آنکھوں میں خوف چھپا تھا۔ وہ جتنی ہمت جمع کر کے بڑے ماموں کے کمرے میں آئی تھی' انہیں سامنے دیکھ کر ہی ہوا ہو گئی۔ دفعتا" اس کا دل چاہا۔ وہ الٹے پیروں لوٹ جائے مگر یوں پیٹھ دکھانے کا مطلب تھا وہ ساری زندگی کے لیے اپنے لیے سزا تجویز کر لے۔

کھٹکے کی آواز پر بڑے ماموں کے ساتھ ساتھ اماں نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ اماں ان کے کمرے میں اس کی شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں محو گفتگو تھیں۔

"کہو۔" آغا ہمدانی نے اسے بغور دیکھا۔ وہ سفید پڑتے چہرے کے ساتھ کھڑی رہ گئی۔

"کچھ کہنا ہے کیا؟" انہوں نے خود ہی اس کی مشکل آسان کر دی۔

"جی۔"

"بولو۔"

"میں یہ شادی نہیں کر سکتی۔" اس کے منہ سے نکلنے والے فقرے نے جیسے آغا ہمدانی کو دھچکا سا لگایا۔

"گستاخی مت کرو انوشے۔" اماں نے اس کی گستاخی پر اسے آنکھیں دکھائیں۔

"جاؤ یہاں سے۔"

"میں بڑے ماموں سے بات کرنے آئی ہوں۔ مجھے ان کے فیصلے سے اختلاف ہے۔ میں فی الوقت شادی نہیں کرنا چاہتی وہ بھی جرار ہمدانی سے۔ میری اس شخص سے ذرا بھی نہیں بنتی اور۔۔۔"

"خاموش ہو جاؤ لڑکی۔" اس کی بدتمیزی اور دیدہ دلیری پر بڑے ماموں نے گرج کر کہا تو باہر کھڑے سبھی نفوس دم سادھے ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

"انوشے کا اندر جانے کا فیصلہ ہی غلط تھا۔" ان سب کی مشترکہ رائے تھی۔۔۔ اندر سے آغا ہمدانی کے تیز تیز بولنے کی آواز آ رہی تھی۔

"میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ تم اس قدر گستاخ اور بدتہذیب ہو جاؤ گی۔ بے ادب ہمارے فیصلے سے ٹکرانے چلی ہو۔ ہم تمہاری رخصتی کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ میں جرار کو خاص تاکید کروں گا کہ وہ تم جیسی بدتمیز اور بے لگام لڑکی کو لگامیں ڈال کر رکھے۔ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو اتنی چھوٹ نہیں کہ وہ بزرگوں کے سامنے زبان چلاتی پھریں اور اپنی شادی کے فیصلے خود کرتی پھریں۔" وہ بہت غصے میں تھے۔

جوابا" انوشے کی سسکیاں ابھریں۔

"اب تم جا سکتی ہو۔"

"اماں۔" اس نے رحم طلب نظروں سے اماں کو دیکھا۔

"تم جاؤ یہاں سے۔" اماں بولیں۔

"اماں آپ بھی۔۔۔"

وہ برستی آنکھوں سمیت وہاں سے بھاگ آئی۔ اس کا جوڑ جوڑ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ اس نے باہر کھڑی پبلک کی جانب بھی نہیں دیکھا اور اپنے کمرے میں آ کر بستر پر اوندھی پڑ گئی اور ہچکیوں سمیت رونے لگی۔ اپنی بے بسی اور بڑے ماموں کی سفاکی پر اسے رنج تھا۔

بڑے ماموں کا ناروا رویہ اور سخت فیصلہ اس کے لیے بہت اذیت ناک تھا۔ کیا اس لمحے موت اس کا مقدر نہیں بن سکتی۔ زندگی بہت کٹھن ہے اور وہ بہت نازک۔

"انوش پلیز خود کو سنبھالو۔" شارمین اس کے پیچھے آ گئی۔

"کیسے سنبھالوں بڑے ماموں نے تو مجھے موت کا فیصلہ سنا دیا۔" وہ مزید رونے لگی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو گا۔ تم دیکھ لینا شارمین۔ میں مر جاؤں گی اور کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہو گی۔" اس کی آنکھوں سے آنسو جھر جھر بہنے لگے۔

"اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔ تم فی الوقت اپنا موڈ خراب نہ کرو اور خود کو سنبھالو۔ ابھی تو اشعر بھائی اور شارمین کی شادی کو انجوائے کرو۔۔۔ صرف دو ہفتے باقی ہیں اور ڈھیروں تیاریاں کرنی تھیں۔"

مانیا بھی اندر آ کر اسے سمجھانے لگی۔

"اچھا اب اس حجرے سے باہر نکلو اور ہمارے ساتھ شاپنگ پر چلو۔ ہم سب میں تمہاری چوائس شاندار ہے۔ اور سنو میرا برائیڈل ڈریس بھی تمہاری پسند کا ہو گا۔" شارمین بولی تو وہ مسکرا دی۔

"مانتی ہو ناں پھر میری پسند کو۔"

"سو فیصدی۔" اور پھر دو ہفتے بہت مصروف گزرے۔ خریداری اور شادی کی تیاریوں میں نہ وقت گزرنے کا پتا چلا اور نہ ہی کوئی سلگتا خیال انوشے کے قریب پھٹکا۔ اس نے مکمل طور پر اپنے ذہن کو شارمین کی شادی کی طرف لگا دیا تھا۔ یوں قبل از وقت گھل گھل کر خود کو ختم کرنے سے فائدہ جب وقت اور موقع آئے گا تو دیکھا جائے گا۔

☼ ☼ ☼

اس شام مہندی تھی۔ سارا انتظام لان میں کیا گیا تھا۔ رنگ و بو کا سیلاب برقی قمقموں میں بہت فسوں خیز لگ رہا تھا۔ بہت سے مہمان آ چکے تھے اور بہت سے ابھی آنا باقی تھے۔ گھر بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ رنگ برنگے قمقموں کے ہار اونچے اونچے قد آور درختوں کے گلے کی زینت بنے ہوئے تھے۔ ہری بھری گھاس پر سرخ ایرانی قالین صوفے اور کرسیوں سے مزین تھے۔ درختوں کے ملگجے سایوں سے مسحور کن روشنیاں جھانک رہی تھیں۔ بزرگ حضرات آغا ہمدانی کے ہمراہ مہمانوں کے استقبال میں مصروف تھے۔ جرار ہمدانی بھی ان کا ساتھ دے رہے تھے جبکہ ساری لڑکیاں ڈھولک کے گرد بیٹھی تالیاں پیٹتے ہوئے گلا پھاڑ پھاڑ کر مہندی کے گیت گا رہی تھیں۔ لڑکے بھی ان کا پورا پورا ساتھ دے رہے تھے۔

سکھیوں مہندی سے لکھ دو ری ہاتھوں پے
میرے سانوریا کا نام۔۔۔

مانیا گا رہی تھی اور زیمان بڑی شوخ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ تبھی وہ اس کے کان میں جھک گیا۔

"اگر کہو تو اپنے نام کی مہندی جلد از جلد تمہارے ہاتھوں پر لگوا دوں۔"

"جی نہیں۔" حیا کی لالی اس کے گالوں پر بکھر گئی۔

"اس انکار کو اقرار سمجھوں کیا؟"

"پتا نہیں۔"

"تو پھر کسے پتا ہے۔"

"یہ بھی پتا نہیں۔" وہ سٹپٹائی اور یکلخت جانے کو اٹھی۔

"کہاں چلیں۔" زیمان نے اس کا آنچل تھام لیا۔

"ذرا انوشے کو دیکھ لوں۔۔۔ اندر کسی کام سے گئی تھی۔" مانیا دھک دھک کرتے دل سمیت جان بچا کر اندر کی طرف لپکی۔ پہلے انوشے کے کمرے میں جھانکا۔ انوشے وہاں نہیں تھی۔ پھر لاؤنج اور ڈرائنگ روم میں دیکھا اور تبھی پچھلی صحن سے انوشے کے تیز تیز بولنے کی آواز کانوں میں پڑی۔

"آپ کیا سمجھتے ہیں۔ بڑے ماموں نے میری رخصتی کی تاریخ رکھ دی ہے تو کیا میں خاموشی سے ان کے حکم پر سر جھکا دوں گی۔ میں نے کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں۔ اور آپ یہ بے جا رعب کسی اور پر جمائیے۔ ابھی مجھ پر آپ کا کوئی حق نہیں میں۔۔۔"

"مکمل حق ہے۔ تم میری منکوحہ ہو۔" جوابا" جرار ہمدانی کی غراتی آواز ابھری۔ مانیا پریشان ہو گئی۔

"خدایا یہ جرار بھائی یہاں پچھواڑے کیا کر رہے ہیں۔ یہ تو بزرگوں کے ساتھ گیٹ پر مہمانوں کے استقبال میں مصروف تھے۔ اور یہ انوشے ہر وقت ان کے ساتھ کیوں الجھتی رہتی ہے۔ مجال ہے جو کبھی سیدھے منہ ان سے بات بھی کر لے۔ جب دیکھو تو تو میں میں' اس قدر دشمنی اور عناد میں بھلا ان دونوں کا

رشتہ کیسے پنپ سکتا ہے۔ جب دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت نہیں 'عزت نہیں تو پھر۔۔۔"

مانیا مزید کچھ نہ سوچ سکی۔ انوشے کی چیختی آواز نے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا تھا۔

"جس تعلق کی بنیاد پر آپ ہر وقت مجھے نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں وہ تعلق کچھ ایسا مضبوط بھی نہیں کہ ٹوٹ نہ سکے 'میں خوامخواہ کا طوق گلے میں لٹکانے کے حق میں بالکل نہیں۔ اگر آپ بڑے ماموں سے انکار نہیں کریں گے تو میں انکار کردوں گی۔"

"بصد شوق مگر یاد رکھو۔ منہ کی کھاؤ گی۔"

جرار ہمدانی کے ٹھنڈے لہجے میں بلا کی تپش تھی۔ ایسی تپش جو مقابل کو جلا کر بھسم کر ڈالے اور انوشے تو بالکل راکھ ہو گئی۔

"منہ کی تو آپ کھائیں گے۔ مجھ پر ساری زندگی رعب جمانے اور مجھے دبا کر رکھنے کا آپ کا منصوبہ ملیا میٹ ہو جائے گا۔ آپ مجھے کمزور تصور نہ کیجیے گا۔" وہ ذرا بھی دبتی نہ لگ رہی تھی۔

جرار ہمدانی بے پناہ تلخی اور جھلاہٹ سے دو قدم آگے بڑھا اور اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر دو تین جھٹکے دے ڈالے۔ اس کی آہنی انگلیاں جیسے انوشے کے بازوؤں میں پیوست ہو گئی تھیں۔

"اگر تم کمزور نہیں ہو تو میری گرفت سے آزاد ہو کر دکھاؤ۔"

"چھوڑیں مجھے۔" مارے تکلیف کے اس کی آنکھوں میں آنسو ابل پڑے۔

"مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔"

"بس بہادری کے سارے دعوے دھرے رہ گئے۔ یاد رکھو 'عورت بھلے مرد سے برابری کا پرچار کرتی رہے۔ مگر اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتی کہ اس معاشرے میں قدم قدم پر تحفظ کے لیے اسے کسی مرد کے سہارے کی ضرورت ہے۔ مرد کے تحفظ کے بغیر بھیڑیے اسے نوچ کھائیں گے۔ مرد نہ صرف عورت کی عزت کا رکھوالا ہے بلکہ اسے معاشی طور پر استحکام فراہم کرتا ہے۔"

جرار نے اسے پرے دھکیل دیا۔ ایک دکھ بھرا اضمحلال 'اس کے چاروں اطراف جیسے دھوئیں کی مانند پھیل گیا تھا۔ وہ چاہنے کے باوجود بھی اس لڑکی کو قائل نہیں کر پائے گا اور نہ ہی اس کے دل میں اپنے لیے چاہت کے دیپ جلا سکے گا۔

بیک وقت وہ افسردہ اور شکستہ پا ہو گیا۔

وہ الٹے پیروں پلٹ گیا تھا۔ تبھی مانیا اس کے سامنے آگئی۔

"جیری بھائی سے یوں لڑ جھگڑ کر تم کون سا ایوارڈ حاصل کر لو گی۔ آخر تم ان سے اتنا خار کیوں کھاتی ہو۔"

"بس وہ شخص مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔"

وہ ابھی تک اپنے بازو مسل رہی تھی جہاں اس کی آہنی انگلیوں نے نشان ڈال دیے تھے۔ "جنگلی" وہ بڑبڑائی۔

"دیکھو انوشے تم جیری بھائی سے الجھنا چھوڑ دو۔ اتنی ناقص العقلی کا ثبوت مت دو۔ جیری بھائی سے دشمنی چھوڑ دو۔ وہ تمہارے شوہر ہیں اور جب مہینے بعد تمہاری ان سے شادی ہو جائے گی تو کیا تمہارا موجودہ رویہ اور بدتمیزی کیا تمہاری ازدواجی زندگی پر اثر انداز نہیں ہو گا۔ شادی سے پہلے کی یادیں بڑی اسٹرونگ ہوتی ہیں۔ اور تم نے جیری بھائی کے دامن میں کبھی کوئی خوشگوار یاد نہیں ڈالی اور۔۔۔"

"تم یہاں جیری کی وکالت کرنے آئی ہو۔" انوشے نے اسے تیکھے انداز میں دیکھا۔

"نہیں تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ ہوش کے ناخن لو۔"

اسی دم جودت کی آواز ابھری۔

"بھئی تم دونوں یہاں مصروف گفتگو ہو اور وہاں مہندی کی رسم شروع ہونے کو ہے۔ سبھی تم دونوں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔۔۔ اور مانیا 'زیمان بھائی نے تمہارے بارے میں پوچھ پوچھ کر میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔"

"اوکے ہم آرہے ہیں۔" مانیا نے لان کی طرف قدم بڑھایا تو انوشے نے بھی اس کی پیروی کی۔۔۔ مگر اس کا موڈ بری طرح بگڑا ہوا تھا۔

وہ بے جان سی ایک طرف صوفے پر ڈھے سی گئی۔ اسے نہ مہندی کی رسم سے دلچسپی تھی 'نہ دوسروں کی چھیڑ خانی سے۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ شارمین کو کس کس نے مہندی لگائی ہے۔

وہ جیسے اپنی ہی آگ میں جل رہی تھی۔ اس شادی کے بعد اس کا نمبر ہے۔ پھانسی کا پھندا جیسے اس کے گلے میں آگیا۔

"کہاں گم ہو۔" زیمان نے اس کی آنکھوں کے سامنے انگلیاں نچائیں۔

"کہیں نہیں۔"

"مانیا بتا رہی ہے کہ تمہاری جیری سے اچھی خاصی جھڑپ ہوئی ہے۔" وہ پوچھ رہا تھا۔

"چلو ہم بھی چل کر شارمین کو مہندی لگاتے ہیں۔"

زیمان کی بات کا جواب دینے کی بجائے وہ تیزی سے اٹھ کر شارمین کی طرف بڑھی مگر راستے میں قالین میں ہائی ہیل ایسی الجھی کہ وہ سنبھل ہی نہ سکی۔ گرنے کے خوف سے اس نے اضطراری طور پر کسی نادیدہ شے کو تھامنے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر اس کا ہاتھ فضا میں لہرا کر رہ گیا۔ وہ یقیناً" اوندھے منہ زمین پر آ رہتی اگر دو مضبوط بازوؤں نے اسے سنبھال نہ لیا ہوتا۔ چند لمحے وہ حواس باختہ سی رہی۔ کچھ سوجھائی نہیں دیا 'تبھی جرار کی آواز اس کے کانوں کے قریب سرگوشی کی صورت میں اتر آئی۔

"سنبھل کر چلا کرو۔"

وہ سرعت سے خود کو اس گرفت سے چھڑا کر سیدھی ہو گئی۔ مارے خفت کے چہرہ لال ہو گیا۔

"آپ کو کس نے کہا تھا 'مجھے گرنے سے بچائیں۔" وہ اس پر الٹ پڑی۔

"اگر تم کہو تو تمہیں۔۔۔ دھکا دے کر دوبارہ گرا دوں۔" جواب میں وہ خاصے کڑوے لہجے میں بولا تھا۔

"آپ سے اور امید کیا رکھی جا سکتی ہے۔ میں جانتی ہوں آپ دشمنی 'شان سے نبھانے والوں میں سے ہیں اور اس کا موقع بڑے ماموں نے آپ کو فراہم کر دیا ہے۔" وہ بھی تلخی سے بولی۔۔۔ جرار کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"مطلب۔۔۔؟"

"مطلب آپ بخوبی سمجھ رہے ہیں۔ ہم دونوں کو عمر بھر کے لیے ایک ساتھ نتھی کر کے انہوں نے آپ کو اپنی دشمنی نبھانے کا پورا پورا موقع دیا ہے۔"

"دشمنی میں نبھا رہا ہوں یا تم؟" تمہارا ناروا رویہ تمہاری بدتمیزی سبھی کے سامنے عیاں ہے۔ اور تمہاری اسی زبان درازی اور بداخلاقی کے طفیل بابا جان نے تمہاری شادی کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں شادی کے بعد ہو سکتا ہے تم اچھی بچی کی طرح بی ہیو کرو۔ مگر انہیں کیا معلوم۔ تم ناکوں چنے چبوانے والوں میں سے ہو۔ خدا رحم کرے میرے حال پر۔"

جرار ہمدانی کی اس ساری بکواس کے جواب میں اس نے صرف "ہونہہ" کہا اور ایک غصیلی نظر سامنے کھڑے شخص پر ڈال کر اندر کی جانب بڑھ گئی۔

کاش وہ اس شخص کا گلا دبا کر اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل کر پاتی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن بارات تھی۔ اور وہ بارات پہ اس شخص کا سامنا بالکل نہیں چاہتی تھی۔ شادی ہال میں پہنچتے ہی زیمان کی نظر انوشے پر پڑی تو وہ قریب آگیا۔ مانیا بھی انوشے کے ساتھ کھڑی تھی۔

"تم نبیل سے ملیں انوشے۔ یہ اشعر کے قریبی دوست ہیں اور یہ ان کی والدہ۔" زیمان نے تعارف کروایا تو انوشے نے لبوں پہ مسکراہٹ سجالی۔

"آداب آنٹی۔"

"جیتی رہو بیٹی۔"

"اور آپ کی تعریف۔۔۔؟" نبیل دلچسپی سے مانیا کو تکنے لگا۔

"مجھے مانیا کہتے ہیں۔"

مانیا نے مسکرا کر اپنا تعارف خود کروایا تو نبیل کا دل دھڑک گیا۔ یہ کیوٹ سی لڑکی اس کے دل میں آن واحد

میں اتر گئی تھی۔ نگاہوں اور دل کو بیک وقت اچھی لگی تھی۔ مما اسے دن رات شادی کا کہتی ہیں۔ اگر یہ لڑکی اس کی زندگی میں شامل ہو جائے تو مزا آجائے گا۔ وہ خود کو خوش نصیب تصور کرے گا اور۔۔۔

"مما۔۔۔"

وہ ان کے کان کے قریب جھک گیا۔

"آپ کو بہو کی تلاش ہے ناں۔ اگر آپ اس لڑکی کو اپنی بہو بنالیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"ہوں۔ لڑکی تو واقعی پیاری ہے۔ بس اس ہنگامے کے بعد میں آغا ہمدانی سے بات کروں گی کہ اس ہیرے کو جلد از جلد ہمارے دامن میں ڈال دیں۔" انہوں نے بیٹے کی پسند کو دل سے سراہا۔

"تھینک یو مما۔" وہ یوں خوش ہو گیا جیسے اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔

شادی کے بعد ولیمہ کا فنکشن بھی اختتام پذیر ہوا تو مسز صدیق سوالی بن کر آغا ہمدانی کے سامنے جا پہنچیں۔

"دیکھیے بھائی صاحب۔ مجھے مایوس نہ لوٹائیے گا۔ آپ کے خاندان سے رشتہ جوڑنا میرے لیے عین سعادت ہوگی۔ نبیل اور اشعر کی بچپن سے دوستی ہے۔ اشعر، نبیل کو بخوبی جانتا ہے۔ اس کے عادات و اطوار سے واقف ہے۔ ماشاء اللہ سے اس میں کسی قسم کی برائی نہیں۔" مسز صدیقی امید بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

"ہوں۔ لڑکا مجھے پسند ہے مگر۔۔۔"

"دیکھیے بھائی صاحب کوئی اگر مگر نہیں۔ میں تو مانیا کو اپنی بہو دل سے تسلیم کر چکی ہوں۔ بس آپ ہماری خوشیاں ہماری جھولی میں ڈال دیجیے۔ میں ہر صورت اقرار سن کر جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" ان کے اصرار پر آغا ہمدانی نے حامی بھری۔

"مگر شادی میں ایک سال کی تاخیر ہوگی۔"

"بہت بہت شکریہ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بس آج سے مانیا میری بیٹی ہوئی۔" وہ وفور مسرت سے کانپنے لگیں۔ "تو میں بات پکی سمجھوں۔"

"جی بالکل۔"

آغا ہمدانی مسکرائے تو دروازے پر کھڑی جودت پریشان ہو اٹھی۔

یہ کیا ہو گیا؟ مانیا اور زیمان بھائی تو ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ اسے بھی مانیا اپنی بھابھی کے طور پر بہت پسند تھی۔ مگر یہاں تو آغا جان نے انجانے میں دو دلوں کو دور کرنے کا پروگرام بنا ڈالا۔

وہ تقریباً دوڑتے ہوئے مانیا کے کمرے میں جا پہنچی۔ مانیا وہاں نہیں تھی۔ وہ لان میں آئی تو مانیا وہیں ٹانگیں پسارے کسی میگزین میں منہ دیے بیٹھی تھی۔

"تم یہاں میگزین پڑھتی رہو اور وہاں آغا جی نے غضب کر دیا۔۔۔؟"

"کیسا غضب۔۔۔؟"

"انہوں نے تمہاری شادی اشعر بھائی کے دوست نبیل سے طے کر دی ہے۔ میں خود اپنے کانوں سے سن کر آرہی ہوں۔ نبیل کی والدہ اندر موجود ہیں۔" وہ پھولے سانسوں کے درمیان بولی تو جیسے مانیا کے اعصاب کو ایک زبردست جھٹکا سا لگا۔ اس کے ہاتھوں سے میگزین چھوٹ گیا۔ یہ کیسی روح فرسا خبر سنادی تھی جودت نے۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو جودت۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

"مگر۔۔۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آغا جی ایسا ظلم نہیں کر سکتے۔" وہ روہانسی ہو گئی۔ اگر آغا جی نے اس کی شادی کہیں اور کر دی تو وہ کیسے جی پائے گی۔ زیمان اس کے دل میں رہتا تھا۔ اور وہ اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اور پھر تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ زیمان نے سنا تو وہ دکھی دل سمیت مانیا کے سامنے چلا آیا۔

"نہیں مانیا۔ میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔۔۔ تم صرف میری ہو۔"

"کیوں جھوٹی آس بندھاتے ہو زیمان۔ تمہیں

اچھی طرح معلوم ہے کہ آغا جی کبھی اپنا فیصلہ نہیں بدلتے۔" کتنے بہت سے آنسو اس کے گالوں پر دائیں بائیں لڑھکنے لگے۔

"مگر اس بار انہیں اپنا فیصلہ بدلنا ہوگا۔" وہ اک عزم سے بولا۔

"مگر کیسے؟" اس نے بھیگی بھیگی پلکیں اوپر اٹھائیں۔

"جرار سے کہیں گے۔ وہی اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔"

"وہ گھر پر نہیں ہیں۔ ایک ہفتے کے لیے کراچی گئے ہیں۔" آنسو ایک بار پھر تیزی سے مانیا کی آنکھوں سے ابل پڑے۔

"مجھے یقین ہے کہ جری ہمارے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔"

وہ زیمان کے بازو سے لگ کر ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ وہ بھی بہت دلگیر ہو رہا تھا مگر خود پر ضبط کیے رہا۔

"پلیز مانیا۔ تم تو مجھے ڈرائے دے رہی ہو۔ میری ہمت توڑ رہی ہو۔" اس نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھنسائیں۔

"میں تمہیں صاف طور پر کہے دے رہی ہوں زیمان۔ میں خودکشی کر لوں گی مگر نبیل سے شادی نہیں کروں گی۔"

"پگلی ایسا سوچنا بھی مت۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ آغا ہمدانی نے تو اس کے قدموں سے جیسے زمین ہی کھینچ لی تھی۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ مانیا کے سامنے تو وہ رو بھی نہیں سکتا تھا۔ عورتیں تو رو کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی ہیں مگر مرد روتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔ ایک دم بودے لگتے ہیں۔ اور وہ ہرگز بودا نہیں تھا۔ مگر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کو امی کے سامنے چلا آیا۔

"امی۔" ان کی گود میں سر رکھ کر اس نے اپنی جلتی آنکھیں موند لیں۔

"کیا ہوا بیٹے۔"

"میں تھک گیا ہوں امی۔ کچھ دیر آپ کی گود میں سر رکھ کر سونا چاہتا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے تمہیں کس بات نے تھکا دیا ہے؟ جودت نے مجھے تمہارے اور مانیا کے بارے میں سب بتا دیا ہے اور آغا جی کے فیصلے کے بارے میں بھی۔۔" انہوں نے زیمان کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے کہا۔

"میں، مانیا کے بغیر مر جاؤں گا امی۔ پلیز آپ کچھ کیجیے۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں بیٹے۔ تم جانتے ہو، آغا جی اپنے قول کے کتنے پکے ہیں۔" بیٹے کی آنکھوں میں بھیگا پن دیکھ کر ان کی اپنی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔

"نہیں امی۔۔۔ ایسا مت کہیں۔ آپ بابا سے کہیں۔ وہ آغا جی سے بات کریں۔"

وہ بہت مضمحل تھا۔ دل بار بار ڈوبنے لگتا تھا۔ صرف وہی نہیں بلکہ ہر کوئی اس فیصلے پر اداس تھا۔ پریشان تھا اور بہت دلگرفتہ بھی۔ مگر مانیا کو تو جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔ اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ وہ تکیے میں منہ دیے اشکوں کے چراغ روشن کرتی رہتی۔ انوشے بھی اس کے دکھ میں برابر کی شریک تھی۔ مگر بے بس تھی وہ تو اپنے لیے بھی کچھ نہ کر سکتی تھی۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو بڑے ماموں کے سامنے صاف صاف جرار ہمدانی سے شادی سے انکار کر دیتی مگر ان کے سامنے تو جیسے اس کا پتا پانی ہوتا تھا۔ کاش وہ اتنی بے بس نہ ہوتی۔ کاش وہ اپنے ساتھ ساتھ مانیا کی خوشیوں کے لیے بھی کچھ کر سکتی۔ اب سب کی امیدیں جرار ہمدانی سے وابستہ تھیں کہ وہی واپس لوٹ کر اس سلسلے میں کچھ کرے۔

ہونہہ! تو سبھی نے اسی شخص پہ تکیہ کر لیا، جس سے وہ خار کھاتی ہے۔ جس سے وہ چڑتی ہے۔ اب وہ مزید پھیل جائے گا اور اس کے سامنے اپنی مردانہ شان کی برتری جتاتا پھرے گا۔

کیا ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ جرار ہمدانی کے لوٹنے سے پہلے خود بڑے ماموں سے اس سلسلے میں بات کر لے۔ یہ اس کے لیے بہترین موقع ہے کہ وہ ان سب پر ظاہر کر دے کہ عورت بھی ہر کام اپنے زور بازو پر کر سکتی ہے۔ وہ کسی بھی لمحے، کسی مشکل کے لیے مرد کی محتاج نہیں۔ اگر وہ مانیا کی سلسلے میں بڑے ماموں کو قائل کر لے تو اس کی واہ واہ ہو جائے گی۔ تب وہ بڑی اکڑ سے جرار ہمدانی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہے گی کہ اسے اپنی زندگی گزارنے کے لیے اس کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ وہ زندگی کے کسی موڑ پر اس کی محتاج نہیں۔ نہ اس کے نام کی۔ نہ اس کی ڈھال کی۔ اپنی اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ بڑے ماموں کے کمرے میں جا پہنچی۔

"کہو کوئی کام ہے کیا؟" انہوں نے فائلوں سے سر اٹھا کر سامنے کھڑی لڑکی کی جانب دیکھا۔ جو بے چینی اور اضطراب سے اپنی انگلیوں پر دوپٹا کھول، لپیٹ رہی تھی۔

"میں آپ سے مانیا کے سلسلے میں بات کرنے آئی ہوں۔"

"کیسی بات۔۔۔؟" وہ چونکے۔

"آپ، آپ نبیل سے مانیا کی شادی نہ کریں۔ وہ وہاں خوش نہیں رہ سکے گی۔" اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے جیسے اسے الفاظ بہت مشکل سے سوکھے حلق سے باہر نکلنے پڑے تھے۔ بڑے ماموں کی خشونت بھری آنکھیں پہلے سے ہی اس کا خون خشک کیے دے رہی تھیں۔ اس کی اس نامعقول بات پر تو وہ مزید برہم ہو گئے۔ مگر پھر بھی ضبط سے بولے۔

"بچوں کو بڑوں کے معاملے میں بولنا زیب نہیں دیتا۔ مجھے اس کی خوشی کا پورا پورا احساس ہے۔ تم کوئی تردد نہ کرو۔"

"مگر آپ اس کی خوشیوں پر نقب لگا رہے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کو اپنا فیصلہ بدلنے کی عادت نہیں لیکن اس بار آپ کو مانیا کی خوشیوں کے لیے اپنا فیصلہ بدلنا ہو گا۔ ضروری نہیں کہ آپ کا کیا ہوا ہر فیصلہ درست ہو۔ آپ کو شاید علم نہیں۔ بعض فیصلے انسان کی جان لے لیتے ہیں اور۔۔۔۔"

"بکومت۔" ان کی بڑی بڑی آنکھوں سے غصہ پوری شدت سے جھانکنے لگا۔

"بد تہذیب لڑکی۔ تمہاری اس زبان درازی اور بد تمیزی سے عاجز آکر میں نے تمہاری شادی کا جلد فیصلہ کیا ہے؟ لڑکی تم تو بالکل ہی ہاتھوں سے نکل چکیں۔ دوسروں کی خوشیوں کے لیے خدائی فوجدار بننے سے بہتر ہے کہ تم اپنی شادی کی تیاری کرو۔۔۔ صرف ڈیڑھ مہینے کی بات ہے۔ اس کے بعد تمہاری لگامیں جرار کے ہاتھوں میں ہوں گی۔ مجھے ایسی لڑکیوں سے سخت چڑ ہے جو بزرگوں کے سامنے چرب زبانی کا مظاہرہ کریں۔ اور گستاخ اور ناہنجار ٹھہریں۔"

وہ گرج رہے تھے۔

وہ کانپتے قدموں سے باہر نکل آئی۔

وہ تو خود کو سولی پر چڑھنے کے لیے تیار کر چکی تھی مگر اس بار وہ سر پر کفن باندھ کر مانیا کی خوشیوں کے لیے ان کے سامنے گئی تھی اور منہ کی کھا کر واپس لوٹ آئی۔ بے نیل و مرام اور شکست خوردہ۔

"مشکل ہے مانیا کہ آغا جی اپنا فیصلہ بدلیں۔ کیا بنے گا۔" وہ کرب سے سوچنے لگی۔

"اف کس قدر سناٹا سا طاری ہے چاروں طرف۔ وہ کھلنڈرا سا نریمان جانے کہاں کھو گیا ہے۔ جانے رات گئے تک کہاں کہاں مارا مارا پھرتا ہے۔ ایک اسی کے دم سے تو ہر طرف رونق اور بہار تھی۔ نریمان یہ تم نے کون سا روگ پال لیا ہے۔ مانیا بھی تو کتنی زرد زرد سی ہو گئی ہے۔ بالکل کسی بت کی مانند خاموش اور چپ۔ یہ سناٹے ضرور میری جان لے لیں گے۔ اف۔"

☆ ☆ ☆

وہ خاموشیوں سے اکتا کر باہر نکل آئی۔ ہر طرف جامد سناٹا تھا۔ در و دیوار پر اداسیوں کا راج تھا۔ ہر شے سوگوار سی تھی۔ بارش خوب زوروں سے برس چکی تھی۔ آکاش سی چھاجوں پانی برس برس کر تھک گیا تھا۔ شاید وہ بھی ان سب کی بے بسی پر دل کھول کر رویا تھا۔

وہ دکھی دل سمیت برآمدے سے اترنے والی دو سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ اور سر گھٹنوں میں دے لیا۔ نجانے وہ کتنے دیر اسی پوزیشن میں بیٹھی رہی۔ تبھی مخصوص قدموں کی چاپ اس کے بالکل قریب آن رکی۔ کون؟ جرار ہمدانی۔۔۔ اس کے وجود کے گرد اس کے مخصوص کولون کی خوشبو پھیل سی گئی۔

اس نے سر اوپر اٹھا کر دیکھا۔ وہ جرار ہمدانی ہی تھا۔ ہینڈ بیگ ہاتھوں میں تھامے وہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اداس آنکھیں اور اداس چہرہ۔ کچھ نہ کچھ اس کی غیر موجودگی میں ہوا ضرور ہے؟ وہ جیسے خود سے بھانپ کر پوچھنے لگا۔

"کیا بات ہے انوشے۔ کچھ ہوا ہے کیا؟"

اس کی ردی حالت دیکھ کر اسے لگا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھیوں میں لے کر بھینچ دیا ہو۔ کس قدر زرد زرد سی ہو رہی تھی وہ۔ اس کی اداس آنکھوں میں ویرانیوں کا راج تھا۔ ملگجے لباس اور الجھے الجھے بالوں میں وہ بہت کمزور سی لگ رہی تھی۔

"تم نے بتایا نہیں۔ کیا ہوا ہے! میرے پیچھے ایسا کون سا حادثہ گزر گیا جو تم نے ایسی حالت بنالی ہے۔"

وہ اس سے پوچھ پوچھ کر عاجز آگیا۔ مگر وہ تھی کہ بول کے ہی نہیں دے رہی تھی۔ وہ جھنجلانے لگا۔ اس کا دل چاہا۔ اس لڑکی کا سر توڑ ڈالے جو اپنے ساتھ ساتھ اس کے ضبط کا بھی امتحان لے رہی تھی۔

"یا وحشت۔۔۔ میں تمہارے اس رویے سے پاگل ہو جاؤں گا۔"

"آیئے میرے ساتھ۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ اندر کی طرف چلی تو جرار ہمدانی نے بھی اس کی پیروی کی۔ وہ اسے لیے مانیا کے کمرے میں آگئی۔ مانیا کو دیکھ کر اس کے دل کو دھچکا سا لگا۔ وہ ہنستی مسکراتی مانیا تو نہیں تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے۔ زرد چہرہ۔

"کیا ہوا مانیا۔" جرار سرعت سے اس کی جانب لپکا۔ اسے سامنے دیکھ کر مانیا کو کرنٹ سا لگا۔ گلے میں آنسوؤں کا پھندا سا پڑ گیا۔

"جیری بھائی۔ آپ نے آنے میں اتنی دیر کیوں لگا دی۔" وہ ہونٹ کاٹنے لگی تھی۔

"کیا ہوا مانیا۔ کچھ تو بتاؤ۔ تم سب کا پراسرار رویہ مجھے بہت تکلیف دے رہا ہے۔" وہ اس کے قریب ہی بیڈ کی پٹی پر ٹک سا گیا۔

"جیری بھائی۔ میں نبیل سے شادی نہیں کروں گی۔۔" وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔

"میں سمجھا نہیں۔" وہ اس کے اس طرح آنسو بہانے پر بوکھلا گیا۔

"آغا جان اس کی شادی نبیل عثمان سے کر رہے ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ نریمان اور مانیا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔" انوشے نے اس کی مشکل حل کر دی۔

"اوہ۔" وہ لمحہ بھر کو خاموش ہو گیا۔

"میرے بھائی۔ کیا وہ سنگین لمحہ آنے سے پہلے موت میرا مقدر نہیں بن سکتی۔" مانیا نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔

"بے وقوف اس طرح بزدلوں کی طرح باتیں نہیں کرتے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ بتاؤ نریمان کہاں ہے۔"

"پتا نہیں۔ رات گئے گھر لوٹتا ہے اور بعض دفعہ تو گھر آتا ہی نہیں۔" انوشے افسردگی سے بولی۔

"فکر نہ کرو مانیا۔" جرار نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ "میں سب ٹھیک کرلوں گا۔ تمہیں یوں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ تم اپنے اس چھ فٹ لمبے بھائی کی موجودگی میں یوں دکھی اور تہی دامن رہ جاؤ گی تمہارا یہ بھائی اپنی جان دے کر بھی تمہاری خوشیاں تمہارے قدموں میں لا ڈالے گا۔ چلو شاباش۔ اب اچھے بچوں کی طرح مسکرا دو۔"

وہ مسکرایا تھا۔

"نہیں جیری بھائی۔ آپ کچھ نہیں کر پائیں گے۔ آغا جی اپنا فیصلہ کبھی بھی نہیں بدلیں گے۔" مانیا کا لہجہ لرزتا ہوا تھا۔

"ماتیا' میں بھی ان ہی کا بیٹا ہوں۔ اگر وہ اپنی ضد پر قائم ہیں تو میں بھی تمہارے ساتھ کسی قسم کی زیادتی ہر گز ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔" اس کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی اور آنکھوں میں عجیب طرح کی سرد مہری اسے اس طرح طیش میں دیکھ کر انوشے جانے کیوں کانپ سی گئی۔ یہ تو بڑے ماموں سے بھی غصے میں دو ہاتھ آگے ہے۔ خدا جانے اب یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔

"ارے جیری بھائی آپ کب لوٹے؟" اس دم جووت نے اندر جھانکا اور جرار کو اندر موجود پاکر کھلکھلا کر قریب چلی آئی۔

"تم کہاں تھیں جنگلی بلی؟"

"ایگزامز کی تیاری میں مصروف تھی۔ آپ کہیے استنے دن کیوں لگا دیے جبکہ چار پانچ دن کا وعدہ کرکے گئے تھے اور اب لوٹے ہیں بہت بے ایمان ہیں آپ۔ جانتے ہیں آپ کے جاتے ہی جیسے ساری رونقیں روٹھ گئیں ہم سے۔" وہ جرار ہمدانی کے بازو سے لگی مسکرا مسکرا کر کہہ رہی تھی اور بظاہر ان دونوں سے لاپروائی کا مظاہرہ کرتی انوشے اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔ جانے کیوں جووت سے جلن سی محسوس ہونے لگی۔ ان دونوں کے تعلق کو یہی لڑکی گھن کی طرح کھائے جارہی ہے۔ جرار سے اس لڑکی کی بے تکلفی اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی اور جرار کا جھکاؤ بھی تو اس کی جانب تھا۔ اب کیوں پریشان ہو انوشے۔ تم خود ہی تو جرار سے دور دور بھاگتی ہو۔ اس سے سیدھے منہ بات تک کرنے کو تیار نہیں۔ تمہیں تو مرد سخت ناپسند ہیں تو پھر یہ جلن کیسی؟ وہ کڑھ کڑھ کر سوچ رہی تھی اور سوچ سوچ کر کڑھ رہی تھی۔

"ارے یہ تمہیں کیا ہوا؟ یہ چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟" جرار نے اس کے متغیر ہوئے چہرے کی جانب دیکھا تو وہ کڑوے لہجے میں بولی۔

"آپ کو اس سے مطلب؟"

"توبہ ہے اس لڑکی سے۔ مجال ہے جو سیدھے منہ بات ہی کرلے۔" وہ اونچی آواز میں بڑبڑایا تو انوشے مزید جڑ گئی۔

"آپ سے سیدھے منہ بات کرنے والے اور لوگ جو موجود ہیں۔" وہ تیزی سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

یہ جرار کیا سمجھتا ہے۔ وہ جووت کے ساتھ اس کی بے تکلفی دیکھ کر اس کے سامنے جھک جائے گی۔ اس سے اس کے التفات اور محبت کی بھیک مانگے گی تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔ وہ اس پر ثابت کرے گی کہ وہ اگر اس سے بے اعتنائی برت سکتا ہے تو وہ بھی کسی اور طرف جھک کر اس سے بے اعتنائی برت سکتی ہے وہ ہر معاملے میں اس کے برابر ہے۔ مرد ہونے کے ناطے جو کام اور جو عمل اس کے لیے جائز ہے۔ عورت ہونے کے ناطے وہی کام اس کے لیے بھی جائز ہے۔ تب اسے معلوم پڑے گا کہ جلن کیسا تڑپاتی ہے اور وہ باغی ذہن لیے **عمیر** کے قریب چلی آئی۔

"**عمیر** پلیز تم مجھے کہیں گھمانے لے چلو۔ ایمان سے بہت بور ہو رہی ہوں۔"

"کیوں۔ جیری کے ساتھ کیوں نہیں جاتیں۔"

"وہ بہت بور ہے۔ تم بتاؤ مجھے کہیں لے جارہے ہو یا نہیں؟"

"کہاں جانا چاہتی ہو؟" وہ پوچھنے لگا۔

"کہیں بھی۔۔۔"

"اوکے۔" وہ ایک دم ہی مان گیا۔

"لیکن اگر جووت کو بھی ساتھ لے لیں تو۔۔۔" اس کی آنکھوں کی چمک نے جیسے انوشے کو بہت کچھ سمجھا دیا۔ "تو اس لڑکی نے جرار کے ساتھ ساتھ اس **عمیر** کو بھی اپنی جانب راغب کر رکھا ہے بڑی تیز لڑکی ہے اور کس قدر گھٹیا بھی۔" وہ سلگتا ذہن لیے اپنی جگہ جمی اس سمت دیکھے گئی جہاں جووت ابھی تک جرار سے باتوں میں مگن تھی۔

"**عمیر**' پہلے ہم "ریس کورس" جائیں گے اس کے بعد کسی بہترین ریسٹورنٹ میں چائنیز سوپ پئیں گے۔" جرار کو متوجہ کرنے کو وہ قدرے اونچی آواز میں بولی۔ جرار نے چونک کر سر اٹھایا اور کتنی دیر اس کا

چونکا ہوا سر اسی زاویے' اس مقام پر رکا رہ گیا ہے وہ **عمیر** کی سنگت میں کتنی مسرور' کتنی خوش ہے اور وہ اس سے ہمیشہ کتنی سرد مہری کا مظاہرہ کرتی ہے تو **عمیر** کی کمپنی اسے بھاتی ہے تو **عمیر** کے ساتھ اسے وقت گزارنا پسند ہے اگر یہی حقیقت ہے تو پھر وہ کیوں اس کے لیے مرا جارہا ہے۔ وہ زبردستی تو اس کے دل میں اپنی جگہ نہیں بنا سکتا۔ اسے مصمم ارادہ کرلینا چاہیے۔ آج کے بعد وہ کبھی مڑ کر بھی اس سمت نہیں دیکھے گا جہاں منزلوں کے بجائے راکھ اڑتی ہے۔ اور۔۔۔ وہ نجانے کب تک خود کو سلگتی سوچوں سے سلگاتا انوشے کے زور سے ہنسنے کی آواز پر اس نے دوبارہ اسی سمت دیکھا۔ وہ کھلکھلاتی **عمیر** کے ہمراہ کار میں بیٹھ رہی تھی۔ لمحہ بھر کو اس کا دل چاہا۔ وہ اس بے وفا لڑکی کا منہ تھپڑوں سے لال کردے۔ اس کی کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں اور وہ تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ شام کو جب وہ باہر نکلا تو وہ **عمیر** کے ساتھ لاؤنج میں خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ **عمیر** لیپ ٹاپ پر کام کرتے مسلسل اس کی باتوں پر مسکرا رہا تھا۔ ملازمہ سامنے ٹیبل پر چائے کے برتن رکھ رہی تھی۔ **دفعتاً** جرار کی آنکھوں سے چنگاریاں سے نکلنے لگیں۔ غصے سے مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔

"پروین!" اس نے غصے سے ملازمہ کو پکارا۔ اس کی دھاڑ سن کر انوشے نے گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی جھلاہٹ' اس کی جھنجلاہٹ جیسے اسے بہت کچھ سمجھا گئی۔ تو موصوف کو اس کی **عمیر** سے بے تکلفی بری لگ رہی ہے۔ اسے بھی تو جووت کے ساتھ اس کی بے تکلفی انتہائی ناگوار گزرتی ہے۔ کبھی اس نے اس کی جلن کا احساس کیا؟ بھلے وہ اس سے بے اعتنائی برتتی ہے بھلے وہ اسے درخور اعتنا نہیں سمجھتی۔ مگر اس سے اس کا انتہائی گہرا تعلق ہی تو ہے اور اس کا تعلق کو لے کر وہ حد سے زیادہ حساس ہو رہی تھی۔ وہ مسکرا دی۔

"جج۔ جی۔ چھوٹے سرکار۔" ملازمہ بے چاری کانپتی ہوئی اس کے قریب آگئی۔

"کچھ نہیں۔ تم جاؤ۔" انوشے کی مسکراہٹ جرار کو زہر لگی۔ دل چاہا جاکر اس کا منہ نوچ لے۔ ملازمہ حیران و پریشان الٹے پیروں باہر نکل گئی۔ اس دم زیمان اندر داخل ہوا۔ بڑھی شیو۔ الجھے الجھے بال اور بے ترتیب لباس۔ وہ بہت مضمحل لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تھکن عیاں تھی۔

"تم کب آئے جرار۔"

"یہ کیا تم مجنوں بنے پھر رہے ہو۔ گھر پر رہو تو تمہیں معلوم ہو ناں کہ میں کب آیا۔" اس نے انوشے کا غصہ اس پر اتارا۔ نگاہیں ہنوز اس کے مسکراتے چہرے پر تھیں۔ وہ ارد گرد سے یکسر بے نیاز **عمیر** کی طرف متوجہ تھی۔ یوں جیسے اس کے علاوہ اس کمرے میں کسی اور کو وجود تک نہ ہو۔

"جیری تمہیں کیا معلوم کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔" زیمان ڈھیلے انداز میں صوفے پر ڈھے سا گیا۔

"مجھے سب علم ہے۔"

"تو پھر اس سلسلے میں تم میری کچھ مدد کرسکتے ہو۔"

"ہونہہ مرد بنے پھرتے ہو اور حقیقت سے روگردانی کرتے ہو۔" وہ دانت پیس کر بولا۔

"پھر تم ہی بتاؤ۔ میں کیا کروں۔" وہ بجھی بجھی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے بولا۔

"چوڑیاں پہن لو۔ یا چلو بھر پانی میں ڈوب مرو۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔" غصے سے جرار کی بھنویں تن سی گئیں۔

"یہ تم کہہ رہے ہو جیری۔ میرے دوست۔ میری مدد کرنے کے بجائے میرے زخموں پر نمک پاشی کررہے ہو۔" وہ افسردگی سے بولا۔

جرار شرمندہ سا ہوگیا۔ وہ اپنے اندر کی تلخیوں کو اس شخص پر انڈیل رہا ہے جو خود جذباتی ہیجان سے گزر رہا ہے۔ اس وقت زیمان کو اس کی سخت ضرورت ہے۔

"سوری یار۔۔۔ میں تم پر ایسے ہی برہم ہوگیا۔"

"تو پھر۔"

"تو پھر یہ کہ میں سب ٹھیک کرلوں گا۔ فکر نہ

کرو۔" جرار نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"سچ جیری۔"

"پانزبو۔" اس نے مدہم لہجے میں کہتے سامنے دیکھا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر عمیر کو دے رہی تھی۔

"ایک کپ مجھے بھی بنا دو۔ اور زیمان کو بھی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی جرار کے لہجے میں ترشی دوبارہ ابھر آئی۔

"ضرور۔" بنا ماتھے پر تیوری ڈالے وہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتی کپ میں چائے انڈیلنے لگی۔ اس نے چائے بنا کر پہلے کپ زیمان کو دیا اور بعد میں اس کی طرف پلٹی۔

"یہ چائے۔" وہ اس لہجے کی کھنک سے نامانوس نہیں تھا۔ وہ سامنے تھی، مگر دل کو طمانیت کی بجائے بے چینی اور اضمحلال کا احساس ہو رہا تھا۔ کیسی مار دینے والی سوچوں نے دل و دماغ کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ وہ اس کا شریک سفر ہے، مگر وہ اس کی بجائے کسی اور پر اپنا التفات لٹا رہی ہے۔ کسی اور کو اپنے دل و دماغ میں رکھے ہوئے ہے۔ دفعتاً" اس کے اندر سناٹوں نے یلغار کر دی۔

اگر اس لڑکی کی یہی روش رہی تو وہ یقیناً" پاگل ہو جائے گا۔ خدایا۔ وہ کیا کرے۔ خدایا۔ وہ کیا نہ کرے۔ اس لڑکی کی بے وفائی جیسے اسے اندر ہی اندر مارے دے رہی تھی۔ اس کا یہی حل ہے۔ وہ اسے مار ڈالے۔ اس کی گردن دبا کر اسے زمین میں دفن کر دے۔ مگر۔ مگر وہ اسے اتنی آسان موت نہیں مارے گا۔ اسے ایک بار نہیں، کئی بار مرنا ہو گا۔ وہ اسے ایسی سزا دے گا جسے وہ تاحیات یاد رکھے گی۔ ہاں۔ وہ اسے طلاق دے دے گا۔ وہ اسے آزاد کر دے گا۔ پھر چاہے وہ کسی کے ساتھ بھی آزادانہ گھومتی پھرے۔

"عمیر۔ تم نے زیمان کو بتایا نہیں کہ آج ہم نے کتنا انجوائے کیا؟" اس کی کھنکتی آواز سے جرار کے جسم میں ہزاروں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ آنکھیں لہو رنگ ہو گئیں۔

"اچھا کون کون گیا تھا۔ کیا جرار بھی ہمراہ تھا۔" زیمان نے پوچھا۔

"بھلا غیر متعلقہ لوگوں کا کیا کام۔ صرف میں اور عمیر گئے تھے۔" تو وہ اس کے لیے غیر متعلقہ ہے۔ جرار بے چینی سے پہلو بدل گیا

"بے ایمان ہمیں ساتھ کیوں نہیں لے کر گئیں۔" عائشہ اور جودت اندر داخل ہوئیں۔

"کباب میں ہڈی کی گنجائش نہیں ہوتی۔" وہ تیکھی نظروں سے اس شخص کو دیکھ گئی جس کا ستا چہرہ اور بجھتی آنکھیں اسے بہت تقویت دے رہی تھیں۔ اب تو وہ جان گیا ہو گا، اندر کی جلن کتنی وحشت ناک ہوتی ہے۔

"اچھا کہاں کہاں گئے تم دونوں۔۔۔" جودت مارے اشتیاق کے پوچھنے لگی۔ تو عمر بتانے لگا۔

"پہلے ریس کورس۔ پھر لانگ ڈرائیو، اس کے بعد چائنیز میں زبردست سوپ پیا۔ سچ جرار اگر تم بھی ساتھ ہوتے تو مزا دوبالا ہو جاتا۔ میں نے تو انوشے سے کہا تھا کہ سبھی چلتے ہیں جیری کی ہمراہی میں مزا آئے گا، لیکن یہی نہیں مانی اور۔۔۔"

"عمیر خاموش ہو جاؤ۔" جرار کھولتے ذہن پر قابو پانے کی کوشش میں بولا۔

"کیا ہوا؟" عمیر اس کے رویے پر حیران تھا۔

"کچھ نہیں۔ ایسے ہی سر میں درد ہے۔" وہ اپنی کنپٹیاں انگوٹھے سے دباتے بولا۔ تب ہی سامنے بیٹھی لڑکی پر ایک خشونت بھری نظر ڈال کر باہر نکل گیا۔ وہ لمحہ بھر کو اپنی جگہ سن سی بیٹھی رہ گئی۔ اف کس قدر غصے سے دیکھ رہا تھا وہ۔۔۔ کہیں کچھ زیادہ تو نہیں ہو گیا۔ عمیر کے ساتھ اس کی بے تکلفی یقیناً" اسے بے حد ناگوار گزری ہے، مگر جب خود جودت کے ساتھ لگاوٹ کا مظاہرہ کرتا ہے اس کی موجودگی کی پروا بھی نہیں کرتا یہ تک جاننے کی کوشش نہیں کرتا کہ اس کا یہ رویہ اسے کیسی اذیت دیتا ہے۔ وہ سنگ دل شخص بھلا اسے ساری زندگی کے لیے اپنے پاؤں کی جوتی بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ وہ اسے اپنی برابری کا درجہ دینے کو تیار

نہیں۔ جو بات اس کے لیے درست ہے، وہی بات اس کے لیے بھی جائز ہے۔ اس شخص کی بڑی بڑی سرخ آنکھیں بار بار اس کے ذہن کے پردے پر تھرک رہی تھیں۔ ہونہہ۔ اس کی سوبلا سے۔ وہ غصے ہو یا کچھ اور۔۔۔ اب پتا چلے گا کہ جلن کیسا تڑپاتی ہے۔

"مجھے تو ان دونوں کے متعلق سوچ سوچ کر ہول اٹھتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے ازلی دشمن ہیں، مگر قسمت نے ان دونوں کو ایک کر دیا ہے۔ ایک ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا ہے۔ پتا نہیں کیا ہو گا۔ مجھے لگتا ہے جیسے آغا جی کا یہ فیصلہ قطعی غلط ہے اور۔۔۔" جودت بولی تو عمیر نے مدہم لہجے میں کہا۔

"خدا سے بہتری کی امید رکھنی چاہیے۔"

"ہوں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"اچھا تم بتاؤ تمہارے ایگزامز کیسے چل رہے ہیں۔" وہ پوچھنے لگا۔

"دو پیپر رہ گئے ہیں۔ دعا کرو اچھے ہو جائیں۔"

"میری دعائیں ہر وقت تمہارے ساتھ ہیں جودت۔ اور میرا دل بھی۔" آخری الفاظ اس نے لبوں میں ہی دبا لیے تھے۔ جب وقت آئے گا تو وہ اس سلسلے میں بزرگوں سے بات کرے گا۔ ابھی تک اس گھر کا سب سے بڑا مسئلہ باقی تھا۔ جرار اور انوشے کی شادی کا مسئلہ۔ دونوں کی زندگی داؤ پر لگی تھی۔ وہ دونوں اگر ہتھیار پھینک دیں تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ جرار تو پھر بھی سمجھدار ہے، لیکن انوشے اپنی بددماغی اور بداخلاقی سے سب کچھ برباد کرنے کے درپے ہے۔ وہ متفکر سا سوچ گیا۔

☼ ☼ ☼

اس رات کھانے کے بعد جرار، آغا ہمدانی کے کمرے میں ان کے مقابل تھا۔

"دیکھیے باباجان۔ آپ کو اپنا فیصلہ بدلنا ہو گا۔"

"کیسا فیصلہ۔" وہ چونکے۔

"میں ملنیا اور نبیل کی بات کر رہا ہوں۔ جب گھر میں رشتے موجود ہیں تو آپ نے کسی باہر کے شخص سے ملنیا کی شادی کی حامی کیوں بھری۔ آپ کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرتے ہوئے اس رشتے سے انکار کرنا ہو گا۔" وہ ٹھوس لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"لیکن میں زبان دے چکا ہوں اور تمہیں معلوم ہے کہ میں اپنی زبان سے ہرگز نہیں پھرتا۔"

"مگر یہ کسی کی زندگی کا سوال ہے باباجان۔" جرار بولا۔ باہر کھڑی جودت، انوشے اور ملنیا اندر ہونے والی گفتگو پر دم سادھے کھڑی تھیں۔

"کس کی زندگی کے متعلق کہہ رہے ہو۔" وہ چونکے۔

"دیکھیے باباجان۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ آپ کا فیصلہ غلط ہے۔ نبیل خوش شکل، تعلیم یافتہ اور خاندانی لڑکا ہے، لیکن ضروری نہیں کہ یہ باتیں اور خوبیاں ملنیا کو خوش کرنے کے لیے کافی ہوں۔ ہمارے پیش نظر صرف ملنیا کی خوشیاں ہونی چاہئیں اور ملنیا، نبیل کے ساتھ کبھی بھی خوش نہیں رہ پائے گی۔"

"تو پھر تمہارے خیال میں وہ کہاں خوش رہ سکتی ہے۔ میں کہتا ہوں۔ اگر وہ یہاں خوش نہیں رہ سکتی تو پھر کہیں بھی خوش نہیں رہ پائے گی۔" آغا ہمدانی کے لہجے میں غصہ ابھر آیا۔

"میرے خیال میں زیمان اس کے لیے ہر لحاظ سے موزوں ہے۔" اس نے اصل بات اگل دی۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔ زیمان نہ سہی، نبیل سہی۔"

"آپ کو کوئی فرق پڑے یا نہ پڑے باباجان، لیکن ان دونوں کو ضرور فرق پڑے گا۔" وہ آغا ہمدانی کی بہت عزت کرتا تھا۔ اس لیے باوجود تلخ ہونے کے وہ نرم لہجے میں بولا۔

"کن دونوں کو۔۔۔؟" وہ چونکے۔

"ملنیا اور زیمان کو۔۔۔ اس لیے کہ وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو۔ ایسی کوئی بات میرے علم میں نہیں۔ خیر، اب کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ میں زبان دے چکا ہوں۔ اور اپنی زبان سے پھرنا میرے لیے موت کے مترادف ہے۔" آغا ہمدانی کے لہجے میں چٹانوں کی سی

سختی تھی۔

"آپ اپنے اس فیصلے سے آپ دو زندگیاں برباد کر رہے ہیں۔ دو نہیں بلکہ تین زندگیاں۔ زیمان' مانیا اور نبیل کی۔ نبیل کو جب معلوم ہو گا کہ مانیا کا دل زیمان کے پاس ہے اور اس کی شادی زبردستی کی گئی ہے تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔ کیا وہ اس حقیقت کو تسلیم کر پائے گا مرد جیسا بھی ہو وہ یہی چاہتا ہے کہ جو عورت اس کی زندگی میں شریک سفر بن کر آئے اس کا دل صرف اور صرف اس کا ہو۔ اس کی زندگی پر کسی دوسرے شخص کی پرچھائیاں نہ ہوں۔" اس کی باتوں میں سچائی تھی۔ آغا ہمدانی لمحہ بھر کو خاموش رہ گئے۔ اگر ان کی ضد اور فیصلے کے ہاتھوں مانیا کی زندگی برباد ہو گئی تو۔۔۔؟ محبت ایسی سچائی ہے جو کبھی چھپی نہیں رہ سکتی اور نبیل پر بھی یہ حقیقت ایک دن ضرور آشکار ہو جائے گی کہ مانیا کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ اور۔۔۔ اور تب وہ مانیا کو اپنی زندگی سے باہر نکالنے میں ذرا بھی تامل نہیں برتے گا۔

"بابا جان میں آپ سے گستاخی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا' مگر مجھ سے مانیا اور زیمان کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ زیمان رات گئے گھر لوٹتا ہے اور مانیا بستر کی ہو کر رہ گئی ہے۔ سوچیے بابا جان۔ کیا آپ کا یہ فیصلہ درست ہے۔ اگر درست ہے اور آپ کا ضمیر مطمئن ہے تو میں بھی اس بے چوں و چرا مان لوں گا اور ان دونوں کو بھی سمجھا دوں گا۔"

جرار کی آواز بوجھل ہو رہی تھی۔ لوہا گرم دیکھ کر وہ بھرپور چوٹ مار رہا تھا' مگر خود بھی جیسے اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ وہ مانیا اور زیمان کی وکالت کر رہا ہے' مگر بالکل یہی پچویشن اس کی اپنی زندگی میں بھی درپیش ہے۔ وہ سنگدل لڑکی بھی تو عمیر کو پسند کرتی ہے۔ تو کیا وہ ایسی لڑکی کو اپنی زندگی میں جگہ دے پائے گا' جس کے دل و دماغ پر کسی اور کی پرچھائیاں ہیں جو اس کے سامنے انتہائی ان کلچرڈ اور ان مینرڈ بن جاتی ہے کہ اس سے سیدھے منہ بات تک کرنے کی روادار نہیں۔ اس کے لیے' اس کے مزاج میں سرمو فرق نہیں آتا۔ آخر وہ کب تک ایک بے معنی بہلاوے کا شکار بنا رہے گا۔ وہ دن میں خواب دیکھنے کا عادی نہیں تھا' لیکن پھر بھی خود کو دھوکا دے رہا تھا۔ اور۔۔۔

"برخوردار۔۔۔" آغا ہمدانی کی آواز نے اسے سلگتی سوچوں کے بھنور سے باہر لا پٹخا۔

"شاید تم اپنے موقف میں حق بجانب ہو۔ تم نے بروقت میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ واقعی میرے اس فیصلے سے تین زندگیاں برباد ہو جائیں گی۔ تم نے مجھے اس گناہ سے بچا لیا جو میں انجانے میں کرنے چلا تھا۔ شاید میں کچھ زیادہ ہی بوڑھا ہو چلا ہوں' جب ہی تو فیصلے صحیح نہیں کر پا رہا۔ مجھے تم پر فخر ہے بیٹے۔ تم ہمیشہ سے میرے بہترین مشیر ہو۔"

"تھینکس بابا جان۔" اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اپنی چھب دکھا گئی۔

"جاؤ۔ بچوں کو جا کر یہ خوش خبری سنا دو کہ میں نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔" انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ وہ مسرور سا باہر چلا آیا اور ان تینوں کو سامنے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"اوہ شیطانوں! تم یہاں۔" وہ خوشدلی سے بولا۔

"جی جناب۔" جودت مسکرائی۔

"تو اس کا مطلب' مجھے کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں۔ سب کچھ تم لوگوں نے اپنے کانوں سے سن لیا۔" اس کی خوب صورت آنکھوں کی چمک دوبالا ہو رہی تھی۔

"جی اندر کی ساری کارروائی ہمارے پیش نظر رہی۔ واہ جیری بھائی۔ کیا زبردست تقریر جھاڑی تھی۔ مقابل کو لاجواب کر دیا۔"

جودت نے وفور مسرت سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ اس کی اس بے تکلفی پر انوشے کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ یکلخت اسے لگا جیسے وہ تو لق و دق صحرا میں تنہا کھڑی ہے اور اس کے پاس گنوانے کو کچھ نہیں بچا۔ بھلے وہ اس شخص سے متنفر ہے۔ بھلے اسے مرد کی باندی بننا گوارا نہیں۔ سے وہ شادی کو گلے کا طوق سمجھتی ہے' لیکن پھر بھی اس شخص سے اس کی

کہیں نہ کہیں کوئی دلی وابستگی ہے۔ وہ لاکھ چاہتے ہوئے بھی اس سے غافل نہیں رہ سکتی اور پھر کسی نے سچ کہا ہے کہ نکاح ایسا بندھن ہے جس کے بعد دو دلوں کے درمیان محبت از خود آجاتی ہے۔ اور۔۔۔

"تم بھی کچھ بولو مانیا۔ خاموش کیوں ہو۔" جرار' مانیا سے پوچھ رہا تھا۔

"میں کیا کہوں۔ میری زبان تو آپ کے احسان کے بوجھ تلے دب کر خاموش ہو گئی ہے۔ آپ نے موت کے مسافر کو زندگی کی نوید دی ہے اگر آج آپ نہ ہوتے۔ تو۔ تو۔۔۔" احساس تشکر سے مانیا کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"ارے پگلی اس میں رونے کی کیا بات ہے۔" اس نے پیار سے اس کے سر پر چپت لگائی۔

"یہ تو خوشی کے آنسو ہیں جیری بھائی۔" جودت نے وضاحت کی۔

"مانیا اب تو خوش ہو نا۔" جرار نے پوچھا۔

"جی بہت۔" آغا جی کے فیصلہ بدلنے پہ جیسے اس گھر کی رونق دوبارہ لوٹ آئی۔ ہر طرف پھر سے زندگی سے بھرپور قہقہے بلند ہونے لگے۔ در و دیوار پہ پہلے جیسی مسرتیں رقصاں ہو گئیں۔ وہی دھما چوکڑی وہی ہنگامے پھر جاگ اٹھے۔ گو رمضان کا مبارک مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود ان سب کی مصروفیات وہی تھیں۔ افطار و سحری کی مصروفیات میں انوشے کی شادی کی خریداری کی مصروفیت بھی شامل ہو گئی۔ سر کھجانے کی بھی فرصت کسی کے پاس نہیں تھی۔ روزہ رکھ کر بازاروں کی خاک چھاننا بہت دشوار تھا' مگر اس کے باوجود وہ سب جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہی تھیں' مگر انوشے کی سرد مہری اور بے زاری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس کی اکتاہٹ ہنوز برقرار تھی حالانکہ اماں اسے کتنی مرتبہ اپنی پسند سے خریداری کا کہہ چکی تھیں' مگر وہ ٹس سے مس ہونے کو تیار نہیں تھی یہاں تک کہ اپنے لیے کی گئی شاپنگ کو دیکھتی تک نہ تھی۔

"انوش۔ تمہارا یہ بھونڈا رویہ انتہائی غصہ دلانے والا ہے۔" اماں اسے تنبیہہ کرتیں۔

"تو میں کیا کروں اماں۔۔۔"

"لڑکیوں کے ساتھ باہر نکلو۔ اپنی خریداری میں دلچسپی لو۔ تمہارا یہ بے زار رویہ اور عدم دلچسپی تمہاری آئندہ زندگی کے لیے اچھا نہ ہو گا۔ اس گھر میں تم اکیلی نہیں ہو۔ جرار بھی موجود ہے۔ وہ تمہارے رنگ ڈھنگ باخوبی دیکھ رہا ہے۔ وہ پہلے ہی تمہاری بدتمیزیوں اور بداخلاقیوں سے واقف ہے۔ اب تو کم از کم اپنا رویہ بدل ڈالو۔ شادی کے دن قریب آرہے ہیں۔ خود میں حلیمی اور بردباری پیدا کرو۔ اپنے شوہر کو اپنا گرویدہ بنانے کے گر اپناؤ۔۔۔"

"مجھے کوئی شوق نہیں اسے اپنا گرویدہ بنانے کا۔۔۔" وہ جھلائی۔ "اور آپ کو میرا رنگ ڈھنگ نظر آرہا ہے۔ اس موصوف کے رنگ ڈھنگ کسی کو نظر نہیں آتے۔"

"وہ مرد ہے۔ تم اس کا مقابلہ کیوں کرتی ہو۔"

"وہ مرد ہے تو کیا اسے سات خون معاف ہیں۔" لوگوں کی اس سوچ پر اسے تاؤ آتا تھا۔

"بکو مت۔ اپنے مزاج درست کر لو۔ ورنہ ایک دن سر پکڑ کر روؤ گی۔" اماں نے اسے تنبیہہ کی تو اس نے گردن نیچے کر لی۔

☼ ☼ ☼

وہ کچن میں ان سب کے ساتھ افطاری بنانے میں مدد دے رہی تھی تب ہی عمیر نے اندر جھانکا۔

"کیا ہو رہا ہے لڑکیوں!"

"افطاری کی تیاری۔"

"اوہو آج کچھ زیادہ ہی اہتمام لگ رہا ہے۔ کیوں کہ محترمہ انوشے بیگم بھی کچن میں نظر آرہی ہیں ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ آج تک ان محترمہ کو کچن کا راستہ ہی معلوم نہیں۔" عمیر پکوڑوں کے لیے بیسن تیار کرتی انوشے کو چھیڑنے لگا۔

"انوشے کو تو کچن کا راستہ پھوپھو نے یاد کروایا ہے۔ ان کا سخت آرڈر ہے شادی تک انوشے ہر طرح کا کھانا

پکانے میں مہارت حاصل کرے۔ ورنہ آغا ہمدانی اور جرار ہمدانی کے سامنے ان کی تربیت ملیامیٹ ہو جائے گی اور وہ اپنی تربیت پر کسی قسم آنچ بھی نہیں آنے دینا چاہتیں۔" عائشہ نے پیاز باریک باریک کاٹتے ہوئے کہا تو انوشے تپ گئی۔

"تو تمہارا مطلب یہ سب میں جرار کے لیے سیکھ رہی ہوں۔"

"بالکل۔"

"خام خیالی ہے تمہاری۔ میں تو اماں کی خفگی کے خیال سے کچن میں چلی آئی ہوں۔ نامعلوم آج کل وہ میرے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑی ہیں۔ ہر وقت تنقید' ہر وقت نصیحت' یوں مت بیٹھو' یوں مت ہنسو' تہذیب کا مظاہرہ کرو۔ آہستہ آواز میں بات کرو' شادی نہ ہوگئی لگتا ہے مجھے کسی زندان میں قید کیا جارہا ہے۔" وہ بے زاری سے بولی۔

وہ بہت اداس اداس اور مایوس لگ رہی تھی۔ وہ ایسی افسردہ اور شکستہ تو پہلے کبھی نہیں تھی' مگر جیسے جیسے شادی کے دن قریب آرہے تھے وہ قنوطی ہوتی جارہی تھی۔

وہ سنک کی طرف ہاتھ دھونے گئی تھی تب ہی جرار ہمدانی کو کچن کے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ یکلخت عمیر کی طرف پلٹی اور بڑی لگاوٹ سے پوچھنے لگی۔

"عمیر آج افطاری تمہاری پسند کی بنے گی۔ تم جو فرمائش کرو گے' میں اپنے ہاتھوں سے تیار کروں گی۔ بتاؤ کیا کیا بناؤں؟"

"کچھ بھی۔"

"اچھا میں قیمے بھرے سموسے بنا لیتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے تمہیں یہ سموسے بہت پسند ہیں۔"

"گریٹ۔ مگر یہ بتاؤ تمہیں میری پسند کا کیسے معلوم۔"

"کمال ہے۔ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے۔" وہ جھنجلا گئی۔ "انسان جس کے قریب ہوتا ہے۔ اس کی پسند وناپسند سے مکمل باخبر ہوتا ہے۔"

کچن کے دروازے سے باہر رکے جرار ہمدانی کے لیے جیسے یہ گفتگو ناقابل برداشت ہو گئی۔

وہ سلگتا ذہن لیے چند لمحوں کو اپنی جگہ پر جمارہا پھر اندر کچن میں چلا آیا۔

"تم یہاں کیا کررہی ہو۔" بڑا خشونت بھرا لہجہ تھا۔

"نظر نہیں آرہا کیا؟" جواباً" انوشے بھی تیکھے انداز میں بولی۔

"نظر نہیں آرہا جب ہی پوچھ رہا ہوں کہ تم یہاں کیا کررہی ہو؟"

"فٹ بال کھیل رہی ہوں۔" وہ چڑ گئی۔

"تم سیدھے سے جواب نہیں دے سکتیں کہ افطاری بنارہی ہوں۔" عائشہ نے اس کی بدتمیزی پر سرزنش کی۔

"کان کھول کر سن لو تم عائشہ اور بے شک جاکر اماں کو بھی بتا دو۔۔۔ میں قبل از وقت کسی کا رعب قبول نہیں کروں گی۔" وہ دھپ دھپ کرتی باورچی خانے سے باہر نکل گئی۔ اور جرار ہمدانی لب بھینچ کر رہ گیا۔

اس لڑکی کی بے وفائی' بے اعتنائی اور بدتمیزی پر خون بری طرح کھول رہا تھا۔ رگوں میں دوڑتے ہوئے خون نے جیسے آگ سے پکڑلی تھی۔

"انوشے بی بی۔ ابھی جتنی بدتمیزی کرنی ہے کرلو۔ کہیں بعد میں زندگی کا دائرہ تم پر تنگ نہ ہوجائے۔ ایک ایک زیادتی کا بدلہ لوں گا۔ تمہاری بے وفائی کا خوب مزا چکھاؤں گا اتنا رلاؤں گا کہ مسکراہٹ کو ترس جاؤ گی' پھر بعد میں جتنی چاہے معافیاں مانگتی پھرنا مگر میں ہرگز درگزر نہیں کروں گا۔" اس کی کنپٹیاں مسلسل سلگ رہی تھیں۔

اس کے ذہن میں بچپن سے یہ بات محفوظ تھی کہ انوشے اس کی دلہن ہے۔ اور وہ اس وقت سے لے کر اب تک اسی تصور کو ذہن میں لیے پھر رہا تھا۔ جب بھی کوئی حسین چہرہ مقابل آتا تو وہ اس میں انوشے کا چہرہ تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگتا۔ بچپن کے پیار کا پودا جوان ہو کر اب تناور درخت بن چکا تھا۔ وہ تب سے اسے چپکے چپکے چاہتا چلا آرہا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ

زبان سے کبھی اقرار نہیں کیا تھا۔ اسے جذبوں کی تشہیر پسند نہیں تھی' مگر اس کی بولتی آنکھیں سب کچھ عیاں کردیتی تھیں' ساری حقیقتیں اگل دیتی تھیں! اگر وہ سنگ دل لڑکی ایک نظر ان کی آنکھوں میں دیکھ لیتی تو از خود ان کے اندر کا بھید جان لیتی۔ ان آنکھوں میں اسے اپنے لیے محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر آجاتا مگر۔۔۔

مگر وہ بے حس تو ان کی طرف سے مکمل لاپروا تھی۔ اس کی محبت بھری نگاہوں کا جواب انتہائی روکھے انداز میں دیتی تھی۔

ابھی تو ضد ہے اسے راستہ بدلنے کی
کبھی روئے گا وہ خود میری چاہتوں کے لیے

☼ ☼ ☼

انوشے نے اس رمضان میں باقاعدگی سے نماز شروع کردی تھی۔ وہ خدا کے حضور خشوع و خضوع سے دعا مانگنے کے لیے ہاتھ اٹھاتی مگر سمجھ نہ آتی کہ کیا دعا مانگے۔

خدایا اس رخصتی کو ٹال دے۔

خدایا اس کی شادی کی ساعتیں دور ہوجائیں۔

وہ یہ دعا مانگنا چاہتی تھی' مگر زبان ساتھ نہیں دیتی تھی۔ جانے دل و دماغ کو کیا ہوگیا تھا۔ بہت الجھا الجھا رہتا تھا۔ جیسے فیصلہ نہ کرپارہا ہو کہ وہ کیا چاہتی ہے؟ راتوں کو بھی اسے نیند نہیں آتی تھی۔ وہ کروٹیں بدل بدل کر ہار جاتی۔

خدایا یہ بے چینی کیسی؟

یہ اضطراب کیوں؟

افطاری کے بعد وہ بالکنی میں جھکی لان کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں جرار اور جودت اسے لان چیئرز پر ایک ساتھ دکھائی دے رہے تھے۔ جرار ابھی ابھی موبائل پر اپنے کسی دوست سے گفتگو کرکے فارغ ہوا تھا جب ہی جودت سامنے چلی آئی اور بے تکلفی سے اس کے سامنے کرسی پر جم سی گئی۔

"جیری بھائی۔ آج کل آپ کچھ زیادہ ہی تنہائی کا شکار نہیں ہورہے؟"

"تم نے کیسے اندازہ لگایا؟" وہ سنبھل کر سیدھا ہوگیا اور چہرے پر بشاشت طاری کرلی۔

"آپ کے چہرے اور آپ کی آنکھوں سے کسی کے لیے بھی اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ آپ آج کل بہت مضمحل اور اپ سیٹ رہنے لگے ہیں۔ کیا بات ہے۔ اپنی الجھن کی وجہ مجھے نہیں بتائیں گے کیا۔"

"یہ تمہارا وہم ہے باگڑ بلی۔" یہ بڑی تکلیف دہ بات ہے گویا وہ اس جگہ پر پہنچ گیا جہاں آنکھیں سچ جھوٹ پر بے اختیار رہ جاتی ہیں۔ کتنے بہت سے رنگ اس کے چہرے پر آکر گزر گئے۔ وہ اضطراری طور پر تاگمسلا تا کچھ سوچتا لگ رہا تھا۔

"وہم بالکل بھی نہیں ہے۔ آپ کچھ چھپا رہے ہیں۔" وہ زمان سے بھی زیادہ جرار بھائی کو پسند کرتی تھی۔ گہری گہری آنکھوں والے' دھیمے دھیمے انداز میں بولنے والے' پر شفقت سے' وہ ہمیشہ اس کی بات مان جایا کرتے تھے مگر اسی سے کیسے افسردہ افسردہ سے نظر آرہے تھے۔ وہ بے چینی ہوا تھی۔

"سچ گڑیا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میرا یقین کرو۔"

"تو پھر ذرا مسکرا کر دکھائیں۔ مجھے یقین آجائے گا۔" وہ شوخی سے اس کی اداس آنکھوں میں دیکھنے لگی تو وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

"بہت تیز ہوتی جارہی ہو۔"

"آپ کی صحبت کا اثر ہے۔"

"اوہو تو باتیں بھی بنانا آگئیں ہماری بندریا کو۔۔۔" وہ خوشدلی سے بولا تو وہ ہنس دی۔

"جی جناب آپ کی نظر عنایت ہے۔ ورنہ بندی کی کیا حیثیت ہے۔" وہ مسکین سی صورت بنا کر بولی تو نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دلکش سا قہقہہ جرار کے لبوں سے نکلا اور ارد گرد کی فضا کا بوجھل پن دور کر گیا۔

"جیری بھائی ایک بات پوچھوں آپ سے۔۔۔؟" لمحوں کے توقف کے بعد جودت پوچھنے لگی۔

"پوچھو۔"

"آپ کا انوش سے کوئی جھگڑا ہوا ہے کیا؟"

"بالکل نہیں۔" وہ بے چین ہو اٹھا۔
"تو پھر آپ انوشے سے نظریں کیوں چراتے پھرتے ہیں۔ اسے دیکھتے ہی یا تو آپ منہ پھیر لیتے ہیں یا اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔" جودت نے انجانے میں جیسے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ پہلو بدل گیا اور ساتھ ہی بات بھی بدل دی۔

"اچھا ایک کام کرو باگڑ بلی۔ اپنے ہاتھوں سے ایک کپ چائے بنا کر لادو ابھی تھوڑی دیر میں عشاء کی اذان ہو جائے گی تو میں تراویح پڑھنے مسجد چلا جاؤں گا۔"

"وہ تراویح باقاعدگی سے پڑھنے جا رہا تھا۔ عمیر، نریمان اور اشعر کو بھی ہمراہ لے جاتا۔ اشعر نے عید کے بعد کینیڈا فلائی کر جانا تھا اور ساتھ میں شارمین نے بھی۔ اس لیے وہ دونوں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت ان سب کے ہمراہ گزار رہے تھے۔

"ایک شرط پر چائے بناؤں گی جیری بھائی۔" جودت مانتے ہوئے بولی۔
"کہو۔"

"آپ تراویح کے بعد مجھے عید کا جوڑا دلوانے لے چلیں گے اور سنیں۔ میں آپ کی شادی کے تمام فنکشنز کے بھی الگ الگ جوڑے آپ سے لوں گی۔ حالانکہ امی بھی میرے سوٹ بنا رہی ہیں، لیکن بہن ہونے کے ناطے میرے لیے بھی آپ کا کوئی فرض بنتا ہے۔"

"جیسا کہو گی۔ ویسا کروں گا۔ اپنی بہن کے لیے تو جان بھی قربان ہے۔" وہ پیار بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"ہائے سچ۔" وہ ایک دم ہی خوش ہو گئی۔
"بالکل سچ۔" وہ اس کے بچپنے پر زور سے ہنس دیا۔
اور بالکنی میں اتنی دیر سے یہ نظارا کرتی انوشے اندر تک سلگ کر راکھ ہو گئی۔ اونہہ۔ کیسے اس سے ہنس ہنس کر باتیں کی جا رہی ہیں اور مجھ سے بات کرتے وقت موصوف کا موڈ آف ہو جاتا ہے۔ ہر وقت ماتھے پر بل پڑے رہتے ہیں۔ میں نے حضرت کی کوئی بھینس تو نہیں چرائی۔ وہ نفرت اور غصے کی ملی جلی کیفیت لیے بالکنی سے ہٹ آئی۔

یہ مرد کبھی باوفا نہیں ہوتے، کسی ایک عورت کا ہو کر رہنا تو انہیں آتا ہی نہیں۔ ایک کو چھوڑ کر دوسری اور دوسری کو چھوڑ کر تیسری کے پیچھے جانا اپنی شان سمجھتے ہیں مگر۔۔۔ مگر اس نے کون سا اس کے ساتھ وعدے وعید کیے ہیں، اس سے عہد و پیمان باندھے ہیں، جو وہ اسی کا ہو کر رہتا اور اس کی اتنی بے اعتنائیوں اور بداخلاقیوں کے باوجود اسے چاہے چلا جاتا۔ وہ اپنے اندر جھانکتے جیسے بہت زیادہ گھبرا رہی تھی۔ اسے اپنی بدلی ہوئی کیفیت دل پسند معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ واقعی لڑکیوں کی نفسیات کو آج تک کوئی نہیں سمجھ پایا۔ جس مرد سے نفرت ہوتی ہے۔ پہلے اس سے خار کھاتی ہیں، مگر پھر خود ہی آہستہ آہستہ اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہیں۔ شاید نفرت، محبت کی پہلی سیڑھی ہے۔ یقیناً "نفرت، محبت کا ایک انوکھا انداز ہے۔ تو۔۔۔ تو پھر جرار نے اس کی نفرت میں چھپی محبت کو محسوس کیوں نہیں کیا؟ تو کیا واقعی اسے جرار سے محبت ہو گئی ہے؟

وہ سفید پڑتے چہرے کے ساتھ کھڑی رہ گئی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا وہ اس حد تک بدل سکتی ہے۔ وہ جس کے وجود کو نظر انداز کیے رکھتی تھی وہی وجود اس کے اندر تک راستہ بنا گیا تھا۔ اس کی روح پر جیسے کوئی بھاری بوجھ آن گرا۔ یہ سب کیوں کر ہوا؟ اور کیسے ہوا؟۔

یہ کیسا عجیب سا مقام تھا وہ اس شخص کی اہمیت کو سمجھنے لگی تھی۔ اس نے یہ احساس بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر محسوس کیا تھا وہ جس کے لیے بے چین ہو رہی ہے، وہ جسے اس کا جیون ساتھی بننا ہے، وہ کسی اور کے حوالے سے خواب دیکھ رہا ہے۔ ہاہ۔ جودت کتنی خوش قسمت ہے اور وہ خود کتنی بدنصیب۔۔۔

☼ ☼ ☼

وہ روزے کے باوجود شارمین اور عائشہ وغیرہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے نکلی تھی۔ اماں نے بہت اصرار

سے اسے ان کے ساتھ روانہ کر دیا تھا، ورنہ اس کا ایک فیصد بھی بازار جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ بازار میں اتنی دیر ہو گئی کہ افطار کا وقت بھی گزر گیا۔ ان چاروں نے روزہ بازار میں ہی کھول لیا۔ مانیا اور شارمین نے اس کے لیے برائیڈل ڈریس کا انتخاب جرار کی پسند کو مدنظر رکھ کر کیا تھا۔

"آج تو بہت تھک گئے۔" انوشے کے پاؤں دکھنے لگے تھے۔ سر میں بھی درد تھا۔ دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ سر درد کی ٹیبلٹ کھائے۔ چائے پیئے اور آرام سے بستر میں گھس کر سو جائے۔ گیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی سامنے لان میں جرار اور جودت بیٹھے نظر آ گئے۔ نریمان بھی ہمراہ تھا۔

"ہو گئی شاپنگ۔۔۔"
"ہاں بہت زبردست شاپنگ کی ہے۔" مانیا بولی۔
"دکھاؤ۔"
"پہلے ذرا تھکن دور کر لیں۔ پھر آرام سے اپنی شاپنگ دکھائیں گے۔ انوشے کا برائیڈل جوڑا بہت زبردست ہے دیکھو گی تو منہ میں پانی آ جائے گا۔" شارمین اور وہ سب کی سب اندر چلی گئیں۔ انوشے نے بھی ان کی پیروی میں پاؤں بڑھائے تو جودت بول اٹھی۔

"تم کچھ ڈھیلی لگ رہی ہو انوش۔"
"ہاں۔" ذرا سر میں درد ہے۔ اس کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گزر گیا تھا۔ اس کے نصیب میں لطیف سی بے تابی نہیں بلکہ کرب انگیز دکھ ہے۔ اپنے ہونے والے ہمسفر کے کسی اور جانب راغب ہونے کا دکھ۔

"تو پھر کوئی دوا لے لو۔۔۔"
"دوا کیا فائدہ دے گی بھلا، جب۔۔۔" چہرے پر چھائی زردی کو چھپانے کے لیے وہ مسکرا دی۔ یونہی بنا کسی خوشی کے مسکرانا اس دنیا کا دشوار ترین عمل ہے اور اسے اس عمل سے گزرنے کے لیے خاص محنت کرنا پڑی تھی۔ جرار اس کے اداس لہجے پر چونک سا گیا۔ نظریں اٹھا کر اسے دیکھا، وہ بہت مجھی مجھی سی لگ رہی تھی، آنکھوں میں افسردگی چھپی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو۔ آؤ بیٹھو۔ چائے پیو ہمارے ساتھ۔ تمہارا سر درد غائب ہو جائے گا۔" جودت مسکرائی۔

"نہیں۔ میرا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ رکھائی سے بولی اور تیز تیز قدم اٹھاتی اندر چلی گئی اور جرار تلخی سے مسکرا دیا۔ کافی حلق میں انڈیل کر کپ زور سے ٹیبل پر رکھا تو جودت چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"ہونہہ۔ تو میرے پاس بیٹھنا تک گوارا نہیں۔ اور عمیر کے ساتھ۔۔۔" وہ اس سے آگے کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

"یہ انوش کو کیا ہوا جیری بھائی، کچھ غصے میں دکھائی دے رہی تھی اور غالباً "خفا خفا بھی۔"
"اس کا اپنا مزاج ہے۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں اس سلسلے میں۔" اس نے یوں کڑوا سا منہ بنایا جیسے کونین کی گولی چبائی ہو۔

"لیکن جیری بھائی اب اسے اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھنا چاہیے۔ اگر وہ اپنے موڈ کے تابع رہی تو آپ دونوں کی زندگی میں دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔ مجھے اس انوشے کی بالکل سمجھ نہیں آتی۔ اس کی جگہ کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو آپ جیسا جیون ساتھی پا کر خود پر فخر محسوس کرتی، مگر یہ انوش، یہ ہر وقت آپ سے نالاں رہتی ہے۔ ہر بات پر لڑنے مرنے کو تیار۔ مجھے بالکل بھی یاد نہیں پڑتا کہ اس نے آج تک آپ سے سیدھے منہ بات بھی کی ہو۔ میں جانتی ہوں آپ اسے بے پناہ چاہتے ہیں جب ہی اس کے ناروا رویے پر آپ کی آنکھوں میں کرب کی پرچھائیاں تھرکنے لگتی ہیں اور چہرے پر اداسی چھا جاتی ہے۔ میں آپ کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں بھائی۔ اگر آپ کہیں تو میں انوش سے بات کر دوں۔"

"بالکل نہیں۔" جرار کا چہرہ سخت ہو گیا۔
"اس میں کوئی حرج نہیں ہے جیری بھائی۔"
"کچھ بھی ہو، تم اس سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کرو گی۔" وہ جھنجلا رہا تھا۔

"لو کے۔" وہ سعادت مندی سے بولی۔ اور پھر کتنے بہت سے دن ست روی سے گزر گئے۔

چاند رات آئی تو لڑکیاں جرار اور نریمان وغیرہ کے ساتھ چوڑیاں پہن آئیں۔ مانیا بہت اچھی مہندی لگاتی تھی۔ اس لیے مہندی لگانے کی ذمہ داری اس نے اٹھالی۔ جودت اور عائشہ کی ہتھیلیوں پر اس نے بہت خوب صورت نقش و نگار بنائے تھے۔ تب ہی نریمان' مانیا کے کان کے قریب جھک گیا۔ ذرا فاصلے پر لیپ ٹاپ میں مصروف جرار کی بھی پروا نہیں کی۔

"اپنی ہتھیلی پر مہندی سے صرف اور صرف میرا نام لکھنا' کوئی بیل بوٹے بنانے کی ضرورت نہیں۔"

"اگر کسی نے دیکھ لیا تو۔۔۔ وہ گڑبڑا گئی۔

"دیکھ لے کسے پروا ہے۔۔۔ پیار کیا تو ڈرنا کیا؟"

"اچھا جی۔۔۔ آغا جان کے سامنے تو اپنے دل کی بات کرتے گھگھی بندھتی تھی' وہ تو جرار بھائی نے ہمت دکھائی اور۔۔۔" وہ شوخ ہوگئی۔

"جن کی قسمت میں ملنا ہو' وہ ہر طرح سے مل جاتے ہیں۔" وہ بے حد آسودہ لگ رہا تھا۔

"بھئی یہ تم دونوں کیا کھسر پھسر کررہے ہو۔ مجھے کون مہندی لگائے گا۔" شارمین نے ان دونوں کے درمیان کود پڑی۔

"ابھی تو انوش کی باری ہے۔" مانیا نے بوکھلا کر سیدھے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آؤ انوشے۔" انوشے اس کے بالکل قریب بیٹھ گئی۔ حالانکہ اسے مہندی لگانے کا بالکل شوق نہیں تھا' مگر اب کی بار حجت کرنے کی بجائے وہ مانیا کے ایک مرتبہ بلانے پر ہی آگئی۔

"تمہاری ہتھیلی پر جیری بھائی کا نام لکھ دوں کیا؟" اس کی ہتھیلی اپنے سامنے پھیلاتے مانیا نے پوچھا تو انوشے نے کنکھیوں سے جرار ہمدانی کی طرف دیکھا۔ وہ اسی سمت متوجہ تھا۔ اگر وہ ہاں کہہ دیتی تو وہ خود کو بہت بلند' بہت اونچا سمجھنے لگتا۔ وہ اس کی محبت میں فنا ہورہی ہے جب ہی ایسی چھچھوری حرکتیں کررہی ہے۔ جب ہی اپنی ہتھیلی پر مہندی سے اس کا نام لکھ رہی ہے۔ حالانکہ دل اندر سے شدت سے چاہ رہا تھا کہ مانیا کو ہاں کہہ دے۔۔۔ مگر اپنی نسوانیت کی آبرو اسے بہت پیاری تھی۔

"نہیں۔" اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا تو جرار ہمدانی نے ضبط کی کوشش میں اپنے لب بھینچ لیے۔

"اگر جرار کا نام لکھوانے کو دل نہیں چاہ رہا تو میرا نام لکھوا دو اپنی ہتھیلی پر۔۔۔" عمیر نے ایک دم ہی مداخلت کی۔ اس کے بھونڈے انداز پر نہ چاہتے ہوئے بھی انوشے بے تحاشا ہنس دی جبکہ جرار کے ماتھے پہ کتنی بہت سی شکنیں ابھر آئیں۔ آنکھیں غصے سے بھر گئیں۔ تو وہ اپنی ہتھیلی پر اس کے نام کی بجائے عمیر کا نام لکھوانا چاہتی ہے۔ لمحہ بھر کو اس کا دل چاہا وہ اس کا گلا دبا دے اور اس قصہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کردے۔۔۔ آخر وہ اس بے وفا لڑکی کو اتنا برداشت کس لیے کررہا ہے' جو کھلے عام بے حیائی پر آمادہ ہے اور اس کی آنکھوں کے سامنے عمیر کے لیے اتاولی ہورہی ہے۔

"لاؤ اپنا ہاتھ۔" عمیر نے انوشے کا ہاتھ تھام لیا اور مانیا سے بولا۔

"لو بھئی مانیا۔ جلدی سے نام لکھ ڈالو۔"

"کس کا۔۔۔" مانیا نے پوچھا۔

"کیا ابھی بھی پوچھنے کی ضرورت ہے۔" عمیر کا انداز ذو معنی تھا۔ انوشے ایک بار پھر ہنس دی۔ جبکہ جرار غصے سے لال پیلا ہوگیا۔

"اتنی بے ہودگی سے ہنسنا شریف بہو بیٹیوں کا شیوہ نہیں۔" وہ ایک زہرخند سے بولا تو اس کی ہنسی کو بریک لگ گئی۔ وہ حیرت سے منہ کھولے اسی شخص کو دیکھے گئی۔ اسے اس سے ایسی سخت بات کی ہرگز توقع نہیں تھی۔

"کیا ہوا ہے یار۔۔۔ وہ مہندی لگوا رہی ہے۔ کوئی حساب کا سوال حل کرتے نالائقی کا ثبوت تو نہیں دے رہی جو تم اسے اس بری طرح ڈانٹ رہے ہو۔" عمیر بولا تو وہ اسی پر الٹ پڑا۔

"تم اپنے کام سے کام رکھو عمیر۔۔۔" جرار کا بگڑا

موڈ اور بگڑا لہجہ انوشے کے سامنے تھا۔ وہ صاف سمجھ رہی تھی کہ وہ کس بات کو بنیاد بنا کر اس طرح خفگی کا مظاہرہ کررہا ہے۔ لوگ خود دوسروں کے ساتھ جتنا چاہے بے تکلف ہوتے پھریں' اپنی شریک سفر کو چھوڑ کر کسی اور طرف اپنی توجہ لٹاتے پھریں۔ بے تکلفی کا مظاہرہ کریں' لیکن یہ کبھی گوارا نہیں کرتے کہ کوئی دوسرا بھی بدلے میں ان کے ساتھ یہی سلوک روا رکھے' جرار نے ہمیشہ جودت کو اہمیت دی۔ ہمیشہ اس کی پسند و ناپسند کو اس پر مقدم جانا' اپنا یہ عیب' یہ خامی وہ صاف طور پر نظرانداز کرگیا' لیکن اس کی عمیر کے ساتھ بے تکلفی ذرا بھی ہضم نہیں کرپایا حالانکہ یہ بھی جانتے ہیں کہ عمیر سے اس کی بے تکلفی محض ایک کزن کی حیثیت سے ہے اور۔۔۔ مانیا نے اس کی ہتھیلی پر جرار کا نام لکھا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر سیدھا صحن میں لگے واش بیسن کی طرف چلی آئی اور رگڑ رگڑ کر مہندی دھونے لگی۔

جب وہ شخص اس سے اتنا متنفر اور بے زار ہے تو پھر اسے بھی اس کا نام اپنی ہتھیلی پر لکھا رہنے کی ضرورت نہیں۔ پانی کی موٹی سی دھار کے نیچے گو گیلی مہندی اتر گئی تھی' لیکن جرار کا نام لکھا صاف نظر آرہا تھا۔ اتنی سی دیر میں رنگ چڑھ گیا تھا۔

"یوں یہ نام نہیں مٹے گا۔ تم ایسا کرو چاقو لے کر اپنی ہتھیلی کھرچ ڈالو۔" پشت پر اسی ستم گر کی غصیلی آواز ابھری تو وہ بوکھلا کر پلٹی۔ اس کی آنکھوں میں کتنے بہت سے آنسو پھر سے امڈنے کو بے تاب ہوگئے۔

"سنو۔ میں عمیر نہیں ہوں جو تمہاری اداؤں پر مر مٹوں گا' مجھ میں اور عمیر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں اگر چاہوں تو تمہیں ایک لمحے میں اپنی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال باہر کروں' مگر میں ایسا ہرگز ہرگز نہیں کروں گا۔ کیوں کہ تم اور عمیر یہی تو چاہتے ہو کہ میں تم دونوں کے راستے سے ہٹ جاؤں' مگر میں تمہاری یہ ناپاک خواہش ہرگز پوری نہیں کروں گا۔ میری طرح تم بھی یہ زندگی سسک سسک کر گزار دو گی۔ جس طرح میں بے نیل و مرام ہوں تم بھی اسی طرح شکستہ پا اور ادھوری رہو گی۔ تمہیں روتا تڑپتا دیکھ کر مجھے خوشی ہوگی۔" وہ اس سے ایک قدم کے فاصلے پر خشونت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ وہ سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ اپنی پلکیں ہی جھکا لیتی اس کا تو جیسے سارا وجود برف ہورہا تھا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے تھے۔

تو واقعی وہ بے حد چھوٹے ظرف کا مالک ہے۔

"مجھے خود پر بے حد تاؤ ہے کہ میں نے تم جیسی بے وفا لڑکی کو چاہا۔۔۔ جس پر اپنے کھرے جذبات لٹائے' مگر تم نے مجھے اس کا کیا صلہ دیا۔ صرف مایوسی' صرف اندھیرے' کیسے کیسے میں نے تمہاری پرستش نہیں کی' مگر تم نے میری تمام تر ریاضتوں پر پانی پھیر دیا۔ میری وفاؤں کا تم نے یہ صلہ دیا کہ تم نے عمیر کے ساتھ عہد و پیمان باندھ لیے۔ ایک لمحے کو بھی تمہیں یہ خیال نہیں آیا کہ ایک شخص اپنی تمام تر شدتوں سے تمہیں چاہتا ہے' مگر تمہیں اس کا خیال آ بھی کیسے سکتا ہے۔ تم تو ازل سے مجھ سے نفرت کرتی ہو۔ اور جہاں نفرتیں محبتوں پر غالب آجائیں وہاں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ نفرت ہے مجھے تم سے۔۔۔ تمہاری صورت سے۔۔۔ تمہاری وجود سے۔۔۔ سنا تم نے' مجھے تم سے نفرت ہے۔"

ان آنکھوں میں قہر کی بجلیاں کوند رہی تھیں اور وہ زبان شعلے اگل رہی تھی۔ انوشے کا چہرہ فق ہوگیا۔ اور گلا سوکھ کر لکڑی ہوگیا۔

خدایا۔ عمیر کے ساتھ اس کی بے تکلفی نے اسے بربادی کے دہانے پر لا کھڑا کیا۔ وہ بری طرح چکرا کر رہ گئی۔

"آ۔۔۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے جرار۔۔۔" مقابل کی سرخ سرخ آنکھیں دیکھ کر وہ کانپ کر رہ گئی۔

"غلط فہمی پہلے تھی۔ اب نہیں۔" خوف زدہ اور ڈری سہمی چڑیا سی لڑکی کی اداکاری پر اسے مزید غصہ آگیا۔

"میرا قصور کیا ہے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ کتنے

بہت سے آنسو گالوں پر دائیں بائیں لڑھکتے رہے۔
اتنی ذلت کا تو اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ اس پر کیسے واضح کرپائے گی کہ وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی مجرم گردانی گئی ہے کہ اس میں اس کا کوئی دوش نہیں۔ وہ تو صرف رد عمل کے طور پر عمیر سے بے تکلف ہوئی تھی اور.... اور.... اور اگر اس شخص نے اس کا اعتبار نہ کیا تو.... ؟ یہ تکلیف وہ سوال اس کی روح کھینچنے لگا۔ کسی کی نظروں میں گر کر زندہ رہنے کا کیا جواز؟ پانیوں کے اس پار کا منظر دھندلا گیا۔ وہ خاموشی سے قسمت اور وقت کے گزرنے کا انتظار کرنے لگی۔ اس کا جوڑ جوڑ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر اتنا روئے کہ اپنے اندر کی ساری گھٹن باہر نکال دے۔

"قصور...." اس نے اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر جھنجوڑ اور سختی سے پرے دھکیل دیا۔
"ہونہہ! معصوم بننے کی کوشش مت کرو۔ اپنے اس غلیظ دل سے پوچھو کہ تمہارا قصور کیا ہے۔ فوراً جواب مل جائے گا۔" وہ لب بھینچ کر بولا تو اس کی آنکھوں میں پھر سے شبنم جمنے لگی۔
"تمہارے یہ آنسو اب مجھ پر اثر نہیں کرسکتے انوشے بی بی۔ میں آنکھیں رکھتے ہوئے اندھا نہیں بن سکتا۔ میں نے تمہیں بارہا عمیر کے ساتھ دیکھا ہے اور...."

"اور آپ بھی تو جووت کے ساتھ...." نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لبوں سے پھسل گیا تھا۔ باقی کا جملہ اس نے زبان دانتوں تلے دبا کر روک لیا۔
"شٹ اپ...." غصے کی زیادتی کے باعث اس کا ہاتھ اسے مارنے کو بلند ہوا، مگر وہ ضبط کرگیا۔
"بکواس بند کرو۔ اپنا الزام دوسروں کے سر تھوپتے، تمہیں شرم نہیں آئی۔ وہ میری چھوٹی بہن ہے اور اس کے لیے مجھے تمہیں کسی قسم کی صفائی دینے کی ضرورت نہیں۔" وہ ایڑیوں پر گھوما اور تیز تیز قدموں سے اندر کی طرف چلا گیا۔ اس کے اٹھتے بڑھتے قدم اس کے جذبات کی تندہی کے غماز تھے۔ وہ بھی اپنے کمرے میں آکر بستر پر اوندھی گر گئی اور ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ تو جرار، جووت کو اپنی بہن سمجھتا ہے۔

اف.... وہ اس معاملے میں بھی اس شخص کے سامنے چھوٹی پڑ گئی۔ خدایا وہ اس کی نظروں سے اتنا گر گئی کہ پاتال میں پڑا اس کا وجود تعفن زدہ ہے۔ اسے جیسے خود سے گھن آنے لگی۔ وہ تو خود سے بھی نظریں ملانے کے قابل نہیں رہی۔ وہ جیسے گہرے صدمے کے زیر اثر تھی۔
"جیری۔ تمہاری بدگمانی میرے لیے بہت اذیت ناک ہے۔ کاش یہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔" مگر دلی خواہشات اس طرح تو پوری نہیں ہوا کرتیں۔ وہ ساری رات کانٹوں پہ گزری صبح عید تھی، مگر وہ کمرے میں بند رہی۔ صبح ناشتے کے لیے بھی کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ وہ کس منہ سے جرار کا سامنا کرپائے گی۔ بزرگ اور نوجوان عید کی نماز پڑھ کر آئے تو تب بھی وہ سامنے نہیں آئی۔ حالانکہ باقی لڑکیاں تیار ہو کر بزرگوں سے عیدی وصول کررہی تھی۔

"یہ انوشے کہاں ہے؟" آغا جی نے پوچھا۔
"بھئی ہماری بہو کو بلاؤ.... سب سے پہلے عیدی لینے کا حق اسی کا ہے۔"
"میں بلا لاتا ہوں آغا جان...." عمیر نے اپنی خدمات پیش کیں۔ وہ سیدھا انوشے کے کمرے کی طرف بڑھا تو جرار نے تعاقب کرکے اسے راستے میں جالیا۔ وہ عین راہداری کے بیچوں بیچ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔
"تم کس ناتے سے انوشے کو بلانے جارہے ہو.... کان کھول کر سن لو عمیر۔ مجھے اس سے تمہاری یہ بے تکلفی قطعی پسند نہیں۔" جرار کے کڑوے لہجے پر عمیر واضح طور پر چونکا۔
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہی ہے کہ مجھے تمہاری انوشے سے بے تکلفی پسند نہیں۔" اس نے اپنا جملہ دہرایا۔
"یہ اچھی کہی تم نے.... کیا اپنی بھابھی کے ساتھ

میری بے تکلفی جائز نہیں۔ میں تمہیں اتنا تنگ نظر نہیں سمجھتا تھا جیری...."
"عمیر۔ میری آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش مت کرو۔" وہ مدھم لہجے میں غرایا۔
"خدا وہ دن نہ لائے۔ میں نے اسے ہمیشہ تمہاری امانت سمجھا ہے۔ میں اسے مانیا کی طرح عزیز جانتا ہوں اور اس کا نظریہ بھی میرے بارے میں یہی ہے۔ اگر تمہیں ہم دونوں کے بارے میں کوئی غلط فہمی تھی تو تصدیق کرلیتے۔ خواہ مخواہ اتنے دنوں تکلیف میں مبتلا رہے۔ اور ایک بات اور.... میں اپنی پسند بدلنے کا عادی نہیں۔" "کیا مطلب؟"
"مطلب۔ مجھے جووت پسند ہے اور ہمارا تعلق جوڑنے کے لیے تمہیں ہی آغا جان سے بات کرنا ہوگی۔" عمیر بولا تو جرار جیسے آن واحد میں ہلکا پھلکا ہوگیا۔ جیسے روح پر پڑا بھاری بوجھ سرک گیا ہو۔
تم سب نے مجھے آخر سمجھ کیا رکھا ہے۔
"اپنا مددگار.... اپنا نجات دہندہ...." عمیر بولا تو جرار ایک خوب صورت سا قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔
"ارے مارے گئے.... میں تو انوشے کو بلانے چلا تھا۔ آغا جان منتظر ہوں گے۔"
"یہ کار خیر میں انجام دیے دیتا ہوں۔" جرار، انوشے کے کمرے کے سامنے آگیا۔ پہلی بار اس لڑکی کے کمرے کا دروازہ بجاتے وہ بہت آسودہ اور مطمئن تھا۔ تیسری دستک پر دروازہ کھل گیا۔
"آپ...." وہ کھلے دروازے کے فریم میں کسی تصویر کی طرح ساکت وجامد رہ گئی۔
یہ یہاں کیسے؟ کیا ابھی اس کے ترکش میں کچھ تیر باقی ہیں؟ یا پھر وہ اسے ندامت کے زیر اثر مار ڈالنے کے درپے ہے؟
"ذرا اپنا ہاتھ دکھاؤ...." وہ اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہا تھا۔ اس کے سخت لہجے پر وہ آنکھوں میں اترتے آنسو اندر اتار گئی۔ "کیوں.... ؟"
"ہاتھ ادھر لاؤ۔" زبردستی اس کا ہاتھ تھام کر جرار نے اس کی ہتھیلی کھول دی۔ اس کا نام اس کی ہتھیلی پر مہک رہا تھا۔
"اپنے ہاتھ پر تو یہ نام لکھوالیا، مگر تمہارے دل پر بھی یہی نام لکھا ہے یا نہیں۔" پتا نہیں وہ کیا جاننا چاہ رہا تھا۔
پہلی بار انوشے نے محسوس کیا۔ اس کے لہجے سے سختی معدوم تھی اور ان آنکھوں میں بھی تنفر کی بجائے چاہت کی نرم نرم پھوار تھی۔
نہ چاہتے ہوئے بھی آنسو گالوں پر بہہ نکلے۔ وہ تو اس قابل بھی نہیں کہ مقابل سے آنکھیں ملا پائے۔
"ادھر میری طرف دیکھو۔" وہ تحکم بھرے انداز میں کہہ رہا تھا۔
اس نے لرزتی پلکیں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ وہ وہی تھا جس سے وہ ایک زمانے سے متنفر تھی شاید بہت بری ہے وہ۔ غالباً" وہ یہی باور کرانے آیا تھا۔ وہ بے ہمت سی ہوگئی اور وہ دروازے میں شان سے ایستادہ مسکرا رہا تھا۔
"اگر اس بات پر رونا آرہا ہے کہ رخصتی عید سے ایک ہفتے بعد کی ہے تو میں آغا جان سے کہہ کر آج کے دن ہی رخصتی کروالیتا ہوں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ فرصت بھی ہے۔ موقع بھی ہے۔ دستور بھی ہے۔"
"آپ.... آپ...." اس سے ایک لفظ بھی بولا نہیں گیا۔ تو کیا وہ بخش دی گئی.... تو کیا اس شخص کا دل اس کی طرف سے صاف ہوگیا۔ تو کیا وہ اس سے خفا نہیں؟
دھندلاتی آنکھوں سمیت وہ گرنے کو تھی، لیکن سنبھال لی گئی۔
"جواب دو۔ کیا آج کے دن رخصتی کروالوں۔" وہ بہت شوخ ہو رہا تھا۔
"ہوں...." جواباً" وہ شرمیلی مسکان لیے بولی تو جرار کا زندگی سے بھرپور قہقہہ اطراف میں بھی خوشیاں بکھیر گیا۔ ان دونوں کے دل کی طرح اس گھر کی در و دیوار سے بھی شکستگیاں دھل گئی تھیں۔ عید کی وہ صبح ان دونوں کے لیے بہت مبارک تھی۔

☆ ☆

دیا شیرازی

چھوٹی سی خواہش

عاطف پسینے میں شرابور آفس سے لوٹا' پنکھے کی رفتار تیز کی۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے صوفے پہ بیٹھ گیا اور جوتے کے تسمے کھولنے لگا۔

"کرن! پانی پلاؤ یار۔" وہ تھکے سے انداز میں بولا۔ بچوں کی چیزیں جلدی' جلدی ترتیب سے رکھتی کرن بیچ میں کام چھوڑ کر پہلے شوہر کو پانی دینے اٹھی۔

"آپ کب آئے۔" فریج سے پانی نکالتے ہوئے اس نے حیرت سے پوچھا۔

"بس۔ ابھی ابھی آیا ہوں۔" عاطف ایک ہی سانس میں غٹاغٹ پانی چڑھا گیا۔

"آپ کپڑے چینج کر کے آئیں' میں کھانا لگاتی ہوں۔ آج میرے پاس آپ کے لیے ایک زبردست خبر ہے۔" کرن پرجوش سی بولی۔ عاطف نے بیوی کو جانچتی نظروں سے دیکھا اور متعلقہ خبر کا اندازہ لگانا چاہا لیکن ناکام رہا۔

"بتادو یار۔ خوامخواہ سسپنس مت پھیلاؤ۔ مجھے ٹینشن ہوتی ہے۔" وہ بے تابی سے بولا۔

یہ عاطف کی کمزوری تھی۔ اسے واقعی سرپرائز بہت برے لگتے تھے۔ سیدھا سادہ آدمی تھا۔ سیدھی سادی باتیں پسند تھیں۔ خوامخواہ کا تجسس اسے الجھن میں ڈال دیتا تھا۔ سوچ سوچ کے پریشان ہوجاتا۔ اسی وجہ سے وہ ایسی باتوں سے نا صرف خود گریز کرتا تھا' بلکہ دوسروں پہ بھی چڑتا تھا۔ لیکن اس کی بیوی کرن کا یہ پسندیدہ کام تھا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن آفس فون کرکے کہتی بہت اچھی خبر ہے' گھر آئیں تو سناتی ہوں۔ بے چارے عاطف کے دماغ کی سوچ سوچ کر ایسی کی تیسی ہوجاتی۔ وہ بقیہ وقت کیسے گزارتا یہ تو صرف اسے ہی معلوم تھا اور جب وہ گھر آتا تو اکثر ہی کوئی پھُس سی بات ہوتی عاطف بجھ کے رہ جاتا۔

"اتنی سی بات کے لیے اتنا سسپنس پھیلانے کی کیا ضرورت تھی۔ کرن! تم بھی اسٹار پلس کے ڈرامے دیکھ' دیکھ کر فضول میں رائی کا پہاڑ بنانے میں ماہر ہوتی جارہی ہو۔" وہ چڑ کر کہتا۔

"ارے یہ اتنی سی بات تھی۔" کرن منہ بنانے لگتی۔ دونوں اپنی اپنی عادت سے مجبور تھے۔

"ایسے نہیں پہلے آپ فریش ہوجائیں۔ کھانا کھائیں' پھر خوش گوار ماحول میں بتاؤں گی۔ ابھی بتادیا تو سارا مزا خراب ہوجائے گا۔" وہ اپنی بات پہ اڑی رہی۔ عاطف ٹھنڈی سانس بھر کے واش روم چلا گیا۔ اسے پتا تھا کرن نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ اب ایک انچ نہیں ہلے گی اپنی بات سے۔ عاطف نہا دھو کر تولیے سے بال رگڑتا ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ بھوک شدید لگی تھی۔ کھانے کی خوشبو سے مزید بڑھ گئی تھی۔

"کرن! جلدی کرو مجھ سے اب مزید بھوک برداشت نہیں ہورہی۔ سر میں درد شروع ہوگیا ہے۔"

"اچھا آئی۔" وہ جلدی' جلدی کوفتوں کا سالن اور ہاٹ پاٹ لے آئی۔ جس میں گرما گرم روٹیاں رکھی تھیں۔ فریج سے ٹھنڈا پانی نکال کے جگ میں رکھا اور فریزر سے کھیر کا ٹھنڈا ٹھار پیالا نکالا۔ عاطف کو کھیر اور کوفتے بہت پسند تھے۔ وہ شوق سے کھانے لگا۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ سرپرائز کو بھی بھول گیا تھا۔

"عمر۔ سمیرا۔ آزہ! آجاؤ بیٹا کھانا کھالو۔ جلدی کرو بابا بھی آگئے ہیں۔" کرن نے بچوں کو آواز دی۔ عمر کمپیوٹر پہ گیم کھیل رہا تھا۔ جبکہ آزہ اور سمیرا اپنا من پسند کارٹون دیکھ رہے تھے۔

"السلام علیکم بابا۔" تینوں بچوں نے ایک ساتھ سلام کیا۔ عاطف کے سینے میں ٹھنڈک اتر گئی۔ اتنے سلجھے باادب بچے' وہ کرن کا بے حد مشکور تھا۔ جس نے دن رات ایک کردیا تھا ان کی تعلیم اور تربیت میں۔

"وعلیکم السلام بیٹا! کیسا رہا اسکول ٹائم۔" عاطف نے مسکرا کے پوچھا۔

"بہت اچھا۔" تینوں نے یکے بعد دیگرے جواب دیا۔

کھانا کھا کر بچے اپنے سابقہ مشاغل میں مصروف ہوگئے۔ کرن نے برتن سمیٹے۔

"کرن! ایک کپ چائے لے آؤ کمرے میں' اور پلیز اب وہ بات بتا بھی چکو' کب سے سولی پہ لٹکایا ہوا

ہے۔" عاطف بے زاری سے بولتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"اچھا بس ابھی آئی۔" کرن کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔ عاطف کی حالت اسے مزا دے رہی تھی۔

"کیسی بنی ہے۔" عاطف نے چائے کا پہلا گھونٹ لیا ہی تھا کہ اس کے شانوں پہ جھکی کرن نے پوچھ لیا۔

"ہوں۔" عاطف نے سر ہلا کر چائے اچھی ہونے کی تصدیق کی۔

"عاطف بات یہ ہے کہ۔" وہ رکی۔ "میں سوچ رہی تھی کہ۔" پھر خاموشی۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا' بات کہاں سے شروع کرے۔

"عاطف! میرے خیال میں اب ہمیں گاڑی لے لینی چاہیے۔" کرن نے ایک ہی سانس میں جملہ ختم کیا۔ مبادا پھر اٹک نہ جائے۔

"پھف۔" عاطف کے منہ سے چائے کا فوارہ چھوٹ نکلا۔

"مجھے پتا تھا تم کوئی ایسی ہی الٹی سیدھی بات کروگی۔" وعید مزا سا ہو گیا۔

"اور یاد رکھو! اب میں تمہاری ایسی کسی فضول خرچی میں تمہارا ساتھ دینے والا نہیں ہوں۔ تمہارے ایل ای ڈی کی اقساط بمشکل پچھلے ماہ ختم ہوئی ہیں۔ ابھی ٹھیک سے سانس بھی نہیں لے لیا کہ یہ نیا مطالبہ شروع۔ بس۔ اب مزید کچھ نہیں' کم از کم تب تک جب تک میری انکم اتنی نہیں بڑھتی کہ کچھ سیو کروں' یہ خرافات اپنے دماغ سے نکال دو۔" وہ غصے سے بولتا ہی چلا گیا۔

کرن خاموشی سے سنتی رہی۔ اس کے چہرے پہ اب بھی اطمینان چھلیا ہوا تھا۔ جیسے کسی منجھے ہوئے وکیل کو اپنی کامیابی کا یقین ہوتا ہے اور وہ چہرے پہ مسکراہٹ سجائے مخالف وکیل کے دلائل سنتا رہتا ہے۔ کرن کو بھی اپنی جیت کا پکا یقین تھا۔

"آپ میری پوری بات تو سن لیتے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی تو عاطف کو اپنے جذباتی پن پہ شرمندگی محسوس ہوئی۔

"کچھ بھی ہو کرن! لیکن میں فی الحال واقعی گاڑی افورڈ نہیں کر سکتا۔ تمہیں پتا تو ہے سب۔" اب کی بار وہ ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

"میرے پاس پورا پلان ہے' آپ سنیں تو۔" کرن اس کے سامنے بیڈ پہ بیٹھ گئی۔

"بتاؤ۔" عاطف ہتھیار پھینکتے ہوئے بولا۔

"میری اس مہینے کمیٹی نکلی ہے۔ تین لاکھ کی۔" کرن خوشی خوشی بتانے لگی۔ عاطف کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ سارے قصے میں پہلی بار اسے دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔

"ارے واہ۔" وہ خوش ہوا۔ "اب اس خوشی کے موقع پر تم ہم سب کو ٹریٹ دو۔" عاطف چہکنے لگا۔

"اوں ہوں۔ ٹریٹ اسی صورت میں ملے گی۔ جب آپ مجھے گاڑی لے دیں گے اور اسی گاڑی پہ ہم سب سی ویو جائیں گے۔ وہ بھی آپ کے خرچے پر' کیوں کہ اصل مالک تو آپ ہوں گے نا گاڑی کے۔"

کرن نے دو پل میں بے چارے عاطف کو سپنوں کی حسین وادی میں پہنچا دیا۔ جہاں ہر کام چٹکی بجاتے ہوجاتا ہے۔

"ٹھیک ہے' لیکن یہ سب تین لاکھ میں نہیں ہوگا۔ اگر ہم اچھی کنڈیشن کی کوئی چھوٹی موٹی گاڑی بھی لے لیں تو چار' پانچ لاکھ سے کم میں نہیں آئے گی۔" عاطف نے اسے حقیقت کی دنیا میں لا پٹخا۔

"تو آپ تین لاکھ کسی سے ادھار لے لیں۔" کرن بے تکلی سے بولی۔

"پھر قرض۔" عاطف کو کوفت ہونے لگی۔ اس سارے قصے سے اسے مزاجا تاؤ کھلائی دیا۔

"او بی بی! آج کل کوئی دس روپے دینے کو تیار نہیں۔ تین لاکھ تو بہت بڑی رقم ہے۔ کون دے گا اور وہ بھی مجھ کنگلے کو۔ آگے پیچھے جائیداد کوئی ہے نہیں۔ جو کماتا ہوں مہینے کے آخر تک ختم ہوجاتا ہے۔ کس آسرے پہ کوئی مجھے قرض دے گا اور کس آسرے پہ اتنی رقم لوں' کہاں سے اتاروں گا۔"

"تو پھر آپ آفس سے ایڈوانس لے لیں۔ ہر مہینے

پانچ ہزار کٹتے رہیں گے۔ چار' پانچ سال میں قسطیں اتر جائیں گی۔ وقت اتنی تیزی سے گزرتا ہے۔ پتا بھی نہیں چلے گا۔ یوں چار سال گزر جائیں گے۔" کرن نے چٹکی بجاتے ہوئے ایک اور نادر مشورہ دیا۔

"وہ تیزی سے ان کا گزرتا ہے جنہیں کوئی پریشانی اور فکر نہ ہو۔ ہم جیسے متوسط طبقے کو دو وقت کی روٹی کے حصول کے لیے دن سے رات کرنا دوبھر ہوجاتا ہے۔" عاطف تلخی سے بولا۔

"اچھا اب اتنے ناشکرے نہ بنیں۔ اللہ نے بہت سوں سے اچھا رکھا ہوا ہے۔"

"یار! پینتیس ہزار میری تنخواہ ہے۔ پانچ ہزار کٹوالوں تو باقی مہینہ کیسے چلے گا۔"

"یہ میرا مسئلہ ہے' میں کرلوں گی مین ٹین۔" کرن اعتماد سے بولی۔

"دال ہی نہ کھلاتی رہنا پورا مہینہ۔" عاطف دہل کر بولا۔

"نہیں کھلا رہی آپ کو دال۔ بس آپ کل جا کر آفس میں قرضے کے لیے اپلائی کریں۔"

"اچھا بھئی جیسے تم کہو۔" عاطف نے پیار بھری نظروں سے بیوی کو دیکھا۔ گاڑی اس کا بھی دیرینہ خواب تھی لیکن وہ بچوں کی اچھی زندگی اور تعلیم کے لیے اپنی خواہش کو دبائے بیٹھا تھا اور آج کرن وہ خواہش پوری کرنے جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

عاطف آج بہت خوش تھا۔ اس کا قرضہ منظور ہوچکا تھا۔ آج شام تک وہ بینک سے رقم وصول کرسکتا تھا۔ اس نے پہلی فرصت میں یہ خبر کرن کو پہنچائی تھی' جو مارے خوشی کے اچھل پڑی۔

"ہائے اللہ! عاطف! مجھے بالکل یقین نہیں آرہا کہ میری اتنی بڑی خواہش اتنی آسانی سے پوری ہورہی ہے۔ دیکھا میں نے کہا تھا نا' انسان کی تقدیر اس کی کوشش میں چھپی ہوئی ہے۔ اگر ہم یہ سوچ کے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے کہ بہت مشکل کام ہے۔ ہم سے نہیں ہوگا تو شاید اگلے چار' پانچ سال اور یوں ہی گزر جاتے۔" کرن اپنی عقل پہ اترانے لگی۔

"ٹھیک کہتی ہو۔ اگر تم ہمت نہ کرواتیں تو میں یوں ہی بیٹھا قسمت کے مہربان ہونے کا انتظار کرتا رہتا۔" عاطف کو اعتراف کرنا پڑا۔ کرن کو خود پہ فخر محسوس ہونے لگا۔

"میں امی کو فون کرکے بتاتی ہوں۔ بہت خوش ہوں گی۔" کرن اپنی زنانہ فطرت سے مجبور اب جلد از جلد اس خبر کو نشر کرنا چاہتی تھی۔

"اچھا میں تمہیں بعد میں کال کرتا ہوں۔ فی الحال تھوڑا مصروف ہوں۔" عاطف نے فون رکھ کر سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ سامنے لیپ ٹاپ پر مختلف گاڑیوں کی تصاویر اور کوائف کھلے ہوئے تھے۔ عاطف کو سفید رنگ کی گاڑی بہت پسند تھی' جبکہ کرن بضد تھی کہ سرخ رنگ چھوٹی گاڑیوں میں بہت خوب صورت لگتا ہے۔ "آخری چوائس میری ہونی چاہیے۔ آخر گاڑی چلانی مجھے ہی ہے۔" اس نے خود کو ایک رعایت دی اور اپنی چالاکی پہ مسکرا دیا۔ عاطف نے گاڑی بک کروالی تھی۔ چھوٹی سی سفید رنگ کی مہران وی ایکس آر دیکھتے ہی کرن کے دل کو بھا گئی۔ آج ادائیگی ہونی تھی۔ عاطف رقم لے کر گیا تھا اور کرن سے ایک ایک منٹ کاٹنا مشکل ہورہا تھا۔ وہ خود کو تصور میں ابھی سے گاڑی میں گھومتے اور شاپنگ کرتے دیکھ رہی تھی۔ آج ان دونوں نے گاڑی کی خوشی میں گھر پر ہی رشتے داروں کو چھوٹی سی پارٹی دی تھی۔ جس میں اس کے میکے والے اور عاطف کی بھائی' بہنوں کی فیملیز مدعو تھیں۔ مختصر سا پروگرام تھا۔ پہلے کیک کاٹنا تھا۔ پھر کھانا' جس میں بریانی' قورما اور نان شامل تھے۔ یہ سارا پلان عاطف نے بنایا تھا جو کرن نے بخوشی مان لیا تھا اور کیوں نہ مانتی' عاطف نے اس کے لیے اتنا کچھ کیا تھا۔

دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ کرن نے پورا گھر چمکا دیا تھا۔ پارٹی میں ابھی بہت ٹائم تھا اور کھانا ویسے بھی باہر سے آنا تھا۔ سو وہ سکون سے بیٹھ کے عاطف کا انتظار

کرسکتی تھی، لیکن سکون تھا کسے۔ اب تک تو عاطف کو آجانا چاہیے تھا۔ کوئی تیسری بار اس نے عاطف کو فون ملایا۔ بیل جارہی تھی۔ ادھر سے کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ پھر اچانک فون کاٹ دیا گیا۔

"حد کرتے ہیں عاطف بھی، مانا کہ حساب کتاب اور کاغذات وغیرہ میں مصروف ہوں گے، لیکن دو منٹ بات کرلیتے تو کیا ہوجاتا۔ ان کی تو یہ ہی عادت ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ آج کا دن خوشیوں کا دن ہے۔ میں کیوں خوامخواہ خود کو پریشان کررہی ہوں۔ شاید تھوڑی دیر تک وہ خود ہی بات کرلیں۔ کرن نے خود کو تسلی دی۔ آدھا گھنٹہ مزید گزر گیا۔ اب اسے پریشانی ہونے لگی تھی۔ نمبر بھی بند جارہا تھا۔

یااللہ خیر کرنا، ایسے کبھی کیا تو نہیں۔" ایک اور پھر دو گھنٹے گزر گئے عاطف کا کوئی اتا پتا نہیں تھا نہ ہی کوئی فون آیا۔ اب تو کرن کی حالت خراب ہونے لگی۔ جتنی دعائیں یاد تھیں، سب پڑھ ڈالیں۔

"یااللہ! عاطف خیر سے ہوں۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ گاڑی بھی نہیں، بس وہ خیر سے آجائیں۔" کرن گڑگڑا کر دعا مانگنے لگی۔ ٹھیک چار بجے عاطف واپس آگیا۔ خالی ہاتھ۔"

"عاطف! کیا ہوا۔ کہاں تھے آپ۔ فون بھی اٹینڈ نہیں کررہے تھے۔ سب ٹھیک تو ہے نا۔ گاڑی کہاں ہے۔" کرن نے بے تابی سے سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ عاطف گردن جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔

"کچھ بولیں بھی، خدا کے لیے مجھے گھبراہٹ ہورہی ہے۔" کرن کو شوہر کی خاموشی دیکھ کر ہول اٹھ رہے تھے۔ عاطف کو الفاظ نہیں سوجھ رہے تھے جن میں وہ کرن کو یہ بری خبر سناتا۔ اس کی نظروں میں کرن کا صبح والا کھلا چہرہ گھوم رہا تھا۔

"بولیں نا عاطف۔" کرن اسے جھنجوڑنے لگی۔

"کرن! مجھ سے گاڑی کی رقم دو موٹر سائیکل سواروں نے چھین لی۔"

"یااللہ۔" کرن نے چکراتے سر کے ساتھ دیوار کو تھاما۔

"میرا موبائل۔ والٹ۔ گھڑی سب کچھ۔ میں خود اتنے صدمے میں تھا کہ گھر آنا تمہارا سامنا کرنا، بچوں کے اترے چہرے دیکھنا، میرے بس سے باہر تھا۔ میں بلاوجہ سڑکوں پر پھرتا رہا اور خود کو یہ باور کراتا رہا کہ صرف ایک گاڑی پہ زندگی ختم نہیں ہوجاتی۔ ہماری زندگی میں بہت کچھ اچھا ہے۔ یہ گھر ہمارے بچے۔" وہ بولتا رہا کرن کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے رہے۔

"تم۔ میں۔ اگر ہم سب سلامت ہوں تو گاڑی پھر لے سکتے ہیں۔" عاطف کے گال بھیگ رہے تھے۔ کرن نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگی، لیکن چہرہ ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

"مجھے بس آپ کی اور بچوں کی زندگی چاہیے آپ، بچے ہم سب خوش رہیں اور کچھ نہیں۔" وہ بمشکل بول پائی۔ عاطف نے اس کے شانے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا۔ کرن کے چہرے پہ ایک اداس مسکراہٹ آکے ٹھہر گئی۔ عاطف اٹھ کر فون کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی اسے بہت سے لوگوں کو یہ اطلاع دینی تھی کہ پارٹی ملتوی ہوگئی ہے۔

اللہ وطن عزیز کے حالات پہ رحم کرے، جہاں کرن اور عاطف جیسی بے شمار فیملیز کی چھوٹی چھوٹی خواہشیں حالات کی بے رحمی کا شکار ہوجاتی ہیں اور وہ قسمت کا لکھا سمجھ کر خاموش رہتے ہیں۔ انہوں نے کبھی وطن عزیز کو برا نہیں کہا۔ نہ اسے چھوڑنے کا تصور بھی کیا ہے۔ بلکہ ہمیشہ حالات بہتر ہونے کی دعا کی ہے۔ وہ کہتے ہیں نا۔

موج بڑھے یا آندھی آئے، دیا جلائے رکھنا ہے
گھر کی خاطر سو دکھ جھیلیں گھر تو آخر اپنا ہے

☆ ☆

شعاع عمیر

کرن کرن خوشبو

ماہ صیام

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک کی آمد پر ارشاد فرمایا: "رمضان کا مہینہ آرہا ہے، جو بڑی برکت والا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں تمہاری طرف متوجہ ہوتا اور اپنی رحمت نازل فرماتا ہے۔ خطاؤں کو معاف کرتا اور دعاؤں کو قبول فرماتا ہے، تمہارے تنافس کو دیکھتا ہے اور ملائکہ کے سامنے فخر فرماتا ہے۔ پس اللہ کو اپنی نیکیاں دکھاؤ، بدنصیب ہے وہ شخص جو اس مہینے میں بھی اللہ کی رحمت سے محروم رہ جائے۔"
(طبرانی)

روزوں کی فضیلت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "انسان کا ہر عمل بڑھایا جاتا ہے۔ دس گنا سے سات سو گنا تک بلکہ اس سے آگے تک جتنا اللہ تعالیٰ چاہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں سوائے روزے کے کہ وہ خاص میرے لیے ہے اور میں خود اس کا بدلہ دوں گا، آدمی اپنی خواہش اور غذا میری خاطر چھوڑتا ہے، روزہ رکھنے والے کے لیے دو خوشیاں ہیں، ایک خوشی افطار کے وقت اور دوسری خوشی اپنے پروردگار سے ملاقات کے وقت اور بلاشبہ روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے ہاں مشک کی بو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔" 1638
(سنن ابن ماجہ شریف، باب ماجاء فی فضل الصیام)

بغیر کسی عذر کے روزہ چھوڑنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"جو شخص بغیر کسی رخصت یا مرض کے رمضان کا ایک روزہ افطار کرلیتا ہے (یعنی بغیر کسی عذر کے روزہ نہیں رکھتا) تو زمانہ بھر روزہ رکھنا اس کی قضا کا سبب نہیں بن سکتا اگرچہ تمام عمر روزے رکھے۔ 1916
(مشکوۃ شریف: باب تنزیہ الصوم)

رشیدہ فیض۔ جام پور

ایک حکایت ایک سبق

سینکڑوں سال پہلے کا ذکر ہے کہ چین کے بادشاہ نے ایک بڑی گزرگاہ کے بیچوں بیچ ایک چٹانی پتھر ایسے رکھوا دیا کہ گزرگاہ بند ہوکر رہ گئی اور اپنے ایک پہرے دار کو نزدیک ہی ایک درخت کے پیچھے چھپا کر بٹھا دیا، تاکہ وہ آتے جاتے لوگوں کا ردعمل سنے اور اسے آگاہ کرے۔ اتفاق سے جس پہلے شخص کا وہاں سے گزر ہوا، وہ شہر کا مشہور تاجر تھا جس نے بہت ہی نفرت اور حقارت سے سڑک کے بیچوں بیچ رکھی اس چٹان کو دیکھا، یہ جانے بغیر کہ یہ چٹان تو حاکم وقت نے ہی رکھوائی تھی، اس نے ہر اس شخص کو برا بھلا کہا جو اس حرکت کا ذمے دار ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد وہاں سے تعمیراتی کام کرنے والے ایک ٹھیکے دار کا گزر ہوا۔ اس کا ردعمل بھی اس سے پہلے گزرنے والے تاجر سے مختلف تو نہیں تھا، مگر اس کی باتوں میں ویسی شدت اور گھن گرج نہیں تھی جیسی پہلے والا تاجر دکھا کر گیا تھا۔ اس کے بعد وہاں سے تین ایسے دوستوں کا گزر ہوا جو ابھی تک زندگی میں اپنا مقام نہیں بنا پائے تھے اور کام کاج کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔ انہوں نے چٹان کے پاس رک کر سڑک کے بیچوں بیچ ایسی حرکت کرنے والے کو جاہل، بے ہودہ اور گھٹیا انسان سے تشبیہ دی اور قہقہے لگاتے ہوئے اپنے گھروں کو چل دیے۔ اس چٹان کو سڑک پر

رکھے دو دن گزر گئے' وہاں سے ایک مفلوک الحال اور غریب کسان کا گزر ہوا۔ کوئی شکوہ کیے بغیر جو بات اس کے دل میں آئی' وہ وہاں سے گزرنے والوں کی تکلیف کا احساس تھا اور وہ یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح یہ پتھر وہاں سے ہٹا دیا جائے۔ اس نے وہاں سے گزرنے والے راہ گیروں کو دوسرے لوگوں کی مشکلات سے آگاہ کیا اور انہیں جمع ہو کر وہاں سے پتھر ہٹوانے کے لیے مدد کی درخواست کی اور بہت لوگوں نے مل کر زور لگا کر چٹان نما پتھر وہاں سے ہٹا دیا۔ جیسے ہی چٹان ہٹی' نیچے سے ایک چھوٹا سا گڑھا پیدا ہو گیا' اس میں رکھی ہوئی ایک صندوقچی نظر آئی' جسے کسان نے کھول کر دیکھا تو اس میں سونے کی ایک اشرفی اور خط رکھا تھا جس میں لکھا ہوا تھا "حاکم وقت کی طرف سے اس چٹان کو سڑک کے درمیان سے ہٹانے والے شخص کے نام جس کی مثبت اور عملی سوچ نے مسائل پر شکایت کرنے کے بجائے اس کا حل نکالنا زیادہ بہتر جانا۔" ہمیں بھی اپنے گرد و نواح میں نظر دوڑا کر دیکھنا چاہیے' کتنے ایسے مسائل ہیں جنہیں ہم باآسانی حل کر سکتے ہیں' لیکن شکوہ شکایات میں ہی لگے رہتے ہیں' مگر نیک کام کے حوالے سے اپنے حصے کا کردار ادا نہیں کرتے' اگر ہم شکوہ و شکایت بند کر کے مسائل کو حل کرنا شروع کریں تو یہ معاشرہ جنت بن جائے۔

کہکشاں انجم۔۔۔۔ فیصل آباد

عافیت کی دس چیزیں

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عافیت دس باتوں میں ہے۔ پانچ تو دنیا کے لیے مخصوص ہیں اور پانچ آخرت کے لیے وقف ہیں۔ دنیوی عافیت یہ ہے۔

(1) علم۔
(2) عبادت۔
(3) رزق حلال۔
(4) مصیبت پر صبر کرنا۔
(5) نعمت پر شکر کرنا۔

آخرت کی عافیت یہ ہے۔

(1) ملک الموت کی شفقت و رحمت۔
(2) منکر نکیر نہ ڈرائیں۔
(3) بڑی دہشت سے امن ملے۔
(4) برائیاں مٹا دی جائیں اور نیکیاں قبول ہوں۔
(5) پل صراط پر چمک دار بجلی کی طرح گزر ہو اور جنت میں سلامتی سے داخلہ ہو۔

افشاں شریف۔۔۔ فیصل آباد

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی چھ نصیحتیں

☆ جو آدمی زیادہ ہنستا ہے' اس کا رعب کم ہو جاتا ہے۔

☆ جو مذاق زیادہ کرتا ہے' لوگ اس کو ہلکا اور بے حیثیت سمجھتے ہیں۔

☆ جو باتیں زیادہ کرتا ہے' اس کی لغزشیں زیادہ ہو جاتی ہیں۔

☆ جس کی لغزشیں زیادہ ہو جاتی ہیں' اس کی حیا کم ہو جاتی ہے۔

☆ جس کی حیا کم ہو جاتی ہے' اس کی پرہیزگاری کم ہو جاتی ہے۔

☆ جس کی پرہیزگاری کم ہو جاتی ہے' اس کا دل مردہ ہو جاتا ہے۔

(حیاۃ الصحابہ جلد 3' ص 562)

روبینہ لیاقت۔۔۔ ملتان

چمکتی کرنیں

○ خاموشی دو انجان بندوں کے درمیان رشتہ جوڑ سکتی ہے لیکن دو جاننے والوں کے درمیان رشتہ توڑ دیتی ہے۔

○ جب آپ کا وقت اچھا ہوتا ہے تو آپ کی غلطیاں مذاق سمجھی جاتی ہیں اور جب وقت برا ہوتا ہے تو مذاق بھی غلطی سمجھا جاتا ہے۔

○ محبت میں اڑ سکنے کی خواہش اور نہ اڑ سکنے کی بے بسی عزت دار لڑکیوں کو تمام عمر رلاتی ہے۔

حرا چوہدری۔۔۔ بوریوالہ

بُشریٰ محمود

یادوں کے دریچے

نازیہ جہانگیر' کی ڈائری میں تحریر وجی شاہ کی نظم

چاند رات'

میں ہوں تیرا خیال ہے اور چاند رات ہے
دل درد سے نڈھال ہے اور چاند رات ہے

آنکھوں میں چبھ گئیں تری یادوں کی کرچیاں
کاندھوں پہ غم کی شال ہے اور چاند رات ہے

دل توڑ کے خاموش نظاروں کو کیا ملا
شبنم کا یہ سوال ہے اور چاند رات ہے

کیمپس کی نہر پر ہے تیرا ہاتھ' ہاتھ میں
موسم بھی لازوال ہے اور چاند رات ہے

ہر اک کلی نے اوڑھ لیا ماتمی لباس
ہر پھول پر ملال ہے اور چاند رات ہے

چھلکا سا پڑ رہا ہے وجی وحشتوں کا رنگ
ہر چیز پر زوال ہے اور چاند رات ہے

عینی مہتاب' کی ڈائری میں تحریر موناسحر کی نظم

ایک پیار بھرا عید کارڈ'

ایک پیار بھرا عید کارڈ
دل میں بسنے والوں کو بروقت اگر پہنچے
جذبوں کی مہک ہوا س میں شامل
سندر خوابوں کی جھلک ہو اس میں شامل
ایک پیار بھرا عید کارڈ' بروقت اگر پہنچے
روٹھے ہوئے پیاروں کو' شبنمی آنکھوں کو
ٹوٹے ہوئے دل کو
تجدید محبت کا انوکھی پیغام دیتا ہے
ایک پیار بھرا عید کارڈ' بروقت اگر پہنچے
بھولے ہوئے لوگوں کو
گزرے ہوئے لمحوں کی یاد دلاتا ہے
دل کے دھڑکن میں طوفان اٹھاتا ہے
تو ایک یادگار تحفہ بن جاتا ہے

رفعت انجم' کی ڈائری میں تحریر پروین شاکر کی نظم

گئے برس کی عید کا دن کیا اچھا تھا
چاند کو دیکھ کے اس کا چہرہ دیکھا تھا
فضا میں کیٹس کے لہجے کی نرماہٹ تھی
موسم اپنے رنگ میں فیض کا مصرعہ تھا
دعا کے بے آواز الوہی لمحوں میں
وہ لمحہ بھی کتنا دلکش لمحہ تھا

ہاتھ اُٹھا کر جب آنکھوں ہی آنکھوں میں
اس نے مجھ کو رب سے مانگا تھا
پھر میرے چہرے کو ہاتھ میں لے کر
کتنے پیار سے چوما تھا!
ہوا کچھ آج کی شب کا بھی احوال سنا
کیا وہ اپنی چھت پر آج بھی اکیلا تھا؟
یا کوئی میرے جیسی ساتھ تھی؟ اور اس نے
چاند کو دیکھ کے اس کا چہرہ دیکھا تھا؟

بیا اسامہ انجم، کی ڈائری میں
ایک خوبصورت نظم

جب تم لوٹ آؤ گے
عید کے آنے میں ابھی چند دن باقی ہیں
کسی کو کسی کے آنے کی لگن ہے
ہر کوئی عید کی تیاری میں مگن ہے
پر میرا حال ایسا ہے
جب سے تم سے بچھڑی ہوں
کیا کوئی ہلال عید....
کیا کوئی مبارک باد....

گھر کو تیری یادوں سے اس طرح سجایا ہے
تیری شوخ باتوں کے رنگ برنگے پردے ہیں
تجھ سنگ بیتے لمحوں کی ہری بیلوں کو
آنسوؤں کے پانی سے ہرا بھرا رکھ کر
ہر طرف لگایا ہے
خود تو تنہائی اور اُداسی کی سیاہ چادر اوڑھی ہے
میری جاگتی آنکھوں میں خواب ایک حسین سا ہے
میرے ٹوٹے دل میں ایک یقین سا ہے
کہ آنے والی عیدوں میں
تم لوٹ آؤ گے
مل کے چاند دیکھیں گے
پھر دعا بھی مانگیں گے
پھر سب کی طرح میں بھی
گھر کو سجاؤں گی
جب تم لوٹ آؤ گے
عید میں مناؤں گی

نمرہ، اقراء، کی ڈائری میں تحریر
ساگر خان کی نظم

تمہاری خاموشی کا سبب
جانتا ہوں میں
روٹھے ہوئے ہو تم
مانتا ہوں میں
پر حصار انا میں قید
اب کی بار بھی
میری یہ خواہش ہے
کہ ہر بار کی طرح
تم ہی مجھے مناؤ
پر یوں ہی دنوں کا شمار کرتے کرتے
تمہارا انتظار کرتے کرتے
کیلنڈر کی طرف دیکھا
تو خیال آیا
اب کی بار میں
اپنی انا کو توڑ دوں
محبت کی کہانی کو
نیا اک موڑ دوں
شاید اسی طرح ہو جائے
میری ساری کوتاہیوں کا تدارک
لو آج میں تمہیں کہتا ہوں جان جاں
عید مبارک!

شگفتہ سلیمان

نمرہ، اقراء ______ کراچی
دیکھا عید کا چاند تو مانگی یہ دعا رب سے
دے، دے تیرا ساتھ عید کا تحفہ سمجھ کے

اقصیٰ ناصر ______ کراچی
شاید تم آؤ میں نے اسی انتظار میں
اب کے برس کی عید بھی تنہا گزار دی

عائشہ ______ گوجرہ
میں نے چاہا تجھے عید پہ کچھ پیش کروں
جس میں احساس کے سب رنگ ہوں روشن روشن
جس میں آنکھوں کے تراشے ہوئے موتی رکھوں
جس میں شامل ہو میرے قلب کی دھڑکن دھڑکن

آسیہ جاوید ______ علی پور چٹھہ
چاند دیکھا ہے تو یاد آئی ہے تیری صورت
ہاتھ اٹھتے ہیں مگر حرف دعا یاد نہیں

صائمہ جیمی ______ کراچی
تحفہ دعاؤں کا تمہیں پہنچے میرا
سدا رہے تمہارے گرد خوشیوں کا گھیرا
مسرتیں تمہیں عید کی مبارک ہوں
تمہارے زیست میں نہ آئے کبھی غموں کا پھیر

لائبہ، ایمن ______ مظفر آباد
تجھ کو تیری نہ مجھ کو میری خبر جائے گی
عید اب کے بھی دبے پاؤں گزر جائے گی

جویریہ ______ فیصل آباد
لبوں پہ رنگ تبسم نہ دل میں موج و سرور
میرے وطن کے غریبوں کی عید کیا ہو گی

سعدیہ، مریم ______ شریف آباد
ہر کسی کے لیے کہاں ہوتی ہیں عید کی خوشیاں
مسرتیں لاتا ہے کہاں سب کے لیے عید کا چاند

صدف عمران ______ کراچی
ہلال عید دیکھ کے مانگتی رہی ہوں جو دعا
اب کی بار شاید وہ با اثر ہو جائے

عاصمہ ندیم ______ کراچی
بن دیکھے اسے یارب یہ عید نہ گزرے
گر پیدا کوئی سبب یہ عید نہ گزرے
دنیا کو دکھایا ہے اک چاند جو تو نے
مجھ کو بھی دکھا دے اب یہ عید نہ گزرے

سیدہ نسبت زہرہ ______ کہروڑ پکا
تارے اترے جب پھیلا یا دامن کو
عید کے چاند میں دیکھا میں نے ساجن کو
چاند رات کی مہندی مجھ سے کہتی ہے
تم بھی اک پیغام لکھو نا ساجن کو

گڑیا شاہ ______ کہروڑ پکا
اس نے بھیجے ہیں چاہت میں لپٹے ہوئے
پھول، خوشبو، حنا، چوڑیاں عید پر
کاش وہ آ جائے جس کے ہیں منتظر
میرا دل، بام و در، کھڑکیاں عید پر

مدیحہ فہید ______ کراچی
عید کا چاند نظر آئے گا جس دم مجھ کو
میں تیرے وصل کی اے دوست دعا مانگوں گی
میں تو برسوں سے ہوں تنہائی کے صحرا میں مقیم
اب تیری رفاقت کی دعا مانگوں گی

نشا نورین ______ بوتا کہ جھنڈا سنگھ
ہم نے ہلال عید کے ہاتھ بھجوایا ہے یہ سندیسہ
کرتا ہے تمہیں کوئی یاد بہت بار بار اسے کہنا

حرا قریشی ______ ملتان
جدائی، رت جگا، کرب مسلسل
چلو تم نے مجھے کچھ تو دیا ہے

انا احب، دعائے سحر ______ فیصل آباد
نہیں ہم کو شکایت اب کسی سے
بس اپنے آپ سے روٹھے ہوئے ہیں
بظاہر خوش ہیں لیکن سچ بتائیں
ہم اندر سے بہت ٹوٹے ہوئے ہیں

رُوبینہ شریف

ہمت

"ارے بھائی! سنا تم نے وہ اپنے محلے میں کریانہ کی دکان والے چچا احمد بخش ہیں نا'ان کا بیٹا رمیز اپنے نکاح کے وقت مولوی صاحب کے سامنے سے اٹھ کر بھاگ گیا تب سے اب تک اس کا پتا نہیں ہے۔"

"اوہ... میرا خیال ہے کہ عین وقت بے چارے کی ہمت جواب دے گئی۔"

"نہیں... یوں کہو کہ عین وقت پر اس نے ہمت کرلی۔"

حورین زینب... کھروڑپکا

تجربہ

ایک سردار جی کپ میں چمچہ چلاتے چائے کی چسکی لیتے برا سا منہ بناتے اور کپ نیچے رکھ دیتے پھر دوبارہ چمچہ ہلاتے چسکی لیتے اور منہ بنا کر کپ رکھ دیتے اور پھر یہی عمل شروع کر دیتے۔ کئی دفعہ جب یہ وہ عمل دہرا چکے تو چمچہ میز پر پٹخ کر کہنے لگے۔

"لو بھئی دوستو۔ یہ بات تو آج ثابت ہو گئی کہ اگر چائے میں چینی ڈالی ہی نہ جائے تو لاکھ چمچہ چلائیں۔ چائے میٹھی ہر گز نہیں ہو سکتی۔"

فوزیہ ثمر بٹ' آمنہ میر... گجرات

سیاست اور بیوی

دو سیاستدان زور و شور سے بحث میں مصروف تھے دونوں نے پہلے ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کی پھر الزامات پر اتر آئے۔

ایک بولا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم کس کے اشاروں پر ناچتے ہو۔"

دوسرے سیاستدان نے مشتعل ہو کر کہا۔ "احمق آدمی سیاست میں بیوی کو کیوں گھسیٹتے ہو؟"

حنا فرحان... راجن پور

فریبی

ایک حسین و جمیل سیکریٹری غصے سے بھری باس کے کمرے میں سے باہر نکلی تو ساتھی ورکر نے پوچھا۔

"جب تم باس کے پاس گئی تھیں تو بڑے خوش گوار موڈ میں تھیں اب سخت غصے میں واپس آئی ہو۔ کیا بات ہے؟"

سیکریٹری نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

"اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اب تمہیں فرصت ہے۔ میں نے کہا فرصت ہی فرصت ہے۔ میرا جواب سن کر اس نے بیس صفحے ٹائپ کرنے کے لیے دے دیے فریبی کہیں کا۔"

حنا کاشف... ملتان

شادی

ایک بچہ شادی میں رخصتی کے وقت اپنی ماں سے "امی دلہن تو بہت رو رہی ہے۔ دلہا کیوں نہیں رو رہا۔"

ماں نے "بیٹا دلہن گیٹ تک روئے گی۔ اس کے بعد دلہا قبر تک روئے گا۔"

شمع بتول... کراچی

شکاری

ایک بڑا شکاری اپنی بیوی اور ساس کے ساتھ شکار کھیلنے کے لیے نکلا۔ ایک صبح جب بیوی بیدار ہوئی تو اس نے دیکھا کہ اس کی ماں خیمے میں سے غائب ہے۔ اس نے فوراً" اپنے سوئے ہوئے شوہر کو جھنجوڑ کر جگایا اور اسے آگاہ کیا۔ پھر وہ دونوں بڑھیا کی تلاش میں نکل پڑے۔ جھاڑیوں میں سے ہوتے ہوئے اچانک وہ ایک کھلی جگہ پر پہنچے تو دیکھا کہ بڑھیا ایک شیر کے سامنے موجود ہے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے گھورے جا رہی ہے۔ بیوی نے جب اپنی ماں کو خطرے میں دیکھا تو وہ چیخ و پکار کرنے لگی اور شوہر کو چلا کر کہنے لگی۔

"ارے جلدی سے کچھ کیجیے کہیں شیر امی جان کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔"

شوہر نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"میں کیا کر سکتا ہوں' شیر خود اس بکھیڑے میں پڑا اب خود ہی اس سے نکلے گا۔"

انیلا... قصور

منیجر

ایک بہت بڑے کارخانے میں تقریب جاری تھی۔ تقریب کے آخر میں مالک نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارے کارخانے میں نئے منیجر کا تقرر ہوا ہے' سب جانتے ہیں کہ ہمارا کارخانہ دیانت اور محنت کا زبردست صلہ دیتا ہے' اگر کسی کی کارکردگی غیر معمولی ہے تو خلاف معمول طریقے سے ترقی کر سکتا ہے۔ ہمارے نئے منیجر کو دیکھیں۔ یہ صرف چھ ماہ پہلے ہماری ٹیم میں شامل ہوئے تھے' لیکن انہوں نے اپنی لیاقت و محنت سے ثابت کر دیا کہ وہ اعلا مرتبے کے اہل ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ ان سے کم لائق سینئرز پیچھے رہ گئے ہیں اور یہ بلند عہدے تک پہنچ گئے ہیں۔"

جب مالک کارخانہ تقریر کر چکا تھا تو نیا منیجر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے پرجوش انداز میں مالک کارخانہ سے ہاتھ ملایا اور کہنے لگا۔

"ڈیڈی! بہت بہت شکریہ۔"

مبین... پھول نگر

ایصال ثواب

ایک مولانا نے ایصال ثواب کی خاطر مسجد کے بیرونی دروازے پر یہ تحریر لکھ کر ٹانگ دی۔

"میرا پیارا بھائی حیدر آج صبح اس جہان فانی سے جنت الفردوس کی جانب کوچ کر گیا۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ مغفرت فرماتے ہوئے اسے اعلا و عمدہ مقام عطا فرمائے۔"

دوسرے دن جب وہ مولانا مسجد میں داخل ہونے لگے تو ان کی نگاہ بے ساختہ اپنی تحریر پر پڑی جہاں نیچے کسی نے مندرجہ ذیل فقرہ لکھ دیا تھا۔

"از جنت الفردوس! حیدر صاحب ابھی تک نہیں پہنچے ہمیں سخت تشویش ہے اگر وہ بروقت نہ پہنچ سکے تو مجبوراً" ان کا پورشن کرائے پر اٹھانا پڑے گا۔"

صالحہ... آسٹریلیا

سوپ کا پیالا

ایک اسکاؤٹ ماسٹر بڑے سخت مزاج کا مالک تھا' مگر وہ اس بات پر بڑا زور دیتا تھا کہ کیمپ میں ہر اسکاؤٹ کو عمدہ غذا استعمال کرنی ہے۔ ایک روز اس نے دیکھا کہ دو اسکاؤٹ سوپ کا ایک بڑا پیالا لے کر جا رہے ہیں اس نے حکم دیا۔ "مجھے ایک چمچہ لا کر دو میں اسے چکھنا چاہتا ہوں۔"

لڑکوں نے جواب میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے ڈپٹ کر کہا۔ "میں ایک لفظ بھی نہیں سنوں گا' جو کہا ہے وہی کرو۔"

چنانچہ ایک چمچہ لایا گیا۔ اس نے چمچہ بھر کر پیا تو اس کا منہ بن گیا۔ سوپ کا بیشتر حصہ منہ سے باہر نکل آیا۔ مارے غصے کے اس کی آنکھیں ابل پڑیں اور اس نے انتہائی غصے میں کہا۔

اسے سوپ ہر گز نہیں کہہ سکتے کیا تم اسے سوپ کہتے ہو؟"

ایک اسکاؤٹ لڑکے نے کہا۔ "نہیں جناب! ہم یہی تو عرض کرنا چاہتے تھے کہ یہ تو برتن دھونے کا محلول ہے۔"

حنا کرن... پتوکی

☼ ☼

مدیرہ کرن

نامے میرے نام

حرا قریشی.....بلال کالونی ملتان

اس ماہ کا خط

محبوب من "کرن" کے لیے...

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

ہم بظاہر کچھ بھی نہیں، لیکن بغیر قیمت کے آپ (کرن) کو مل رہے ہیں تو اس میں غلط کیا ہے؟ اصل میں خود کو تیری (کرن) ذات میں ضم کرنے کے طلب گار ہیں۔ اجی حضور! نا سمجھ دل پھر سے ایک بار تیرے اوراق کے سینے پر مدعا لیے حاضر ہوا ہے۔ اس صاحب مشتاق دل کو تہی داماں لوٹانے کی غلطی سے قصد بھی نہ کیجیے گا۔ "صدا" عام سی ہے، تیئن خاص "کرن" کے لیے ہے تو جناب من! قبولیت کا پیمانہ بخش دیجیے نا۔ حقیقت کے سانچے میں ڈھلے سادہ سے الفاظ سادگی سے دل کے صاف و شفاف آئینے میں اندر تک اتر گئے۔ ودھیا! آسیہ عارف جی "آئیڈیل" پڑھا۔ بشریٰ جی سے سو فیصد متفق ہوئے۔ اس میں نوخیز ابھرتی کونپلوں (لڑکیوں) کے لیے عمدہ سبق تھا۔ جن کے خواب کانچ سے اور دل گلوں کی طرح نازک ہوتے ہیں۔ "آپ اپنے دام" میں کوئی بھی کسی بھی وقت آسکتا ہے۔ اگر یہ سوچ لیں تو دوسروں پر تنقید اور اپنے گریبانوں میں جھانکنے کی زیادہ سے زیادہ مہلت ملے ایک چھوٹا سا سبق بصورت "چھوٹی سی کہانی" کے ملا۔ کبھی کبھی عجلت اور غصے میں کیے گئے کام بھی ہمارے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ کشف کی چھوٹی سی غلطی نے خود اس کی ذات اور حنان کے لیے اچھی قسمت کا در وا کیا۔ سوہنیو! ایسا بھی ہوتا ہے۔ مان گئے عزہ جی آپ کو "ملال" پڑھ کر عالیہ کے دکھ میں برابر کے شریک ہوگئے۔ سسرال جیسی پوٹلی میں صبر اور شکر جیسی کنجیاں بند کرنا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ.... ملال آپ کے سامنے ہے۔ ذرا ذرا سی بات کو ہاٹ ایشو بنا کر اپنی شریک حیات کو شک کی وادی میں دھکیلنا اور لمحوں میں سزا سنا کر فرعون بن جانا کہاں کی انسانیت ہے۔

شاہ زیب کا عباس کے گھر عبیر کی تصویر کو پا کر اس پر شک کرنا دراڑ بھی بن سکتا تھا اگر حقیقت سامنے نہ آتی۔ دانش مند مردوں کو یہ زیب نہیں دیتا۔ ازدواجی زیست میں اعتبار اور عزت نہایت ہی اہم لڑیاں ہیں۔ جن کو الجھنے نہ دینے کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ تجدید محبت اسی پہلو کی ایک اہم کڑی ہے۔ ویری ویل نظیر فاطمہ جی!

تم ہو کہ اک پھول کھلا ہے گلاب کا

جی ہاں! افسانوں کی بزم سے رخصت ہوئے تو ناولٹ کے جہاں میں ایک کھلا گلاب فٹ سے اپنی حنا بستہ مٹھیوں میں بھر لیا۔ کیا سمجھے! ابھی فائزہ جی کو جھک کر محبت و احترام کا بوسہ دیا۔ نہایت ہی منفرد انداز "شاید" لوہا بنے گی قارئین کو مقناطیس کی طرح کشش کرے گا۔ سعد کی منہ زور محبتیں، سالار کی شدت پسندی اور ام ہانی کی معصومیت مزید تحریر کو کون سے قوس قزح کے بدلتے رنگ عطا کرنے والی ہے؟ ہم منتظر فرد ہیں فائزہ جی۔

مثل غنچوں کے لبوں پر تبسم بکھیرتی فاخرہ جی کی "سالا خالا اور اوپر والا" آخری مرحلے پر ہے، سو اب جلدی سے کچھ نیا لے کر آیئے۔ "موسم گل" نے کسی حد تک بور کیا۔ بے قصور ہوتے ہوئے بھی عرفہ ریاض نے بڑے مشکل حالات کا سامنا کیا۔ بعد شکر زین نے کچھ تو آسانی پیدا کیں۔ "بہار دسترس میں ہے" موضوع بے شک پرانا تھا، لیکن موزیلٹی بیہودہ پیغامات جا بجا تھے۔ بالکل بجا فرمایا مجاہد نے اور خوب ٹکا کر جواب دیا حیات کو کہ اصلی مرد عورتوں کا ہاتھ تھامنے میں نہیں

بلکہ عورتوں پہ ہاتھ اٹھانے میں شرم محسوس کرتے ہیں۔ جو بھی تھا پڑھ کر کہ مزا آیا۔

"ترنم ندیوں کا" اس کے لہجے کی روانی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کرن ڈائجسٹ میں لکھنے والی کئی ایسی رائٹرز ہیں جن کی باتوں میں بلا کی روانی اور فقروں کو پڑھتے کشش تعلق سی رگوں میں محسوس ہوتی ہے۔ فرحین اظفر بھی ان میں سے ایک ہیں۔ "ردائے وفا" کی ہر قسط انتظار کی شدت کو بڑھا دیتی ہے۔ عفت کا پرخلوص جذبہ اس کے لیے ضرور عافیت کی راہیں ہموار کرے گا۔ انس کی آزمائش بھی ختم ہوگی، جہاں وہاں نائلہ کو بھی اپنی معصیت کے نتائج نظر آئیں گے۔ سوہا اور ماہا بھی حالات کے پیچ و خم سے جلد تجربہ حاصل کرلیں گی۔ ابھی تو آغاز ہے آگے آگے دیکھیے.... ہوتا ہے کیا۔ "اپنی تھکن مجھے دے دو" رملہ نے خود کو حد سے زیادہ ڈی گریڈ کیا ہوا تھا۔ اس پر شاہ میر کا مناہل کے انکار کے بعد جابرانہ رویہ، بہرکیف دیر آید، درست آید کے تحت ہر فرد اپنے مقام پر فٹ ہو ہی گیا۔ شدید گرم موسم میں یہ تحریر خنک موجوں کی طرح ذہن کو خنکی عطا کرگئی۔ خوش رہیے زرنین! "ایک ساگر ہے زندگی" اور "میں گمان نہیں" پر تبصرہ ادھار رہا۔

ج - پیاری حرا آپ نے کرن پر بھرپور تبصرہ کرکے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ بہت شکریہ کرن کو پسند کرنے کا۔ "اک ساگر ہے زندگی" اور "میں گمان نہیں یقین ہوں" پر تبصرہ کا انتظار رہے گا۔

نشانورین.....بوتالہ جھنڈا سنگھ

اس دفعہ کرن بھرپور گرمی اور لائٹ نہ ہونے کی وجہ سے پسینے میں بھیگے ہوئے برے حال میں ملا اور کرن کو دیکھ کر گرمی کو بھول کر جو کہ اپنے عروج پر ہے۔ باغ باغ ہوگئے۔ ایسے لگا جیسے ٹھنڈا پانی مل گیا ہو۔

اس دفعہ جب کرن ملے گا تو رمضان شروع ہوچکا ہوگا۔ سو سب کو میری طرف سے رمضان مبارک ہو اور خدا سب مسلمانوں کو روزے رکھنے کی توفیق دے۔ (آمین)
اس دفعہ ماڈل سادگی کے ساتھ سر پر دوپٹا لیے دل کو بہت پیاری لگی۔ نفیسہ جی آپ کی کیا تعریف کروں ایک تو ناول زبردست، اوپر سے جلدی اینڈ لا رہی ہیں۔ واہ کیا بات ہے اور میرے خیال میں ایشال طلاق دے ہی دے گا جو کہ اس کو دے دینی چاہیے۔ اگر زینب نے کوئی غلطی کی بھی ہے تو اس میں، اس غلط قدم اٹھانے پر مجبور بھی اس کے شوہر نے کیا ہے۔

فرحین اظفر نے اپنے ناول "ردائے وفا" کو پہلی قسط سے اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے، مگر نائلہ نے سوہا کے ساتھ اچھا نہیں کیا، اس کو سزا ملنی چاہیے، اوپر سے شبیر بھی بار بار گھر جاکے تنگ کرتا ہے جو کہ نائلہ جیسی لڑکی کا علاج ہے۔

مکمل ناول میں زرنین آرزو سے ملاقات کی "اپنی تھکن مجھے دیدو" میں جہاں مناہل پر غصہ آیا وہاں رملہ کا ملاپ شاہ میر کے ساتھ، خوشی بھی ہوئی۔ ناولٹ ابھی پڑھ نہیں پائی افسانوں میں نظیر فاطمہ نمبر لے گئیں ویلڈن "تجدید محبت" لکھ کر بہت بڑا پیغام دیا ہے شک کرنے والا کبھی کامیاب نہیں ہوتا وہ تو شکر ہے اس کے دوست نے غلطی دور کردی ورنہ گھر تباہ ہوجاتا۔

اس دفعہ انٹرویو سب اے ون تھے۔ "نامے میرے نام" پر اپنا نام چمکتا دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑے۔ بس فوزیہ ثمر کی کمی محسوس ہوئی۔

ج - پیاری نشا ہماری طرف سے بھی آپ کو رمضان مبارک۔ آپ نے ابھی کچھ تحریروں پر تبصرہ کیا ہے پسند کرنے کا شکریہ۔ باقی تحریروں پر تبصرے کا انتظار رہے گا۔

حنا کرن اسلم۔ ٹھٹھہ گلاب سنگھ گجرانوالہ

نائس ٹائٹل سے سجا کرن 13 تاریخ کو ملا سب سے پہلے "نامے میرے نام" پڑھا، اس کے بعد قسط وار ناول پڑھے۔ نبیلہ ابر راجہ کی تحریر میں کافی جھول نظر آرہے ہیں، باپ کی ڈیتھ پہ ایک بیٹی کا اتنا سرسری رویہ؟ ناولٹ "شاید" بہت اچھا لگا افسانے سارے ہی بہت اچھے تھے، خاص طور پر "اپنے دام میں آپ" جس میں ہمارے کمزور عقیدے کے بارے میں بتایا گیا کہ کس طرح ہم بلا سوچے سمجھے دوسروں پر یہ بہتان لگاتے ہیں۔

ج - پیاری بہن صبا! آپ کا تبصرہ پڑھ کے خوشی ہوئی۔ کرن پسند کرنے کا شکریہ! اپنی رائے سے ہمیں آگاہ کرتی رہیے گا۔ ہم آپ قارئین کی رائے کی روشنی میں کرن کو بہتر سے بہتر کرتے رہیں گے۔ ان شاء اللہ۔

روبینہ لیاقت۔ ملتان

"کرن" سے وابستہ ہوئے تقریباً" آٹھ سال ہوگئے ہماری "کرن" سے وابستگی نئی نہیں۔

اب آتے ہیں اس ماہ کے "کرن" کی طرف تو جناب اس دفعہ کا "کرن" ہمیشہ کی طرح لیٹ "نہیں" ملا بلکہ 12 تاریخ کو مل گیا۔ کرن لیا تو ہمارے شہر کا موسم خوشگوار ہوگیا۔ سب سے پہلے نفیسہ سعید کا "ایک ساگر ہے زندگی" پڑھا یہ قسط بھی پچھلی اقساط کی طرح اچھی تھی۔ فرہاد جیسے بے حس مرد بھی پائے جاتے ہیں جنہیں اپنے رشتوں کا احساس نہیں۔ ایشال پر بھی غصہ آیا کہ کتنا خودغرض نکلا' جیبہ کو دیکھ کر اسے بے اولادی کا احساس ہوا۔ اب اگلی قسط پڑھ کر ہی پتا چلے گا کہانی کس رخ جاتی ہے۔

فرحین اظفر کی "ردائے وفا" پڑھی اف اتنا غصہ آیا نائلہ صاحبہ پر کہ حد نہیں۔ حدید سے پوشیدہ نہیں 'نائلہ کی حرکات پھر بھی اس نے استفسار نہیں کیا کہ اس نے کیا کیا سوہا کے ساتھ مشترکہ رائے ہے (میری اور حنا کی) کہ نائلہ سے کچھ بعید نہیں کہ وہ سوہا پر الزام نہ لگادے کہ شبیر حسین سوہا سے ملنے آتا ہے۔

"میں گمان نہیں یقین ہوں" گزشتہ سے پیوستہ اقساط ایک ساتھ پڑھی ابھی تک تو متاثر نہ کرسکی کیا پتا آگے جاکر کہانی دلچسپ ہو جائے اور نبیلہ جی کی باقی کہانیوں کی طرح متاثر کرسکے۔

"موسم گل میرے دیس میں" عتیقہ ملک کی اچھی کاوش تھی سب سے اچھا سین عبداللہ بھائی والا تھا ہماری تو ہنسی تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی بس اینڈ میں کچھ کمی لگی۔

"سالا' خالہ اور اوپر والا" بلاشبہ اچھی تحریر ہے۔ ہمیں پتا چل گیا تھا خالہ اور ابا کی جوڑی بن ہی جائے گی۔ "شاید" کے بارے میں کیا کہوں فائزہ جی کا نام ہی کافی ہے لفظوں کی کھلاڑی ہیں انہیں خوب آتا ہے لفظوں سے کھیلنا۔ بہترین الفاظ "کبھی کبھی جدائی کچھ نہیں کہتی قربت مار دیتی ہے۔" قبل از وقت کچھ نہیں کہتی بس سالار کا اماں جان کے ساتھ رویہ کچھ سوچنے پر مجبور کرگیا۔

"تجدید محبت" نظیر فاطمہ کا اچھا تھا۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں محبت کی پہلی سیڑھی کا نام ہی اعتبار ہے۔ "چھوٹی سی کہانی" دلچسپ تحریر نے مسکرانے پر مجبور کردیا۔ بشریٰ احمد کی "آئیڈیل" اور طوبیٰ احسن کی "ملال" سبق آموز تحریر تھیں۔

"سادہ سی کہانی" آسیہ عارف کی اچھی تحریر تھی ویسے بھی مجھے گاؤں کے سادہ لوح انسان اچھے لگتے ہیں "اپنے دام میں آپ" ہمارے معاشرے کا یہ ہی المیہ ہے تو ہم پریشانی میں گھرے ہوئے ہیں کتنے سادہ انداز میں تحریر کی اچھی تھی۔ "اپنی تھکن مجھے دے دو" پڑھی پہلے زملہ پر غصہ آتا رہا پھر شاہ میر پر' ٹھیک ہوا اس کے ساتھ جو منا ہل نے کیا۔

"یادوں کے دریچے سے" کے لیے نظم ارسال کی تھی کیا وہ ناقابل اشاعت ہے۔

ج: پیاری روبینہ کرن کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ قارئین بہنوں سے گزارش ہے کہ یادوں کے دریچوں میں جب بھی کوئی نظم ارسال کریں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں ورنہ وہ قابل اشاعت نہیں ہوگی۔

ثناء شہزادہ۔ کراچی

جون کا شمارہ 12 تاریخ کو ہمارے ہاتھوں میں آیا اور تپتی گرمی میں ہمیں پرسکون کرگیا۔ کیا بات ہے جناب کرن کی ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے "حمد و نعت" سے روح کو تروتازہ کیا۔ پھر بڑھے انٹرویوز کی طرف سب کے اچھے تھے اس بار انٹرویوز "مقابل ہے آئینہ" میں شکیلہ شہزادی کے جوابات بہت بہت اچھے لگے۔ اب تو میں نے اپنی امید چھوڑدی ہے کہ مجھے بھی اس سلسلے میں جگہ ملے گی۔

افسانے سب ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ "آئیڈیل" میں رائٹر نے بڑی خوب صورت بات سمجھائی اور میں نے دل میں سوچا کہ جو رشتے اوپر آسمان پر جڑتے ہیں اور زمین پر ملتے ہیں وہ چاہے جیسے بھی ہوں ایک دوسرے کے آئیڈیل بن جاتے ہیں ایک خوشگوار زندگی گزارتے ہیں جو لوگ آئیڈیل کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں وہ اس کہانی سے سبق ضرور سیکھیں۔ "چھوٹی سی کہانی" اور "محبت کی ایک سادہ سی کہانی" تھیں تو بہت مختصر مگر زبردست تھیں۔ "ملال" میں طوبیٰ احسن صاحبہ نے ہمیں صبر کا درس دیا اور یہ حقیقت ہے ہمارا صبر کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔ "اپنے دام میں آپ" بھی بہت اچھا تھا ہمارا ایمان کتنا کمزور ہوگیا ہے کہ ہم ان باباؤں کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔ ذرا سا ہمارے ساتھ کچھ ایسا ویسا ہو جائے ہم فوراً" ان عاملوں کے پاس بھاگتے ہیں جو ہمیں بے وقوف بنا کر اپنی جیب گرم کرلیتے ہیں ہم یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اوپر جو ذات بیٹھی ہے وہ کبھی اپنے بندوں کا برا نہیں ہونے دے سکتی۔ "تجدید محبت" میں نظیر فاطمہ کی ہیروئن نے عزت کو محبت پر ترجیح دی بہت اچھا لگا۔ یہ مرد اتنے بے اعتبار کیوں ہوتے ہیں۔ میری تو دعا ہے پروردگار سے کہ میری لائف میں جو آئے وہ مجھ پر خود سے زیادہ اعتبار کرے (آمین)

ناولٹ میں "خالا سالا اور اوپر والا" میں نہیں پڑھتی کیونکہ مجھے سبق آموز کہانیاں پسند ہیں۔ حیا بخاری کے ناولٹ میں ہیروئن کو کچھ زیادہ ہی ناشکرا دکھایا گیا جو مجھے بہت برا لگا۔ مجاہد کا کریکٹر اچھا تھا اس نے حیا کی محبت میں اس کی ہر خواہش پوری کی مگر محترمہ کے تو مزاج ہی نہیں مل رہے تھے خیر اینڈ میں وہ سمجھ گئی کہ اللہ کو صبر و شکر کرنے والے بندے پسند ہیں۔ "موسم گل" بس سو سو تھا زیادہ پسند نہیں آیا۔ "شاید" میں فائزہ افتخار صاحبہ نے خوب صورت لفظوں کا انتخاب کرکے ہمیں پہلی قسط میں ہی اپنی گرفت میں لے لیا۔ دو انسان ہانی کی محبت میں پاگل ہیں مگر مجھے لگتا ہے ہانی کی جو خوشیاں سعد دے گا' وہ سالار اعظم نہیں دے سکتا۔ کیونکہ اس کی محبت میں حاکمیت ہے۔ اس کا پل پل بدلتا رویہ بتارہا ہے کہ بعد میں ہانی کے ساتھ کیا ہوگا۔ مکمل ناول "اپنی تھکن مجھے دے دو" زرین آرزو نے بھی اچھا لکھا مگر بہت زیادہ اچھا نہیں تھا۔ "میں گمان نہیں یقین ہوں" شروع میں اچھا نہیں لگا مگر اب بہت زبردست لگ رہا ہے۔ رنم کی شادی لگتا ہے ایک سے ہوگی مگر پھر زیان کے لیے بھی تو کوئی اچھا سا ہیرو آنا چاہیے۔ "ایک ساگر ہے زندگی" میں ایشال کتنا کم ظرف ہے غصہ آرہا ہے اس پر کے پہلے تو اس لڑکی کو دیکھنے تک کا روادار نہیں تھا اور اب وہ منکوحہ ہوگئی واہ! بہت خوب کیا کہنے ہیں ایشال صاحب کے اب دو بیویاں بھی رکھنے کو تیار ہیں "ردائے وفا" میں بہت اچھا لگا کے نائلہ کے اوپر شبیر حسین کو مسلط کردیا کسی عذاب کی صورت میں نائلہ کے حال پر اب دل خوش ہورہا ہے' اب اسے اندازہ ہورہا ہوگا کہ کسی کے ساتھ برا کرنے سے ہمارے اپنے ساتھ بھی برا ہوسکتا ہے۔ پلیز فرحین صاحبہ! آپ نائلہ اور حدید کو الگ کردیں جلدی سے اور عفت کو حدید سے ملادیجیے۔ نائلہ کو تنہائی کے اندھیروں میں بھیج دیجیے۔

اور ہاں 10 جولائی کو لبنیٰ جدون کی سالگرہ ہے انہیں میری طرف سے سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ ویسے آپ ہیں کہاں آپ کے مکمل ناول یاد آرہے ہیں عید کے حوالے سے کوئی خوب صورت مکمل ناول لکھیں ناں پلیز۔

ج: آپ کی اور ہماری اور کرن کی سب قارئین کی طرف سے لبنیٰ جدون کو بہت بہت سالگرہ کی مبارک ہو۔ ان تک آپ کی خواہش پہنچ گئی ہے۔ کرن کے سب افسانے اور ناول' سلسلے پسند کرنے کا شکریہ۔ ثنا آپ کا "کچھ موتی چنے ہیں" کے لیے انتخاب اور "مقابل ہے آئینہ" کے جوابات ہمیں موصول نہیں ہوئے آپ اگر دوبارہ بھیجیں گی تو ضرور شائع کریں گے۔

ملک قراۃ العین عینی۔ منڈی بہاؤالدین

میں آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے میرے خط کو کرن میں جگہ دی۔ آپ کا بہت شکریہ آپ نے میری حوصلہ افزائی کی۔

کرن 15 تاریخ کو سخت گرمی میں ٹھنڈی پھوار بن کے برسا' پیاری سی ماڈل سر پر دوپٹا اوڑھے بہت ہی خوب صورت اور مذہبی لگ رہی تھی۔ انٹرویوز بالکل پسند نہیں آئے' رائٹروں کے انٹرویوز شامل کیجیے بمع تصاویر' سونم کیفی میری پسندیدہ RJ ہیں "مقابل ہے آئینہ" میں شکیلہ شہزادی سے ملاقات بس سو سو ہی تھا "ایک ساگر ہے زندگی" نفیسہ سعید کی ان شاء اللہ آئندہ ماہ آخری قسط ہوگئی تو پھر ان شاء اللہ تبصرہ کروں گی 'فرحین اظفر کا "ردائے وفا" بہت ہی بیسٹ ناول ہے گڈ ویری گڈ فرحین اظفر جی۔ افسانے سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھے بہت پسند آئے۔ "شاید" بہت اچھے مراحل طے کررہا ہے فائزہ جی تسی گریٹ او۔ "خالا' سالا اوپر والا ایک مزاح سے بھرپور اسٹوری ہے پڑھ کر بہت مزا آتا ہے۔ گڈ۔ "موسم گل" عتیقہ ملک اور "بہار دسترس" میں ہے حیا بخاری کا' دونوں ناول پرفیکٹ ہیں۔

"اس ماہ کا خط" طاہرہ ملک کا تبصرہ بہت لمبا اور بہترین تھا۔

میں اپنی کاوش آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتی ہوں اور مجھے کہانی بھیجنے کا طریقہ بتائیں پلیز میرا خط کا جواب ضرور دیجیے۔ "کرن کتاب" میں موٹاپے کے چھٹکارے کے بارے میں یا مہندی اور عید کے بارے میں

کرن کتاب شائع کریں۔
ج ۔ قرۃ العین جی کرن کو پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ آپ اپنی کہانی کرن کے ایڈریس پر ارسال کر سکتی ہیں۔ قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کرن کے لیے آپ کی دعاؤں کو قبول فرمائے (آمین)

مریم مغل' آمنہ حمید' عزیٰ یاسین' نبیلہ یاسین' صائمہ نواز بدو کی گوسائیاں گوجرانوالہ کینٹ

ہم کرن کی پچھلے پانچ سال سے قاری ہیں۔ کرن نے ہماری ہر مشکل موڑ پر رہنمائی کی۔ کرن میں ہماری فیورٹ اسٹوری "اک ساگر ہے زندگی" ہے۔ اس میں ہمارے پسندیدہ کردار حبیب اور شاہ زین ہیں۔ مکمل ناول "میں گمان نہیں یقین ہوں" بہت زبردست جارہا ہے۔ ناولٹ "شاید" فائزہ افتخار ویل ڈن۔ بہت زبردست ناول لکھنے کے لیے شکریہ۔ "اپنی تھکن مجھے دے دو" زرین آرزو کا ناول بھی زبردست رہا۔ "خالہ سالا اور اوپر والا" کیا ہی کہنے۔ باقی افسانے بھی زبردست رہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ آواز کی دنیا میں FM 103-6 کے آر جے آنسہ ملک اور عادل زوہیب کا انٹرویو شائع کریں۔
ج ۔ شاہین رشید تک آپ کی فرمائش پہنچائی جارہی ہے۔ خط لکھنے کا شکریہ۔

آسیہ ارم۔ کراچی

سب سے پہلے آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میرے خط کو جگہ دے کر میرے میاں جی کے مذاق کا نشانہ بننے سے بچالیا۔ جون کے کرن کا ٹائٹل بہت اچھا تھا آج کے دور میں جبکہ دوپٹا نایاب ہو گیا ہے آپ نے ماڈل علینہ کو سر پہ دوپٹا لے کر دکھانے پر بہت اچھا امپریشن ڈالا ہے۔ "اک ساگر ہے زندگی"
شکر ہے نفیسہ سعید صاحبہ آپ نے اس کا اینڈ کر دیا۔ "شاید" فائزہ افتخار کا بہت اچھا ناولٹ ہے پڑھ کر مزا آیا مگر فائزہ جی آپ اینڈ میں سعد سے ام ہانی کو ضرور ملوا دیجیے گا کیا ہوا جو وہ بڑی ہے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہی بتایا ہے اپنی عملی زندگی سے کہ اس سے کوئی فرق نہیں ہوتا اور سعد کی محبت زیر زور کرتی ہے کہ وہ ام ہانی سے شادی کرے۔ "اپنی تھکن مجھے دے دو" زرین آرزو اپنے مکمل ناول کے ساتھ مکمل انصاف نہ کر سکیں حویلی میں اتنے لوگ بتائے مگر صرف 3 ہی لوگوں کو گرد گھومتے ناول ختم اور معاف کیجیے گا یہ کیا شاہ میر کو ڈاکٹر بتایا اور اس کا ایسا اپنی بیوڈ اور بڑے ابا رملہ سے اتنی محبت کرتے ہیں مگر سامنا ایک دفعہ بھی نہیں کرایا کہ پتا چلتا بڑے ابا کتنے پانی میں ہیں (یعنی محبت کے جنون) اور حویلی سے باہر اتنی دفعہ گئے سب مگر ذکر صرف حویلی کے اندر کا یا اللہ اتنا ٹائم ویسٹ ہوا۔ شکر ہے فرحین اظفر صاحبہ آپ نے "ردائے وفا" میں کچھ چینج بھی لکھا ویل ڈن! عنیقہ ملک آپ نے شکر ہے ہمارے لیے کچھ چینج ٹاپک پر لکھا پڑھ کر بہت مزا آیا بہت کوششیں کی کہ کچھ تنقید ڈھونڈ سکوں مگر نہ جی۔ عرفہ کا کردار بہت جاندار تھا ایک بات میں ان لڑکیوں سے ضرور کہوں گی کہ آپ لوگوں کے ساتھ جس طرح کا بھی مسئلہ ہوا اپنے گھر والوں کو سب سے پہلے انفارم کریں جب کوئی بات (آپ کے متعلق) کوئی اور بتاتا ہے تو وہ بہت غلط رنگ اختیار کرتی ہے۔ جیسے عرفہ نے اپنے گھر میں سب سے پہلے بتایا اور عنیقہ جی تھوڑا سا آپ عمر مبارک کے بارے میں بھی بتاتیں کہ عرفہ کے بھائی نے کیسے مارا کہ وہ مر ہی گیا خیر۔ حیا بخاری کا ٹاپک اچھا تھا آج کل کا یہی المیہ ہے کہ جو چیز آپ کے پاس ہے اس کا شکر مت ادا کرنا اور خواہشوں کے غلام گردش میں گھومنا۔
"محبت کی اک سادہ سی کہانی" آسیہ عارف نے دو پیار کرنے والوں کے خطوط میں ان کی محبت کے کیسے کیسے رنگ دکھائے' ہلکی پھلکی کہانی نے بہت مزا دیا۔ "فاخرہ گل" اب بس کر دیں آپ نے کہانی کا کوئی پلاٹ تو چنا نہیں ہے۔ مزا آرہا ہے نہ ہنسی۔ "کچھ موتی چنے ہیں" کے تمام اقتباس اچھے تھے کسی ایک کا نام لے کر دوسرے کے ساتھ زیادتی والی بات ہو گی۔
"حسن و صحت" یہ سلسلہ پلیز بند مت کیجیے گا بہت کچھ گھر بیٹھے سیکھنے کو ملتا ہے اسے کاش کہ "نامے میرے نام" میں اس بار اس ماہ کا خط میرا ہو آمین۔
اب اجازت دیں تمام بہنوں اور ادارہ کرن کو رمضان اور عید کی پیشگی مبارک۔
ج ۔ پیاری بہن آسیہ ارم خط لکھنے کا شکریہ۔ اسی طرح آپ اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہا کریں ان شاء اللہ آپ کا خط "اس ماہ کا خط" میں شامل ہو جائے گا۔

☆ ☆